خطباتِ حکیم الامتؒ 32 جلدوں سے منتخب الہامی جواہرات

جواہراتِ حکیم الامتؒ

از افادات

حکیم الامت مجدد الملت
حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

پسند فرمودہ

مفتی اعظم مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ
شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ
ودیگر اکابرین

جمع وترتیب

حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ
خلیفۂ مجاز
مفتی اعظم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

جلد ۱
عقائد... نماز... حج
رمضان... روزہ
زکوٰۃ... سیرۃ النبی ﷺ

جلد ۲
علم وعرفان
شریعت کے اسرار ورموز
حکمت ومعرفت کا منتخب گنجینہ

جلد ۳
تصوف... اخلاق
باطنی تزکیہ کا دستور العمل
تصوف کی اصلاحات
کی تشریحات

جلد ۴
اتباعِ سنت
حقوق العباد... فقہی مسائل
معاملات... آخرت
سیاست
تعویذات وعملیات
لطائف وظرائف
معاشرت

اِدارہ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان

خطباتِ حکیم الامت 32 جلدوں سے منتخب الہامی جواہرات

جواہراتِ حکیم الامت

۲

عقائد... نماز... حج... زکوٰۃ... رمضان... آخرت، سیرۃ النبی ﷺ... اتباعِ سنت
تصوف... علم وعرفان... اوراد ووظائف... فقہی مسائل... اخلاق... معاملات... سیاست
حقوق العباد... معاشرت... عملیات وتعویذات... لطائف وظرائف

ازافادات

حکیم الامت مجدد الملت
حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

پسند فرمودہ

مفتی اعظم مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ
شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ
ودیگر اکابرین

جمع وترتیب

حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ
خلیفۂ مجاز
مفتی اعظم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240

جواہرِ حکیم الامت

تاریخ اشاعت............ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ
ناشر............ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت............سلامت اقبال پریس ملتان

انتباہ

اس کتاب کی کاپی رائٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں
کسی بھی طریقہ سے اس کی اشاعت غیر قانونی ہے

قانونی مشیر

قیصر احمد خان

(ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ملتان)

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ ۔۔ چوک فوارہ ۔۔ ملتان   اسلامی کتاب گھر خیابان سرسید روڈ ۔ راولپنڈی
ادارہ اسلامیات ۔ ۔ انارکلی ۔۔۔۔۔ لاہور   دار الاشاعت ۔۔ اردو بازار ۔۔۔۔۔ کراچی
مکتبہ سید احمد شہید ۔ اردو بازار ۔۔۔۔ لاہور   مکتبہ القرآن ۔۔۔ بنوری ٹاؤن ۔۔۔۔۔ کراچی
مکتبہ رحمانیہ ۔۔۔ اردو بازار ۔۔۔۔۔ لاہور   مکتبہ دار الاخلاص ۔۔ قصہ خوانی بازار ۔۔ پشاور
مکتبہ رشیدیہ ۔ سرکی روڈ ۔ کوئٹہ
ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K   119-121 HALLIWELL ROAD
(ISLAMIC BOOKS CENTERE   BOLTON BL1 3NE (U.K.)

عرض ناشر

الحمدللہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

امابعد! حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے خواص وعوام کی دینی ضروریات پر کثیر تعداد میں کتب تصنیف فرمائیں حتی کہ آپ کو ”سیوطی وقت“ کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ تصانیف کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تقریر ووعظ کے ملکہ سے بھی خوب نوازا اور سفر وحضر میں مواعظ کا سلسلہ جاری رہا۔ نصف صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی آپ کے مواعظ وملفوظات کی تاثیر زندہ جاوید ہے کہ ہر پڑھنے والا یہی پکار اٹھتا ہے کہ علوم ومعارف اور ظاہر وباطن کی اصلاح پر مشتمل یہ مواعظ وملفوظات کسبی نہیں بلکہ الہامی ہیں کہ ”از دل خیزد بر دل ریزد“ کا حسی آئینہ ہیں۔ خطبات وملفوظات حکیم الامت کی افادیت اور ان کے بارہ میں اکابر کے تاثرات تیسری جلد کے شروع میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے تمام مواعظ جو کہ تقریباً 350 ہیں اور 32 ضخیم جلدوں پر محیط ہیں۔ عصر حاضر کی مصروفیات کے پیش نظر اہل علم اور خواص حضرات اور عامۃ المسلمین کا ان سے استفادہ کرنا مشکل ہے، جبکہ ان مواعظ میں بیسیوں عنوانات پر علم وحکمت کے ہزاروں موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ (خلیفہ مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) کو جزائے خیر سے نوازیں جنہوں نے بندہ کی درخواست پر مواعظ کی 32 جلدوں سے منتخب جواہرات کی نہ صرف نشاندہی فرمائی بلکہ اہم عنوانات کے تحت ان کی تقسیم بھی فرمادی۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء

نیز ہر جوہر کے آخر میں وعظ کا نام اور جلد نمبر بھی دے دیا گیا ہے تا کہ بآسانی مراجعت کی جاسکے۔ مواعظ سے ماخوذ ”جواہرات حکیم الامت“ کا یہ نافع سلسلہ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات کی 30 جلدوں کے جواہرات بھی زیر ترتیب ہیں۔ اللہ تعالیٰ حسب سابق ادارہ کے اس جدید اشاعتی سلسلہ کو شرف قبولیت سے نوازیں اور ہمیں تمام مراحل میں اپنے اکابر کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں کہ دور حاضر میں تمام شر و رفتن سے حفاظت کا یہی ایک مضبوط قلعہ اور سہارا ہے۔ والسلام

محمد اسحٰق غفرلہٗ ذیقعدہ 1431ھ بمطابق اکتوبر 2010ء

کلماتِ مرتب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ و کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

امابعد! اخی فی اللہ، برادر محترم حضرت الحاج حافظ محمد اسحٰق صاحب ملتانی مدظلہ کے ارشاد کے مطابق خطبات وملفوظات حکیم الامتؒ کو مختلف عنوانات کے تحت علیحدہ کردیا، تاکہ ہر موضوع پر علیحدہ جلدیں شائع کردی جائیں باوجود تقریبا روزانہ بلاناغہ اس امر کو سرانجام دینے میں علالت اور ضعف کے سبب دوسال لگ گئے آج بفضلہٖ تعالیٰ بخیر وخوبی یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ **الحمدللہ طیبا مبارکا فیہ**

حق سبحانہ وتعالیٰ اس خدمت کو قبول فرما کر زادِ آخرت وسرمایہ نجات بنادیں اور ان کی اشاعت کے اسباب فرما کر ناشر اور ناچیز کیلئے صدقہ جاریہ بنادیں آمین

ان جلدوں میں مواعظ سے بفضلہٖ سبحانہ وتعالیٰ اتنا علمی وعملی مواد جمع ہوگیا ہے کہ قارئین حضرات اور علماء ومشائخ نیز جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی مطالعہ کے بعد اپنے علم میں اضافہ اور ترقی محسوس کریں گے اور عمل کیلئے جذبہ ذوق وشوق پائیں گے۔ حضرات مشائخ اپنی مجالس میں انہیں اجتماعی طور پر سنیں تو ازحد نفع ہوگا۔

فقط والسلام خیر ختام دعاؤں کا ازحد محتاج
بندہ محمد اقبال قریشی غفرلہ
۱۲ صفر المظفر ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۸ جنوری ۲۰۱۰ء

Mohammad Rafi Usmani
Mufti & President Darul-Uloom Karachi,Pakistan
Ex-Member Council of Islamic Ideology Pakistan

محمد رفیع عثمانی
رئیس الجامعۃ لدار العلوم کراتشی و المفتی بہا
عضو مجلس الفکر الاسلامی لحکومۃ باکستان سابقاً

التاریخ ۲۸ ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۲۰۰۸
الرقم

عزیز محترم جناب محمد اقبال قریشی صاحب
و جناب حافظ محمد اسحاق صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خیر و عافیت کے ساتھ رکھے۔

گرامی نامہ سے یہ معلوم ہو کر بہت مسرت ہوئی کو خطبات حکیم الامت میں جو خطبات آئے ہیں، ان میں سے منتخب خطبات کو مبوّب کر کے جواہرات حکیم الامت کے نام سے چار جلدوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ان شاء اللہ اس سے طالبین کو ہر موضوع سے متعلق حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات تلاش کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ امید ظن غالب کے درجہ میں یہ ہے کہ اس انتخاب میں بھی پچھلی تالیفات کی طرح اس بات کا التزام کیا جائے گا کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ اور عبارتوں میں ادنیٰ تغیر نہ ہو۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کار خیر کا آپ حضرات کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ لوگوں کو اس سے خوب خوب فائدہ پہنچے اور اسے آپ حضرات کیلئے ذخیرہ آخرت اور صدقہ جاریہ بنائے۔

والسلام

(محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ)
رئیس الجامعہ دار العلوم کراچی

JUSTICE MUHAMMAD TAQI USMANI

Member Shariat appellate Bench
Supreme Court of Pakistan
Deputy Chairman Islamic Fiqh Academy (OIC) Jeddah
vice President Darul-Uloom Karachi 14 Pakistan.

محمد تقي العثماني

قاضي مجلس التمييز الشرعي للمحكمة العليا باكستان
نائب رئيس : مجمع الفقه الاسلامي بجدة
نائب رئيس : دار العلوم كراتشي ١٤ باكستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکرمی جناب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماشاء اللہ آپ نے تو حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے علوم کو پھیلانے کی بڑی سعادت حاصل کی ہے، البتہ علماء میں یہ بات کہی ہے کہ کسی کتاب پر اسے دیکھے بغیر لکھنا دیانت کے خلاف ہے لہٰذا صرف فہرست دیکھ کر لکھنا مناسب نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ بندہ کی تقریظ کے [illegible] بغیر شائع کر دیں۔ آپ کا نام ہی کافی ہے۔

والسلام

بندہ

۱۰-۱۱-۳۱

علمِ و عرفان

- ☆ شریعت مطہرہ کے انوار و برکات
- ☆ ہزاروں علمی مباحث پر حکیمانہ نکات
- ☆ شریعت کے اسرار و رموز سے پردہ کشائی
- ☆ حکمت و معرفت کے بے شمار مضامین
- ☆ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے الہامی خطبات
  علم و حکمت اور علوم و معرفت کا منتخب گنجینہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللھم
صل علی محمد و علی آل محمد
کما صلیت علی ابراہیم و علی آل ابراہیم
انک حمید مجید

اللھم
بارک علی محمد و علی آل محمد
کما بارکت علی ابراہیم و علی آل ابراہیم
انک حمید مجید

فہرست مضامین

قرآن کی تعلیم امن	۲۷
حفظ قرآن کی ضرورت	۲۸
عشق قرآن......دو باتوں کا اہتمام	۲۹
داڑھی کا وجوب اور وجود......ایک فکری غلطی	۳۰
حسب فہم جواب	۳۱
تعلیم اعتدال	۳۲
طلب جنت	۳۳
مراتب ایمانی مختلف ہیں......حب وبغض کا مدار	۳۵
حکیمانہ طرز اصلاح	۳۶
اسلام کی تعلیم اعتدال	۳۷
حق کی قبولیت وتاثیر	۳۸
مقام رسالت......نصاب اصلاح	۳۹
علم کی فضیلت واہمیت	۴۰
مقام ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما......عقل وفراست	۴۱
اہل جنت کی غذا	۴۲
ایک قرآنی حکم کی وضاحت	۴۳
داخلہ جنت کی خوش فہمی	۴۴
اسمائے جلال وجمال	۴۶
دین کے اثرات وبرکات	۴۷
اخلاص کی قیمت......کسب حلال اور حب دُنیا	۴۸
انا اللہ کی فضیلت	۴۹
شریعت اور رحمت	۵۱
حکیمانہ جواب	۵۲

ترجمہ قرآن کا معیار......نظری کی وبا اور علاج	۵۳
دنیا و آخرت کا فرق	۵۵
دنیا کی حقیقت	۵۶
حب دنیا کا مرض	۵۷
دُنیا کی حقیقت	۵۸
غفلت سے احتراز........رخصت اور سہولت	۵۹
علم کی دو قسمیں.......عظمت و کیفیت وحی	۶۰
عہد الست	۶۱
دار الطلبہ کے فضائل......درس عبرت	۶۲
مردہ کو چیزوں کا ثواب پہنچتا ہے........سعادت ونحوست کی حقیقت	۶۴
اہل باطل کی کتب سے اجتناب	۶۵
عوام الناس کا درجہ علم	۶۶
ایک شبہ کا عملی جواب	۶۷
حرمت کا مدار	۶۸
ایک حدیث کی وضاحت.......علماء کی کوتاہی	۷۰
رحمت خداوندی.......علم وفقہ کی عظمت	۷۱
وہبی علوم	۷۲
مطالعہ میں احتیاط......تبلیغ کا طریقہ کار	۷۳
علم کی ضرورت......علم کی قسمیں	۷۴
قوت اجتہادیہ	۷۵
قوت بیانیہ	۷۶
فن تدریس.....تقریر کا ایک ادب.....نزع کی تکلیف کا راز	۷۷
اسلام اور سائنس	۷۸
اجزائے دین کی تفصیل	۷۹
معاشرتی ادب.......بغاوت کا انجام	۸۰

خاوند سے مشورے کی ضرورت.......اہل جنت کی قسمیں	۸۱
قرآنی نکات......قرآن کا طرز کلام	۸۲
فضیلت کسب حلال......اولاد کا عذاب	۸۳
داڑھی کی ضرورت	۸۵
نہی عن المنکر کا طریقہ...احکام چندہ.......علوم مقصودہ	۸۶
دعویٰ اور دعوت کا فرق	۸۷
امت کی زبوں حالی.........علماء کے کرنے کے کام	۸۸
نوافل کی اہمیت......بدعت وسنت	۸۹
وسعت اختیار کا اثر	۹۱
ایمان وکفر	۹۳
تعمیر مساجد کی فضیلت	۹۴
فضیلت صدقہ	۹۶
زمین وسورج کی حرکت........حقوق نفس کی رعایت	۹۷
فضائل امت محمدیہ	۹۸
اصلاح غیر کے مدارج	۹۹
اشاعت اسلام کا سبب.....مسلمان اور کافر کا فرق	۱۰۱
صدقہ کی برکات	۱۰۲
قرآنی افادات	۱۰۳
ایک عوامی غلطی کا ازالہ.........گناہ کے تاریک اثرات	۱۰۴
ماہ ربیع الاول کی فضیلت..........لوح محفوظ کی مثال	۱۰۵
ایک اشکال کا جواب	۱۰۷
اجزائے آخرت	۱۰۸
صحبت کی برکات	۱۰۹
واقعہ حضرت یونس علیہ السلام	۱۱۱
فرق ملکیت وتصرف	۱۱۳

انسانی تخلیق اور مقصد تخلیق	۱۱۵
اصلاح نفس میں عمومی غفلت	۱۱۸
حقیقت نور	۱۱۹
انسانی سلامتی کا راستہ	۱۲۰
ضرورت تقلید	۱۲۱
حکم یا سفارش......آج کل کی حالت	۱۲۳
معرفت کی لذت..........فضیلت شب براءت	۱۲۵
خود سے خیر خواہی......کمال اسلام	۱۲۶
باہمی ہدیہ کا تبادلہ........ہدیہ میں خلوص کی ضرورت	۱۲۷
اصول شریعت......ایک عوامی اشکال کا حل	۱۲۸
اتفاق کی ضرورت وصورت	۱۲۹
رہبر کامل کی ضرورت........امت پر کمال پرشفقت	۱۳۰
عبادت کی ضرورت واہمیت......دنیا کو مقصود نہ بنایا جائے	۱۳۱
حقیقت علم	۱۳۲
رحمت حق	۱۳۳
نظام زکوۃ......اہل اللہ کے مراتب	۱۳۴
کفر اور اس کی اقسام	۱۳۵
شب برأت	۱۳۶
غیبی نظام رزق	۱۳۷
شرارت نفس	۱۳۸
تلقین نماز	۱۳۹
آخری جنتی......بدعات کے زہریلے اثرات	۱۴۰
ماہ صفر کی عید......اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا	۱۴۲
اسلامی حدود کی وضاحت	۱۴۳
ایک حدیث کی تشریح	۱۴۵

مصائب اختیاریہ	۱۴۶
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں	۱۴۷
طلب جنت کا ذریعہ......حب دنیا کی حقیقت	۱۴۸
جنت اور اس کی وسعت.......صحت واطمینان کی نعمت	۱۴۹
چندہ کا طریقہ......نااہل کو منتظم یا مہتمم بنانا	۱۵۰
چوری اور ہیرا پھیری	۱۵۱
تعزیت کا اچھا طریقہ	۱۵۲
ایک بزرگ کا کشف......پتھر کا گریہ......اولاد اور شفاعت	۱۵۳
کمال فہم وفراست	۱۵۵
آمد وخرچ کا طریقہ.......عقل کیا ہے؟.......رحمت خداوندی	۱۵۶
آداب عیادت......احکام کے اسرار	۱۵۷
مباح کی حد	۱۵۸
اولاد نہ ہونے کی حکمت	۱۵۹
عبادت وطاعت کا فرق	۱۶۰
حضرت موسیٰؑ اور عزرائیل	۱۶۱
تکثیر جماعت کا اثر	۱۶۲
مضامین قرآن کی اقسام	۱۶۳
اللہ تعالیٰ کی بندوں سے محبت ولطف	۱۶۴
اقسام افعال......ایک علمی بحث	۱۶۵
تجلی کے معنی.......حلال وحرام	۱۶۶
مسلمات کی خصوصیات	۱۶۸
روزہ کی فرحت	۱۶۹
محبت رسول	۱۷۱
شان صحابہ	۱۷۲
نور کی حقیقت......انسانی تخلیق	۱۷۴

فقیہ کون ہے؟......نزول قرآن	۱۷۶
قرآنی آیت کی تشریح......حق تعالیٰ کی توجہ	۱۷۸
اہل جنت کا عیش	۱۷۹
واقعہ معراج کی ایک جزئی	۱۸۰
وضو کی برکات......مثالی ازدواجی زندگی	۱۸۲
فرائض ونوافل سے قرب حق	۱۸۳
ممنوعات شرعیہ کی حکمت	۱۸۴
حقوق اللہ کی حقیقت......تعلق مع اللہ	۱۸۵
انسانی احتیاج	۱۸۶
جان وایمان کی حفاظت	۱۸۷
تکبر حرام ہے......تعلیم انبیاء علیہم السلام	۱۸۸
خدمت دین	۱۹۰
نسخہ کیمیا	۱۹۱
مجاہدہ اور ترقی......نعمت رزق	۱۹۲
حکمت اور موعظت حسنہ	۱۹۴
نعمت اسلام کا حق	۱۹۷
سکوت کا اثر	۱۹۹
نور علم	۲۰۰
حفاظت دین کا نظام	۲۰۱
تہذیب اخلاق کا شرعی نظام	۲۰۲
فضیلت اسلام	۲۰۳
ایک اعتراض کا جواب	۲۰۴
اہل اسلام کا ترقی کا راستہ	۲۰۵
استقبال قبلہ کا راز	۲۰۷
حقیقت اسلام	۲۰۸

علوم کشفیہ کا مطالعہ:	۲۰۹
اطمینان و تشفی کا راستہ	۲۱۰
حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ	۲۱۲
خشیت صحابہؓ:	۲۱۳
ضعیف ترین ایمان:	۲۱۴
لفظ رب العالمین کا نکتہ:	۲۱۵
مسلمان کی ذمہ داریاں	۲۱۶
دعوت کا ضابطہ.......ایک معترض کی اصلاح	۲۱۷
اقسام تبلیغ	۲۱۹
بزرگوں کا طرز نصیحت.......عذر بلا اہتمام عمل	۲۲۰
مسلمان کا مذاق.......حسن اسلام کا تقاضہ	۲۲۱
ذکر قلبی......حقیقت ذکر	۲۲۲
تبلیغ میں اعتدال	۲۲۴
تبلیغ بقدر استطاعت	۲۲۶
اہل علم کا عوام سے معاملہ	۲۲۷
اکابر دیوبند کی دقت نظر	۲۲۸
تعلیم خلوت کا راز	۲۲۹
تبلیغ کی برکت......ناصح غیر عامل	۲۳۰
انذار کی قسمیں	۲۳۱
جمال و جلال خداوندی......جنت کا سوال	۲۳۲
کیفیت نزع کی تفصیل	۲۳۳
تفسیری نکتہ	۲۳۵
ایک مسنون دعا کی تشریح	۲۳۶
افراط خوف کا اثر	۲۳۷
حکیمانہ جواب......وجود صانع حقیقی......شانِ عبدیت	۲۳۸

آیت کی تفسیر	۲۳۹
طاعت کے فائدے	۲۴۰
صورت مثالی......اخلاقی حدود	۲۴۱
اعتدال حقیقی	۲۴۲
مصالح عقلیہ	۲۴۳
قرب کی صورتیں	۲۴۴
کشف اور جانور......اجابت کا مروجہ مفہوم	۲۴۹
حقیقی اجابت.....احناف کا عمل بالحدیث	۲۵۱
ضرورت تقلید......جواز قیاس	۲۵۲
تقلید میں غلو......عہد صحابہ میں جمع قرآن کا مسئلہ	۲۵۳
اختلافی صورت میں طریقہ کار	۲۵۴
حق تعالیٰ کے ساتھ محبت طبعی	۲۵۵
محبت غیر حق......مجاہدہ سے متعلق ایک شبہ کا ازالہ....گھی مرغوب شے نہیں	۲۵۷
تصرف بلاواسطہ	۲۵۸
شرط احسان	۲۵۹
سلف کی خوبی	۲۶۰
قرب علمی	۲۶۱
مسئلہ انفاق سے متعلق وضاحت	۲۶۲
اہل اسلام سے شکوہ....مرض سے گناہ معاف....رزق میں برکت کے معنی	۲۶۳
نکاح کی ترغیب	۲۶۴
اسوہ حسنہ	۲۶۵
بنی اسرائیل کے کفن چور کا واقعہ	۲۶۶
روز محشر اعمال کی کیفیت	۲۶۸
فکر آخرت کی برکات	۲۶۹
فضیلت تلاوۃ......وصل محبوب	۲۷۰

مقام ولدیت	۲۷۱
عرب کی جاہلانہ رسم	۲۷۲
حقیقت تعذیب	۲۷۳
تعذیب شمس وقمر	۲۷۴
صورۃ تعذیب	۲۷۶
اہل جنت کی غذاونعمتیں	۲۷۷
جہنم کی ہولنا کی	۲۷۸
نیکی کی برکات	۲۷۹
اقسام انسان......تبلیغ کا حکیمانہ طرز......رحمت خداوندی	۲۸۰
قربانی سنت ابراہیم	۲۸۱
سنت ابراہیمی کا مصداق	۲۸۳
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد ازواج کی مصالح وحکم	۲۸۴
جنت محل رضا	۲۸۶
محبت شیخ اوراس کی وجہ	۲۸۷
علوم انبیاء علیہم السلام	۲۸۸
تجلی کلامی.....حکم تدفین کے مصالح	۲۸۹
گناہ کی چنگاری کی یاد	۲۹۰
گناہ بےلذت	۲۹۱
باطنی گناہ	۲۹۲
استنباط رحمت	۲۹۳
مسلمان کیلئے گناہ بےلذت ہی ہے	۲۹۴
حفاظت نظر مقدم ہے......بے پردگی کے مفاسد	۲۹۵
فضیلت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ	۲۹۷
استقامت اعمال	۲۹۹
ایک عوامی غلطی	۳۰۱

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ	۳۰۲
دوستوں سے ملاقات بھی عبادت ہے..... عارف اور غیر عارف کا فرق	۳۰۳
واقعہ منصور	۳۰۶
تہذیب کی حقیقت	۳۰۷
جسم و روح	۳۰۸
حیاء کا اقتضاء	۳۰۹
ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے...... ترک تنخواہ کی خواہش	۳۱۱
غلبہ خشیت	۳۱۲
عفو و درگزر	۳۱۳
دولت کی بے وفائی...... حقیقت علم	۳۱۴
کمال معرفت	۳۱۴
رحمت حق بہانہ می جوید...... نااتفاقی کا بڑا سبب	۳۱۵
مصیبت زدہ پر طعن...... نماز اور انتظار نماز	۳۱۶
انگریزی تعلیم کی ممانعت کا الزام	۳۱۸
خطبۃ الوداع کا اختلاف	۳۲۰
بددعا بغلبہ بشریت	۳۲۱
تعلیم نسواں	۳۲۲
اتفاق کی جڑ...... قرآن حکیم سے سائنسی مسائل کا استنباط	۳۲۳
محبوبیت کا باطنی سبب	۳۲۴
کے اسباب ظاہرہ	۳۲۵
فضیلت وعظ..... باکمال عورتیں	۳۲۸
کھانے میں اعتدال	۳۳۰
طریقہ تعلیم نسواں	۳۳۱
ازالہ شبہات میں، تقلید محقق لازم ہے	۳۳۲
قرآن میں ہر مضمون کا ہونا ضروری نہیں	۳۳۲

نکاح کی غرض وغایت	۳۳۳
جوش کا کم ہونا کمالِ محبت کی دلیل ہے.....علم اعتبار کی حقیقت کی توضیح	۳۳۴
مسلمانوں کی حضرات اہل بیتؓ سے محبت	۳۳۵
صالح جنات کیلئے جنت	۳۳۶
اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت	۳۳۷
خودکشی حرام ہونے کی وجہ.....گناہ کے دو اثر	۳۳۸
دنیا میں کفر کا وجود بھی حکمت خداوندی ہے.....انبیاء اور اولیاء کی ایک شان	۳۳۹
بندہ کو علم غیب عطا نہ ہونے میں حکمت.....اجابت دعا کے دو درجے	۳۴۰
اجابت کے معنی درخواست لے لینا ہے	۳۴۰
معمولی چیز بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو......انس سے متعلق احادیث مختلفہ میں تطبیق	۳۴۱
قرآن پاک کو سب سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے....ارواح کو عالم اجسام میں کیوں بھیجا گیا	۳۴۲
فضیلت شہادت	۳۴۳
شہادت کی فضیلت کا سبب:	۳۴۴
شہادت سے بغیر مشقت کے درجات مل جاتے ہیں:	۳۴۵
احکام کا علم نہ ہونا قابل قبول عذر نہیں	۳۴۵
بے علم دو گناہوں کا مرتکب ہے.....امراض باطنی کو مرض نہ سمجھنا جہالت ہے	۳۴۶
امراض جسمانی سے روحانی امراض اشد ہیں	۳۴۷
بزرگوں سے امور دنیا میں مشورہ لینے کی مثال	۳۴۸
اموال اور اعمال کی نسبت ہماری طرف مجازی ہے	۳۴۸
خودکشی کے حرام ہونے کا راز.....قرض کی فضیلت	۳۴۹
ماانا علیه و اصحابی کا مفہوم:	۳۵۰
حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذکاوت.....ابو طالب کو آپ کی حمایت سے نفع	۳۵۱
مطعم بن عدی کا شکریہ	۳۵۲
حضرت علیؓ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب حسی	۳۵۳
حضرت صدیق اکبرؓ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب معنوی	۳۵۳

توکل سے اطمینان اور سکون قلب حاصل ہوتا ہے	۳۵۴
دین کے دسویں حصہ پر عمل کا مفہوم...ولی کا صحابہ کے برابر نہ ہونے کا راز	۳۵۵
طلاق کا ایک اہم مسئلہ.....اسلام میں حرج نہیں...عامل شریعت کو پریشانی نہیں ہوتی	۳۵۶
ویرانہ کا اصل سبب معاصی ہیں	۳۵۷
مستورات کو بہشتی زیور کو سبقاً سبقاً پڑھنے کی ضرورت	۳۵۸
کسی چیز کی خاصیت جاننے کا نفع	۳۵۹
اعمال کے خواص جاننے کے فائدے	۳۶۰
مالیخولیا میں علاج سے کم نفع ہونے کا سبب	۳۶۱
مزاج میں لطافت کی زیادتی کا اثر......اعمال کی قسمیں	۳۶۱
طبیب روحانی کا کمال.....علوم شرعیہ کو مدرک بالوحی مان لینے کا عظیم نفع	۳۶۲
مصلح کا اصل کام تعلیم دین ہے	۳۶۲
صنعت گری کا پہلا استاد کوا ہے	۳۶۳
کلمہ طیبہ کے حصول خواص کے ضروری شرائط.....ہر عمل کے الگ الگ خواص	۳۶۴
وسوسہ گناہ کا مقدمہ ہے	۳۶۵
اسرار شریعت	۳۶۶
مشقت اور مجاہدہ سے ثواب بڑھ جاتا ہے...مختلف اوقات میں مختلف دعاؤں کی حکمت	۳۶۷
شریعت میں کسب دنیا کی اجازت ہے انہماک کی نہیں	۳۶۸
قرض کا ثواب صدقہ سے زیادہ کیوں ہے	۳۶۸
ایک جوہری اور حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کی حکایت	۳۶۹
پل صراط کی حقیقت	۳۷۰
علم صرف درسیات پر موقوف نہیں......سبقت رحمتی علی غضبی کی عجیب مثال	۳۷۱
حکایت حضرت حبیب عجمی	۳۷۲
حصول حظ کیلئے رویت اور ہم کلامی کی ضرورت نہیں	۳۷۳
مثنوی مولانا روم میں فحش قصے بیان ہونے کی عجیب مثال	۳۷۴
حقوق اللہ کہنے کی عجیب مثال	۳۷۴

دین کا کوئی جزو بھی زائد نہیں	۳۷۶
مستحبات کی عجیب مثال.....کسب حلال کی ضرورت	۳۷۷
ربوا سے متعلق محرفین کی اختراع....ہمارے گناہوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت	۳۷۸
غیر محقق کو محقق کے اتباع کے بغیر چارہ نہیں	۳۷۹
خودکشی کے حرام ہونیکا راز......حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رتبہ	۳۸۰
لیلۃ التعریس میں نماز فجر قضا ہونے کا سبب	۳۸۱
قاتل کی توبہ کا معروف واقعہ	۳۸۲
تولّی کی قسمیں	۳۸۴
عمل...دخول جنت کی علّت تامّہ نہیں	۳۸۵
مصائب سے حق تعالیٰ شانہ کا قرب بڑھتا ہے	۳۸۶
کسب معصیت میں حکمت بیان کرنا کفر کے قریب ہے	۳۸۷
توبہ سے متعلق دو احادیث	۳۸۸
صحبت صالح کی علامات......شبہات کا شافی علاج	۳۹۱
اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کی آسان تدبیر.....بندہ کا کام ہمت کرنا ہے	۳۹۲
حروف مقطعات.......سوال عن الحکمت میں کیا حکمت ہے	۳۹۳
گناہوں کی تفصیلات کا علم ضروری ہے	۳۹۴
گناہ کی دو قسمیں	۳۹۵
نماز پنجگانہ کی دلیل پوچھنے والے کی حکایت	۳۹۶
احکام شرعیہ کے ساتھ ہمارا مشرب عاشقانہ ہونا چاہیئے	۳۹۷
اسرار احکام معلوم کرنے کا طریقہ......علوم ظاہری کا ماحصل	۳۹۸
مومن کے لئے خلود فی النار نہیں	۳۹۹
حدیث شفاعت میں ایک لطیف تحقیق....جمیع العلم فی القرآن کا جواب	۴۰۰
شریعت کی حفاظت علماء حضرات سے وابستہ ہے	۴۰۱
شہوتِ شیخ شباب سے اشد ہے...حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شدتِ نزع کا سبب	۴۰۲
بعض اہل اللہ کی شدّتِ نزع کا موجب	۴۰۳

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کمال	۴۰۴
حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب انبیاء میں اکمل ہیں.... بعض اولیاء کی حالت رفیعہ	۴۰۵
خانقاہ اور مدرسہ دونوں کی ضرورت	۴۰۵
مشاہدہ جمالِ حق کی دو صورتیں	۴۰۶
ضرورت مجاہدہ...... متواضعین کی شہرت ہو ہی جاتی ہے	۴۰۷
اطاعت رسول کی اہمیت.... سود کا وبال	۴۰۸
موت ھاذم اللذات ہے	۴۰۹
عیادت میں تھوڑی دیر بیٹھنے میں حکمت:	۴۱۰
تین شخصوں پر لعنت...... دن میں چالیس مرتبہ موت کو یاد کرنے کا اجر	۴۱۱
گناہ کا اثر..... علماء و مشائخ کی آبروریزی کا گناہ	۴۱۲
زمین کے روپیہ میں برکت نہ ہونے کا مفہوم	۴۱۲
کمال عبدیت...... متن قرآن کے تین اصول مسائل	۴۱۳
پل صراط	۴۱۳
حق کی پہچان...... بوقت دخول ابواب جنت کھولے جانے میں حکمت	۴۱۴
موت کے وقت مؤمن کا حال:	۴۱۶
ایک بے استعداد طالب علم کا حال:	۴۱۷
حق تعالیٰ شانہ کا امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فضل عظیم:	۴۱۸
علم خضر علیہ السلام کی مثال	۴۱۹
مثنوی کے شعر سے غلط استدلال	۴۲۰
کاملین اور محققین کی تقلید کا حکم	۴۲۱
جنت بہت بڑا انعام ہے	۴۲۲
طالب علم کیلئے تین ضروری کام...... دعا کے حدود وقیود	۴۲۳
حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ کی حکایت	۴۲۴
تقسیم کار کا اصول	۴۲۷
احکام شرعیہ میں رعایت جذبات	۴۲۸

دشمنی اور دوستی کا اعتدال	۴۲۹
راحت کا راز......غیر عامل واعظ کیلئے وعید	۴۳۰
ہدایت غیر کا حد سے زیادہ اہتمام مطلوب نہیں	۴۳۱
نفع رسانی کی حدود	۴۳۲
چند فضول سوالات	۴۳۳
ترقی کا مدار محض اسباب پر نہیں......جسمانی اعضاء کے گناہ	۴۳۴
علم کی قسمیں....جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بضرورت مذمت دنیا فرمائی	۴۳۵
اپنی فکر مقدم ہے	۴۳۶
صدقہ میں وسعت سے زیادہ خرچ کرنا مناسب نہیں	۴۳۷
حضرت امام مالکؒ کی قابل رشک دیانت علم...ہر مسئلہ کی وجہ معلوم ہونا لازم نہیں	۴۳۸
باطل اور حق کے پہچاننے کا سہل طریقہ	۴۳۹
فقہ پر اعتبار نہ کرنے کا انجام.....دعائے مغفرت مطلوب ہے	۴۳۹
فضیلت شب برأت	۴۴۰
حکایت حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری رحمہ اللہ	۴۴۳
خود کو مقدس سمجھنے کی عجیب مثال	۴۴۴
بھولنے کی دو علتیں	۴۴۵
مباحات کے انہماک کے مضر ہونے کا احادیث سے ثبوت	۴۴۵
دین سیکھنے کا سہل طریقہ	۴۴۹
فساد کا انجام........جھوٹ کی مذمت	۴۵۰
مصنف کی قلبی ظلمت کا تصنیف پر اثر	۴۵۱
اپنی اولاد کو غیر مستند کتب کے مطالعہ سے روکئے	۴۵۲
اہل باطل کی کتب کا مطالعہ مضر ہے.....بلاغت حدیث	۴۵۳
حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا ادب	۴۵۴
بنی اسرائیل کی بے ادبی کا انجام	۴۵۵
شیطان کی شرارت.....تفاوت فہم	۴۵۶

دعا کی خاصیت	۴۵۷
آج کل کی رسومات زیادہ خطرناک ہیں	۴۵۸
سلطان محمود غزنوی کی بت شکنی	۴۵۸
مستورات کی اصلاح کی آسان تدبیر	۴۵۹
جنت کو پہلے پیدا کرنے میں حکمت	۴۶۰
تحصیل علم کی اصل غرض محض رضاء الٰہی ہے	۴۶۱
مسائل کی تحقیق میں حضرت حاجی صاحب کا ارشاد	۴۶۲
مستورات کیلئے طریق تحصیل علم دین... آمین کہنے والا دعا میں شریک ہوتا ہے	۴۶۳
جنٹلمینوں کا عجیب مرض.... شیخ ابن عربی کا مقام	۴۶۴
امام غزالی کی وقعت وعظمت..... کسب اور طلب میں فرق	۴۶۵
نعمت مدرسہ کی قدر اور شکر گزاری..... انگریزی دانوں کی ایک غلطی	۴۶۶
دنیائے ملعونہ	۴۶۷
اردو میں مسائل پڑھنے کا طریقہ.... دین کی برکات	۴۶۹
غیر عالم کے وعظ میں مفاسد	۴۷۰
قوانین کی دو قسمیں	۴۷۲
پردے سے گھبرانا عجیب بات ہے.... حضرت عارف رومی کے ایک شعر کا مفہوم	۴۷۴
فقہ کی تعریف..... اللہ تعالیٰ کی ہستی کی دلیل	۴۷۵
مثنوی شریف مضامین حقہ سے لبریز ہے	۴۷۶
مثنوی کا ایک خاص کمال	۴۷۸
محبت کا انحصار تین باتوں پر ہے... عبادت کے مقبول ہونے کی علامت	۴۷۹
حسن تعلیم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم..... پیرانی صاحبہ کی عملی تبلیغ	۴۸۰
قبروں کی پختگی پر فخر قابل افسوس ہے...... ہمارے سلف کا فقر اختیاری تھا	۴۸۱
استقامت..... مدرسین کی ایک کوتاہی	۴۸۲
کبائر بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے	۴۸۳
حج مردانہ...... ریل سے جہنم کی یاد تازہ ہوتی ہے	۴۸۴

بدنظری سے سیری نہیں ہوتی......الفاظ ومعانی	۴۸۶
دروغ برگردن راوی کہنے سے بری الذمہ نہیں ہوسکتا...بڑوں کی موت میں حکمت	۴۸۷
نماز اور بیت الخلاء میں ہجوم وساوس	۴۸۸
شادی ایک ماہ کی خوشی کا نام ہے	۴۸۹
تعلق مع اللہ کی برکت.....لیڈران قوم کی خیر خواہی کی عجیب مثال	۴۹۰
حضرت حکیم الامتؒ کا ایک خواب......تارکین تقلید کا حال	۴۹۱
غیر مقلدین کی آمین....آمین کی تین قسمیں....جنم روگ	۴۹۲
مدعیان عامل بالحدیث کو دو نصیحتیں.....ایک عامی کا عجیب استدلال	۴۹۳
جملہ معاصی میں سخت کلفت ہے	۴۹۴
تعدد کثرت ازواج رسول کریمؐ میں حکمت...عمل کا موقوف علیہ طلب صادق ہے	۴۹۶
وجوب عمل علم پر موقوف نہیں....علم وعمل	۴۹۷
باکمال شخص..... حضرات اہل اللہ پریشان کیوں نہیں ہوتے	۴۹۸
اہل اللہ کا مختلف مذاق....حکایت حضرت بہلول داناؒ...اجازت اور مشورہ میں فرق	۵۰۰
احناف تفقہ فی الدین رکھتے ہیں....تصوف اور فقہ کے معنی	۵۰۱
حضرت مولانا شاہ اسماعیل صاحب شہید حنفی تھے	۵۰۲
اہل حق کو سب وشتم کرنے کا انجام	۵۰۳
نیک صحبت خلوت سے بہتر ہے......تمنائے موت	۵۰۵
جان کی دو حیثیتیں	۵۰۶
تقلید شخصی کی ضرورت	۵۰۷
تبلیغ کے حدود وآداب......علاج بالاضداد	۵۰۸
دین کا مدار اعمال پر ہے	۵۰۹
درجات کا اصل مدار...... مغلوب الحال کی تصانیف کا مطالعہ مضر ہے	۵۱۰
انبیاء علیہم السلام کامل العقل ہوتے ہیں	۵۱۱
احکام الغضب	۵۱۲
قضائی غیر الغضب کے بعد ضرورت سختی	۵۱۳

مسلمانوں کا اجراء حد کے وقت حال... جانوروں کو ذبح کرنا بے رحمی نہیں	۵۱۴
حرارت غریزیہ کی دعا	۵۱۵
تمام علوم کی روح اور تمام اعمال کا مدار	۵۱۷
اسلام اور عیسائیت کے مابین بڑا فرق ہے......شیطان کا جال	۵۱۸
دین کی حقیقت	۵۱۹
انسان اور دیگر مخلوقات کی اطاعت کا فرق	۵۲۰
حقوق نفس......اسلام کے چند درجے	۵۲۳
شریعت اور خواب....درجات اسلام	۵۲۵
اعمال ظاہرہ و باطنہ	۵۲۶
شرف نسب.....شریعت میں ماں کے نسب کا اعتبار نہیں	۵۲۷
ایک جماعت اولیاء کا حال	۵۲۸
شان ملکیت شان نبوت کے تابع ہے	۵۲۹
ایک علمی نکتہ.....قبولیت ذکر کی عجیب مثال	۵۳۰
رحمت خداوندی......عمل اور رحمت	۵۳۱
معراج کے اسرار......ترحم سیدنا حضرت نوح علیہ السلام	۵۳۲
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر شفقت	۵۳۴
فضائل دُرود شریف	۵۳۵
زیارت روضۂ اقدس کی فضیلت	۵۳۶
ایک نیم ملا کا غلط معنے سمجھنے کے سبب حافظ کو لقمہ دینا	۵۳۷
گیارہویں کرنے والوں کو تاریخی غلطی	۵۳۸
آیت افک پر ایک اشکال کا جواب	۵۳۹
اصلاح کیلئے تین امور کی ضرورت	۵۴۰
نجات کیلئے ایمان کی ضرورت	۵۴۱
خود ساختہ محقق.......باغی سلطنت	۵۴۲
دین کے جملہ احکام آسان ہیں	۵۴۳

* * *

قرآن کی تعلیم امن

قرآن نے صرف دو چیزوں کا اہتمام کیا ہے ایک امن عام کہ اس دنیا میں رہ کر یہ حالت ہو کہ

کسے را باکسے کارے نباشد کوئی کسی کے کام میں ٹانگ نہ اڑائے

میں کہتا ہوں کہ جو امن قرآن نے سکھلایا ہے کسی قانون نے نہیں سکھلایا لیکن افسوس ہے کہ اس وقت لوگ مسلمانوں کو شورش پسند کہتے ہیں حالانکہ اگر موازنہ کر کے دیکھا جائے تو مسلمانوں سے زیادہ امن پسند اور عافیت جو کوئی قوم دنیا میں نہیں ہے مثال کے طور پر ایک جزئی بیان کرتا ہوں جمعہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ جب نماز مکمل ہو جائے تو زمین پر پھیل جاؤ۔

وہ مجمع جو کہ محض خدا تعالیٰ کی عبادت کے لئے اور خدا تعالیٰ کے سامنے سر جھکانے کے لئے جمع ہوا ہے اس کو بھی یہ حکم ہو رہا ہے کہ جب اپنا کام کر چکو تو جمع رہنے کی کوئی ضرورت نہیں سب منتشر ہو جاؤ کیونکہ ممکن ہے فضول اجتماع سے کوئی خرابی پیدا ہو آگے فرماتے ہیں۔

وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ اور اللہ کے فضل (روزی) کو تلاش کرو۔

جس سے مقصود یہ ہے کہ منتشر ہو کر بھی ادھر ادھر مارے مارے نہ پھرو۔ کیونکہ اس میں پھر فساد کا احتمال ہے بلکہ رزق حلال کی تلاش میں لگو پھر فرماتے ہیں وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا یعنی خدا تعالیٰ کو بہت یاد کرو کیونکہ اصل مقصود یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہو تو حق تعالیٰ کے اس کلام سے معلوم ہوا کہ مجمع بلا ضرورت نہ ہونا چاہئے اور اگر کسی ضرورت سے ہو تو ضرورت کے ختم ہو جانے پر سب کو منتشر ہو جانا چاہئے غور کیجئے کہ نمازیوں کا مجمع جس میں شورش و فساد کا احتمال ہی نہیں ہے مگر چونکہ خدا تعالیٰ جانتے ہیں کہ انسان ضعیف ہے عجب نہیں کہ اس میں تو تو میں میں ہو جائے اگرچہ جوتی پیزار نہ ہو۔ اس لئے حکم فرما دیا کہ سب منتشر ہو جاؤ۔

غرض ایک تو قرآن میں امن کی رعایت ہے دوسرے خدا تعالیٰ کی رضا جوئی ان دو امر کے سوا اگر کوئی تیسرا مسئلہ آ گیا ہے تو وہ اس کے تابع ہو کر آیا ہے تو معلوم ہوا کہ قرآن میں اس کے سوا اور کوئی مسئلہ نہ ڈھونڈنا چاہیے علی ہذا اگر حکایتیں قرآن میں ہیں تو وہ بھی ان ہی کی خادم ہو کر ذکر کی گئی ہیں کہ فلاں قوم نے یہ کیا تھا تو ان کو یہ سزا ملی اور فلاں قوم نے یہ کیا تھا تو ان کو یہ اجر ملا ہم اگر ایسا کریں گے تو ہم کو بھی ایسی ہی سزا یا اجر ملے گا اس سے معلوم ہوا کہ جہاں جملہ خبریہ ہیں ان سے مقصود جملہ انشائیہ ہی ہیں۔ (ضرورۃ العلم بالدین ج ۳)

حفظ قرآن کی ضرورت

ایک اور دلیل حفظ قرآن کے ضروری ہونے کی بیان کرتا ہوں اور یہ دلیل اس وقت کے مذاق کے اعتبار سے بہت عجیب دلیل ہے اس کے لئے اول دو مقدمے سنیئے۔

پہلا مقدمہ یہ ہے کہ جتنی ارضی وسماوی کتابیں ہیں ان میں کوئی کتاب بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ یاد ہو کر یاد رہ سکے اور اگر کسی نے یاد بھی کر لیا تو بہت بڑے حافظے کی ضرورت ہے اور قرآن شریف بہت جلد یاد ہو جاتا ہے اور بہت تھوڑی عمر میں لڑکے اس کو حفظ کر لیتے ہیں۔

چنانچہ قصبہ پانی پت میں تو اگر دس برس کا بچہ حفظ نہ کرلے تو کہتے ہیں کہ کیا بوڑھا ہو کر حفظ کرے گا اور اکثر لڑکیاں بھی وہاں کی حافظ ہوتی ہیں اور سبع کی جاننے والی لڑکیاں متعدد ہیں اور قرآن کے حفظ کے ایسے عجیب وغریب قصے ہیں کہ لوگ سن کر تعجب کرتے ہیں۔

چنانچہ میرے ایک دوست بروداں کے رہنے والے ہیں انہوں نے تین ماہ سے بھی کم مدت میں قرآن حفظ کر لیا تھا ایک اور میرے دوست نے اپنے پیر یعنی میرے استاد کو خواب میں دیکھا کہ انہوں نے ان کو اپنے سینے سے لگایا اور ان کے سینے میں ایک نور داخل ہوا۔ انہوں نے ایک معبر سے بیان کیا انہوں نے تعبیر یہ دی کہ تم کو قرآن حفظ ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے یاد کرنا شروع کیا۔ سو چھ ماہ میں اچھا خاصہ حفظ ہو گیا۔

ایک اور قصہ یاد آیا ایک واعظ مظفر نگر میں وعظ کہہ رہے تھے ایک آیت میں قصداً رکے اور حاضرین سے خطاب کیا کہ اس مجلس میں جتنے حافظ ہوں کھڑے ہو جائیں تاکہ میں ان سے یہ آیت پوچھ سکوں اس کو سن کر ایک کثیر جماعت کھڑی ہو گئی انہوں نے کہا کہ صاحبو! مجھ کو آیت یاد ہے میں نے صرف یہ دکھلانا چاہا کہ مسلمانوں کے اس اتفاقی اور مختصر مجمع میں

جہاں خاص حفاظ ہی کو جمع نہیں کیا گیا ایسی تعداد سے مذہبی کتاب کے برزبان یادرکھنے والے موجود ہیں کیا دوسری کوئی قوم قصداً جمع کر کے بھی اس قدر تعداد اپنی مذہبی کتاب کے حافظوں کی دکھلاسکتی ہے غرض قرآن مجید بہت سہولت سے یاد ہوتا ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اس زمانے میں عقلاء اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نیچر ہر زمانے میں اس چیز کو پیدا کرتا ہے جس کی ضرورت ہوتی ہے میں اس کو شرعی اصطلاح میں کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ہر زمانے میں اس چیز کو پیدا کرتے ہیں جس کی ضرورت ہوتی ہے۔

ان دونوں مقدموں کے ممہد ہونے کے بعد میں کہتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ مادہ طبیعت میں ودیعت کیا ہے کہ قرآن شریف بہت جلد یاد ہو جائے معلوم ہوا کہ فطرۃ اس کے حفظ کی ضرورت ہے تو صاحبو! اپنے نیچر کی مخالفت نہ کرو۔ (ضرورۃ العلم بالدین ج ۳)

عشق قرآن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے الفاظ کا اس قدر عشق تھا کہ آپ خود تلاوت کرتے ہی تھے۔ ایک دفعہ آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے فرمایا کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا اعلیک اقراء وعلیک انزل. (اوکما قال) کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میں سناؤں حالانکہ آپ ہی پر تو قرآن اترا ہے۔ فرمایا، ہاں! میں دوسرے کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی سے یہ درخواست کیوں کی حالانکہ سارا قرآن آپ کو حفظ تھا۔ اوراس کے معانی بھی آپ کے ذہن میں حاضر تھے۔ صرف اسی لئے کہ قرآن کے الفاظ سے آپ کو عشق تھا۔ اور دوسرے کی زبان سے سننے میں بوجہ یکسوئی کے مزہ زیادہ آتا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ صرف الفاظ قرآن بھی بدون لحاظ معنی کے مطلوب ومقصود ہیں۔ (الفاظ قرآن ج ۲)

دو باتوں کا اہتمام

حضرت تھانویؒ نے ڈھاکہ میں ایک مرتبہ خاص نواب صاحب کے اعزہ میں وعظ کہا تھا جن میں زیادہ تر جنٹلمین تھے۔ میں نے اس جلسہ میں خاص طور پر تصحیح عقائد ہی کا بیان کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ آپ لوگ اگر اپنی پوری اصلاح نہ کرسکیں تو کم از کم دو باتوں کا اہتمام کرلیں۔ ایک یہ کہ اپنے عقائد صحیح کرلیں۔ دوسرے جو ناجائز اعمال آپ کرتے ہیں ان کو حرام سمجھ کر کریں۔

کھینچ تان کر ان کے جائز کرنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ آپ کی لغو تاویل سے حرام فعل حلال تو ہو نہیں سکتا مگر اس تاویل سے یہ مفسدہ لازم آئے گا کہ آپ حرام کو حلال سمجھیں گے اور حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے۔ قطعی یا ظنی تو یہ حالت سخت خطرناک ہے اور اگر حرام سمجھ کر کریں گے، تو کفر کا خطرہ نہ رہے گا، صرف معصیت رہ جائے گی۔ یہ کفر سے اہون ہے دوسرے جب آپ اس کو حرام سمجھتے رہیں گے تو کیا عجب ہے کہ کسی وقت توبہ کی توفیق ہو جائے۔ اور اگر مان لیا جائے کہ آپ عمر بھر ان افعال کو نہ چھوڑ سکیں گے تو کفر سے تو بچاؤ رہے گا۔ (الفاظ قرآن ج ۲)

داڑھی کا وجوب اور وجود

ایک صاحب نے مجھ سے اپنا قصہ بیان کیا کہ ایک جنٹلمین کو میں نے نصیحت کی کہ تم داڑھی کیوں منڈاتے ہو یہ گناہ ہے۔ اس سے توبہ کرنی چاہیے۔ وہ کہنے لگے کہ داڑھی کا ثبوت تم قرآن سے اگر دے دو تو میں بھی توبہ کر لوں گا۔ میں نے کہا کہ قرآن سے داڑھی کا ثبوت میں دے سکتا ہوں چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی:

قال یابن ام لاتاخذ بلحیتی ولا براسی

ہارون علیہ السلام نے (موسیٰ علیہ السلام سے) کہا کہ اے میرے ماں جائے! میری داڑھی اور سر کو نہ پکڑ۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کے داڑھی تھی ورنہ موسیٰ علیہ السلام اسے کس طرح پکڑتے۔

میں نے ان حضرت سے یہ کہا کہ اگر وہ شخص تم سے یہ سوال کرتا کہ اس آیت سے تو داڑھی کا وجود ثابت ہوا کہ ہارون علیہ السلام کے داڑھی تھی وجوب تو ثابت نہ ہوا کہ اس کا رکھنا واجب ہے۔ تو تم کیا جواب دیتے۔ اور وجود ثابت کرنے کیلئے تم نے قرآن کو کیوں تکلیف دی اپنی ہی داڑھی دکھلا دی ہوتی کہ لو میری داڑھی دیکھ لو اس سے وجود ثابت ہو گیا۔

وہ کہنے لگے کہ اجی اس کو اتنی عقل تھوڑا ہی تھی کہ وہ یہ سوال کر سکتا۔ میں نے تو اس کو دڑبڑا ہی لیا۔ میں نے کہا، بس یہی فرق ہے ہم طالب علموں میں اور آپ میں۔ ہم ایسی دلیل کبھی نہیں بیان کر سکتے جو خود ہمارے نزدیک بھی مخدوش ہو۔ (تعیم التعلیم ج ۲)

ایک فکری غلطی

اہل سائنس نے یہ تحقیق کیا ہے کہ انسان کی منی میں ایک قسم کا کیڑا ہوتا ہے اس سے

حمل قرار پاتا ہے۔ ایک صاحب کو اس کی فکر ہوئی کہ قرآن سے اس مسئلہ کو ثابت کیا جائے۔ کیونکہ سائنس والوں کی تحقیق تو غلط ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ تو یقیناً صحیح ہے۔ بس کسی طرح اس کو قرآن میں ٹھونسنا چاہئے۔ **استغفر اللہ العظیم**۔ غرض انہوں نے کھینچ تان کر اس کو قرآن سے ثابت کیا۔ اب سنئے! کیا خوبصورت استدلال ہے آپ نے اس آیت سے ثبوت دیا۔

اقرأ باسم ربک الذی خلق خلق الانسان من علق.

علق کے معنی لغت میں خون بستہ بھی ہیں اور جونک کو بھی علق کہتے ہیں۔ آپ نے یہ تفسیر کی کہ خدا نے پیدا کیا کہ انسان کو جونک سے۔ کیا واہیات ہے۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ اس تفسیر سے سائنس کا مسئلہ کیوں کر ثابت ہو گیا کیونکہ وہ لوگ اس کے قائل نہیں ہیں کہ انسان کی منی میں جونک ہوتی ہے۔ ہاں اس پر ایک حاشیہ اور لگانا چاہیے کہ جونک سے مراد وہ نہیں ہے جسے عام لوگ جونک کہتے ہیں بلکہ مطلق کیڑا مراد ہے۔ بس یہ تفسیر کر کے وہ صاحب خود ہی اپنے جی میں خوش ہو لیے ہوں گے تو آپ نے دیکھا کہ اس طرز میں شریعت کی کس قدر تحریف لازم آتی ہے۔ اور اس سے احتراز کس قدر ضروری ہے کہ اگر کوئی ایسے مسائل کو ثبوت قرآن سے مانگے تو اس سے صاف کہہ دینا چاہیے کہ قرآن علم تشریح کی کتاب نہیں ہے۔ اسی طرح جب کسی چیز کے حرام ہونے کی وجہ دریافت کی جائے تو بس یہی جواب دو کہ خدا نے اس کو منع کیا ہے۔ خواہ مخواہ اپنی طرف سے علتیں نہ گھڑنا چاہئیں۔ (تعیم التعلیم ج ۲)

حسب فہم جواب

ایک مرتبہ میں ریل میں سفر کر رہا تھا۔ اتفاق سے ایک جنٹلمین صاحب بھی گاڑی میں اسی درجہ میں رونق افروز تھے۔ ایک اسٹیشن پر پہنچ کر ان کا ایک ملازم ایک کتا ان کے سپرد کر گیا۔ جس کو انہوں نے ایک سیخچہ سے باندھ دیا۔ جب گاڑی چلی تو میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شریعت نے کتا پالنے سے کیوں منع کیا ہے حالانکہ اس میں ایسے ایسے کمالات ہیں۔ انہوں نے اس کے وہ کمالات بیان کئے جو خود آقا صاحب میں بھی نہ تھے۔

میں نے کہا اس کے دو جواب ہیں۔ ایک جواب عام اور ایک جواب خاص۔ جواب عام تو یہ ہے کہ نھانا عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے زیادہ جاننے والے تھے۔ اس لئے ہم کو

اس کی تلاش کی ضرورت نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں منع کیا۔ اس کو سن کر وہ ساکت ہو گئے۔ مگر ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس جواب سے ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ پھر کہنے لگے میں خاص جواب سننے کا بھی مشتاق ہوں۔ میں نے کہا کہ خاص جواب یہ ہے کہ کتے میں جہاں بہت سے کمالات ہیں وہاں اس پر ایک عیب بھی اتنا بڑا ہے جس نے اس کے سارے کمالات کو دھو دیا ہے۔ وہ یہ کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں ہے۔ اپنے آقا کے ساتھ چاہے کیسا ہی وفادار ہو مگر اپنی قوم سے اس کو ایسی نفرت ہے کہ جہاں دوسرا کتا اس کو نظر پڑا اور یہ اس کو پھاڑ کھانے کو دوڑا۔ پس جس میں قومی ہمدردی نہیں وہ پاس رکھنے کے قابل نہیں۔ یہ جواب چونکہ ان کے مذاق کے موافق تھا کیونکہ یہ لوگ قومی ہمدردی کا سبق رات دن رٹا کرتے ہیں گو اس پر عمل کی توفیق نہ ہو۔ اس جواب سے پھڑک اٹھے اور کہنے لگے کہ جواب یہ ہے۔ حالانکہ یہ جواب کچھ بھی نہیں محض لطیفہ ہے۔ (تعمیم التعلیم ج ۲)

تعلیم اعتدال

جس پیغمبر کا یہ ارشاد ہے: ”**کسب الحلال فریضة بعد فریضة**“ انہی کا یہ ارشاد بھی ہے: ”**حب الدنیا رأس کل خطیئة**“ اور یہ اشارہ بھی ہے:

تعس عبدالدینار تعس عبدالدرهم تعس عبدالخمیصة ان اعطی رضی وان منع سخط تعس وانتکس واذا شیک فلاانتقش.

اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بد دعا دی ہے کہ دینار و درہم کا بندہ ہلاک ہو جائے ذلیل ہو جائے اور اگر اس کے کانٹا لگے تو خدا کرے نکلنا نصیب نہ ہو۔ شاید کوئی ذہین یہاں یہ اشکال پیدا کرے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بد دعا بھی دعا ہو کر لگتی ہے پھر اس کا کیا ڈر؟ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حق تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ:

اللهم انما بشر فایما رجل اذیته اوشتمته اولعنته فاجعلها له صلوٰة وزکوٰة و قربة تقربه بها الیک.

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم اس بد دعا کا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بشریت کے اقتضاء سے غلبہ غضب میں فرما دی ہو۔ تشریعی بد دعا کا یہ حکم نہیں اور اس جگہ جو عبدالدینار والدرہم کو بد دعا دی گئی ہے وہ بشریت کی راہ سے نہیں ہے بلکہ تشریعی بد دعا ہے جب یہ بات سمجھ میں

آ گئی تو اب اس بددعا سے بہت ڈرنا چاہیے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور تشریعی بددعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں "انی اری ربک یسارع فی ھواک" کہ میں دیکھتی ہوں کہ جو آپؐ چاہتے ہیں حق تعالیٰ ویسے ہی کر دیتے ہیں۔

چنانچہ ایک بزرگ کا ارشاد ہے: "حلالھا حساب و حرامھا عذاب" کہ دنیا کی حالت یہ ہے کہ اس کا حلال حصہ تو حساب سے خالی نہیں اور حرام پر عذاب ہوگا تو کوئی جز کلفت سے خالی نہ ہوا۔

اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ دنیا کی تمام لذتیں ماکولات و مشروبات وملبوسات ونساء میں منحصر ہیں اور ماکولات میں سب سے افضل شہد ہے اور وہ ایک مکھی کی قے ہے اور مشروبات میں سب سے افضل پانی ہے جس میں خنزیر تک بھی آدمی کا شریک ہے اور ملبوسات میں سب سے بہتر حریر ہے جو ایک جانور کا لعاب ہے اور نساء کی یہ کیفیت (یہ مضمون نساء کے متعلق مستورات کے حاضر ہونے کے سبب بیان نہ کیا تھا نظر ثانی میں بڑھا دیا گیا ۱۲ منہ) ہے کہ "ترھن لاحسن مواضعھا ویقعمد منھا انتن مواضعھا" یہ باتیں ہیں جن پر غور کرنے سے دنیا کی حقیقت دوسروں پر بھی واضح ہوتی ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب مسلمان پل صراط پر سے گزریں گے تو جہنم مؤمن سے کہے گا:

جزیا مؤمن فان نورک اطفاء ناری.

اے مسلمان! جلدی سے آگے بڑھ جا' تیرے نور نے تو میری آگ ہی کو بجھا دیا۔ اس کی تفسیر میں بعض نے فرمایا ہے کہ جیسے مؤمن جہنم سے پناہ مانگتا ہے ایسے ہی جہنم بھی مؤمن سے پناہ مانگتا ہے تو جس سے جہنم بھی پناہ مانگے جو رأس الغموم ہے اس کی خوشی کی کیا حد ہوگی اور واقعی جہنم کو مؤمن سے پناہ مانگنا چاہیے کیونکہ مؤمن میں اور جہنم میں کوئی مناسبت نہیں اور جہاں مناسبت نہ ہو وہاں تو طرفین اسے اعراض ہی ہوگا۔ اس مضمون کو ایک شاعر نے دوسرے رنگ سے بیان کیا ہے:

میں جو ہوں قابل دوزخ تو گناہوں کے سبب لیک دوزخ نے کیا کیا جو مرے قابل ہے

یعنی جہنم نے کیا قصور کیا جو مجھے اس کے اندر بھیجا گیا' واقعی مسلمان بھی عجیب چیز ہے کہ دوزخ سے وہ بُعد چاہتا ہے اور دوزخ اس سے بُعد چاہتی ہے۔ (حم الآخرہ ج ۱۷)

طلب جنت

صاحبو! تم جنت کے طالب ہو تو جنت تو انشاء اللہ تم کو ملے ہی گی' جنت تمہارے ہی

واسطے ہے، کفار کے واسطے تھوڑا ہی ہے اس سے تو بے فکر رہو پس ذرا برے برے کام چھوڑ دو مگر جی یوں چاہتا ہے کہ جنت کی بھرتی نہ بنو بلکہ کام کے آدمی بنو تو جنت میں اتنی وسعت ہے کہ سب سے ادنیٰ مسلمان کو بھی دنیا سے دس گنا رقبہ جنت میں ملے گا۔

اس پر بعض نیچریوں نے اعتراض کے طور پر کہا ہے کہ ہم نے تو سارا جغرافیہ پڑھا ہے، ہم کو تو جنت کا کہیں پتہ نہیں لگا۔

اس کا جواب میں نے یہ دیا ہے کہ تم نے جغرافیہ ارضی پڑھا ہے جغرافیہ عالم نہیں پڑھا ہے وہ ہمارے پاس ہے اگر تم جغرافیہ عالم پڑھتے یعنی قرآن تو تم کو جنت کا پتہ چل جاتا اور جن لوگوں نے یہ جغرافیہ عالم پڑھا ہے ان کو جنت کا بھی علم ہے اور دوزخ کا بھی اور پل صراط کا بھی اور عرش ومیزان کا بھی اور بعض کو تو ان میں دنیا ہی کے اندر سب کا انکشاف ہو گیا ہے۔

چنانچہ شیخ عبدالکریم جیلیؒ بڑے صاحب کشف ہیں انہوں نے تو جنت اور دوزخ کی پیمائش تک کر لی ہے کیونکہ دونوں باوجود وسعت کے ہیں تو محدود ہی اور محدود کی پیمائش ممکن ہے لیکن اگر حواس جسم سے پیمائش کی جاتی تو پھر بھی عرصہ دراز لگتا۔ جب قوی روحانیہ سے پیمائش کی گئی تو عرصہ دراز کی ضرورت نہیں ہوئی کیونکہ روح کی قوت بہت زیادہ ہے۔ نیز شیخ عبدالکریم جیلیؒ کو ایک دریا بھی منکشف ہوا ہے جس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ اس کی ایک ایک لہر آسمان وزمین سے دس گنا زیادہ ہے مگر فرشتے اس کی لہروں کو روکے ہوئے ہیں ورنہ آسمان وزمین سب غرق ہو جاتے۔

پھر بعض جاہلوں نے یہ شبہ کیا ہے کہ جنت جب اتنی بڑی ہے کہ ''عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ'' تو وہ سماتی کہاں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تم کو اس شبہ کا حق نہیں کیونکہ تمہارے مقتدر اہل سائنس اس بات کے خود قائل ہیں کہ فضاء الجو غیر متناہی ہے پھر اس غیر متناہی میں اگر جنت بھی ہو تو کیا حرج ہے۔ ممکن ہے جس طرح مریخ میں تم آبادی کے قائل ہو اسی طرح کوئی کرہ جنت بھی ہو اور وہاں بھی آبادی ہو مگر بوجہ بعد کے وہ کرہ تم کو نظر نہ آتا ہو کیونکہ مریخ کی آبادی کا علم تم کو اس لیے ہوا ہے کہ تم اس کو زمین سے قریب مانتے ہو اور یہ جواب بطور الزام کے ہے ورنہ جنت کو ہم اس فضاء الجو سے باہر ساتوں آسمانوں سے اوپر مانتے ہیں چنانچہ قرآن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جنت آسمانوں سے آگے ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَاتُفَتَّحُ لَهُمْ (اے للکفار) اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخلُوْنَ الْجنةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخَياط۔ (الاعراف آیت نمبر ۴۰)

"جولوگ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور ان (کے ماننے) سے تکبر کرتے ہیں ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور وہ لوگ کبھی جنت میں نہ جاویں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے کے اندر سے نہ چلا جاوے۔"

اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت سموات سبعہ سے اوپر اور عرش سے نیچے ہے اور عرش ان سب سے بڑا ہے اس سے بڑی کوئی مخلوق نہیں۔ شیخ عبدالکریم جیلیؒ کو جو دریا منکشف ہوا ہے جس کی ایک لہر آسمان و زمین سے بھی دس گنی ہے عرش سے وہ بھی اس کے نیچے لکھتے ہیں اور عرش گو سب سے بڑا ہے مگر وہ بھی محدود ہے اور حق تعالیٰ کی ذات حد سے منزہ ہے۔ وہ غیر محدود ہے۔ (ھم الآخرہ ج ۱)

مراتب ایمانی مختلف ہیں

بات یہ ہے کہ مراتب ایمانی مختلف ہیں۔ ایک مرتبہ اہتمام آخرت کا ایمان کا درجہ نفس تصدیق ہے کہ اس سے کم پر اکتفا جائز نہیں یہ درجہ فکر آخرت و ایمان کا زنا اور سرقہ و دیگر معاصی کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے اور ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی طبیب نے مریض کو نسخہ لکھ کر دیا اور جملہ امور اس کے متعلق بتلا دیئے اور طبیب کو مقصود ہے کہ اس مریض کو اس نسخہ سے کامل شفا ہو جائے گی مگر مریض نے پورے نسخہ کا استعمال نہ کیا بلکہ آدھے نسخہ کا استعمال کیا۔ ظاہر ہے کہ آدھے نسخہ سے ادنیٰ درجہ کا نفع ہوگا اور پورے سے پورا نفع ہوگا۔ اسی طرح نفس تصدیق عذاب دائمی جہنم سے بچنے کا باعث ہوسکتی ہے مگر پوری نجات کا سبب نہیں بن سکتی اور اس درجہ کے ساتھ معاصی جمع ہوسکتے ہیں اور دوسرا درجہ ایمان کا وہ تصدیق ہے جس پر اثر کامل مرتب ہو اور یہی تصدیق کامل ہے۔ یہ مرتبہ ایمان کا معاصی کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا جس شخص کو یہ مرتبہ حاصل ہو تو اس سے زنا اور سرقہ وغیرہ سرزد ہی نہیں ہوگا۔ (الاطمینان بالدنیا ج ۱)

حب و بغض کا مدار

مدار حب و بغض کا اعمال پر ہے۔ البتہ مومن و کافر کے عمل معصیت میں اتنا تفاوت

ہے کہ ایک شخص نے سنکھیا کھایا اور تریاق نہیں کھایا۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص مرے گا اور ایک شخص نے سنکھایا کھایا اور تریاق بھی کھالیا' اثر سنکھیا کا اس صورت میں بھی ہوگا مگر ضعیف۔ یہی حال مومن اور کافر کا ہے کہ مومن نے باوجود استعمال معصیت کے تریاق بھی کھا رکھا ہے۔ وہ کیا ہے؟ ایمان کہ اس نے اثر کو ضعیف کر دیا ہے۔ بخلاف کفار کے کہ تریاق ایمانی انہوں نے کھایا اس لیے پورا اثر ہوا باقی زہر کھانے والے دونوں برابر ہیں اس لیے دونوں کو زہر کے مفاسد سنائے جائیں گے۔ (الاطمینان بالدنیا ج ۱)

حکیمانہ طرز اصلاح

شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ آپ وعظ فرما رہے تھے کہ اسی مجلس میں ایک شخص پر نظر پڑی جس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچا تھا، کوئی آج کل کا مولوی ہوتا تو یا وعظ ہی میں اس کی خبر لیتا یا کچھ بھی نہ کہتا مگر شاہ صاحب نے وعظ میں تو اس سے کچھ تعرض نہ کیا کیونکہ آداب وعظ میں سے یہ بات ہے کہ وعظ میں تعرض خاص نہ ہو بلکہ خطاب عام ہونا چاہئے اور امر بالمعروف کو ترک بھی نہیں کیا بلکہ جب وعظ ہو چکا تو آپ نے ان صاحب سے فرمایا کہ تم ذرا ٹھہر جاؤ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے، وہ تو سہم گیا کہ بس اب میری خبر لی جائے گی، مگر اہل اللہ کے یہاں کسی کی خبر نہیں لی جاتی۔ ہاں خبر دی جاتی ہے چنانچہ جب سب لوگ چلے گئے تو آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھائی میرے اندر ایک عیب ہے جس کو میں تم پر ظاہر کرتا ہوں وہ یہ کہ میرا پاجامہ ڈھلک کر ٹخنوں سے نیچے پہنچ جاتا ہے اور اس کے متعلق حدیث میں سخت وعید آئی ہے اس کے بعد آپ نے سب وعیدیں بیان کر دیں، پھر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا دیکھنا میرا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے تو نہیں ہے اس شخص نے شاہ صاحب کے پیر پکڑ لئے اور کہا حضرت آپ میں تو یہ عیب کیوں ہوتا یہ مرض تو مجھ نالائق میں ہے۔ میں آج سے توبہ کرتا ہوں ان شاء اللہ پھر ایسا نہ ہوگا۔ دیکھئے شاہ صاحب نے کس شفقت کے ساتھ نصیحت فرمائی جس کا فوراً اثر ہوا۔ واللہ شفقت کا اثر مخاطب پر ضرور ہوتا ہے ہاں کوئی بہت ہی بے حس ہو تو اور بات ہے۔ صاحبو ہم کو عوام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرنا چاہئے جیسا کہ اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے اور اگر کسی سے کنارہ کشی اور علیحدگی ہی اختیار کی جائے تو اس میں بھی خیر خواہی کا قصد ہونا چاہئے۔ اور ظاہر میں تہذیب کے ساتھ تعلق قطع کرنا چاہئے۔ (العبد الربانی ج ۴)

اسلام کی تعلیم اعتدال

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار تفقد احوال صحابہؓ کے لئے رات کو اٹھے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کو دیکھا کہ آہستہ آہستہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ زور زور سے بلند آواز کے ساتھ قرآن مجید پڑھ رہے ہیں۔ صبح ہوئی اور حضورؐ نے سب سے فرمایا کہ تم ایسا کیوں کر رہے تھے اور تم ایسا کیوں کر رہے تھے۔ سب نے کچھ وجوہات بیان فرمائے۔ پھر حضورؐ نے فیصلہ فرمایا کہ اے ابوبکرؓ تم کسی قدر اپنی آواز کو اونچا کردو اور حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ تم اپنی آواز کو ذرا پست کرو۔ نیز جماعت اشعریین کی حضورؐ نے تعریف فرمائی کہ مجھے ان کے منازل کا علم ان کی آواز سے ہوجاتا ہے جب کہ رات کو وہ قرآن پڑھتے ہیں اور آیت وتقلبک فی السجدین کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ آپ رات کو اپنے اصحاب کا تفقد فرماتے تھے اور اس وقت آپ صحابہؓ کی آواز سے ان کے عمل کو معلوم فرماتے تھے۔

اب بتلایئے میں اس ادھیڑ بن کو کیا کروں کہ پہلے ایک خیال آیا اور ساتھ ہی اس کا جواب بھی ذہن میں آ گیا۔ تو میں خاموش ہوگیا مگر چونکہ اس حدیث میں اور فقہاء کے فتویٰ میں بظاہر تعارض ہوا اس لئے پھر فکر میں لگ گیا چنانچہ پھر اس تعارض کو اس طرح رفع کیا کہ سونے والے دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو تہجد کے لئے جاگنا چاہیں دوسرے وہ جو جاگنا نہ چاہیں جو جاگنا چاہیں ان کے پاس ذکر بالجہر کی اجازت ہے چنانچہ ہم نے خانقاہ میں رات کو دو بجے کے بعد ذکر بالجہر کی اجازت دے رکھی ہے کیونکہ وہ سب جاگنا چاہتے ہیں اور جو جاگنا نہ چاہے اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ خانقاہ میں تمہاری رعایت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ یہ سونے والوں کی جگہ نہیں اور جو لوگ سونا چاہیں ان کے پاس بیٹھ کر ذکر جہر ممنوع ہے تاکہ ان کی نیند میں خلل نہ آئے۔

اب اسی مسئلہ میں دیکھئے کہ فقہاء کا فتویٰ تو یہ تھا کہ سونے والوں کے پاس ذکر جہر مکروہ ہے مگر احادیث میں ایسے واقعات ملے جن سے رات کے وقت ذکر جہر کا نائمین کے پاس ثبوت ہوتا ہے کیونکہ حضرت عمرؓ کا قول حضورؐ کے جواب میں یہ تھا **کنت اطر و الشیطان واوقظ الوسنان** کہ میں بلند آواز اس لئے کر رہا تھا کہ شیطان کو بھگاتا اور سونے والوں کو جگاتا تھا۔ ایسے موقعہ میں غلبہ مقصودیت سے فیصلہ کیا جائے گا اور دلائل میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ میں نائمین کے پاس رفع صوت بالذکر عارض عادی تھے اور اصل مقصود عدم رفع ہے۔ (الغالب للطالب ج ٦)

حق کی قبولیت وتاثیر

حضورؐ کا وعدہ ہے: **لایزال طائفة من امتی منصورین علی الحق لایضرھم من خذلھم** (سنن ابن ماجہ: ۱۰ بلفظ ظاہرین)

(میری امت میں سے ہمیشہ ایک جماعت دین حق کی نصرت کرنے والی رہے جو ان کی مخالفت کرے گا ان کو نقصان نہ پہنچا سکے گا)

اب اس کے بعد بتاؤ کہ اسلام میں ضعف کہاں ہے۔ البتہ اہل اسلام میں بے شک ضعف ہے جس کی مثال بعینہ یہ ہے کہ کھانا اچھا عمدہ موجود ہے لیکن کھانے والا بیمار ہے کہ برا معلوم ہوتا ہے یا کھانے والے کو صفرا ہوا ہے کہ کڑوا معلوم ہوتا ہے تو اب شرابی کھانے میں ہے یا کھانے والے میں؟ اسی طرح مسلمان ضعیف ہے یا اسلام ہے۔

ہنوز آں ابر رحمت در فشانست　　　خم وخم خانہ با مہر و نشانست

ابھی وہ ابر رحمت موتی بکھیر رہا ہے خم وخم خانہ بارونق ہے۔

یہ تو قوت اسلام کی لمی دلیل تھی اور اسلام کے مضبوط ہونے کی دلیل انی یہ ہے کہ جو شخص اس کو اختیار کرے وہ کمزور نہیں رہتا۔ تو اگر دین میں یہ اثر نہیں تو یہ قوت کہاں سے آئی۔ اگر لاٹھی مضبوط نہ ہو انسان بے خوف نہیں چل سکتا اور اگر لاٹھی مضبوط ہو تو انسان بے خوف وخطر چلا جاتا ہے اسلام میں اگر طاقت نہ ہو تو انسان خوف کرے لیکن اسلام کی طاقت تو روز بروز ترقی پر رہتی ہے۔ اس لئے معلم کامل کی حالت پیرانہ سالی میں یہ رہتی ہے۔

خود قوی تر مے شود خمر کہن　　　خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

پرانی شراب تیز ہو جاتی ہے خاص کر وہ شراب جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اور فرماتے ہیں۔

ہر چند پیر وخستہ وبس ناتواں شدم　　　ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

ہر چند بہت کمزور اور بوڑھا ہو چکا ہوں لیکن جس وقت تیرے چہرے پر نظر کرتا ہوں جوان ہو جاتا ہوں۔

میں نے دیکھا کہ حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ باوجود ضعف کے جب کچھ بیان فرماتے تھے تو بہت بلند آواز سے فرماتے تھے اور گھنٹوں بیان کرتے تھے حالانکہ بعد میں آہ آہ کرنے لگتے تھے میری موجودگی میں مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کی عمر

سو سال سے زیادہ تھی۔ ایک مرتبہ فجر کے وقت خوب سردی کے زمانہ میں خادم سے کہا کہ غسل خانہ میں گھڑا رکھ دے مجھے کچھ شبہ معلوم ہوتا ہے پھر کھلے غسل خانہ میں کھڑے ہو کر نہائے اور خود آ کر امامت کی تو اس عمر میں اول تو شبہ ہی مستبعد ہے دوسرے ایسا موقع میں نہانا پھر امامت کرنا سب باتیں طاقت کی علامت ہیں۔ گو یہ ضروری نہیں کہ جسمی قوت بھی ہو مگر روحی طاقت تو ضرور ہوتی ہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ روحی اثر جسمی طاقت کو بھی تا دیر قائم رکھتا ہے چنانچہ اسی وجہ سے بزرگ باہمت ہوتے ہیں ان میں ضعف اور بودا پن نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق میں بڑی قوت ہے۔ (الاعتصام بحبل اللہ ج ٦)

مقام رسالت

ملا دو پیازہ نے ایک آل نامہ لکھا۔ اس میں ایک جملہ یہ بھی ہے کہ الرسول خیر خواہ دشمناں (رسول دشمنوں کا خیر خواہ ہوتا ہے) واقعی انبیاء علیہم السلام کی شان یہی ہے کہ وہ دشمنوں سے بھی غایت شفقت و خیر خواہی کرتے ہیں چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام کا ارشاد اپنی قوم کے ہلاک ہونے کے بعد قرآن مجید میں مذکور ہے۔

فتولیٰ عنهم وقال یاقوم لقد ابلغتکم رسلٰت ربی ونصحت لکم فکیف اٰسٰی علیٰ قوم کافرین

شعیب ان سے منہ موڑ کر چلے اور فرمانے لگے کہ اے میری قوم میں نے تم کو اپنے پروردگار کے احکام پہنچا دیئے اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی۔ پھر میں ان کافر لوگوں پر کیوں رنج کروں۔ (الیسر مع العسر ج ٦)

نصاب اصلاح

اطاعت مطلقہ کے محل کیا کیا ہیں۔

سو سنئے کہ سب سے اول محل تو عقائد ہیں یعنی جس طرح شریعت نے عقائد سکھلائے ہیں اسی کے موافق اعتقاد رکھیں۔

دوسرا محل اعمال دیانات ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ انہیں بھی شریعت کے موافق پابندی سے صحیح طور پر ادا کریں۔

تیسرا محل معاملات ہیں، بیع وشراء وغیرہ کہ ان کو بھی احکام شرع کے مطابق کریں اور یہ معلوم کریں کہ کون سی بیع فاسد ہے اور کون سی باطل، کون سا معاملہ صحیح ہے اور کون سا فاسد، کس معاملہ میں ربوا لازم آتا ہے اور کس میں قمار یہ سب شریعت سے معلوم کرکے اسی کے موافق کیا کریں۔

چوتھا محل معاشرت ہے کہ اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، ملنا جلنا اس کو معلوم کریں کہ اس کے شریعت میں کیا آداب ہیں۔

پانچواں محل اخلاق ہیں، اخلاق کے یہ معنی نہیں کہ نرمی سے بول لیے یا تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے یا ادب سے سلام کرلیا، یہ تو آثار ہیں اخلاق کے خود اخلاق نہیں۔ اخلاق یہ ہیں کہ تواضع، صبر، شکر، زہد وقناعت، شوق ورضا وغیرہ یہ ہیں۔ اخلاق یعنی اعمال باطنی، ان کے مقابلہ میں ان کے اضداد ہیں، کبر، بے صبری، ناشکری، طمع وحرص، حسد، بغض، کینہ یہ اخلاق ذمیمہ ہیں۔ (آثار العبادۃ ج ۷)

علم کی فضیلت واہمیت

بڑی کمی اس وقت یہ ہے کہ لوگ علم کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اگر کسی کو دین کی طرف توجہ کی توفیق بھی ہوتی ہے تو وہ مسجد بنواتا اور مسجد میں رقم لگاتا ہے، مدارس کی امداد نہیں کرتا چنانچہ لوگ مسجد میں تو تیل بہت دیتے ہیں مگر طلبہ کی خدمت نہیں کرتے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم (سنن الترمذی: ۲۶۸۵)

”کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری فضیلت ادنیٰ اُمتی پر ہے۔“

اس فضیلت کا منشا یہ نہیں کہ علم کا نفع متعدی ہے اور عبادت کا نفع لازم کیونکہ علم کا نفع بھی متعدی نہیں لازم ہے۔ نفع متعدی اگر ہے تو تعلیم کا ہے بلکہ فضیلت علم کا منشا یہی ہے کہ وہ شرط عمل ہے کیونکہ عبادت بدون علم کے نہیں ہوسکتی اور جو ہوتی ہے وہ عبادت کی محض صورت ہوتی ہے حقیقت نہیں ہوتی۔ ہاں تعلیم کی فضیلت کا منشاء یہی ہے کہ اس کا نفع متعدی ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ”انما بعثت معلما“ (کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں)

یہاں سے معلم کی فضیلت بھی معلوم ہوئی کہ وہ اس امر میں نائب رسولؐ ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو وہاں دو جماعتیں تھیں، ایک علماء کی جو مسائل

شرعیہ کا تذکرہ کررہے تھے دوسری عابدین کی جو ذکر اذکار کررہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم علماء میں بیٹھ گئے اور فرمایا "انما بعثت معلما" (میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں) مگر آج کل قرآن کے معلموں کی تو ایسی بے قدری ہے کہ دو روپیہ ماہوار اور کھانا ان کو ملتا ہے۔ اس سے زیادہ تنخواہ کسی کی ہوئی تو دس بارہ حد ہے۔ اسی طرح مؤذنوں کی اور اماموں کی بڑی بے قدری ہے بلکہ جو لوگ امامت سے پہلے معزز تھے، امام بن جانے کے بعد ان کی بھی بے قدری کی جاتی ہے کیونکہ وہ بھی مسجد کے ملا ہی کہلاتے ہیں۔ سو یاد رکھو کہ معلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب ہے مگر حضورؐ کا پیشہ معلمی نہ تھا کہ اس پیشہ سے آپؐ نے گزر کیا ہو بلکہ آپؐ کا ذریعہ معاش جہاد اور توکل علی اللہ تھا۔ آج کل جو معلمین کی بے قدری ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس کو پیشہ بنا لیا ہے لیکن اگر مسلمانوں کو علم کی طرف توجہ ہوتی اور شوق ہوتا تو معلموں کو اس کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ شکایت تو اسی کی ہے کہ مسلمانوں کو علم کی طرف بالکل توجہ نہیں۔ (اصل العبادۃ ج ۷)

مقام ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما

حدیث میں آیا ہے کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر رضی اللہ عنہ ہوتے تو اس پر ظاہراً یہ شبہ ہوتا ہے کہ حضورؐ نے اپنے بعد نبوت کا مستحق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا حالانکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان سے افضل تھے اس لئے ان کا استحقاق زیادہ معلوم ہوتا ہے تو اس کا راز ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو حضورؐ کے اندر فنا ہو گئے تھے وہ من بعدی میں داخل ہی نہ تھے وہ آپ کے غیر تھوڑا ہی تھے۔ وہ تو عین ہو گئے تھے یہ وجہ ہے کہ آپؐ نے اپنے بعد ان کو مستحق نہیں کیا کیونکہ وہ تو معی تھے ان کو من بعدی کیسے کہا جا سکتا ہے۔
یہی راز ہے اس کا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اتنے پریشان نہیں ہوئے جتنے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پریشان ہوئے پریشانی تو بعد سے ہوتی ہے جو فانی ہو چکتا ہے وہ بعد نہیں ہوتا وہ تو ہر وقت مشاہدہ کررہے تھے پھر کیسی پریشانی۔ (احکام المال ج ۸)

عقل و فراست

عقل ایسی چیز ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے عمر رضی اللہ عنہ اس وقت کیا حال ہوگا جب قبر میں رکھے جاؤ گے اور

فرشتے کڑکتے ہوئے گرجتے ہوئے تمہارے پاس آ دیں گے اور تم سے پوچھیں گے **من ربک ما دینک** اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتلا دیجئے کہ عقل بھی اس وقت رہے گی یا نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عقل تو دنیا سے بھی زیادہ ہوگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عقل ہمارے پاس ہوگی تو پھر کیا اندیشہ ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ عقل سے کام لیں گے اور جواب صحیح دیں گے۔ (احکام المال ج ۸)

اہل جنت کی غذا

حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جنت میں سب سے پہلی غذا زمین کی روٹی ہوگی۔ حق تعالیٰ زمین کی روٹی بنا کر جنت والوں کو کھلائیں گے۔ ظاہراً اس حدیث پر کوئی ہنسے گا کہ اچھے جنت میں گئے کہ ڈھیلے اور پتھر کھانے کو ملے اس سے تو دنیا ہی میں اچھے تھے۔ وہاں تو روٹی کھاتے تھے اور یہاں ڈھیلے اور پتھر نصیب ہوئے کسی کے حصہ میں کوہ منصوری کا پتھر اور کسی کے حصہ میں کوہ شملہ کا۔ اچھے جنت میں آئے کہ ایسی چیزیں کھانی پڑیں۔ اس حدیث کی شرح بجز اہل اسرار اور اہل اللہ کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کی شرح سن کر آپ کو اہل اللہ کی قدر معلوم ہوگی کہ حق تعالیٰ نے ان کو کیسا فہم دیا ہے حقیقت میں **ظل اللہ فی الارض** کا لقب پورا ان ہی حضرات پر صادق ہے سو وہ حضرات یوں کہتے ہیں کہ دنیا میں جتنی چیزیں اچھی سے اچھی کھا رہے ہیں اور اچھے سے اچھے کپڑے پہن رہے ہیں یہ کہاں سے آئے۔ زمین ہی سے تو نکلے ہیں۔ اگر اونی کپڑے ہیں تو اون ہوتی ہے حیوانات سے اور حیوانات نے زمین ہی کے تو اجزا کھائے ہیں جن سے وہ اون پیدا ہوئی ہے۔ غرض جس چیز کو بھی لیجئے گا اجزائے زمین ہی اس کی حقیقت نکلے گی۔ زمین میں پانچ سیر گیہوں ڈالے تھے اور پیدا ہوئے پانچ من تو وہ پانچ سیر سے زیادہ جو پیدا ہوئے وہ زمین ہی کے تو اجزاء ہیں۔ انہی کی تو صورت بدل گئی ہے یا آم کا درخت نکلا اور اس میں ہزاروں آم پیدا ہوئے یا غلہ پیدا ہو یا کسی قسم کا پھل اترا سب زمین ہی کے تو اجزا ہیں عناصر سے مرکب ہو کر جس میں جزو غالب ارضی ہے، اس شکل سے نمودار ہو گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کے اندر سب چیز موجود ہے پس یہ کہنا غلط ہو گیا کہ زمین میں بس ڈھیلے اور پتھر ہی ہیں۔ زمین میں انار بھی ہیں، آم بھی ہیں، انگور بھی ہیں، کھٹائی بھی مٹھائی بھی۔ سب چیزیں زمین

کے اندر موجود ہیں۔ ہر طرح کا مادہ اس میں رکھا ہوا ہے۔ یہ وہی مادہ ہے جو ان رنگ برنگ صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا کہ زمین کے اندر سب کچھ ہے۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب کوئی کسی کے یہاں مہمان ہو کر جاتا ہے تو اس کو بے چھنا آٹا تک نہیں کھلاتے۔ اور لوگ جائیں گے خدا کے مہمان ہو کر تو اللہ تعالیٰ پر یہ گمان کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ زمین کو بے چھانے کھلا دینگے بس وہ اپنی قدرت کی مشین سے شملہ اور منصوری کے پتھر سے جو فضلہ ہے وہ الگ کر دیں گے اور ان میں جو اجزاء قابل کھانے کے ہیں وہ رہنے دیں گے۔

اب اس تقریر سے کچھ بھی شبہ نہیں رہتا (میں کہتا ہوں کہ زمین کی روٹی کے برابر کوئی چیز مزیدار ہو ہی نہیں سکتی' اس لئے کہ دنیا میں جتنے بھی مزے ہیں سب زمین ہی کا طفیل ہے خوشبوئیں جس قدر بھی ہیں زمین ہی سے پیدا ہوئی ہیں اس سے جو روٹی تیار ہوگی ظاہر ہے کہ اس میں ہزاروں قسم کے تو مزے اور ہزاروں قسم کی خوشبوئیں ہوں گی۔ لہذا اس کی روٹی سے کون سی چیز مزہ دار ہو سکتی ہے۔ (جامع)

اب ایک بات اور رہ گئی وہ یہ ہے کہ اس تکلف کی ضرورت کیا تھی کہ اس زمین کی روٹی بنائی جائے یہ جنت کی نعمتوں کے برابر تو ہو گی نہیں پھر جنت ہی کی چیز کھلا دیتے۔

اس کا راز بھی حضرات اہل اللہ ہی نے بیان کیا ہے وہ یہ کہ اہل اللہ میں سے بعض ایسے ہوئے ہیں کہ انہوں نے دنیا کی لذت چکھی تک نہیں یا تو قصداً یا میسر نہیں ہوئی اس لئے وہ موازنہ نہ کر سکتے تھے جنت اور دنیا کی نعمت میں اور جب کہ دونوں کا تفاوت معلوم نہ ہوتا تو جنت میں نعمتوں کی قدر بھی پوری نہ ہوتی اس لئے حق تعالیٰ نے پہلے دنیا کی چیز کو کھلا دیا کہ سب سے زیادہ لطیف غذا دنیا کی یہ ہے اب ہمارے یہاں کی غذا کھاؤ۔

اگر کوئی کہے کہ پھر ایسے ہی لوگوں کو کھلا دیا ہوتا جن کو دنیا کی لذات نہیں ملیں سب کو کیوں کھلایا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ کریم کی یہ عادت نہیں ہوتی کہ بعض کو کھلائیں اور بعض کو محروم رکھیں اس لئے ہم سوالیوں کو بھی ان کے ساتھ شامل کر دیا یہ راز ہے اس حدیث کا اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ زمین کیا چیز ہے کھانے اس میں میوے اس میں کپڑے اس میں سب چیزیں زمین ہی میں ہیں۔ اس لئے یہ بڑی قدر کی چیز ہے۔ (احکام المال ج ۸)

ایک قرآنی حکم کی وضاحت

فلیضحکوا قلیلاً ولیبکوا کثیراً کہ ہنسنا کم چاہیے اور رونا بہت چاہیے اس

سے ہنسنے اور رونے کا حکم ثابت کیا ہے کہ رونا افضل ہے ہنسنے سے حالانکہ اس آیت کا یہ مدلول نہیں۔ یہ آیت منافقین کے بارہ میں ہے انہی کے متعلق پہلے سے بیان چلا آ رہا ہے **فلیضحکوا** میں ھم کی ضمیر منافقین کی طرف ہے اور یہ خبر ہے بصورت انشاء اور حاصل ترجمہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں تھوڑے دنوں ہنستے رہیں پھر قیامت میں زیادہ روئیں گے۔ اس آیت میں منافقین کی اخروی حالت بیان کی گئی ہے کہ یہ لوگ دنیا میں کچھ دنوں کو ہنس لیں پھر آخرت میں رونا ہی رونا ہے۔ یہ مطلب تھا آیت کا نہ یہ کہ رونے کی فضیلت اور ہنسنے کی مذمت جیسا آج کل کے مدعی سمجھے ہیں اور قلیلاً سے دنیا کی زندگی مراد ہے اور اس کے مقابل کثیراً سے آخرت کی زندگی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت میں خوب دل کھول کر رووگے اور ہنسنا کبھی نصیب نہ ہوگا۔ **جزآءً بما کانوا یعملون** خود اس کا قرینہ ہے غرض یہ آیت آخرت کے متعلق ہے۔ **فلیضحکوا ولیبکوا** امر ہے لفظاً اور خبر ہے معنیً۔

مگر مصیبت تو یہ ہے کہ لوگوں نے ذرا سی آیت دیکھ لی اور نتیجہ نکالنا شروع کر دیا نہ ما قبل کی خبر ہے نہ مابعد کی اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ قرآن کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں۔

اسی طرح ایک اور آیت ہے **ولن یجعل اللّٰہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً** بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ کافر مسلمانوں پر کبھی غالب نہ آئیں گے پھر اس پر بڑا اشکال کہ قرآن شریف میں تو یہ ہے اور واقعہ اس کے خلاف ہے وہ یہ کہ کفار کو بہت دفعہ دنیا میں مسلمانوں پر غلبہ ہوا ہے جس کا انکار نہیں ہوسکتا۔ مشاہدہ کا کیا انکار مگر حقیقت میں آیت کا یہ مطلب ہی نہیں جو سمجھا گیا ہے یہ آیت دنیا کے متعلق ہے ہی نہیں یہ تو آخرت کے متعلق ہے۔ کیونکہ اوپر ذکر منافقین کا ہے۔ ان کا ذکر کر کے فرماتے ہیں۔ **فاللّٰہ یحکم بینکم یوم القیٰمة ولن یجعل اللّٰہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً** مطلب یہ ہے کہ آخرت میں فیصلہ کے وقت ڈگری مومنین کی ہوگی اور منافقین ہاریں گے خود۔ **فاللّٰہ یحکم بینکم یوم القیٰمة** بتلا رہا ہے کہ یہ حکم آخرت کے متعلق ہے یعنی قیامت میں جب مقدمہ پیش ہوگا تو اس میں مسلمان مغلوب نہ ہوں گے اب کوئی اشکال نہیں۔ (احکام الجاہ ج ۸)

داخلہ جنت کی خوش فہمی

حدیث شریف میں ہے **من قال لا الٰہ الا اللّٰہ دخل الجنة** جس نے لا الٰہ الا اللّٰہ کہا، جنت میں داخل ہوگیا۔

اس سے اپنے نفس کے موافق یہ مراد لے لی ہے کہ بس یہی کافی ہے۔ نہ کسی عمل کی ضرورت ہے نہ کسی گناہ سے بچنے کی حاجت۔ جو جی چاہے کرتے پھرو بس لا الٰہ الا اللہ کہہ لو سیدھے جنت میں چلے جاؤ گے یہ بھی وہی **کلمة الحق ارید بها الباطل** (یہ کلمہ تو حق ہے مگر اس سے مراد باطل لی گئی ہے۔

اگر کوئی کہے کہ ہم نے جو اس حدیث میں کہا ہے خود اسی حدیث ہی میں آگے مصرع ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ **وان زنیٰ و ان سرق** یعنی اگر چہ وہ زنا کرے، اور چوری کرے۔ تب بھی جنت میں داخل ہوگا اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعد لا الٰہ الا اللہ کہہ لینے کے کچھ بھی کرتا پھرے کچھ مضر نہیں۔

جواب یہ ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اعمال مامور بھا (جن کاموں کا حکم دیا گیا ہے) کے بجالانے اور معاصی سے بچنے کی ضرورت نہیں بلکہ مطلب اس کا یہ ہے کہ زنا و سرقہ سے ایمان نہیں جاتا۔ اس ایمان کی برکت سے کبھی نہ کبھی جنت میں داخل ہو جائے گا۔ گو بعد سزا سہی تو اعمال کی عدم ضرورت اس سے کیسے ثابت ہوئی جیسے جہلاء کا زعم ہے کہ جو جی چاہے کرتا پھرے کچھ بھی حرج نہیں اور موٹی بات ہے کہ اگر صرف لا الٰہ الا اللہ کافی ہوتا اور کسی عمل کے کرنے یا گناہوں کے چھوڑنے کی ضرورت نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیوں اعمال کی تاکید فرماتے اور گناہوں پر وعیدیں کیوں ارشاد فرماتے۔ یہ تو بہت آسان بات تھی اسی کی تعلیم فرما دیتے۔ نیز جب آپ ہی سے اعمال ساقط نہ ہوئے تو اور کیسے ساقط ہو سکتے ہیں۔ دیکھئے آخر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں کوئی بھی سمجھ دار تھے یا نعوذ باللہ سارے ناواقف ہی تھے۔ کیا صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور اعمال نہیں کرتے تھے۔ کیا صرف لا الٰہ الا اللہ پر بس کرتے تھے ان کے واقعات دیکھ لیجئے دین پر ان کو کیسی توجہ تھی۔ مستحب تک کو چھوڑنا بہت برا خیال کرتے تھے معلوم ہوا کہ یہ صرف تمہارا مذاق ہے ان دلائل کا یہ مفہوم نہیں صرف نفس کو اعمال کی مشقت سے بچانے کے لئے تم نے حیلے تراش لئے ہیں۔ کیا آیت **لمثل هذا فليعمل العاملون** اس کی مثل عمل کرنے والوں کو چاہیے کہ عمل کریں۔

اور حدیث **من ترک الصلوة متعمداً فقد کفر** جس نے نماز کو قصداً چھوڑ دیا وہ کافر ہوگیا۔ وغیرہ یہ نصوص نہیں ہیں کیا آپ کو صرف ایک ہی نص ملی مجھے تو شرم آتی ہے ایسی ظاہر بات کی تفصیل کرتے ہوئے۔ (خیر المال للرجال ج ۸)

اسمائے جلال و جمال

خدا کے اسماء کو لوگ جلالی اور جمالی کہتے ہیں یہاں تک تو صحیح ہے واقعی اسمائے باری تعالیٰ بعض جلالی ہیں اور بعض جمالی مگر لوگوں نے جو ان سے مراد لے رکھی ہے وہ غلط ہے لوگوں کے نزدیک جلالی ان اسماء کو کہتے ہیں جن کے پڑھنے سے وبال پڑے گرمی پیدا ہو۔ جنون پیدا ہو جائے اور جو اسماء ایسے نہ ہوں ان کو جمالی کہتے ہیں سو یہ تفسیر محض غلط ہے۔ کہیں خدا کے نام سے بھی وبال اور نحوست یا جنون پیدا ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ! بلکہ جلالی وہ ہیں جن میں معنی قہر کے پائے جاتے ہیں جیسے قہار، جبار، عزیز اور جمالی وہ ہیں جن میں معنی لطف کے پائے جاتے ہیں جیسے رحمٰن، رحیم، کریم، لطیف سو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ میں دونوں صفتیں ہیں۔

اسی معنی کے اعتبار سے بعضے بزرگوں کو بھی لوگ جلالی کہتے ہیں کہ ان کو غصہ بہت آتا ہے۔ سو یہ صحیح ہے کہ بزرگوں کو غصہ آتا ہے مگر اس میں مصالح ہوتے ہیں پس ان کا جلال بھی مشتمل بر جمال ہوتا ہے۔ جیسا حق تعالیٰ کے قہر کے ساتھ بھی لطف ملا ہوا ہوتا ہے۔

اس لطف پر ایک آیت یاد آئی حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ولو یؤاخذ اللّٰہ الناس بظلمھم ماترک علیھا من دابۃ اگر میاں لوگوں سے ان کے گناہوں پر مواخذہ فرماتے تو زمین پر جتنے چلنے والے ہیں سب کو ہلاک کر ڈالتے۔

بظاہر یہاں مقدم اور تالی میں ملازمت کا تعلق نہیں معلوم ہوتا کیونکہ مواخذہ تو ہو آدمیوں سے اور ہلاک ہوں دواب بھی۔ اگر یوں فرماتے تو ملازمت کا تعلق ہوتا۔

ولو یؤاخذ اللّٰہ الناس بظلمھم ماترک علیھا من الناس اگر اللہ تعالیٰ لوگوں سے ان کے گناہوں کی وجہ سے مواخذہ فرماتے تو زمین پر کوئی آدمی نہ بچتا۔

سو بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آدمیوں کو ڈرا بھی رہے ہیں جو قہر و جلال ہے اور اس کے ساتھ ہی انسان کا شرف بھی بتلا رہے ہیں جو لطف و جمال ہے۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ اگر انسان سے مواخذہ کیا جاتا تو سارے عالم کو اس لئے درہم برہم کر دیا جاتا کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے انسان ہی کے واسطے ہے جب یہ نہ رہتا تو کچھ بھی نہ رہتا۔ سبحان اللہ! جن پر غصہ ہے ان کی شرافت و مقصودیت بھی ظاہر کی جا رہی ہے۔ صاحبو! واقعی تم بڑے مرتبہ والے ہو مگر افسوس ہم لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر تدبر نہیں کرتے اگر تدبر کرتے تو اللہ

تعالیٰ کے غصہ میں بھی رحمت نظر آتی اور اس سے ہمارے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی اسی طرح اہل اللہ بھی غصے ہوتے ہیں مگر ان کے غصہ کے اندر رحمت بھی ہوتی ہے واقعات کو دیکھو تو معلوم ہو کہ وہ کتنی رعایتیں کرتے ہیں۔

یہ حالت ہوتی ہے اہل اللہ کے دنیوی تعلقات کی کہ ان کو کسی چیز کے نہ آنے سے فرحت ہو، نہ جانے سے غم۔ (خیر المال للرجال ج ۸)

دین کے اثرات و برکات

دین سے فہم بھی درست ہو جاتا ہے۔ اسی درستی فہم پر ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک شخص گنوار حضرت مولانا گنگوہیؒ صاحب کی خدمت میں آیا اور کہا کہ مولوی جی، مجھے مرید کرلو۔ حضرت نے فرمایا، اچھا بھائی آ۔ مرید کرتے ہوئے جو باتیں کہلواتے ہیں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھا کرو، سب کچھ کہلوایا جب مولانا اپنی باتیں پوری فرما چکے تو آپ کہتے ہیں کہ مولوی جی تم نے افیم سے تو توبہ کرائی نہیں مولانا نے فرمایا کہ بھائی مجھے کیا خبر کہ تو افیم بھی کھاتا ہے حضرت چونکہ طبیب بھی تھے جانتے تھے کہ دفعۃً افیون کا چھوڑنا مشکل ہے اور طالب کی حالت کی رعایت ضروری ہے اس لئے آپ نے فرمایا کہ کتنی کھایا کرتے ہو۔ میرے ہاتھ پر رکھ دو۔ اس نے گولی بنا کر حضرت کے ہاتھ پر رکھ دی۔ حضرت نے اس میں سے کچھ کم کر کے باقی اس کو دے دی اور فرمایا کہ اتنی کھالیا کرو پھر مشورہ کر لینا۔ وہ شخص کچھ دیر خاموش بیٹھ کر کہنے لگا اجی مولوی جی جب توبہ ہی کرلی پھر اتنی اور اتنی کیا یہ کہہ کر افیون کی ڈبیہ نکال کر دیوار پر ماری اور یہ کہا کہ اری افیم جا میں نے تجھے چھوڑ دیا بس یہ کہہ کر چلا گیا نہ ذکر پوچھا نہ شغل۔

افیون کے چھوڑنے سے دست آنے لگے۔ اس نے کہلا کر بھیجا کہ مولوی جی دعا کر دیجیو کہ میں اچھا ہو جاؤں مگر افیم نہ کھاؤں گا غرض بری حالت تک نوبت پہنچی مرتے مرتے بچا مگر اچھا ہو گیا تندرست ہو کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے پوچھا کون؟ کہا میں افیم والا اور سارا قصہ بیان کیا۔ اس کے بعد دو روپیہ پیش کئے مولانا نے کس قدر عذر کے بعد دلجوئی کی اور روپے قبول فرما لئے تو آپ کہتے ہیں کہ اجی مولوی جی یہ تو تم نے پوچھا ہی نہیں کہ یہ کیسے روپے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی اب بتلا دے کیسے روپے ہیں اس نے کہا کہ یہ روپے افیم کے ہیں۔ حضرت نے پوچھا کہ افیم کے کیسے اس نے کہا میں دو روپے مہینہ کی افیم کھاتا تھا جب

میں نے افیم سے توبہ کی تو نفس بڑا خوش ہوا کہ اب دو روپے ماہوار بچیں گے میں نے کہا کہ یہ تو دین میں دنیا مل گئی بس میں نے نفس سے کہا کہ یہ یاد رکھو کہ یہ روپیہ تیرے پاس نہ چھوڑوں گا۔ یہ مت سمجھ کہ تجھے دے دوں گا بلکہ اسی وقت نیت کر لی کہ جتنے کی افیم کھایا کرتا تھا وہ پیر کو دیا کروں گا پس یہ دو روپیہ ماہوار آپ کے پاس آیا کریں گے۔ (خیر المال للرجال ج ۸)

اخلاص کی قیمت

حضرت شیخ ابوالحسن نوریؒ کا واقعہ ہے کہ ایک جہاز میں بیس مٹکے شراب کے خلیفہ وقت کے واسطے آئے تھے آپ بھی دریا کے کنارے ٹہلتے ہوئے پہنچے جہاز والے سے پوچھا کہ اس میں کیا چیز ہے؟ اس نے کہا کہ خلیفہ کے واسطے شراب آئی ہے آپ نے مٹکوں کو توڑنا شروع کیا انیس توڑ دیئے صرف ایک مٹکا باقی رہ گیا تھا کہ اس کو آپ نے چھوڑ دیا اس واقعہ کی خبر خلیفہ کو پہنچی خلیفہ کو غصہ آیا اور ان کے پکڑ لانے کا حکم ہوا حاضر کئے گئے۔ خلیفہ نے ایسی جرات کی وجہ دریافت کی تو آپ نے کہا حق تعالیٰ کا حکم ہے۔

وامر بالمعروف و انه عن المنکر واصبر علیٰ ما اصابک حکم کر کرنے کا اور روک برائی سے جو تکلیف تجھ کو پہنچے اس پر صبر کر۔

خلیفہ نے پوچھا کہ ایک کو کیوں چھوڑ دیا فرمایا کہ اس کے توڑنے میں نفس کی آمیزش ہو گئی تھی۔ اس لئے چھوڑ دیا وہ اس طرح کہ جب میں انیس مٹکے توڑ چکا تو نفس کے اندر خیال ہوا کہ تو نے بڑا کام کیا کہ خلیفہ کی بھی پرواہ نہ کی اس بات پر نفس پھولا تو میں نے ایک کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ کام خالص اللہ کے واسطے نہ رہا تھا خلیفہ پر اس اخلاص کا یہ اثر ہوا کہ ان کا معتقد ہو گیا اور محتسب شہر بنا دیا اسی طرح نفس کی کید کی طرف اس گنوار کا فہم بھی پہنچا۔

یہ حکایت (گنوار کی) اس پر یاد آ گئی تھی کہ میں نے کہا تھا کہ دین اختیار کرنے سے آدمی کا فہم بھی درست ہو جاتا ہے ایسے شخص کو وہ باتیں منکشف ہوتی ہیں جو علماء کو بھی نہیں ہوتیں۔ یہ تو نعمت معنوی تھی باقی حسی نعمتیں بھی ایسے شخص کو اوروں سے زیادہ عطا ہوئی ہیں۔ (خیر المال للرجال ج ۸)

کسب حلال اور حب دُنیا

کسب الحلال فریضة حدیث ہے پس کسب حلال تو فرض ہے ہاں حب دنیا سے منع کیا جاتا ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے۔

حب الدنیا راس کل خطیئة (کہ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے)

صاحبو! ایک ہے کسب دنیا اور ایک ہے حب دنیا کسب دنیا جائز اور بعض مواقع پر واجب اور فرض بھی ہے اور حب دنیا حرام ہے اور ان میں باہم تلازم نہیں نہ کسب دنیا کے لئے حب دنیا لازم اور نہ حب دنیا کے لئے کسب دنیا لازم کیونکہ کسب دنیا اس وقت بھی ممکن ہے کہ معاش حاصل کرے مگر اس کے ساتھ شغف نہ ہو۔ اسی طرح حب دنیا اس وقت بھی ہوسکتی ہے کہ کمائے بھی نہیں مگر اس کے ساتھ شغف ہو مثلاً کوئی شخص دنیا نہ کماتا ہو مگر دین سے بھی غافل ہو تو اس کو حب دنیا حاصل ہے اور کسب دنیا حاصل نہیں کیونکہ دین سے غفلت ہونا یہی حب دنیا ہے اور بعض جگہ دونوں جمع ہو جاتی ہیں یعنی کسب دنیا بھی ہو اور حب دنیا بھی ہو مثلاً ایک شخص دنیا بھی کماتا ہے اور دین سے بھی غافل ہے اور بعض جگہ دونوں نہیں ہوتیں نہ کسب دنیا نہ حب دنیا مثلاً کوئی شخص کسب دنیا نہیں کرتا اور دین سے غافل بھی نہیں غرض حب دنیا و کسب دنیا متلازم نہیں بعض محبّ ہیں کاسب نہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی کاسب ہو اور محبّ نہ ہو سو ہم حب دنیا سے منع کرتے ہیں۔ باقی کسب دنیا وہ تو خاص قیود کے ساتھ ضروری ہے آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ شرعی فتوے سے تجارت فرض کفایہ ہے اسی طرح زراعت بھی فرض کفایہ ہے کیونکہ زندگی موقوف ہے ان چیزوں پر اور ضروریات معاش کی تحصیل فرض کفایہ ہے اور فرض کفایہ وہ ہے کہ بعض کے کر لینے سے بقیہ لوگوں کے ذمہ سے فرض ساقط ہو جاتا ہے اس لئے یہ خیال بالکل ہی غلط ہے کہ علماء کسب دنیا سے منع کرتے ہیں بھلا فرض کفایہ سے کون منع کرسکتا ہے۔ بس محبّ دنیا ہونا تو کسی کو جائز نہیں باقی کسب دنیا میں کسی قدر تفصیل ہے یعنی ایک وہ شخص ہے کہ جس کو کسب دنیا ضروری ہے اور بعض وہ ہیں جن کے لئے کسب دنیا ضروری نہیں بیان اس کا یہ ہے کہ جس شخص کو عدم کسب کی حالت میں پریشانی ہو تو پریشانی کی حالت میں کسب دنیا ضروری ہے اس کو چاہیے کہ کسب دنیا کرے۔ (خیر المال للرجال ج ۸)

انا للہ کی فضیلت

قرآن کے ایک ایک لفظ میں اتنی دلالتیں اور اس قدر رعائتیں اعجاز قرآن کی دلائل ہیں آگے فرماتے ہیں **الذین اذا اصابتھم مصیبة قالو انا لله وانا الیه راجعون.** یہ جملہ یا تو صفت مادحہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ بشارت جن صابرین کے لئے ان کی یہ خاص

مدح ہے یا صفت مقیدہ ہے کہ صابرین میں جن کی یہ شان ہے صرف انہی کے لئے بشارت ہے۔ بہر حال اس سے ہر مصیبت کے وقت انا للہ پڑھنے کی فضیلت ثابت ہوئی۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چراغ گل ہو جانے پر بھی انا للہ پڑھا کیونکہ یہ بھی ایک مصیبت ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ روشنی بھی نعمت ہے واقعی رات کو اندھیرے مکان میں جب چراغ روشن کیا جاتا ہے تو جان میں جان آتی ہے۔ اندھیرے گھر سے وحشت سی معلوم ہوتی ہے اس لئے آپ نے چراغ گل ہونے انا للہ پڑھ کر روشنی کا نعمت عظمیٰ ہونا اور...... اندھیرے کا مصیبت ہونا ظاہر کر دیا۔

مگر آج کل انا للہ بہت بدنام ہو گیا ہے لوگوں نے اس کو مردوں کیلئے خاص کر لیا ہے۔

گنگوہ میں ایک لڑکا ہر بات پر انا للہ پڑھا کرتا تھا تو ایک بڑھیا نے کہا بچے خدا سے خیر مانگ۔ تو ہر بات پر انا للہ پڑھ کر کس کو مارے گا شاید بڑھیا کو اپنی ہی فکر ہوئی ہوگی کہ بس سب سے زیادہ میری عمر ہے کہیں انا للہ سن کر ملک الموت گھر میں نہ آگھسیں اور مجھے سب سے زیادہ عمر والی دیکھ کر اپنے ساتھ لے جائیں۔ اسی طرح لاحول بھی بہت بدنام ہے۔

کانپور کا ایک قصہ ہے کسی نے دوسرے کو دور سے دیکھ کر سمجھا کہ یہ فلاں شخص ہے پاس پہنچا تو اور تھا۔ اس نے اپنی غلطی پر لاحول پڑھ دی وہ دوسرا شخص اس کے سر ہو گیا کہ تم نے مجھ کو شیطان کہا وہ ہر چند سمجھاتا ہے کہ میں نے تم پر لاحول نہیں پڑھی اپنی غلطی پر پڑھی ہے۔ مگر وہ کسی طرح مانتا ہی نہیں بہت مشکل سے پیچھا چھڑایا۔

سورۂ یٰسین بھی بہت بدنام ہے اس کو بھی لوگوں نے مردوں کے لئے خاص کر لیا ہے حالانکہ حدیث شریف میں اس کی بہت فضیلت آئی ہے اس سورۃ کو دم کرنے سے بڑے مہلک امراض میں شفا حاصل ہوتی ہے مگر میں جب کسی مریض پر یہ سورت دم کرتا ہوں تو آہستہ پڑھا ہوں کہیں زور سے پڑھنے میں وہ بیمار یا اس کے گھر والے یہ نہ کہیں کہ مارنے کو آیا تھا۔

دہلی میں ایک دفعہ مومن خاں شاعر تراویح میں قرآن سنتے تھے ایک ڈوم بھی ان کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ وہ مومن خان سے چند روز کے بعد کہنے لگا کہ خان صاحب وہ سورت آوے جو مردوں پر پڑھی جاتی ہے تو مجھ سے ایک دن پہلے کہہ دینا تاکہ میں اس دن نہ آؤں۔ اس کے سننے سے آدمی مر جاتا ہے۔ مومن خان نے وعدہ کر لیا چند روز کے بعد اس نے یہ بات پھر یاد دلائی تو مومن خان نے کہہ دیا کہ وہ سورت تو پڑھی بھی گئی مجھ

کو کہنا یاد نہیں رہا۔ بس ڈوم یہ سن کر سہم ہی تو گیا کہ ہائے وہ سورت پڑھی گئی اور وہم کی وجہ سے اس کی روح تحلیل ہوگئی اور دو تین دن میں مرگیا یہ محض اس کے وہم کا اثر تھا۔ اس سورت کا اثر نہ تھا ورنہ آج کل لوگ کیوں نہیں مرجاتے۔ (حقیقت الصمر ج ۹)

شریعت اور رحمت

مجھ کو تو ہر آیت میں رحمت ہر حکم میں رحمت نظر آتی ہے۔ اگر شریعت کے ہر ایک برتاؤ کو غور سے دیکھیں تو ہر ایک میں رحمت پائی جاوے گی۔ اور یہ میری من گھڑت نہیں بلکہ سلف کے اقوال اس کے مؤید ہیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ سب سے بڑی آیت رحمت کی آیت مداہنت ہے کہ آپس میں کا لین دین لکھ لیا کرو۔ وجہ دلالت یہ کہ حق تعالیٰ کو جب ہمارا دنیا کا نقصان گوارا نہیں تو اخروی نقصان کو کب گوارا فرمائیں گے لکھنا مشروع فرمایا۔ تا کہ چار پیسہ کی بھی بھول نہ ہو کہ نقصان اٹھانا پڑے ایک لمبی آیت رکوع کا رکوع اسی قانون میں نازل فرمایا تو ہمارا چار پیسہ کا نقصان بھی گوارا نہیں یہ کتنی بڑی رحمت اور محبت ہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں سحر کا بڑا زور تھا تو حضرت موسیٰؑ کو وہ وہ معجزے عطا کئے گئے کہ جس سے اہل سحر متحیر و عاجز ہوگئے اور ناچار آپ کو رسول برحق ماننا پڑا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب کا بڑا زور تھا اس لئے حضرت عیسیٰؑ کو دم سے مردہ زندہ کر دینے کا معجزہ عنایت ہوا لا علاج برص والے کو دم کے دم اچھا کر دیتے۔

زمانہ بھر کا مسلم ہے کہ مادرزاد نابینا بینا کسی دوا سے بھی نہ ہو سکتا۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کو بھی بحکم خداوندی بینا کر دیتے تھے۔

چونکہ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں حکومت اور سلطنت کا زور تھا کہ ہر بادشاہ اپنی طاقت و خداداد قوت پر مغرور تھا اپنے اس زور و قوت پر مغرور ہو بیٹھے تھے خدائی اور آسمانی احکام بالکل نسیاً منسیا ہو چکے تھے۔ اس زمانہ میں جب سلیمانؑ کو نبی برحق بنا کر بھیجا گیا تو ان کو ایسا زبردست بادشاہ بنایا گیا کہ جس کو دیکھ کر وہ لوگ اپنی طاقت و زور سب بھول گئے اور سر تسلیم خم کرتے ہی بن پڑا۔

باقی یہ بات کہ ہر نبی کو وہی معجزہ کیوں دیا جاتا ہے جس میں اسکی قوم کو غلو ہو۔ اس میں

حکمت یہ ہے کہ جس امر کا جس زمانہ میں غلبہ ہوتا ہے اس کی معرفت ان لوگوں کو زیادہ ہوتی ہے اور جس قدر معرفت زیادہ ہوتی ہے اس کی حد مقدوریت زیادہ معلوم ہوتی ہے جب معجزہ اس حد سے آگے ہوگا اس کے اعجاز کو بھی وہ لوگ خوب سمجھیں گے اور جو مصلحت ہے معجزہ کی وہ خوب ظاہر ہوگی۔ پس حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسی قوت کی سلطنت دی گئی تاکہ بمقابلہ دوسرے سلاطین کے یہ بات ظاہر ہو جاوے کہ سلاطین کتنے ہی بڑھ جائیں ساری دنیا غرب سے شرق تک کے مالک ہو جائیں کتنے ہی ریلوے انجن موٹر کار وغیرہ نکالیں مگر جن اور طیور پر کہاں سے حاکم بنیں گے۔ ان کی زبانیں کیسے معلوم کریں گے۔ ہوا کو کیونکر ایسا تابع بنائیں گے کہ صرف زبان ہلانے سے وہ کام کرنے لگے۔

اور حضرت سلیمانؑ کو ان چیزوں پر حاکم بنایا۔ سب کو ان کے قبضہ میں دیا
پس اس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ معجزہ ہے۔ (دواء الضیق ج۹)

حکیمانہ جواب

ایک شخص نے مجھ سے پوچھا۔ نماز پانچ وقت کی کیوں فرض ہوئی۔ اس میں کیا مصلحت ہے۔ میں نے کہا تمہارے ناک آگے کیوں ہے پیچھے کیوں نہیں اس میں کیا حکمت ہے انہوں نے کہا اگر پیچھے ہوتی تو بدنما معلوم ہوتی میں نے کہا جب سب کی پیچھے ہوتی ہے تو کیوں بدنما معلوم ہوتی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ افسوس ہے کہ اگر محمد ابن زکریا کچھ کہہ دے تو مان لیا جائے۔ اور اگر محمد بن عبداللہ کچھ کہیں تو اس کی تصدیق نہ کی جائے۔ غرض! جب میں نے ثابت کر دیا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے پھر ہمیں ضرورت نہیں کہ ہر ایک حکم کی علت بتائیں۔ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ اس میں خاصہ یہی ہے جو خدا تعالیٰ کے ارشاد سے معلوم ہو جاتا ہے۔ بلکہ جو ادویہ مؤثر بالکیفیت کہلاتی ہیں تو وہ بھی مؤثر بالخاصیت ہی ہیں۔

مثلاً برودت کا علاج اجزاء حارہ سے کرتے ہیں۔ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ علاج بالکیفیت ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ حرارت نہیں کیونکہ اول تو علاج بالمثل بھی ہوتا ہے تو وہاں علت کہاں گئی اور شفاء وہاں بھی ہوتی ہے معلوم ہوا کہ حرارت علت نہیں۔ (دواء الضیق ج۹)

ترجمہ قرآن کا معیار

صاحبو! اگر ہم قرآن کو کتاب علاج روحانی سمجھتے تو تراجم کے اندر بھی اسی بات کو ملحوظ کرتے کہ کون سا ترجمہ ماہر فن کا ہے کہ اس کا معتبر جان کر اس پر عمل کیا جائے اور کون سا غیر ماہر کا ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے۔ اگرچہ وہ کیسا ہی رنگین کیوں نہ ہو کیونکہ مقصود تو عمل ہے اور اس میں رنگینی عبارت کو کوئی بھی دخل نہیں مگر ہم لوگ قرآن کو قصہ کہانی کی کتاب سمجھ کر دیکھتے ہیں۔ جب ہی تو رنگین ترجمہ کی قدر ہوتی ہے۔ اگر ترجموں کے مطالعہ سے مقصود عمل ہوتا تو رنگینی پر نظر نہ ہوتی بلکہ مقصود پر نظر ہوتی۔ اگر رنگین عبارت دیکھنے کا شوق ہے تو اس کیلئے ترجمہ قرآن کا کیوں انتخاب کیا جاتا ہے۔ عمدہ زبان تو قصہ چہار درویش کی ہے اس کا مطالعہ کر لیا کیجئے۔ ترجمہ قرآن کو خواہ مخواہ کیوں تکلیف دی۔ غرض صحیح معیار عمدہ ترجمہ قرآن کا یہ نہیں جو آج کل عوام کا مذاق ہو گیا بلکہ صحیح معیار وہ ہے جو میں نے بیان کیا کہ معتبر ماہر فن کا ترجمہ لیا جائے پھر اس کو کسی معتبر عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لیا جائے۔ بدوں اس کے ترجمہ دیکھنا کافی نہیں۔

اسی طرح ترجمہ سمجھنے کے لیے محض ادب دانی کافی نہیں آج کل لوگوں میں یہ بھی بڑی کوتاہی ہے کہ ان لوگوں کی بڑی قدر کرتے ہیں جو عربی میں تقریر و تحریر کر لیا کریں اور اس کو بڑا کمال سمجھتے ہیں مگر قرآن سمجھنے کے لیے محض ادب دانی کافی نہیں اور میں اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں کہ اگر قانون کی کتاب ایک شاعر سے پڑھی جائے جس کی زبان بہت عمدہ ہے مگر قانون سے اس کو مس نہیں اور ایک دوسرا شخص ہے جو زبان دانی میں حصہ کم رکھتا ہے مگر قانون سے پورا واقف ہے۔ اب اگر کتاب قانون کی کسی عبارت میں دونوں کا اختلاف ہو۔ شاعر کچھ مطلب بیان کرے اور قانون دان وکیل کچھ اور کہے۔ عقلاء زمانہ انصاف سے بتلائیں کہ اس صورت میں کس کا قول قابل توجہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ قانون دان وکیل کے سامنے زباندان شاعر کا قول ایک کوڑی کو بھی نہ پوچھا جائے گا' زبان آ جانے سے فن سہل نہیں ہو سکتا۔ (المراد ج ۱)

بدنظری کی وبا اور علاج

ایک شخص میرے پاس آئے جو بوڑھے ہو گئے تھے مگر نظر بد کے مرض میں مبتلا تھے۔ آج کل لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جوانی میں گناہ نہیں چھوٹتے تو بڑھاپے میں جا کر چھوٹ جائیں گے مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جو گناہ جوانی میں نہیں چھوٹا وہ بڑھاپے میں کبھی نہیں چھوٹے گا۔

درختے کہ اکنوں گرفت ست پائے　　بہ نیروئے شخصے برآید زجائے
اگر ہمچناں روزگارے ہلی　　بہ گر دونش از بیخ برنگلی

(وہ درخت جس نے ابھی جڑ پکڑی ہے ایک شخص کی طاقت سے اکھڑ سکتا ہے۔ اگر ایسے ہی وقت گزرتا گیا تو چرخی کی مدد سے بھی جڑ سے نہ نکالا جا سکے گا)

سو جو گناہ اب جوانی میں نہ چھوٹا حالانکہ ابھی اس کی جڑ کمزور ہے تو بڑھاپے میں کیا خاک چھوٹے گا جبکہ جڑیں مضبوط ہو جائیں گی اور چاروں طرف پھیل جائیں گی۔ نیز ایک بات تجربہ کی یہ ہے کہ ہمیشہ عفت جوان آدمی کی قوی ہوتی ہے کیونکہ جس طرح جوانی میں تقاضا زیادہ ہوتا ہے اس کے روکنے کی قوت بھی زیادہ ہوتی ہے اور بڑھاپے میں یاد رکھئے کہ تقاضا کم نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا مگر تقاضے میں کمی نہیں آتی اور اس کے تقاضے کو روکنے والی قوت کم ہو جاتی ہے تو اور بھی کچھ نہ ہو نظر بد میں تو وہ شخص مبتلا رہے گا ہی۔ خصوصاً جبکہ عورتیں اس کی نظر سے احتراز بھی نہیں کرتیں۔ چنانچہ بوڑھے آدمی سے پردہ بھی کم کرتی ہیں بہت سے بہت وہ فعل نہ کر سکے گا مگر میں کہہ چکا ہوں کہ مدار معصیت ارادہ پر ہے۔ جب ایک شخص نے معصیت کا پختہ ارادہ کر لیا اور پھر بوجہ ناکارہ ہونے کے اسے پورا نہ کر سکا تو گناہ اس کے نامہ اعمال میں لکھا گیا۔

غرض وہ بوڑھے شخص مجھ سے ملے کہ اس کی کوئی سہل تدبیر بتلاؤ کہ میں اس مرض سے نجات پاؤں۔ میں نے کہا کہ سہل کی قید سے تو یہ سلسلہ غیر متناہی چلے گا۔ آج آپ مرض کے ازالہ کی سہل تدبیر پوچھتے ہیں کل کو اس تدبیر کو سہل کرنے کے لیے اگر وہ سہل نہ معلوم ہوئی، دوسری تدبیر پوچھیں گے، اس میں کچھ دشواری پیش آئی تو پھر اس کی سہولت کے لیے اور تدبیر پوچھیں گے۔ اس طرح تو مرض کا علاج نہیں ہو سکتا، بس سہولت کی فکر نہ کیجئے۔ بجز ہمت کے اس کا کوئی علاج نہیں۔ ایک دفعہ پختہ عزم کر لیجئے کہ چاہے کتنی ہی تکلیف ہو ہرگز نگاہ اوپر کو نہ اٹھاؤں گا اور جو کبھی اٹھ جائے تو فوراً نیچی کر لیجئے۔ اس ترکیب سے ان شاء اللہ مرض زائل ہو جائے گا۔ اس کے بدوں زوال ممکن نہیں وہ کہنے لگا کہ میں چھوڑنے پر قادر ہی نہیں، ہمت کیسے کر سکتا ہوں؟ میں نے کہا کہ یہ آپ غلط کہتے ہیں۔ آپ یقیناً چھوڑنے پر قادر ہیں اور دلیل سے میں نے ان کو سمجھا دیا کہ آپ قادر ہیں، وہ دلیل یہ تھی کہ حق تعالیٰ شانہ کا ایک طرف تو یہ ارشاد ہے:

لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا. (البقرہ آیت نمبر ۲۸۶)

کہ حق تعالیٰ طاقت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے۔

دوسری طرف یہ ارشاد ہے: **قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ.** (النور۔ آیت نمبر ۳۰)

کہ مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہوں کو نیچے رکھیں اور شرم گاہوں کو محفوظ رکھیں۔

ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ نگاہ نیچی کرنے پر بندہ قادر ہے اس لیے کہ اس کے متعلق حق تعالیٰ کا حکم ہے اور ان کا کوئی حکم طاقت سے زیادہ نہیں ہوتا۔ میرے سامنے تو وہ اس دلیل میں تاویلیں نکالتے رہے مگر گھر جا کر جو انہوں نے اس میں غور کیا اور خط بھیجا کہ واقعی میں غلطی پر تھا' انسان ہر گناہ سے بچنے پر قادر ہے۔ البتہ پہلے پہل کلفت ضرور ہوتی ہے اس کے بعد یہ کلفت کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ پھر عادت ہوجاتی ہے۔ (المراد ج ۱۷)

دنیا و آخرت کا فرق

طالبین دنیا کے بارے میں پہلے یہ فرمایا گیا ہے۔ "**عَجَّلْنَا لَهٗ فِیْهَا مَانَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ**" کہ طالبین دنیا میں سے ہم جس کو چاہیں اور جس قدر چاہیں عطا کر دیتے ہیں۔ اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس کے مقابلہ میں طالبین آخرت کے لیے یہ فرمایا جاتا "**اعطیناہ مایشآء**" کہ ہم طالب آخرت کو جو کچھ وہ چاہے گا وہی دیں گے کیونکہ جب دنیا والوں کے لیے یہ فرمایا گیا کہ ان کو جو ہم چاہیں گے وہ دیں گے تو بظاہر اس کے مقابل طالبین آخرت کے لیے فضیلت پوری اس طرح معلوم ہوگی کہ ان کو ان کی طلب کے موافق سب کچھ دیا جائے مگر بخلاف اس کے اس آیت میں "**مایشآء**" نہیں فرمایا گیا بلکہ بجائے اس کے "**اُولٰٓئِکَ کَانَ سَعْیُهُمْ مَّشْکُوْرًا**" فرمایا گیا۔ تو بات یہ ہے کہ اگر اس جگہ حق تعالیٰ اہل آخرت کے بارے میں یہ ارشاد فرماتے کہ ان کو جو کچھ وہ چاہیں گے وہی دیا جائے گا تو اس میں درحقیقت کچھ زیادتی نہ ہوتی بلکہ وعدہ گھٹ جاتا کیونکہ نعمائے آخرت کی شان یہ ہے:

مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر.

"یعنی نہ ان کو آنکھوں نے دیکھا نہ کان نے سنا نہ کسی بشر کے قلب پر خیال گزرا۔"

تو بتلایئے کہ جب وہاں کی نعمتوں کا یہ حال ہے تو اگر یہ فرمایا جاتا کہ طالبین آخرت کو جو

کچھ وہ چاہیں گے' دیا جائے گا اس سے زیادتی ہوتی یا کمی؟ بہت کمی ہو جاتی کیونکہ وہاں کی نعمتوں کا ہم کو وہم بھی نہیں ہو سکتا۔ پھر ہماری خواہش کے موافق جو ہم کو ملتا وہ تو بہت ہی کم ہوتا۔ حق تعالیٰ شانہ کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ ہمارے واسطے انہوں نے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کا ہم کو خطرہ بھی نہیں ہو سکتا اور وہاں کا ثواب ہماری خواہش پر موقوف نہیں۔ فرمایا بلکہ اپنی رحمت سے' خواہش سے بہت زیادہ عطا فرمائیں گے۔ اسی کے بارے میں مولاناؒ کا ارشاد ہے:

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را　　کہ بیک گل مے خری گلزار را
نیم جاں بستاند وصد جاں دہد　　آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

(المرادج۱)

دنیا کی حقیقت

حدیث شریف میں ہے کہ دنیا گھر اس شخص کا ہے جس کا گھر نہ ہو' یعنی دنیا گھر بنانے کی جگہ نہیں ہے۔ یاد رکھو کہ گھر سے سب کو محبت ہوتی ہے اور محبت کی وجوہ مختلف ہیں۔ بعض کو تو خود گھر ہی سے بالذات تعلق ہوتا ہے' خاص کر عورتیں چونکہ رات دن اسی میں رہتی ہیں اس لیے ان کو گھر سے شدید تعلق ہوتا ہے۔ ہمارے بزرگوں میں ایک بی بی تھیں' بہت بوڑھی ہو گئی تھیں۔ جب کبھی ان سے عرض کیا جاتا کہ تم ہمارے یہاں آ جاؤ تو وہ یہی کہتی تھیں کہ نہیں بھائی میں تو یہی چاہتی ہوں کہ جس گھر میں ڈولی آئی تھی اسی گھر کھٹولی نکلے۔ (یعنی جس گھر میں دلہن بن کر آئی تھی اسی گھر سے جنازہ بھی نکلے) اور بعضوں کو گھر سے اس وجہ سے محبت ہوتی ہے کہ گھر میں آسائش بہت ہوتی ہے' کسی کا زور نہیں' دباؤ نہیں' چین سے پڑے ہیں۔ بعضوں کو اس لیے ہوتی ہے کہ گھر میں سامان ہے' راحت کی سب چیزیں مہیا ہیں۔ دوسری جگہ جاتے ہیں تو پریشانی ہوتی ہے' جب جی گھبرایا گھر چلے گئے' جب بھوک لگی گھر میں جو کچھ رکھا ہو خواہ باسی تازہ یا کوئی اور شے کھا لیا' یہ بات باہر کہاں! بلکہ وطن ہی میں اگر کہیں دعوت ہو جائے اور باسی روٹی کو جی چاہے تو ممکن نہیں کہ آپ باسی کھائیں' تازی ہی کھانا پڑے گی یا کسی خاص شے کو جی نہیں چاہتا' کبھی وہ شے کھائی نہیں اور دعوت میں وہی سامنے آئی' جھک مار کر وہی کھانا پڑے گی یا اس وقت بھوک نہیں' اپنے گھر تو نہ کھاتے لیکن یہاں کھانا ہی پڑے گا خواہ تھوڑا ہی کھائیں۔ یہ آسائش گھر ہی میں ہے۔ غرض اور

بلاد کے اعتبار سے اپنے وطن میں اور وطن کے اجزاء کے اعتبار سے وطن کے اس خاص حصہ میں جس کو اپنا گھر کہتے ہیں زیادہ راحت ملتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ گھر وہ شے ہے کہ جتنی چیزیں آدمی کو مرغوب ہوتی ہیں ان سب چیزوں کا میزان الکل لفظ گھر ہے۔ یعنی حق تعالیٰ نے اس کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں' جاہ و مال' اولاد' کھانے پینے' پہننے کی چیزیں اور تمام تفریح کا سامان وہ سب گھر کے اندر آ گئیں۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد "**الدنیا دار من لادار له**" ہزاروں دفتروں کا ایک دفتر ہے اگر دنیا کی تمام چیزوں کی مال کی' جاہ کی اور اولاد کی' کھانے پینے وغیرہ کی الگ الگ مذمت کی جاتی اور ان کو دل سے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو اتنا بلیغ اور مختصر مضمون نہ ہوتا جس قدر یہ ابلغ ہے کہ اس میں سب کچھ آ گیا اور پھر صرف دو لفظ۔ (الدنیا ج۱)

حدیث میں ہے:

یاعبداللّٰہ اذا اصبحت فلا تحدث نفسک بالمسا و اذا مسیت فلا تحدث نفسک بالصباح وعد نفسک من اھل القبور o

اے عبداللہ بن عمرو جب تم صبح کرو تو اپنے دل میں شام کا خیال نہ لاؤ اور جب شام کرو تو صبح کا خیال نہ لاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ بلاضرورت امائی محضہ نہ پکاؤ کہ شام کو یوں کریں گے تو صبح کو یوں کریں گے کیونکہ الحدیث یفسر بعضہ بعضا اور دوسری حدیث میں اس قید کی تصریح ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "**من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه**" اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لایعنی امور کے ترک کرنے کا حکم دیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ضروری اور مفید امور کا ترک ضروری نہیں تو اس میں ضروری خیالات کی بھی اجازت ہے۔ مثلاً کسی کے ذمہ کسی کا قرض ہو تو اس کی بابت تحدیث النفس جائز ہے بلکہ واجب ہے کہ اس کے ادا کی تدبیریں سوچے' یہ ممنوع نہیں بلکہ ممانعت اس کی ہے کہ شیخ چلی کی طرح خیالی منصوبے پکائے۔ (غریب الدنیا ج۱)

حب دنیا کا مرض

اگر غور کیا جائے تو حب دنیا کو ہر مرض سے تعلق ہے کیونکہ جس میں حب دنیا ہوگی اس کو

آخرت کا اہتمام ہی نہ ہوگا تو وہ شخص اعمال حسنہ کو انجام ہی نہ دے گا، نہ برائیوں سے بچے گا اور ایسے ہی برعکس جب آخرت کی فکر ہوتی ہے تو جرائم صادر نہیں ہوتے مثلاً جو لوگ جرائم کرتے ہیں وہ محض اس وجہ سے کہ آخرت کی فکر نہیں، اگر آخرت کے واقعات لوگوں کے پیش نظر ہوں تو جرائم کبھی صادر نہ ہوں مگر حب دنیا کے مراتب مختلف ہیں جیسے فکر آخرت کے مراتب مختلف ہیں۔ پس جن درجات میں تضاد ہے وہ جمع نہیں ہو سکتے اور جن میں تضاد نہیں وہ جمع ہو سکتے ہیں اور یہی راز ہے۔ اس کا کہ ایک حدیث میں تو فرمایا ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے

لایزنی الزانی حین یزنی وھو مومن ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مومن.

''زانی شخص اس حال میں کہ وہ مومن ہے زنا نہیں کرتا اور چور اس حال میں کہ مومن ہے چوری نہیں کرتا۔''

اور دوسری حدیث میں ہے کہ فرمایا رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے

من قال لاالہ الااللّٰہ دخل الجنة وان زنی وان سرق.

''جس نے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوا اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری کی۔''

(الاطمینان بالدنیا ج ۱)

دُنیا کی حقیقت

حدیث کے معنی ہیں میرے نزدیک **''الدنیا سجن المؤمن''** کے۔ لوگوں نے اس حدیث کے مختلف معنی کہے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ جیل خانہ تکلیف وغیرہ کی وجہ سے نہیں فرمایا کیونکہ بعض مومنین کو دنیا میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اس لیے فرمایا کہ جیل خانے میں کبھی جی نہیں لگا کرتا اگرچہ کیسا ہی عیش ہو تو مسلمان کی شان یہ ہے کہ دنیا میں اس کا جی نہ لگے۔ اگرچہ بظاہر اس میں کیسا ہی عیش و آرام ہو کیونکہ جی لگنے کی جگہ گھر ہے اور وہ گھر نہیں ہے۔ پھر جب جی نہ لگے گا تو کیوں ہوسیں ہوں گی اور کیوں سوچے گا کہ یوں ہو اور یہ ہو اور وہ ہو بلکہ اب یہ سوچے گا کہ دنیا تو پردیس ہے یہاں جس طرح سے بھی دن گزر جائیں ٹھیک ہے اور دنیا کی سوچ کے بجائے اب یہ ہوگا کہ آخرت کی سوچ ہوگی کہ اس کے لیے یہ سامان ہونا چاہیے اور یہ فکر ہونا چاہیے اپنے نفس کی اصلاح ہونی چاہیے اور یہ سوچے کہ اگر یہ سامان ہو گیا تو پھر یوں بہار ہوگی اور یوں عیش ہوگا ورنہ یوں مصیبت ہوگی یوں پریشانی ہوگی۔ (متاع الدنیا ج ۱)

غفلت سے احتراز

بعض اہل لطائف نے لکھا ہے کہ مولود کے کان میں جو اذان کہی جاتی ہے اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اس کو سنا رہے ہیں کہ اذان تکبیر ہوگئی ہے۔ اب جنازہ کی نماز کے منتظر رہو اور یہ بھی حکمت ہے کہ اذان و تکبیر میں اللہ کا نام ہے تو شروع ہی سے اس کے کان میں اللہ کا نام اس لیے لیا جاتا ہے تاکہ استعداد ایمان کی قوی ہو جائے اور شیطان اس سے دور ہو جائے اور دونوں حکمتوں میں گویا اشارہ ہے اس طرف کہ دنیا میں غافل ہو کر نہ رہنا مگر ہم لوگوں کی غفلت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ اس پر بھی تنبیہ نہیں ہے۔ (الباقر ج۱)

رخصت اور سہولت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ سہولت ہی کو اختیار فرمایا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ:

ماخیر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی امرین الااختار ایسر ھما. الخ

ترجمہ: ”جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دو کاموں میں سے کسی ایک کا اختیار دیا جاتا تو آپ دونوں میں سے آسان کو اختیار فرماتے۔“

لہٰذا اسی حدیث کے موافق ہم کو یہی عمل کرنا چاہیے کہ ایسے مواقع پر رخصت ہی کو اختیار کریں چنانچہ وضو بھی قربات مقصودہ سے نہیں بلکہ شرائط صلوٰۃ میں سے ہے لہٰذا اس کے بارے میں سہولت کو اختیار کرنا مناسب ہے دوسرے مقاصد میں بھی جس محل میں رخصت میں کوئی شرعی مصلحت ایسی ہو جو کہ عزیمت میں نہ ہو وہاں مشقت اور عزیمت اختیار نہیں کی جاتی بلکہ رخصت و سہولت کو ترجیح ہوتی ہے۔

اور جیسے وضو قربت مقصودہ نہیں اسی طرح جو کا کھانا بھی گو سنت نبویؐ تو ضرور ہے اور تعامل صحابہ بھی یقیناً ہے لیکن یہ قربات میں سے نہیں بلکہ عادات میں سے ہے اور وہ بھی ان لوگوں کے واسطے جو قوی المعدہ تھے تو اب جو لوگ اپنے اوپر یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ بے چھنے جو کھانے سے ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی پیٹ کو پکڑے پکڑے نہ پھریں گے، ان لوگوں کے واسطے جو کھانا مضائقہ نہیں بلکہ اولیٰ و انسب ہے اور نیت اتباع کے ساتھ باعث ثواب کثیر ہے۔ (الدنیا والآخرہ ج۱)

علم کی دو قسمیں

علوم کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا علم فی نفسہ بھی مقصود ہے اور دوسری قسم جن کا علم مقصود برائے اعمال ہے۔ ان دو قسموں میں سے ثانی قسم میں تو ہم اور عامہ اہل علم دونوں شریک ہیں کہ جس طرح ہم اس جگہ اعمال وعلوم دونوں کو مقصود قرار دیتے ہیں اسی طرح وہ بھی ہماری موافقت کرتے ہیں اور دونوں کو مقصود میں داخل کرتے ہیں۔ گو لنفسہ ولغیرہ کا فرق ہو۔ مثلاً طریقہ وضو کا علم حاصل کرنا کہ یہ خود مقصود بالذات نہیں بلکہ اس وجہ سے مقصود ہے کہ یہ طریقہ ادائے فرض کا جو شروط صلوٰۃ میں سے ہے لہٰذا صرف وضو کے طریقہ کا جان لینا اتفاقاً کافی نہ ہوگا بلکہ وضو کر کے جب نماز ادا کرلی جائے گی اس وقت مقصود کی تکمیل ہوگی یہ مسئلہ تو مجمع علیہ ومسلم ہے۔

رہی پہلی قسم علم کی جس کا علم فی نفسہ بھی مقصود ہے اس میں عامہ اہل علم صرف علوم ہی کو مقصود قرار دیتے ہیں اور ان کو اعمال کیلئے کسی درجہ میں مقصود نہیں سمجھتے جیسا کہ مسئلہ مبحوث عنہ سے واضح ہے اور ہم یہ کہتے ہیں کہ اس جگہ گو علوم مقصود اصلی اور مطلوب بالذات ہیں لیکن اعمال بھی مقصودیت میں شرکت رکھتے ہیں اور ان کی تعلیم اس لیے بھی کی گئی ہے تاکہ اعمال میں ان سے کام لیا جائے بغیر اس کی تکمیل مقصود نہیں ہوتی۔ (الدنیا ولآخرہ ج ۱)

عظمت وکیفیت وحی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زانو پر سر رکھے ہوئے لیٹے تھے کہ نزول وحی ہونا شروع ہوا۔ وہ صحابی فرماتے ہیں کہ اسی وقت ثقل سے یہ حالت تھی کہ قریب تھا کہ میرا زانو پھٹ جائے۔

نیز ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار تھے کہ آپؐ پر نزول وحی ہوا۔ اونٹنی اس شدت کو برداشت نہ کرسکی اور بیٹھ گئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ باوجود یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ممتاز تحمل عطا فرمایا گیا تھا مگر پھر بھی آپؐ پر اس قدر شدید اثر ہوتا تھا مگر ہم جو آج اس کلام مجید کو پڑھتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہ شدت ہم کو نہیں ہوتی اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اول اس کے نزول میں جبرائیل علیہ السلام وارد ہوئے اور اس میں خفت ہوئی۔ اس کے بعد آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا نزول ہوا تو اور خفت ہوئی۔ اب ان واسطوں کے بعد ہم اس کے متحمل ہو سکے کہ ہم اس کو پڑھ سکیں اور یاد کر سکیں۔ باقی اس کی اصل عظمت کہیں نہیں گئی۔ ان دونوں حضرات نے اس کی صولت کو برداشت کر لیا۔ اب ہمارے واسطے سہل ہو کر ہم تک پہنچا ہے جیسے بچے سے بوجھ اٹھوانا ہو تو ماں باپ سہارا لگا دیتے ہیں تو بچہ اس کو اٹھا لیتا ہے لیکن اب تک بھی اگر موانع مرتفع ہوں تو اس تجلی کا اتنا بڑا اثر باقی ہے کہ بعض وقت جب نہایت خشوع و خضوع سے تلاوت کی جاتی ہے تو ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے حتیٰ کہ بعض اولیائے کرام تو ان آیات کلام مجید کو سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ اس جہان سے رحلت فرما گئے اور ان حضرات کے قلوب تو اعلیٰ درجہ کے نورانی تھے جو اس سے متاثر ہوئے مگر ہم سیاہ کاروں پر بھی اتنا اثر تو ضرور ہے کہ بسا اوقات جب قرآن شریف کو قرآن کی طرح پڑھا جاتا ہے تو ایک عجیب کیفیت اور رقت طاری ہو جاتی ہے۔ (الدنیا والآخرہ ج ۱)

عہد الست

ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ ہم کو عہد الست کا لیا جانا خوب یاد ہے جس وقت اللہ تعالیٰ نے الست بربکم فرمایا ہے اس وقت تمام روحیں سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ تک رہی تھیں کہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم جواب دیں تو پھر ہم بھی جواب دیں۔ چنانچہ سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلیٰ اس کے بعد سب نے کہا بلیٰ۔

ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ حدیث میں جو وارد ہے:

الارواح جنود بجندة فما تعارف منها اتلف وما تناكر منها اختلف.

کہ روحیں لشکروں کی طرح جمع کی گئی تھیں جن میں باہم وہاں تعارف ہو گیا ان میں یہاں بھی الفت ہو گئی اور جن میں وہاں تعارف نہیں ہوا ان میں اختلاف ہو گیا۔ تو وہ بزرگ کہتے ہیں کہ اس تعارف و تناکر کی صورت یہ ہوئی کہ جب ارواح جمع کی گئی ہیں تو بعض رو در رو تھے ان میں تو طرفین سے الفت ہو گئی اور بعض رو در پشت تھے کہ ایک کا منہ دوسرے کی طرف اور اس کی پشت دوسرے کی طرف۔ ان میں ایک تو دوسرے سے الفت ہو گئی جس کا منہ دوسرے کی طرف تھا اور دوسرے کو اس سے نفرت ہوئی جس کی پشت اس کی طرف تھی اور بعض پشت در پشت تھے کہ اس کی پشت اس کی طرف اس کی پشت اس کی طرف۔ ان

دونوں میں دنیا میں بھی نفرت ہوئی اور اپنے اصحاب سے فرمایا کرتے تھے کہ فلاں میری داہنی طرف تھا فلاں بائیں طرف تھا وہکذا۔ (ھم الآخرۃ ج ۱)

دار الطلبہ کے فضائل

اس دار الطلبہ کے باب میں حدیث میں ہے: **''او بیتاً لابن السبیل بناہ''** یعنی اگر چہ وہ ابن السبیل فاسق ہو پھر بھی اس کے لیے گھر بنانے میں ثواب ہوگا چہ جائیکہ وہ طلبہ علم ہوں جو کہ اضیاف ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور پھر یہ بھی نہیں کہ یونہی سکونت رکھیں بلکہ قال اللہ اور قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا شغل رکھیں کہ اس کے برابر کوئی شغل ہی نہیں۔ (ابن ماجہ)

درس عبرت

اگر تم مسلمان ہو تو ان آیات کو دیکھ کر جو کفار کی شان میں ان کے فعل کی وجہ سے ہیں عبرت حاصل کرو اور دیکھو کہ جو خصائل کفار کے تھے وہ آج ہم میں پائے جاتے ہیں۔ افسوس! کس قدر بری بات ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی شریف کو چمار کہہ دیا جائے اس کو بہت برا معلوم ہوگا لیکن اگر چمار کو چمار کہہ دیا جائے تو اس کو خیال بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح کفار کو کافر کہہ کر خطاب کرنے سے جتنا انہیں خیال ہو سکتا ہے اس سے زیادہ ہمیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ

من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر.

میں یہ بھی بات سمجھنا چاہیے کہ تاویل بہ نسبت عدم تاویل کے اس خاص اعتبار سے زیادہ موجب ہے تغلیظ کو اور اس سے زجر و توبیخ اور بڑھ گئی ہے اور اشد ادکم نہیں ہوا۔ (تذکیر الاخرۃ ج ۱)

آپ نے کسی عاقل کو انجن یا تنور کی آگ سے احتیاط کی تعلیم کرتے ہوئے نہ دیکھا ہوگا کیونکہ اس تعلیم کی ضرورت نہیں اس سے تو ہر شخص خود ہی بچتا ہے۔ ہاں ڈبیہ اور چنگاری سے احتیاط کی تاکید کرتے ہوئے اپنے بڑوں کو بہت دیکھا ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مضرت کا ادنیٰ درجہ زیادہ قابل اہتمام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجنبی لوگوں سے خلوت کو منع کرنے میں زیادہ سخت الفاظ نہیں فرمائے اور نامحرم اقارب سے خلوت کے بارے میں ارشاد ہے: **''الحمو االموت''**، یعنی کسی نے

سوال کیا تھا کہ یارسول اللہ! عورت اگر اپنے دیور کے ساتھ تنہائی میں بیٹھے تو کیسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ تو موت ہے۔ اس فرق کی وجہ یہی ہے کہ اس کو لوگ خفیف سمجھتے ہیں اور خفیف سمجھ کر اس سے احتیاط نہیں کرتے اور تربیت کا اصول یہ ہے کہ لوگ جس مضرت کو خفیف سمجھیں، مربی و حکیم اس سے زیادہ ڈرایا کرتا ہے۔ (ترجیح الاخرۃ ج۱)

حدیث میں ہے کہ گناہ سے دل پر زنگ لگ جاتا ہے جو بار بار گناہ کرنے سے بڑھتا رہتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

ہر گناہ زنگے ست برمرأۃ دل   دل شود زیں زنگہا خوار و خجل
چوں زیادت گشت دل را تیرگی   نفس دوں رابیش گردد خیرگی

”ہر گناہ دل کے آئینہ پر ایک زنگ کا داغ ہے جس کی وجہ سے دل ذلیل و شرمندہ ہو جاتا ہے اور جب دل کی تاریکی زنگ کی زیادتی سے بڑھ جاتی ہے تو کمینے نفس کی حیرانگی بڑھ جاتی ہے۔“ (تذکیر الاخرۃ ج۱)

ایک مرتبہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی آج سے سنت کے موافق جو کی روٹی کھایا کریں گے۔ چنانچہ جو کا آٹا پسوایا گیا اور اس کو چھلنی میں نہیں چھانا گیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آٹے میں پھونک مار دیا کرتے تھے، جتنی بھوسی پھونک مارنے سے اڑ گئی وہ اڑ گئی، باقی کو گوندھ لیتے تھے۔ خواجہ صاحب نے بھی ایسا ہی کیا، اب جو وہ روٹی کھائی گئی تو سب کے پیٹ میں درد ہو گیا۔

اب ان کا ادب دیکھئے کہ یہ نہیں فرمایا کہ سنت کے اتباع سے ایسا ہوا بلکہ یہ فرمایا بھائی ہماری غلطی تھی جو ہم نے برابری کا دعویٰ کیا اور اپنے کو اس سنت کے قابل سمجھا، ہم اس کے قابل نہ تھے اس لیے ہم کو تکلیف ہو گئی۔ بس اس سنت پر وہی عمل کر سکتا ہے جو اس درجہ کا ہو، ہم اس درجہ کے نہیں ہیں۔ سبحان اللہ! ادب اسے کہتے ہیں۔ (تذکیر الاخرۃ ج۱)

لوگ دیوان حافظ کو معمولی کتاب سمجھتے ہیں حالانکہ اس میں تمام تر سلوک ہی سلوک بھرا ہوا ہے اور یہ محض اعتقادی بات نہیں ورنہ تم کسی اور کتاب سے تو اتنے مسائل تصوف سلوک کے نکال دو جو واقع میں تصوف کی کتاب نہ ہو۔ بات یہ ہے کہ مضمون نکلتا اسی جگہ سے ہے جہاں پہلے سے ہوتا ہے۔ آخر دوسرے دیوان بھی تو ایسے موجود ہیں جن میں دیوان حافظ کا اتباع کیا گیا ہے مگر ان میں سے اتنے مسائل نہیں نکل سکتے کیونکہ وہاں پہلے ہی سے کچھ نہیں۔ (تذکیر الاخرۃ ج۱)

مردہ کو چیزوں کا ثواب پہنچتا ہے

بعض لوگ ہر موسم پر موسم کی چیزیں اپنے عزیزوں کے لیے خیرات کیا کرتے ہیں۔ خاص کر وہ چیزیں جن کو مرنے والے کو رغبت تھی۔ اس میں پڑھے لکھے بھی مبتلا ہیں اور وہ بہت دور پہنچے۔ انہوں نے اس عمل کے لیے "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" (ال عمران آیت نمبر ۹۲)

سعادت ونحوست کی حقیقت

سعادت کی حقیقت لغت میں نیک بختی ہے جس کے معنی ہیں خوش قسمتی۔ مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اچھے نصیب والے ہیں وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے اور اس حقیقت سے یہ نہ سمجھا جائے کہ دخول جنت میں عمل کو دخل نہیں بلکہ جس کا نصیب اچھا ہے جس کی تقدیر بھلی ہے وہی جنت میں جائے گا۔ سو یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جنت میں جانے کے لیے عمل کی ضرورت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن وحدیث دوقومی کی تاکید اور گناہوں پر وعید کیوں ہوتی؟ کیا یہ تاکید و وعید بیکار ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ جس کے نصیب اچھے ہیں جس کی تقدیر بھلی ہے اس کے متعلق وہاں یہی لکھا جاتا ہے کہ فلاں شخص چونکہ عمل نیک کرے گا اس لیے جنت میں جائے گا۔ پس صاحب نصیب وہی ہے جو نیک عمل کرتا ہے اور بدنصیب وہ ہے جو برے عمل کرتا ہے۔ نصیب کا اچھا ہونا تقدیر کا بھلا ہونا عمل صالح پر موقوف ہے۔ قانون اور قاعدہ یہی ہے۔

یوں خلاف قاعدہ کسی پر فضل ہو جائے وہ اور بات ہے مگر وہ بھی صرف ہمارے نزدیک خلاف قاعدہ ہوگا کیونکہ ہم کو اس کے عمل کی خبر نہیں، باقی اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ بھی خلاف قاعدہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ہر شخص کی پوری خبر ہے تو جس کو باوجود بدعملی کے بدون عذاب کے جنت میں بھیجا جائے گا اس کے پاس کوئی عمل صالح اتنا بڑا ہوگا جو تمام گناہوں پر غالب آ گیا ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ کو تھی ہم کو خبر نہ تھی۔

سعادت کے دوسرے معنی اور بھی ہیں جو نحوست کے مقابل ہیں یعنی بابرکت ہونا۔ اس کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ بابرکت ہیں وہ جنت میں جائیں گے اور جو منحوس ہیں وہ جہنم میں جائیں گے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ حقیقی منحوس کون ہیں؟ صرف وہ ہیں جو کہ جہنم میں جائیں گے اور یہ جو مشہور ہے نحوست کہ بعض لوگ قمری کو یا اُلو کو یا کیلے

کے درخت کو منحوس سمجھتے ہیں یا بعض ایام کو منحوس سمجھتے ہیں یہ کوئی چیز نہیں۔ میرٹھ میں ایک بنیا منحوس گھوڑوں کو خریدتا تھا اور بہت نفع کماتا تھا۔ اس کے حق میں وہی بابرکت تھے، بعض لوگوں کو قرآن کی اس آیت ''فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ'' (القمر آیت نمبر ۱۹) ''تو ہم نے ان پر ایک ہوائے تند ایسے دنوں میں بھیجی جو (ان کے حق میں) منحوس تھی۔'' سے شبہ ہوگیا ہے کہ بعض ایام بھی منحوس ہوتے ہیں مگر انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ایام نحسات کی تفسیر دوسری آیات میں ''سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ'' وارد ہوئی ہے تو اس کو ملا کر یہ لازم آئے گا کہ کوئی دن بھی مسعود نہیں بلکہ سب ایام منحوس ہی ہیں اور اس کا کوئی قابل نہیں۔ لہٰذا اس سے استدلال صحیح نہیں ہوسکتا۔ دراصل ایام میں سعد و نحس کا مسئلہ اہل نجوم کا اختراع ہے اور شیعہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے بھی اس کو منسوب کیا ہے مگر وہ روایت موضوع ہے۔ شریعت میں بعض ایام متبرک تو ہیں مگر منحوس کوئی دن نہیں۔ رہا یہ سوال کہ پھر ایام نحسات کے کیا معنی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے معنی نحسات علیہم ہیں یعنی قوم عاد کے حق میں وہ ایام منحوس تھے کیونکہ ان پر ان ایام میں عذاب آیا تھا اور وہ عذاب مسبب تھا کفر و معصیت سے۔ پس معلوم ہوا کہ اصل نحوست کی چیز معصیت ہے۔ بہرحال خود اس آیت سے معلوم ہوا کہ سعادت نام ہے طاعت کا اور نحوست نام ہے معصیت کا۔ اب بتلاؤ کہ منحوس ہم ہیں یا الو اور قمری اور کیلا۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں معصیت سے مبرا ہیں تو یہ کیسی غلطی ہے کہ ہم اپنی نحوست کو دوسری چیزوں پر ٹالتے ہیں۔ بس ہماری وہ حالت ہے:

حملہ برخود میکنی اے سادہ مرد
ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

''بے وقوف اپنے اوپر حملہ کرتا ہے جب کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا۔'' (دار المسعود)

اہل باطل کی کتب سے اجتناب

عالم حقانی وہی ہے جو تمہاری مرضی کے موافق فتویٰ نہ دے کیونکہ جو مرضی کے موافق فتویٰ دیا کرے، اس میں غرض کا قوی شبہ ہے کہ وہ عوام کو اپنے سے مانوس کرنا چاہتا ہے۔ اور جو شخص کسی کی مرضی کی رعایت نہ کرے سمجھ لو کہ وہ صحیح احکام بیان کرتا ہے۔ طبیب اگر تلخ دوا دے تو بتلاؤ اس میں اس کی کیا مصلحت ہے، یقیناً کچھ نہیں بلکہ سراسر مریض کی مصلحت

ہے۔ پس جو علماء ایسی باتوں سے منع کرتے ہیں۔ جن میں لوگوں کو مزہ آتا ہے سمجھ لو کہ وہ محض خیر خواہی سے منع کرتے ہیں کیونکہ وہ ان باتوں میں زہریلا اثر مشاہدہ کرتے ہیں۔ واللہ! اہل باطل کی کتابوں کا بعض علماء پر بھی برا اثر ہو جاتا ہے تو عوام کی تو ان کے مطالعہ سے کیا حالت ہوگی۔ لہٰذا عوام کو کوئی کتاب بدون مشورہ علماء کے ہرگز نہ دیکھنا چاہیے۔ (الفاظ قرآن ج ۲)

عوام الناس کا درجہ علم

ایک نو تعلیم یافتہ نے مجھ سے ایک باریک مسئلہ پوچھا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے ان کو میرا یہ جواب بہت ناگوار ہوا۔ کہنے لگے اس کی کیا وجہ کہ میں اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ میں نے کہا وجہ یہ ہے کہ اس کے سمجھنے کے لئے جن مقدمات ومبادی کے جاننے کی ضرورت ہے۔ آپ نے ان کو نہیں جانا اور جس بات کا علم مقدمات ومبادی پر موقوف ہو۔ اس کو بدون ان کے جانے ہوئے سمجھنا دشوار ہے اور اگر آپ اس کا دعویٰ کریں کہ بدون مقدمات ومبادی کے بھی میں سمجھ سکتا ہوں تو پہلے آپ میرے سامنے ایک گھس کھدے کو جس نے اقلیدس کے مقدمات واصول موضوعہ معلوم نہیں کئے اقلیدس کی کوئی شکل سمجھائیں اور میرے سامنے اس سے تقریر بھی کروائیں تو میں بھی اس مسئلہ کا جواب بدون مقدمات ومبادی کے آپ سمجھا دوں گا۔ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا خاموش ہو گئے۔

ایک شخص سے میں نے ایسے ہی موقع میں یہ بھی کہا تھا کہ شاید آپ کے دل میں وسوسہ آیا ہو کہ علماء کے پاس میرے سوال کا جواب نہیں اس لئے بہانہ کر کے ٹال دیا۔ تو اب آپ یہ کیجئے کہ سامنے درس گاہ میں جو مدرس پڑھا رہے ہیں ان سے اپنا سوال بیان کر دیجئے اور کہئے کہ وہ اس کا جواب مجھ سے دریافت کریں۔ میں ان کے سامنے جواب بیان کر دوں گا کیونکہ وہ اس کے مقدمات ومبادی سے واقف ہیں۔ اس سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ علماء کے پاس آپ کے سوال کا جواب ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ آپ اس کا جواب کو نہیں سمجھ سکتے کیونکہ آپ اس کے مقدمات سے جاہل ہیں اور جس کو مقدمات کا علم ہے وہ سمجھ جائے گا۔ چنانچہ میں آپ کے سامنے اس مدرس سے بھی جواب کی تقریر کرا دوں گا۔ اور اگر وہ ایسا کرتے تو بہت جلدی اقرار کر لیتے کہ واقعی میں اس سوال کا اہل نہ تھا۔ (الفاظ قرآن ج ۲)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی حقیقت سمجھ لو کہ اگر کھانا کھاتے ہوئے لقمہ زمین پر گر جائے تو اس کو اٹھا کر صاف کر کے کھا لو کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ تو ان کی نعمت کی ان کے سامنے بے قدری کرنا بڑی بے حیائی ہے۔ (الفاظ قرآن ج ۲)

ایک شبہ کا عملی جواب

ہمارے اطراف میں ایک بزرگ مولانا ظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں جو تقویٰ کے اندر ہمارے اکابر میں مسلم و ممتاز تھے۔ وہ ایک بار موضع گڑھی پختہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں کے رئیس نے مولانا سے سوال کیا کہ حدیث میں آیا ہے۔

لايومن احدكم حتى يكون الله ورسوله احب اليه من نفسه وماله وولده اجمعين.

کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہ ہوگا جب تک اللہ و رسولؐ اس کی جان و مال و اولاد وغیرہ سب سے زیادہ اس کو محبوب نہ ہو جائیں۔

مگر میں دیکھتا ہوں کہ مجھے اپنے والد صاحب سے محبت زیادہ ہے مولانا نے اس وقت تو اس کا ایک مناسب جواب دے دیا۔ پھر یہ چاہا کہ ان کے اس شبہ کو عملی طور پر دفع کر دیا جائے تو زیادہ اطمینان کا باعث ہوگا۔ چنانچہ آپ نے عملی طور اس کا جواب اس طرح دیا کہ تھوڑی دیر میں باتوں باتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ شروع کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ایسا ہے جس میں ہر مسلمان کو لطف آتا ہے۔ سب لوگ شوق سے سننے لگے۔ اور وہ رئیس بھی بہت مزے لے لے کر سن رہے تھے۔ جب مولانا نے دیکھا کہ رئیس صاحب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں بہت مزہ آ رہا ہے۔ تو درمیان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر قطع کر کے فرمانے لگے کہ اچھا خان صاحب اس ذکر کو تو رہنے دیجئے۔ اب میں کچھ آپ کے والد ماجد کے کمالات و مناقب بیان کرتا ہوں کہ وہ بھی بڑے اچھے آدمی تھے۔ وہ رئیس بولے حضرت توبہ توبہ یہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں میرے والد صاحب کا تذکرہ کہاں سے ٹھونس دیا۔ نہیں نہیں! آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا تذکرہ کیجئے۔ میرے والد کے کمالات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت! جو آپ درمیان میں خواہ مخواہ ان کا ذکر کرنے لگے۔ میرے قلب کو اس سے بہت گرانی

ہوئی۔ مولانا نے ہنس کر فرمایا، کیوں خان صاحب! تم تو یہ کہتے تھے کہ مجھے اپنے والد کے ساتھ محبت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں والد صاحب کا تذکرہ گراں کیوں ہوا؟ خان صاحب سمجھ گئے کہ مولانا نے میرے شبہ کا عملی جواب دیا ہے۔ کہنے لگے، مولانا جزاک اللہ! اب میرا شبہ جاتا رہا اور معلوم ہوگیا کہ الحمدللہ! مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسی محبت ہے کہ والد کی محبت کو اس سے کچھ بھی نسبت نہیں۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی   مرا با جان جاں ہمراز کردی

تو صاحبو! موازنہ کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ واقعی اللہ و رسولؐ کے برابر مسلمان کو کسی سے محبت نہیں اور موازنہ ہوتا ہے کسی محرک کے پائے جانے پر۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک شخص تمہارے ماں باپ کو گالی دے اور ایک شخص اللہ و رسولؐ کی شان میں (معاذ اللہ) گستاخی کرے تو بتاؤ تم کو کس پر غصہ زیادہ آئیگا۔ یقیناً جس کے اللہ و رسولؐ کی شان میں گستاخی کی ہے اس پر زیادہ غصہ آئے گا اور تم آپے سے باہر ہوکر اس کی زبان نکالنے پر آمادہ ہو جاؤ گے۔ جب ہر مسلمان کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنی ذلت اور ماں باپ کی ذلت کو گوارا کرسکتا ہے۔ مگر اللہ و رسولؐ کی شان میں ذرا سی گستاخی کا تحمل نہیں کرسکتا، تو اب مطمئن رہو کہ بحمداللہ تم کو طبعی محبت بھی اللہ و رسولؐ سے ہی زیادہ ہے مگر اس کا ظہور کسی محرک کے پائے جانے پر ہوتا ہے اور جب آپ کو اللہ و رسولؐ سے محبت زیادہ ہے تو اب اس کے کیا معنی کہ بدون سمجھے قرآن پڑھنے سے کیا فائدہ! (الفاظ قرآن ج ۲)

حرمت کا مدار

چنانچہ اس مسئلہ کو قرآن شریف میں بہت صاف طور پر حل کر دیا گیا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما

لوگ آپ سے شراب اور جوئے کی بابت سوال کرتے ہیں کہ یہ حلال ہیں یا حرام۔ آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں ایک گناہ (ہے مگر وہ) بڑا (گناہ) ہے اور لوگوں کے لئے منافع متعدد ہیں۔ سبحان اللہ! کیا پاکیزہ طرز کا جواب ہے۔ یعنی لوگوں کو شراب اور جوئے کی حرمت میں یہ وسوسہ ہوسکتا تھا کہ ان میں منافع دنیویہ بہت ہیں اس لئے ان کو حرام نہ کرنا چاہیے تو حق تعالیٰ اس شبہ کے اصل سے انکار نہیں فرماتے بلکہ اس کو تسلیم فرماتے ہیں کہ واقعی ان میں لوگوں

کے لئے نفع بھی ہے۔ اورایک ہی نفع نہیں بلکہ ہم صیغہ واحد کی بجائے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں کہ ان میں بہت سے منافع ہیں مگر بات یہ ہے کہ ان میں ایک گناہ بھی ہے۔

اس جگہ یہ بات قابل غور ہے کہ حق تعالیٰ نے منفعت کے بیان میں تو جمع کا صیغہ اختیار فرمایا یعنی منافع للناس اور مضرت کے بیان میں صیغہ واحد لایا گیا یعنی اثم۔ اگر یہ کلام بشر کا ہوتا تو مقابلہ کے لئے یہاں بھی جمع کا صیغہ اثام ہوتا۔ مگر حق تعالیٰ نے اس جگہ صیغہ واحد ہی اختیار فرمایا۔ جس سے اس حقیقت پر متنبہ فرمانا منظور ہے۔ اگر کسی چیز میں ہزاروں منفعتیں ہوں مگر اس میں ایک گناہ بھی ہو یعنی ادنیٰ شائبہ ناراضی حق کا ہو تو وہ ہزاروں منفعتیں ایک گناہ کے سامنے ہیچ ہیں۔

کیونکہ جس طرح خدا کی رضا خواہ ذرا سی ہو بڑی دولت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

رضوان من الله اكبر ۔ اسی طرح خدا کی ناراضی بھی بڑی وبال کی چیز ہے خواہ اس ناراضی کا سبب ایک ہی گناہ کیوں نہ ہو۔ اسی لئے اس جگہ اثم بصیغہ واحد لایا گیا مگر اس کو کبیر کے ساتھ موصوف کردیا گیا ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ شراب اور جوئے میں منافع تو بہت ہیں مگر ایک گناہ بھی ہے اور وہ ایک ہی گناہ اتنا بڑا ہے جس نے ان سب منافع کو گاؤ خورد کردیا ہے۔ اس لئے آگے منافع کا لفظ اختیار نہیں کیا گیا بلکہ نفع کا لفظ اختیار فرمایا۔ **واثمهما اكبر من نفعهما**

کہ ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بہت بڑا ہے۔ یہاں صیغہ واحد اختیار کرنے کی وجہ یہی ہے کہ پہلے کلام سے یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ ان منافع کے مقابلہ میں ایک گناہ بھی ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ اگر ایک من مٹھائی میں تولہ بھر زہر ملا ہوا ہو تو وہ ساری مٹھائی اس ایک تولہ زہر کی وجہ سے خاک میں مل جاتی ہے۔ اسی طرح جب وہ منافع ایک گناہ کی وجہ سے خاک میں مل گئے تو اب وہ اس قابل نہیں رہے کہ ان کو جمع کے صیغہ سے تعبیر کیا جائے۔ اس لئے فرماتے ہیں: **واثمهما اكبر من نفعهما**

اس آیت نے فیصلہ کردیا کہ کسی چیز کے حرام ہونے اور گناہ ہونے کا مدار دنیاو نقصان پر نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھے ہوئے ہیں اور بعض دفعہ زبان سے بھی کہہ دیتے ہیں کہ اس کام میں کیا حرج ہے۔ (تعیم التعلیم ج ۲)

ایک حدیث کی وضاحت

ایک معقولی صاحب کی حکایت ہے کہ انہوں نے حدیث پڑھی نہ تھی مگر پڑھانے کو تیار ہو گئے ۔ ایک حدیث میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا قصہ آیا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر اطلاع کئے نکاح کر لیا تھا ۔ جب وہ شادی سے اگلے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان پر زردی کا اثر دیکھا ۔ یہ دلہن کے زعفرانی کپڑوں کا نشان لگ گیا تھا ۔ فرمایا مهیم هذه الصفرة ۔ انہوں نے کہا، تزوجت یارسول اللہ ؐ یعنی میں نے شادی کر لی ہے ۔ آپ ؐ نے فرمایا اولم ولو بشاة ولیمہ کرو اگرچہ ایک ہی بکری کا ولیمہ ہو یہ تو حدیث تھی ۔ کسی طالب علم نے سوال کیا کہ یہ زردی کیسی تھی؟

مدرس صاحب نے حدیث پڑھی تو تھی نہیں جو اس کی حقیقت سمجھتے ۔ آپ نے اجتہاد کیا کہنے لگے کہ بات یہ ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف جوان آدمی تھے ۔ ایک زمانہ سے رکے ہوئے تھے ۔ جب شادی ہوئی تو انہوں نے مقاربت میں کثرت کی اس لئے چہرہ پر زردی آ گئی ۔ ظالم نے کیا حدیث کا ناس مارا ہے ۔ آپ نے رای علیه اثر الصفرة کے یہ معنی سمجھے کہ چہرہ زرد ہو گیا تھا ۔ لاحول ولا قوۃ!

طالب علم بے چارہ یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا ۔ مگر اس کے دل کو یہ بات نہ لگی ۔ اس نے ایک دوسرے عالم سے اس کا مطلب پوچھا انہوں نے صحیح مطلب بیان کر دیا کہ شادی کے دن دلہن کے کپڑوں کو خوشبو اور عطر لگایا جاتا ہے ۔ عرب میں جو خوشبو اس وقت استعمال کی جاتی تھی اس میں زعفران وغیرہ پڑتی تھی ۔ دلہن کے پاس جانے سے وہ رنگ عبدالرحمٰن بن عوف کے کپڑوں پر بھی لگ گیا چونکہ اس خوشبو کا استعمال مرد نہیں کرتے تھے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو گیا کہ یہ رنگ دلہن کی خوشبو کا ہے ۔ اس حقیقت کے معلوم ہو جانے پر طالب علم کا اطمینان ہو گیا ۔

علماء کی کوتاہی

اس غلطی کا منشاء زیادہ تر علماء کی کوتاہی ہے کہ انہوں نے کبھی صاف صاف یہ نہیں کہا کہ اردو میں علم دین پڑھ لینے سے بھی وہ فضائل حاصل ہو سکتے ہیں جو احادیث و قرآن میں علم کے لئے وارد ہیں حالانکہ حدیث و قرآن میں کہیں عربی کی تخصیص نہیں ۔ چنانچہ اس آیت سے

بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم مضر وہ ہے جو آخرت میں کام نہ آئے اور نافع وہ ہے جو آخرت میں کام آئے۔ اس میں کہیں یہ قید نہیں کہ وہ عربی میں ہونا چاہیے۔ مگر شاید علماء نے یہ بات صاف صاف اس لئے نہیں کہی کہ ان کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر ہم یہ کہہ دیں گے کہ اردو میں مسائل جان لینے سے بھی علم کی یہ فضیلتیں حاصل ہو سکتی ہیں تو پھر ہماری قدر نہ ہوگی۔ پھر تو سارے ہی عالم ہو جائیں گے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں بھی علماء کو نقصان ہوا بلکہ دو نقصان ہوئے ایک عوام کو ایک علماء کو۔ عوام کو تو یہ نقصان ہوا کہ انہوں نے جب علم کو عربی کے ساتھ مخصوص سمجھا اور عربی پڑھنے کی سب کو فرصت یا ہمت نہ ہوئی اور اردو میں پڑھنے کو وہ علم ہی نہ سمجھے تو مسائل شریعت سے بالکل بے خبر رہ گئے اور علم ہی سے محروم ہو گئے۔ علماء کا یہ ضرر ہوا کہ جب عوام علم سے بالکل محروم ہو گئے تو وہ علماء کی قدر و منزلت سے بھی اندھے ہو گئے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ ہر چیز کی قدر وہی کر سکتا ہے جس کو کچھ تو اس سے مناسبت ہو۔ (تعمیم التعلیم ج ۲)

رحمت خداوندی

مایفعل الله بعذابکم ان شکرتم وآمنتم وکان الله شاکرا علیما

یعنی اگر تم خدا کی نعمتوں کا شکر کرو جس کی تفسیر یہ ہے کہ ایمان لے آؤ۔ یہ واؤ عطف تفسیری کے لئے ہے تو حق تعالیٰ تم کو عذاب کر کے کیا کریں گے۔ یعنی تمہارے عذاب کرنے میں خدا کا کون سا نفع ہے اور حق تعالیٰ بڑے قدردان ہیں۔ جاننے والے ہیں ان کو سب خبر ہے کہ کون ایماندار ہے اور کون نہیں اور وہ ہر مسلمان کے ایمان کی قدر فرمائیں گے۔

اس آیت میں کیسی بلاغت ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ اگر تم ایمان لے آؤ تو ہم تم کو عذاب نہ کریں گے بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں ہم تم کو عذاب کر کے کیا کریں گے۔ اس عنوان میں جس قدر بلاغت ہے اہل لسان و اہل ذوق اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ واقعی حق تعالیٰ کا ہمارے عذاب میں کیا نفع ہے۔ وہ تو ہر وقت بخشنے کے لئے تیار ہیں۔ کوئی اپنے کو بخشوانا بھی چاہے۔ (تعمیم التعلیم ج ۲)

علم وفقہ کی عظمت

حقیقت علم یہی ہے جو تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے اور یہی ہے وہ فقہ جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

فقیه واحد اشد علی الشیطان من الف عابد.

کہ ایک فقیہ شیطان پر ہزاروں عابدوں سے زیادہ گراں ہے اس سے درسی فقہ مراد نہیں۔ کیونکہ محض کتابیں پڑھنے سے شیطان کی چالیں سمجھ میں نہیں آتیں بلکہ وہ معرفت ہے جو تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔ جس سے عارف کو دین کی سمجھ بوجھ ایسی کامل ہو جاتی ہے کہ شیطان کے تمام تار و پود کو توڑ دیتا ہے۔ شیطان بعض دفعہ دنیا کو دین کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ عارف اس دھوکا کو سمجھ کر لوگوں پر ظاہر کر دیتا ہے جس سے لوگ دھوکا سے بچ جاتے ہیں اس لیے وہ شیطان پر گراں ہے۔

اسی علم کی فضیلت میں یہ حدیث وارد ہے۔ **من یرد الله به خیر ایفقهه فی الدین**

یہ علم حقیقی کتابیں پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو صحابہ کے ان پڑھ ہونے پر فخر فرماتے ہیں لمۃ لانکتب ولانحسب بتلایئے صحابہ نے کیا لکھا پڑھا تھا کچھ بھی نہیں بلکہ بعضے تو ان میں دستخط بھی نہ کر سکتے تھے۔ اور بعض صحابہ فتاویٰ کو تابعین کے حوالے کر دیتے تھے۔ مگر بایں ہمہ علوم میں وہ سب سے افضل تھے۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود صحابہ کی شان میں فرماتے ہیں اعمقھم علما کہ امت میں سب سے بڑھ کر صحابہ کا علم عمیق ہے۔ آخر وہ کونسا علم تھا کیا درسی اور کتابی علم تھا۔ ہرگز نہیں بلکہ یہ علم وہی فہم قرآن تھا جو حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے ان کو عطا فرمایا تھا جس میں ان کے تقویٰ سے ترقی ہوتی رہتی تھی اور یہی وہ علم ہے جس کے متعلق امام شافعیؒ کا قول ہے۔

شکوت الیٰ وکیع سوء حفظی　　فا وصانی الیٰ ترک المعاصی

آخر وہ کون سا علم ہے جس میں معاصی حائل ہیں۔ کیا وہ کتابی علم ہے ہرگز نہیں۔ کتابی علم تو جس کا حافظہ قوی ہوگا اس کو زیادہ یاد رہے گا۔ (کوثر العلوم ج ۲)

وہبی علوم

حقیقت علم جس کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کے قلب پر غیب سے وہ علوم وارد ہوتے ہیں جو کتابوں میں نہیں مل سکتے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

علم چوں بر دل زنی یارے شود　　علم چوں برتن زنی مارے شود
بے کتاب و بے معید واوستا　　بنی اندر خود علوم انبیاء

اس سے معلوم ہوا کہ وہ علوم وہبی ہیں کسبی نہیں ہیں۔ اس کے متعلق ایک روایت میں آیا من

عمل بما علم به علمه الله مالم يعلم ۔ آج کل لوگوں نے کثرت معلومات کو علم سمجھ لیا ہے حالانکہ علم اور چیز ہے اور معلومات اور چیز ہیں۔ (کوثر العلوم ج ۲)

مطالعہ میں احتیاط

صاحبو! اللہ کے واسطے، رسول کے واسطے بے دینوں کی خصوصاً مخالفین اسلام کی کتابیں ہرگز مت دیکھو۔ طلباء بھی ایسی کتابیں نہ دیکھا کریں جواب دینے اور رد کرنے کے لیے بھی نہ دیکھیں۔

الا ان يامره واحدمن ا لكاملين بضرورة .

(مگر یہ کوئی کاملین میں سے ضرورت کی وجہ سے اس کا حکم دیدے)

حدیث میں آیا ہے کہ دجال کی خبر سن کر اس سے دور بھاگو پاس نہ جاؤ۔ مناظرہ اور رد کے واسطے بھی نہ جاؤ کیونکہ بعض لوگ مناظرہ کے واسطے جائیں گے اور معتقد ہو جائیں گے تو طلباء کو چونکہ ان کا علم بھی ناقص ہے مناظرہ کے قصدے سے بھی مخالفین کی کتابیں نہ دیکھنا چاہئیں کیونکہ پہلوان اگر کسی سے کشتی کرنا چاہے تو اس کو پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ مقابل اپنے سے کمزور ہے یا زبردست اگر کمزور ہے تو مقابلہ کرے ورنہ اس سے دور ہی رہے۔ ایسے شخص کا مقابلہ وہ کرے جو اس سے بھی زیادہ زبردست ہو۔ پس محقق کے سوا کسی کو اجازت نہیں کہ مخالفین کی رد کے درپے ہو کیونکہ غیر محقق پر اندیشہ ہے کبھی خود ہی کسی شک میں نہ پڑ جائے آج کل مخالفین کی کتابوں میں بہت گندے مضامین ہوتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر اول دہلہ میں ناقص کو پریشانی ہوتی ہے تو ایسی کتابیں ہرگز نہ دیکھنی چاہئیں۔ (العلم والخشية ج ۲)

تبلیغ کا طریقہ کار

تبلیغ کا قاعدہ اور طریقہ، یہ علماء کی رائے سے ہونا چاہیے تم روپیہ جمع کر کے علماء سے طریقہ پوچھو اور مبلغ بھی انہی کی رائے سے مقرر کرو۔ اس مشورہ کے لیے ایک کمیٹی بناؤ۔ علماء کو اس میں مشورہ اور رائے دینے سے انکار نہ ہوگا اور میں علماء سے بھی کہتا ہوں کہ وہ اس سے انکار نہ کریں۔ پھر اس طرح اللہ کا نام لے کر کام شروع کریں۔ ان شاء اللہ بہت جلد کامیابی ہوگی۔ گو اول معمولی دقتیں بھی پیش آئیں گی مگر دقت سے نہ گھبرائیں۔ پیادہ سفر کرنے کی تو ضرورت نہیں۔ سواری میں سفر کریں۔ جہاں ریل ہو وہاں ریل سے پہنچیں ورنہ گاڑی

بھلی سے جائیں باقی فٹن اور موٹر کی ضرورت نہیں نہ لیمن اور برف کی ضرورت ہے مبلغوں کو ان فضولیات میں قوم کا روپیہ برباد نہ کرنا چاہئے۔ آپ کا تو یہ رنگ ہونا چاہیئے۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی
در رہ منزل لیلےٰ کہ خطر ہاست بجاں شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(اے دل یہی بہتر ہے کہ عشق الٰہی میں مٹ جاؤ۔ بے زر و مال سے حشمت و دبدبہ میں قاروں (دنیاداروں) سے بہت بڑھ جاؤ۔ لیلےٰ (محبوب حقیقی) کی راہ میں جان کو سینکڑوں خطرات ہیں۔ اس راہ میں قدم رکھنے کی اول شرط یہ ہے کہ مجنوں بنو) (العلم والخشیۃ ج ۲)

علم کی ضرورت

علم اس لیئے ضروری ہے کہ اس سے خشیت پیدا ہوتی ہے جو کہ ضروری ہے اور اب اس کے برعکس یہ تقریر ہوئی کہ علم اس لیے ضروری ہے کہ بدوں اس کے خشیت پیدا نہیں ہوتی۔ تو مشہور تقریر صحیح نہ ہوئی۔

یہ اشکال ذہن میں عرصہ دراز سے تھا مگر جواب ابھی دس بارہ دن ہوئے ذہن میں آیا ہے۔ نہ معلوم اب تک ذہن میں یہ اشکال کیوں رہا۔ کیا جواب کی طرف التفات نہیں ہوا جواب شافی اب تک نہ ملا تھا۔ بہر حال اب جواب ذہن میں آ گیا ہے۔

حاصل جواب کا یہ ہے کہ قرآن کا نزول محاورات کے موافق ہوا ہے۔ اسالیب معقول پر نہیں ہوا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن سے قضایا عقلیہ کی نفی ہوتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ قضایا عقلیہ سے قضایا نقلیہ کا تعارض جائز نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ دلالات قرآنیہ میں محاورات کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اصطلاحات معقول کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ پس یہ ہو سکتا ہے کہ اسلوب معقول سے ایک کلام کی دلالت کسی خاص معنی پر ہو اور اسلوب محاورہ سے دوسرے معنی پر دلالت ہو اور مقصود ثانی ہو نہ کہ اول۔ پس بطریق اسلوب معقول تو وہ اشکال وارد ہوتا ہے مگر بطریق اسالیب محاورات پر یہ اشکال نہیں پڑتا۔ (العلم والخشیۃ ج ۲)

علم کی قسمیں

علم کی دو قسمیں ہیں۔ اور یہی دو قسمیں خشیت میں بھی جاری ہیں۔ ایک عقلی ایک

حالی۔ عقلی کو کبھی اعتقادی بھی کہہ دیتے ہیں اور حالی کو طبعی بھی کہا جاتا ہے پس جہاں علم اعتقادی ہے وہاں خشیت بھی اعتقادی ہے۔ اور جہاں علم حالی ہے جس کو کہا تھا۔ ؂

علم گر بر دل زنی یارے شود

(علم اگر دل میں اثر کرے وہی معاون و مددگار ہوتا ہے) وہاں خشیت بھی حالی ہوگی۔ پس اب کوئی مادہ ایسا نہ رہا جس میں علم ہو اور خشیت نہ ہو جن کو آپ اہل علم سمجھ کر خشیت سے خالی دیکھتے ہیں وہ خشیت حالی سے خالی ہیں خشیت اعتقادی سے وہ بھی خالی نہیں۔ پس جیسا علم ان کا اعتقادی ہے ایسی ہی خشیت بھی اعتقادی ہے اور یہاں سے یہ اشکال بھی رفع ہو گیا کہ اس آیت میں خشیت کو علماء میں منحصر کیا گیا ہے۔ حالانکہ بہت سے جاہل بھی خدا سے ڈرتے ہیں۔ جواب ظاہر ہے کہ جن کو آپ جاہل سمجھتے ہیں علم اعتقادی سے وہ بھی خالی نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کے زبردست و قہار و منتقم ہونے کا اعتقاد ان کو بھی ہے اور یہی علم اعتقادی ہے پھر وہ علم سے خالی کہاں ہوئے۔

اب خشیت اعتقادی کے معنی بھی سمجھ لیجئے۔ خشیت اعتقادیہ کہتے ہیں احتمال مکروہ و احتمال عقاب کو۔ سو ایسا کون سا مسلمان ہے جس کو اپنے متعلق احتمال کے درجہ میں یہ خطرہ نہ ہوتا ہو کہ شاید مجھے عذاب ہو۔ سو نفس ایمان کے واسطے اتنا کافی ہے مگر کمال ایمان کے واسطے یہ خشیت کافی نہیں۔ بلکہ اس کے لیے خشیت عالی کی ضرورت ہے جس میں ہر وقت عظمت و جلال خداوندی کا استحضار رہتا ہے جہنم کا عذاب ہر دم پیش نظر رہتا ہے۔ اور اسی درجہء کمال کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لا یزنی الزانی حین یزنی و ھو مؤمن

(نہیں زنا کرتا زانی جب کہ وہ زنا کرتا ہے کہ مومن ہو یعنی زنا کی حالت میں ایمان نہیں رہتا یہاں محض ایمان اعتقادی مراد نہیں جس کے ساتھ اعتقادی خشیت ہوتی ہے۔ بلکہ ایمان کامل مراد ہے جس کے ساتھ خشیت حالی ہوتی ہے اب مخالفین اسلام کا یہ اعتراض بھی رفع ہو گیا کہ حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مومن زنا نہیں کر سکتا اور ہم بہت سے مسلمانوں کو زنا کار دیکھتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ اس میں مومن اعتقادی مراد نہیں بلکہ مومن حالی مراد ہے۔ (العلم والخشیۃ ج ۲)

قوت اجتہادیہ

حضرت ابن مسعودؓ کے پاس ایک عورت آئی اور کہنے لگی کہ میں نے سنا ہے کہ آپ

بال نوچنے (یعنی جو حسن کے لیے پیشانی وغیرہ کے بال نوچ دے تا کہ پیشانی فراخ معلوم ہو ۱۲ منہ) والی وغیرھا کو لعنت کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ جس کو قرآن لعنت کرے میں اسکو کیوں لعنت نہ کروں۔ کہنے لگی میں نے تو تمام قرآن پڑھا۔ اس میں تو یہ نہیں ہے آپ نے فرمایا لوقراءتیہ لوجدتیہ یعنی اگر خیال کر کے پڑھتی تو اس میں ملتا کیونکہ ان افعال کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور قرآن میں ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جو حکم دیں اس کو قبول کرو۔ پس اس طرح یہ احکام بھی مدلول قرآن ہو گئے۔

تو دیکھیے حضرت ابن مسعودؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو بھی قرآن ہی میں داخل فرماتے ہیں اور خود قرآن میں بھی ہے۔

فاذا قراء ناہ فاتبع قرانہ . ثم ان علینا بیانہ

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قرآن کے اجمال کو بیان فرمایا اور اگر کہیں حدیث میں بھی خفا رہا تو اس کو حضرت مجتہدین نے ظاہر فرما دیا حتی کہ **اکملت لکم دینکم** پوری طرح ظاہر ہو گیا اور اس ظہور اکمال کے بعد پھر چونکہ کوئی حاجت باقی نہیں رہی بحکمت الٰہیہ چوتھی صدی کے بعد قوت اجتہادیہ کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ اب اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ (تعلیم البیان ج۲)

قوت بیانیہ

اجتہاد سے اکمال کے ظہور کا یہی حاصل ہے کہ ان کا قیاس بھی مثل حدیث مبین قرآن و نیز مبین حدیث ہے پس مجتہدین کے قیاسیات یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات یہ سب علوم قرآنیہ ہیں لہذا علم القرآن سے علم الشریعہ مراد ہوگا اور قرآن کا ترک شریعت کا ترک ہوگا۔ اس پر استدلال کرنے کے لیے بھی زیادہ صاف ایک واقعہ یاد آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقدمہ کے متعلق فرمایا تھا کہ **اقضی بینکما بکتب اللہ** اور پھر وہ ہوگا جو کہ شریعت کے موافق ہو اور بیان میں تقریر اور تحریر دونوں داخل ہیں۔ چنانچہ اسی تعلق کے اعتبار سے قرآن شریف میں ایک مقام پر ارشاد ہے:

علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم

یعنی کبھی تو بالبنان ہوتا ہے اور کبھی باللسان یہ دونوں قسمیں بیان کی ہیں اس بیان کا نعمت ہونا منافع دنیوی کے اعتبار سے بھی ہے لیکن اس وقت ان کا ذکر نہیں اس وقت

خاص منافع دین کا ذکر ہے جن کے اعتبار سے یہ بیان ایک بڑی نعمت دینیہ بھی ہے اور وہ یہ ہیں کہ آج ہم لوگوں میں جو علم موجود ہے اس کی بدولت ہم خدا تعالیٰ کے مقبول بندوں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یہ نعمت بیانیہ ہی کی بدولت ہے کیونکہ اگر ہمارے حضرات سلف صالحین علوم کو مبین نہ کر جاتے تو ہم کو کچھ خبر بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ (تعلیم البیان ج ۲)

فن تدریس

صدرا مین مشاۃ بالتکریر کی بحث ایک مشہور بحث ہے۔ کانپور میں ایک مولوی فضل حق طالب علم مجھ سے صدرا پڑھتے تھے جس دن یہ مقام آیا ہے تو میں نے بلا اہتمام معمولی طور سے اس کی تقریر کر دی۔ جب انھوں نے اس کو اچھی طرح سمجھ لیا تو میں نے یہ کہا کہ یہ وہی مقام ہے جو مشاۃ بالتکریر کے لقب سے مشہور ہے۔ ان کو بڑا تعجب ہوا اور کہنے لگے کہ یہ تو کچھ بھی مشکل نہیں۔ آخر سالانہ امتحان میں ممتحن نے یہی مقام سوال میں دیا۔ مولوی فضل حق مرحوم نے اس مقام کی جو تقریر لکھی تھی (کہ وہ اب تک مدرسہ جامع العلوم میں محفوظ ہے) ممتحنین بھی اس پر عش عش کرتے تھے۔ بعض نے یہ کہا کہ ہم نے اس مقام کی تقریر ایسی کبھی نہیں دیکھی۔ (تعلیم البیان ج۲)

تقریر کا ایک ادب

حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت بے باکی اور آزادی سے تقریر کرنا بھی مذموم ہے چنانچہ حدیث میں ہے۔

الحیآء والعی شعبتان من الایمان والبذاء والبیان شعبتان من النفاق.

اس حدیث میں حضورؐ نے حیاء کے مقابلے میں اور عی کو بیان کے مقابلے میں فرمایا ہے اور حیاء اور عی کو ایک ساتھ جمع کر کے ایمان کے شعبوں میں سے قرار دیا ہے اور بذاء اور بیان کو نفاق کے شعبے قرار دیئے ہیں۔ اس قرینے سے معلوم ہوا کہ عی سے وہ عی مراد ہے جو کہ حیا کی وجہ سے ہو۔ اور حیاء فی نفسہ عام ہے خواہ حیا من الخلق خواہ من الخالق۔ مگر اس مقام پر مقصود حیا من اللہ ہے یعنی ہر لفظ پر یہ سوچے کہ کہیں شریعت کے خلاف کوئی بات نہ نکل جائے۔ (تعلیم البیان ج۲)

نزع کی تکلیف کا راز

اہل اللہ کو اپنے متوسلین سے بے حد تعلق ہوتا ہے۔ یہاں سے اس کا راز بھی معلوم ہوتا

ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نزع کی جو تکلیف زیادہ ہوئی۔ بعض لوگ شدت نزع کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کو علامت بد سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس کی کچھ بھی اصل نہیں۔

اس وجہ سے اہل تحقیق نے یہ بیان کیا ہے کہ اس کی بنا شدت تعلقات پر ہے۔ تعلق جسمانی ہو یا روحانی۔ جسمانی یعنی رطوبات اصلیہ زیادہ ہوں جیسے بچوں میں یا پہلوانوں میں دیکھا ہوگا کہ بچوں میں نزع کی تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے حالانکہ ابھی انہوں نے گناہ کون سے کیا ہے اور مدقوق کو بالکل نہیں ہوتی کیونکہ رطوبات ان میں باقی نہیں رہتیں۔ تارکین کو نزع کی تکلیف کم ہوتی ہے خواہ وہ برے ہوں یا اچھے ہوں کیونکہ ان کو تعلق روحانی نہیں ہے۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام کو امت سے بہت تعلق ہوتا تھا۔ (تعلق شفقت کا نہ جائیداد اور مال کا) اس وجہ سے نزع کی تکلیف ان کو زیادہ ہوئی۔ (آخر الاعمال ج۲)

اسلام اور سائنس

ایک حدیث میں ہے جو نسائی میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوۃ کسوف کے موقع پر فرمایا کہ میں نے مسجد کی دیوار کے قریب جنت و دوزخ کو دیکھا۔ بعض لوگ اس پر ہنستے ہیں کہ جنت و دوزخ تو آسمان زمین سے بھی بڑی بتلائی جاتی ہیں۔ حضورؐ نے ان کو دیوار پر کیوں کر دیکھ لیا اور اصلی حالت پر کیسے دیکھ لیا۔ مگر خدا تعالیٰ نے فوٹو اور خوردبین کو ایجاد کرا کے اس استبعاد کو دور کر دیا فوٹو میں بڑی سے بڑی شے کو چھوٹا کر کے دکھایا جا سکتا ہے اور خوردبین سے چھوٹی سے چھوٹی چیز پہاڑ بنا کر دکھائی جا سکتی ہے تو کیا خدا تعالیٰ کو یہ قدرت نہیں کہ اس نے جنت و دوزخ کا فوٹو مسجد کی دیوار پر اتار دیا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شعاع میں خوردبین کی قوت رکھ دی ہو جس سے فوٹو کی چھوٹی چیزیں آپ کو اصلی حالت پر نظر آ گئیں ہوں اور حدیث میں یہی لفظ وارد ہے۔ **مثلت لی الجنة والنار**۔ یہ نہیں فرمایا کہ جنت و دوزخ زمین میں آئی تھیں بلکہ آپؐ نے فرمایا کہ وہ میرے لئے ممثل ہو گئیں۔

اسی لئے جب کوئی نئی ایجاد ہوتی ہے تو میں خوش ہوتا ہوں۔ کیونکہ ان سے شرعیات کا استبعاد دور ہو جاتا ہے چنانچہ ایک عجیب بات اس زمانہ میں یہ ہے کہ آج کل حرارت و برودت کا بھی وزن ہونے لگا۔ کہ اس مکان میں کس وزن کی حرارت ہے اور کس درجہ کی برودت ہے (اور بخار میں تھرمامیٹر سے مریض کی حرارت کا وزن کیا

جاتا ہے) اب اگر کسی گنوار سے کہئے کہ گرمی بھی تلتی ہے تو اس کو کتنا تعجب ہوگا تو جب دنیا ہی میں بعض اعراض کا وزن ہونے لگا جس کی حقیقت ہے ما بہ الوزن کے انخفاض وارتفاع سے مقدار کا معلوم ہو جانا جو کہ سرسری نظر میں خواص جوہر سے ہے تو اگر دوسرے عالم میں جا کر وہ جوہر ہی بن جاوے تو کیا تعجب ہے۔ (تفصیل الدین ج ۳)

اجزائے دین کی تفصیل

دین کے پانچ اجزاء ہیں۔ ایک جز تو ہے عقائد کا کہ دل سے اور زبان سے یہ اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کی جس طور پر خبر دی ہے وہی حق ہے (جس کی تفصیل کتب عقائد سے معلوم ہوگی)

دوسرا جزو عبادات ہیں یعنی نماز روزہ زکوٰۃ وحج وغیرہ۔

تیسرا جزو معاملات یعنی احکام نکاح وطلاق وحدود وکفارات وبیع وشراء واجارہ وزراعت وغیرہ اور ان کے جزو دین ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ شریعت یہ سکھاتی ہے کہ کھیتی یوں بویا کرو اور تجارت فلاں چیز کی کیا کرو بلکہ ان میں شریعت یہ بتلاتی ہے کہ کسی پر ظلم وزیادتی نہ کرو اور اس طرح معاملہ نہ کرو جس میں نزاع کا اندیشہ ہو غرض جواز وعدم جواز بیان کیا جاتا ہے۔

چوتھا جزو ہے معاشرت یعنی اٹھنا بیٹھنا، ملنا، جلنا، مہمان بننا، کسی کے گھر پر جانا کیوں کر چاہئے اور اس کے کیا آداب ہیں۔ بیوی بچوں عزیزوں اجنبیوں اور نوکروں وغیرہ کے ساتھ کیوں کر برتاؤ کرنا چاہئے۔

پانچواں جزو جس کا نام ڈراؤنا ہے تصوف ہے اور ڈراؤنا اس لئے ہے کہ آج کل لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تصوف کیلئے بیوی بچوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ تو خوب سمجھ لیجئے کہ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ جاہل صوفیوں کا مسئلہ ہے جو تصوف کی حقیقت کو نہیں جانتے غرض یہ پانچواں جزو ہے جسکو شریعت میں اصلاح نفس کہتے ہیں۔

تو یہ پانچ اجزاء دین کے ہیں۔ ان پانچوں کے مجموعہ کا نام دین ہے اگر کسی میں ایک جزو بھی ان میں سے کم ہو تو وہ ناقص الدین ہے۔ جیسے کسی کا ایک ہاتھ نہ ہو تو وہ ناقص الخلقت ہے۔ (تفصیل الدین ج ۳)

معاشرتی ادب

اسلام میں استیذان کیلئے کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہر جگہ اور ہر مکان کیلئے اجازت مانگنے کی ضرورت ہے بلکہ قرائن سے یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص خلوت میں بیٹھا ہے مثلاً بیٹھک کے کواڑ بند کر رکھے ہیں یا پردے چھوڑ رکھے ہیں یا زنانہ مکان ہے تو اس وقت استیذان کی ضرورت ہے اور اگر مردانہ مکان ہے اور کواڑ بند نہیں نہ پردے چھوڑے ہوئے ہیں تو بلا استیذان کے جانا جائز ہے (مگر یہ کہ قرائن سے معلوم ہو جائے کہ اس وقت کسی ضروری کام میں مشغول نہیں ہے۔ جس میں دوسروں کے آنے سے خلل واقع ہوگا) اور جہاں استیذان کی ضرورت ہے وہاں یہ طریقہ ہے کہ پہلے جا کر سلام کرو السلام علیکم! پھر اپنا نام بتلا کر کہو کہ میں اندر آ سکتا ہوں؟ اگر وہ اجازت دے چلے جاؤ ورنہ تین دفعہ اس طرح کر کے لوٹ آؤ۔ (تفصیل الدین ج ۳)

بغاوت کا انجام

حدیث شریف میں ہے لاتقوم الساعة حتیٰ لایقال فی الارض الله الله

(المسند للامام احمد ۳:۱۰۷، ۲۰۱، ۲۶۸)

جب تک کوئی بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے قیامت نہ آئے گی۔

مختصراً اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام طاعت ہے اور کفر بغاوت ہے تو دنیوی سلطنتوں کا تو یہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی شہر میں باغی زیادہ ہوں تو شہر پر توپ خانہ لگا دیا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ بھی اگر یہی کرتے تو اکثر اوقات توپ لگے ہوتے۔ مگر یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے یہ قانون مقرر کیا کہ اگر کل باغی ہوں مگر صرف ایک غیر باغی ہو تو اس کی بدولت تمام عالم محفوظ رہے گا۔ ہاں جب بغاوت عام ہو جائے اس وقت پھر ہلاک عام بھی ہوگا۔

یہیں سے ایک اور بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ بہت سے لوگ جن کو آپ حقیر سمجھتے ہیں جیسے اللہ اللہ کہنے والے غرباء وہ آپ کی بقاء کے سبب ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس خلق کا اتباع ہم کو بھی کرنا چاہئے کہ ایک کے لئے سب کی رعایت فرمائی۔ شیخ فرماتے ہیں۔

مراعات صد کن برائے یکے   ایک کی خاطر سو کی رعایت کرو

اور فرماتے ہیں۔ خورند از برائے گلے خارہا (ضرورۃ العلم بالدین ج ۳)

خاوند سے مشورے کی ضرورت

اگر خاص عورت ہی کا مال ہے تو گو اس میں اجازت خاوند کی ضرورت نہیں مگر اس سے مشورہ کر لینا ضرور چاہئے۔ نسائی میں ایک حدیث ہے۔

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لايجوز لامراة هبة في مالها اذا ملك زوجها عصمتها الا باذن زوجها. (سنن النسائی ۲:۲۷۸)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح کے بعد عورت کو اپنے مال میں سے ہبہ کرنا بدوں اجازت زوج کے جائز نہیں۔ اس میں بعض علماء نے اضافت بادنی ملابست مانی ہے اور مالھا سے مراد مال زوج لیا ہے لیکن اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو اس پر محمول کیا جاوے کہ عورتیں ناقصات العقل ہوتی ہیں اگر یہ اپنے مال میں خود مختار ہوں گی تو نہ معلوم کہاں کہاں روپیہ برباد کریں گی۔ اس لئے آپ ناقص العقل طبقہ کو حکم فرماتے ہیں کہ تم اپنے مال میں بھی جو تصرف کرو اس میں اپنے مرد سے مشورہ کر لیا کرو تو یہ بات جی کو لگتی ہے اور اس میں بڑی مصلحت یہ ہے کہ اس طرح برتاؤ کرنے میں میاں بی بی میں اتحاد بڑھتا ہے اور مرد کو عورت سے محبت زیادہ ہوتی ہے کہ اس کو مجھ سے اتنا تعلق ہے کہ اپنے مال میں بھی کوئی کام بغیر میرے مشورے کے نہیں کرتی اور اگر عورت اپنی جمع کو الگ رکھ کر اس میں اپنی رائے سے تصرف کرے تو اس صورت میں ایک قسم کی اجنبیت معلوم ہوتی ہے اس وجہ سے میرے نزدیک حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے اور مالھا سے مال زوج مراد لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔

(قلت قال السندی فی تعليقه على النسائی و هو عند اكثر العلماء على معنى حسن العشرة واستطابة نفس الزوج واخذمالك يظاهره في مازاد على الثلث. (اسباب الغفلة ج۳)

اہل جنت کی قسمیں

جنت میں دو قسم کے لوگ ہوں گے ایک کاملین وہ تو دونوں صورتوں میں جمال حق ہی کا مشاہدہ کریں گے دوسرے ناقصین وہ ایک رخے ہوں گے کہ صرف ارنی ارنی پکاریں گے۔ ان کو کسی چیز کی طرف توجہ نہ ہوگی۔ مگر یہ ناقصین کاملین کے سامنے ناقص ہیں ہم سے آپ سے تو بہت بڑھے ہوئے ہیں۔

آسماں نسبت بعرش آمد فرود   لیک بس عالی ست پیش خاک تود

آسمان اگر چہ عرش کی نسبت پست ہے مگر ایک خاک کے ٹیلہ کے سامنے بہت بلند ہے۔

(مظاہر الاعمال ج ۳)

قرآنی نکات

یہاں ایک بات قابل تنبیہ ہے وہ یہ کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے بنون کو زینت حیوۃ الدنیا بتلایا ہے بنات کو بیان نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ بنات کو خود تم نے بھی بے حقیقت سمجھ رکھا ہے کیونکہ لوگوں کو لڑکوں سے زیادہ خوشی ہوتی ہے اور لڑکیوں کو عموماً وبال سمجھتے ہیں تو تمہارے نزدیک وہ کیا خاک زینت دنیا ہوں گی۔

دوسرا نکتہ بنات کے ذکر نہ کرنے میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ بتلا دیا کہ بنات زینت دنیا بھی نہیں ہیں بلکہ محض زینت خانہ ہیں اگر وہ بھی زینت دنیا ہوتیں تو حق تعالیٰ ان کو یہاں ذکر فرماتے۔ پس صرف بنون کو زینت دینا فرمانا اور بنات کو ذکر نہ فرمانا اس کی دلیل ہے کہ لڑکیاں دنیا کی بھی زینت نہیں ہیں کیونکہ عرفاً زینت دنیا وہ سمجھی جاتی ہے جو منظر عام پر زینت بخش ہو اور وہ ایسی زینت نہیں کہ تم ان کو ساتھ لئے لئے پھرو اور سب دیکھیں کہ ان کی اتنی لڑکیاں ہیں اور ایسی آراستہ پیراستہ ہیں بلکہ وہ محض گھر کی زینت ہیں۔

یہاں سے پردہ کی دلیل کی طرف اشارہ نکل آیا۔ دوسرے لغت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کا پردہ کرایا جائے کیونکہ اردو میں عورت کو عورت کہتے ہیں جس کے معنی لغت میں ہیں چھپانے کی چیز تو اس کے ساتھ یہ کہنا کہ عورتوں کو پردہ نہ کراؤ ایسا ہے جیسا یوں کہا جائے کہ کھانے کی چیز کو نہ کھاؤ۔ پہننے کی چیز کو نہ پہنو اور اس کا لغو ہونا ظاہر ہے تو یہ قول بھی لغو ہے کہ عورتوں کا پردہ نہ کراؤ۔ ان کو عورت کہنا خود اس کی دلیل ہے کہ وہ پردہ میں رہنے کی چیز ہیں۔ (مظاہر الاعمال ج ۳)

قرآن کا طرز کلام

اس میں ضرورت مخاطب کے لحاظ سے گفتگو کی جاتی ہے جس کی بے ربطی ہزار ربط سے افضل ہوتی ہے اور یہی شفقت منشا ہے اس امر کا کہ قرآن کی ہر تعلیم کامل ہے جس میں تمام پہلوؤں کی پوری پوری رعایت کی جاتی ہے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ ہر سورت

میں بہت سے احکام بیان فرما کر اخیر میں ایسی بات بیان فرماتے ہیں جو سب کی جامع ہوتی ہے اور جس پر عمل کرنے سے تمام احکام مذکورہ میں سہولت ہو جاتی ہے چنانچہ سورہ آل عمران میں مختلف ابواب کے احکام بیان فرما کر کلام کو ختم نہیں کیا بلکہ اخیر کی آیت میں بطور میزان الکل کے ایک بات ایسی بتلا دی جو سب کو جامع ہے۔

یہ ایسا ہے جیسا تفصیلی حساب کے بعد میزان دی جایا کرتی ہے اگرچہ مفصل حساب بیان کرنے کے بعد میزان کی ضرورت نہیں ہوتی مگر ظاہر ہے کہ میزان بیان کر دینے سے ایک قسم کا ضبط و تکرار ہو جاتا ہے مفصل حساب کا یاد رہنا دشوار ہے اور میزان کا یاد رہنا آسان ہے۔

اسی طرح یہ آیت اخیرہ تمام سورت کی میزان ہے جس میں بالاجمال جملہ احکام مذکورہ داخل ہیں اور دیکھنے میں دو تین باتیں ہیں جن پر عمل بہت سہل ہے خدا تعالیٰ نے اس بات کی رعایت ہر جگہ رکھی ہے یہ طرز سوائے قرآن کے کسی کلام میں بھی نہیں ہے کہ تمام باتوں کو ختم کر کے ایک بات ایسی بتلا دی جو سب کو جامع ہے۔

یہ ایسا ہے جیسے شفیق باپ مفصل نصیحتیں کر کے اخیر میں ایک گر بتلا دیتا ہے اور منشا اس کا شفقت ہے کہ لڑکے کو ساری باتیں شاید یاد نہ رہیں یا اتنی باتوں کو سن کر گھبرا جائے تو اخیر میں ایک گر بتلا دیتا ہے کہ بس اس کو یاد کر لو۔ تو جس نے دوسروں کو شفقت سکھلائی اس کے کلام میں شفقت کی پوری رعایت کیوں نہ ہو گی۔ (سبیل النجاح ج ۳)

فضیلت کسب حلال

حدیث میں ہے۔

كسب الحلال فريضة من بعد الفريضة (حلية الأولياء: ۷/ ۱۲۶، كشف الخفاء للعجلونی ۲: ۱۶۲)

حلال روزی کمانا فرض کے بعد ایک فرض ہے۔ اس صورت میں تجارت و زراعت بھی باعث ثواب ہے بلکہ ان کاموں میں مشغول ہو کر دین کی پابندی کرنا یہ نرے ذکر و شغل سے افضل ہے۔ (سبیل النجاح ج ۳)

اولاد کا عذاب

حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَلَا تُعۡجِبۡکَ اَمۡوَالُهُمۡ وَاَوۡلَادُهُمۡ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰهُ اَنۡ یُّعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِی الدُّنۡیَا

ان کے اموال و اولاد تم کو تعجب میں نہ ڈالیں اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے دنیوی زندگی میں ان کو عذاب دینا چاہتے ہیں۔

حق تعالیٰ نے اموال و اولاد کو اس جگہ آلہ عذاب فرمایا ہے اور واقعی غور کر کے دیکھا جائے تو کثرت مال و اولاد کے ساتھ افکار و تشویشات بھی زیادہ ہو جاتی ہیں اور یہی کلف و پریشانی کی حقیقت ہے جس میں امراء اکثر مبتلا ہیں چنانچہ کسی مالدار کے اولاد نہ ہو تو اس کو اپنے مال کی فکر ہوتی ہے کہ میرے بعد یہ تیرے میرے پاس پہنچے گا اس لئے وہ کسی نہ کسی کو متبنیٰ بناتا ہے اور بعد میں اپنے بھی اولاد ہو جائے تو پریشان ہوتا ہے اور اگر کسی کو مال کے ساتھ اولاد بھی نصیب ہو جائے تو خیر ایک غم تو دھلا اب یہ فکر ہے کہ بچہ بڑا ہوا ہے اس کی تعلیم و تربیت کرنا چاہئے اور یہ ایسی چیز ہے کہ کسی کے قبضہ و اختیار میں نہیں۔ بعض دفعہ لاکھ کوشش کرو مگر اولاد نالائق اٹھتی ہے اور جو لائق بھی ہوئی تو پھر اس کے نکاح کی فکر ہے سو پریشانیوں کے بعد نکاح بھی ہوا تو اب یہ فکر ہے کہ بیٹے کے اولاد نہیں ہوتی۔ اگر لڑکا بے اولاد رہ گیا تو پھر جائیداد کے غیروں کے پاس جانے کا اندیشہ ہے غرض عمر بھر یہی پریشانی رہتی ہے۔

میں نے ایک بڑی بی کو دیکھا جو اپنے بچوں کو بہت چاہتی تھیں رات کو سب بچوں کو اپنے ہی پلنگ پر لے کر سوتی تھیں جب اولاد زیادہ ہوئی تو پلنگ کی بجائے فرش پر سب کو لے کر سوتی تھیں اور رات کو یہ حالت تھی کہ بار بار اٹھ کر سب کو ہاتھ سے ٹٹولتی تھیں کہ سب زندہ بھی ہیں یا نہیں اور اگر ذرا بھی کسی کو تکلیف ہو گئی تو بس ساری رات کی نیند اڑ گئی تو بھلا اس صورت میں یہ اولاد آلہ عذاب نہیں تو کیا ہے خدا کی قسم راحت میں وہ ہے جس کے دل میں صرف ایک کی محبت ہو وہ ایک کون خدا تعالیٰ اور یہ حالت ہو۔

یکے بین و یکے دان و یکے گوے
یکے خواہ و یکے خوان و یکے جوے

ایک ہی کو دیکھ ایک ہی کو جان ایک ہی کو چاہ ایک ہی کو پڑھ اور ایک ہی کی تلاش کر۔

خلیل آسا در ملک یقین زن
نوائے لا احب الآفلین زن

حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی طرح یقین کا دروازہ کھٹکھٹا اور لا احب الآفلین (میں فانی ہونے والوں کو دوست نہیں رکھتا) کی صدا بلند کر اسی کو ایک عارف فرماتے ہیں۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگزارند و خم طرہ یارے گیرند

مصلحت یہ ہے کہ دوست سارے جہان کی مصلحتوں کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہوں۔

اور فرماتے ہیں۔

دلا رامیکہ داری دل درو بند　　دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

جس محبوب سے تمہارا دل بستہ ہے تو پھر تمام جہان سے آنکھیں بند کرلو۔ (سبیل النجاح ج ۳)

داڑھی کی ضرورت

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک جماعت فرشتوں کی ایسی ہے کہ وہ ہر وقت یہی تسبیح پڑھتے ہیں۔

سبحان من زین الرجال باللحیٰ والنسآء بالذوائب.

(کشف الخفاء للعجلونی ۱ :۵۳۸)

وہ ذات ہر عیب سے پاک ہے جس نے مردوں کو داڑھی سے زینت بخشی اور عورتوں کو چوٹی سے زینت بخشی۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد کے داڑھی کا ہونا زینت ہے اور اگر اس زینت کے رکھنے کی ضرورت نہیں تو عورتوں کا سر بھی منڈانا چاہیے غرض داڑھی منڈانے کی وجہ حسن و جمال تو نہیں ہوسکتی۔

کلکتہ میں ایک ملحد نے مولانا شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا تھا کہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ داڑھی رکھنا خلاف فطرت ہے کیونکہ اگر فطرت کے موافق ہوتی تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے وقت بھی ہوتی۔ مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر خلاف فطرت ہونے کی یہی وجہ ہے تو دانت خلاف فطرت ہیں ان کو بھی توڑ ڈالو کیونکہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے وقت دانت بھی نہیں تھے۔

غرض داڑھی کا منڈانا نہایت لغو حرکت ہے اور میں نے اس وقت بالقصد داڑھی کا تذکرہ نہیں کیا لیکن میں چونکہ اپنے عیوب و امراض بتلا رہا ہوں۔ اسی ذیل میں اس کا تذکرہ بھی آ گیا صاحبو! واللہ بعض دفعہ داڑھی کے تذکرہ سے شرم آتی ہے کہ شاید کسی کو ناگوار گزرے مگر منڈانے والوں کو اتنا حجاب بھی نہیں ہوتا اور اب تو غضب یہ ہے کہ بعض لوگ داڑھی منڈانا حلال بھی سمجھنے لگے ہیں اور جب اس کی بابت ان سے گفتگو کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ قرآن میں اس کی حرمت دکھلایئے۔ (طریق النجاۃ ج ۳)

نہی عن المنکر کا طریقہ

اپنے ہی لوگوں کو کہتا ہوں کہ منکرات کو منع تو کریں مگر اس طرح کہ نفسانیت کو دخل نہ ہونے پائے پھر ان شاء اللہ ضرور اثر ہوگا کسی پر انکار کرنے کا مضائقہ نہیں ہاں اتنا ہو کہ خلوص ہو۔ (حقوق القرآن ج۴)

احکام چندہ

چندہ دینے والوں کیلئے دو باتیں ہیں جو کہ خیال رکھنے کے قابل ہیں ایک یہ کہ اپنی وسعت سے کم مت دو اور خواہ تھوڑا دو مگر نباہ دو۔

احب الاعمال الی اللہ ادومھا وان قل .(صحیح مسلم ص۲۱۸)

(ترجمہ:۔اللہ تعالیٰ کو وہ عمل محبوب ہے جو ہمیشہ ہو خواہ مختصر ہو۔)

دوسرے یہ کہ چندہ دے کر مدرسے کو اپنی ملکیت مت سمجھو، اور مہتممین کی رائے میں دخل مت دو۔ آج کل یہ مرض بکثرت ہوگیا ہے کہ ذرا سا چندہ دے کر حکومت کرتے ہیں۔ ایک پیسہ بھی جس کا مدرسے میں شامل ہے وہ مدرسے کے ہر کام میں دخل دینے کو تیار ہے اور اپنی ہی رائے کو ترجیح دینا چاہتا ہے اور اگر بلائے رائے ان کے کوئی انتظام کرلیا جائے تو چندہ بند کرلیتے ہیں۔ (حقوق القرآن ج۴)

گفتگوئے عاشقاں درکار رب	جوشش عشق است نے ترک ادب
بے ادب ترنیست زوکس درجہاں	باادب ترنیست زوکس درجہاں

ایسا ہی ایک قصہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا جو حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ جب تم مجھ سے خفا ہوتی ہو تو اس وقت لا ورب ابراہیم کہتی ہو، اور جس وقت خوش ہوتی ہو، اس وقت لا ورب محمد (قسم ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی) کہتی ہو۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: **لا اھجر الا اسمک** (بجز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے نہیں چھوڑتی ہوں) (حقوق القرآن ج۴)

علوم مقصودہ

میں طلبہ کو نصیحت کرتا ہوں کہ زیادہ توجہ فقہ وحدیث وتفسیر پر کریں کہ یہی علوم مقصودہ ہیں، انہی سے خدا تعالیٰ اور رسولؐ کی عظمت کا علم ہوتا ہے اور معقول وادب میں بقدر

ضرورت توجہ کریں کیونکہ عربی دان ہونا کچھ کمال نہیں خدا دان ہونا چاہئے اگر عربی دانی کوئی چیز ہوتی تو ابوجہل حضرت بلالؓ سے افضل ہوتا کیونکہ وہ قریشی فصیح ہے اور حضرت بلالؓ حبشی ہیں جو ابوجہل کے برابر ہرگز فصیح و بلیغ نہ تھے مگر دیکھ لیجئے کہ عربی دانی اس کے کیا کام آئی کچھ بھی نہیں بلکہ وہ ابوجہل ہی رہا اور حضرت بلالؓ وہ ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت میں اپنے آگے آگے چلتا دیکھا تھا اسی کو ایک بزرگ کہتے ہیں۔

حسن زبصرہ بلالؓ از حبش صہیبؓ زروم   زخاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

(ترجمہ:۔ حضرت حسن بصریؒ کو بصرہ سے اور حضرت بلالؓ کو حبش سے اور حضرت صہیب رومیؓ کو روم سے جذب فرمایا اور خاک مکہ مکرمہ سے ابوجہل پیدا ہو یہ کس قدر عجیب قدرت ہے۔)

یہاں سے معلوم ہوا کہ محض عربی دانی کوئی چیز نہیں اور نہ ایسا شخص عالم ہے بلکہ ابوجہل کی طرح جاہل ہے اصل علم وہ ہے جس کو حق تعالیٰ اس آیت میں فرماتے ہیں۔

كُونُوا رَبّٰنِيّٖنَ .   ”یعنی اللہ والے ہو جاؤ خدا تعالیٰ سے علاقہ پیدا کرو۔“

بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ.

یعنی تم کتاب پڑھاتے اور پڑھتے ہو اس میں ایک مقتضی کا ذکر ہے کہ تمہارا یہ فضل خود اس کو مقتضی ہے کہ تم کو اللہ والا بننا چاہئے (العبد الربانی ج ۴)

دعویٰ اور دعوت کا فرق

اس میں ایک راز ہے وہ یہ کہ واعظ جس امر پر خود عامل نہیں ہوتا اس کے متعلق اگر وہ وعظ کہنے بیٹھتا ہے تو الفاظ میں شوکت وصولت نہیں ہوتی اندر سے دل بجھنے لگتا ہے چنانچہ ایک مقدمہ یہ ہے ایک بزرگ کے پاس ایک بڑھیا اپنے بچہ کو لے گئی اور کہا حضرت یہ گڑ بہت کھاتا ہے ذرا آپ اس کو نصیحت کر دیجئے انہوں نے کہا کہ کل آنا کل سمجھا دوں گا وہ اگلے دن بچہ کو لے کر آئی اور آپ نے نصیحت کر دی وہ اس سے رک گیا کسی خادم نے کہا حضرت یہ کونسا باریک مسئلہ تھا جس کے لئے آپ نے ایک دن کی مہلت مانگی تھی فرمایا بات یہ ہے کہ کل تک میں خود اس مرض میں مبتلا تھا اس وقت میری نصیحت کا اثر نہ ہوتا کیونکہ زبان ہی نہ اٹھتی اس لئے میں نے ایک دن کی مہلت مانگی تا کہ پہلے اپنی اصلاح کرلوں چنانچہ کل سے میں نے بھی گڑ کھانا چھوڑ دیا اور اس کا عزم کرلیا کہ آئندہ بھی نہ کھاؤں گا تو آج

میرے بیان میں اثر تھا الفاظ میں زور تھا سو واقعی غیر کامل کے وعظ میں شوکت وصولت نہیں ہوتی پھر اگر اس میں حیا ہے تو اس کو انقباض کا احساس ہوگا یہ دوسرا مقدمہ ہوا پس وہ جلد اپنی اصلاح کرلے گا اس لئے باحیاء کو وعظ سے نہ روکنا چاہیے (العبد الربانی ج۴)

امت کی زبوں حالی

وعظ کہنے والے زیادہ تر جاہل ہیں اور علماء وعظ نہیں کہتے اگر علماء واعظ ہوتے تو مسلمانوں کی حالت تباہ و برباد نہ ہوتی بعض علماء اس کے متعلق یہ عذر کرتے ہیں کہ ہم کو وعظ کہنا نہیں آتا میں کہتا ہوں کہ آپ کو عربی پڑھنا ہی کب آتا تھا یہ بھی تو محنت کرنے سے ہی آیا ہے اسی طرح وعظ کہنے کا ارادہ کیجئے اور کچھ دنوں محنت کیجئے یہ کام بھی آجائے گا جس کی سہل تدبیر یہ ہے کہ اول اول طلبہ کے سامنے مشکوٰۃ وغیرہ لے کر بیٹھ جاؤ اور کتاب دیکھ کر بیان کرو پھر کچھ دنوں میں بدوں کتاب کے بیان کرنا شروع کرو۔ اسی طرح ایک دن خوب بیان کرنے لگو گے حیرت کی بات ہے کہ جہلاء میں تو وعظ کی جرات ہو اور علماء کو اس کی ہمت نہ ہو جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب جہلاء علماء کے سامنے بھی غلط باتیں بیان کرنے سے نہیں ڈرتے۔ (العبد الربانی ج۴)

علماء کے کرنے کے کام

اس وقت اس کے چند افراد میرے ذہن میں ہیں ان کو عرض کرتا ہوں اور استقرار چار ہیں وعظ، تدریس امر بالمعروف بخطاب خاص، تصنیف۔ علماء کو ان چاروں شعبوں کو اختیار کرنا چاہئے اس طرح کہ طلباء کے سامنے تو مدرس بن کر بیٹھیں اور عوام کے سامنے واعظ ہوں اور خاص مواقع میں امر بالمعروف کریں اور خاص مواقع میں مراد یہ ہے کہ جہاں اپنا اثر ہو وہاں خطاب خاص سے نصیحت کریں کیونکہ ہر جگہ امر بالمعروف مفید نہیں ہوتا اور بعض دفعہ عام لوگوں کو امر بالمعروف کرنے کی وجہ سے مخالفت بڑھ جاتی ہے جس کا تحمل ہر ایک سے نہیں ہوتا اور اگر کسی سے تحمل ہو سکے تو سبحان اللہ! وہ امر بالمعروف کریں مگر یہ ضرور ہے کہ اپنی طرف سے سختی اور درشتی کا اظہار نہ کریں بلکہ نرمی اور شفقت سے امر بالمعروف کرے اس پر بھی مخالفت ہو تو تحمل کرے اور اگر تحمل کی طاقت نہ ہو تو خطاب خاص نہ کرے محض خطاب عام پر اکتفا کرے۔

(علامہ بیہقی نے حدیث لایزال طائفة من امتی علی الحق منصورین ۔
(سنن ابن ماجه: ۱۰، السنن الکبریٰ للبیهقی ۹: ۲۲۶)
(ہمیشہ میری امت میں سے ایک جماعت حق کی نصرت کرتی رہے گی)
کی شرح میں لکھا ہے کہ اس سے کوئی خاص جماعت مراد نہیں بلکہ دین کی خدمتیں بہت سی ہیں ہر شخص ان میں سے جو خدمت بجا لا رہا ہے وہ اس میں داخل ہے خواہ واعظ ہو یا مصنف، فقیہ ہو یا محدث (جامع)

اگر ایک قصبہ میں مثلاً بقدر ضرورت واعظ موجود ہوں۔ تو دوسرے علماء پر وعظ کہنا واجب نہیں ان کو درس و تدریس میں مشغول رہنا جائز ہے اور اگر واعظ کوئی نہ ہو تو مولوی صاحب کو اجازت نہیں کہ وہ صرف مدرس ہی بن کر رہیں بلکہ ضرورت کے موقعہ پر ان کو وعظ بھی کہنا چاہئے۔ (العبد الربانی ج۴)

نوافل کی اہمیت

فرائض کی تکمیل نوافل سے ہوتی ہے اگر کوئی نوافل ادا نہ کرے اور بالکل ترک کرے۔ اس کا فرض بھی غیر کامل ہوگا۔ گو بمعنی ناقص نہیں بلکہ غیر اکمل ہوگا اور اگر مع نوافل ادا کرے۔ تو وہ فعل اکمل ہوگا تو دیکھئے تکمیل فرائض کی نوافل سے ہوئی۔ (علوم العباد علوم الرشاد ج۴)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر. (المسند للامام احمد بن حنبل ۲: ۴۳۸، الترغیب والترهیب للمنذری ۴: ۵۲۱، ۵۵۷)

”یعنی میں نے بندوں صالحین کے لئے وہ شے تیار کی ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی اور نہ کسی کے دل پر ان کا گذر ہوا۔“ آپ بہت سے بہت وہ نعمتیں چاہیں گے جو کچھ آپ کے دل میں آویں گی اور جن اشیاء کا وعدہ ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہیں جو تمہارے ذہن میں آتی نہیں اس سے زیادہ آپ کیا چاہیں گے اور ثمرات تو ان لوگوں کے لئے ہیں جو طالب ثمرات ہیں۔ (التہذیب ج۴)

بدعت وسنت

کئی سال ہوئے میں ایک دفعہ کان پور گیا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ نواح کان پور میں

بعض دیہات کے نومسلم راجپوت مرتد ہونے والے ہیں۔ آریہ ان کو بہکا رہے ہیں تو میں نے اپنے احباب میں سے کچھ علماء اور رؤساء کو ساتھ لیا اور موضع گجنیر میں قیام کیا جو سب دیہات میں بڑا گاؤں تھا پھر وہاں سے دو دو تین عالموں کو متفرق دیہات میں تبلیغ کے لئے بھیجا گیا اور ان کے چودھریوں کو بلایا اور کہا کہ بھائی ہم نے سنا ہے کہ تم آریہ ہونے والے ہو، اگر کوئی شبہ اسلام میں ہو رفع کر لو، ایک نے جواب دیا کہ ہم آریہ کیوں ہوتے، انکے یہاں تو نیوگ کا بڑا فحش طریقہ ہے جس کو کوئی شریف ہرگز گوارہ نہیں کر سکتا پھر ہم نے کہا کہ ہاں بھائی بس تم مسلمان ہی رہنا وہ کہنے لگے کہ ہم مسلمان بھی نہیں ہوتے ہم تو نو مسلم ہی اچھے رہیں گے، میں نے کہا اچھا تو نومسلم ہی رہو پھر باتوں باتوں میں ان سے پوچھا گیا تم ہماری طرح مسلمان کیوں نہیں ہوتے تو کہنے لگے اصل بات یہ ہے کہ ہم تمہاری طرح مسلمان ہو جائیں تو ڈر یہ ہے کہ ہمیں تم میں سے کوئی اپنی لڑکی نہ دے گا نہ ہماری لڑکی لے گا اس لئے ہم تمہارے ساتھ بھی نہیں مل سکتے اور نہ آریوں کے ساتھ ملیں گے۔ اس جواب پر میں ذرا خاموش ہوا تھا کیونکہ اس کا وعدہ میرے اختیار سے باہر تھا، خدا بھلا کرے قصبہ بارہ کے پٹھانوں کا وہ بھی خبر سن کر آ گئے تھے ان میں سے ایک رئیس کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ صاحبو! تم بے فکر رہو تم کو ہم اپنی لڑکیاں دیں گے اور تمہاری لڑکیاں لیں گے گو اس سے برادری میں ہماری ذلت ہوگی مگر اسلام کی وقعت و خدمت کے لئے ہماری جان و آبرو سب فدا ہیں، میں اس جواب سے بڑا خوش ہوا اور ان کو بہت دعا دی کہ شاباش!

ایں کارزار تو آید و مرداں چنیں کنند

(یہ کام تم سے ہوا اور مردان خدا ایسا ہی کرتے ہیں)

مگر یہاں آ کر چودھری لاجواب تو ہو گیا لیکن اپنی حالت کے بدلنے پر آمادہ نہ ہوا۔ معلوم ہو گیا کہ یہ بات اس نے محض شرارت کی راہ سے کہی تھی جس سے ہم کو صرف لاجواب کرنا مقصود تھا اور حقیقت میں ان لوگوں کو اپنی حالت کا بدلنا منظور نہیں وہ اپنے اسی طرز میں خوش ہیں دراصل وہ مسلمان بھی برائے نام ہی ہیں۔ حالت ان کی یہ ہے کہ ان کے نام ہندوؤں جیسے ہیں چنانچہ ایک چودھری کا نام ننوسنگھ تھا اور دوسرے چودھری کا نام ادھار سنگھ تھا۔ یہ بہ نسبت پہلے کے ذرا سمجھدار تھا، بڑے چودھری سے کہا گیا کہ تجھے کلمہ بھی آتا ہے

کہنے لگا ہاں آتا ہے کہا گیا سناؤ تو کہنے لگا کہ بس تو مت پوچھ گاؤں کے لوگ یوں کہیں گے کہ بڈھا سٹھیا گیا جو کلمہ پڑھتا ہے ان کو کلمہ پڑھنے سے بھی رکاوٹ تھی۔ وہ ایسے مسلمان تھے بس چند باتیں ان میں اسلام کی موجود تھیں۔ ایک تو وہ ختنہ کراتے تھے، دوسرے مردوں کو دفن کرتے تھے، تیسرے نکاح قاضی سے پڑھواتے تھے مگر ساتھ ہی ہندوؤں کی طرح پھیرے بھی کرتے تھے اور ایک یہ بات ان میں اسلام کی تھی کہ محرم میں تعزیہ بناتے تھے اور اس کو اتنا بڑا اشعار سمجھتے تھے کہ ادھار سنگھ نے یوں کہا تھا کہ ہم آریہ کیسے بنت۔ ہمارے یہاں تو تاجیہ (تعزیہ) بنت ہے میں نے یہ سن کر کہا کہ دیکھو تعزیہ مت چھوڑنا کہنے لگے اجی بھلا اسے ہم کب چھوڑنے لگے۔ بعض علماء کو میری اس بات پر خیال ہوا کہ اس نے ایک بدعت کی، مسلمانوں کو اجازت دی میں نے کہا بس چپکے بیٹھے رہو یہ کانپور اور لکھنؤ میں ہی شرک و بدعت ہے مگر یہاں فرض ہے کیونکہ اس جگہ تعزیہ ہی ان لوگوں کے دین کا وقایہ ہے ابھی تو ان لوگوں کا تعزیہ بناتے رہنا ہی ان کے اسلام کے محافظ ہے۔ پھر جب رفتہ رفتہ یہ پکے مسلمان ہو جائیں گے اس وقت بدعت و سنت کی تعلیم دے دینا۔ ہمارے ایک دوست نے عجیب بات کہی میں نے اسے کہا کہ کالج علی گڑھ میں مولود شریف ہوا کرتا ہے جو کہ بدعت ہے وہ دوست فرمانے لگے کہ یہ مولود شریف (بہیئۃ معروفہ) اور جگہ تو بدعت مگر کالج میں جائز واجب ہے کیونکہ اس بہانہ سے کبھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر شریف اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و معجزات سن لیتے ہیں تو اچھا ہے اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت ان کے دلوں میں قائم رہے ورنہ وہ تو سال بھر ایسی خرافات میں مبتلا رہتے ہیں کہ بھول کر بھی خدا اور رسول کا نام ان کی زبان پر نہیں آتا مجھے ان کی یہ بات پسند آئی کیونکہ واقعی اگر کسی جگہ بدعت ہی لوگوں کے دین کی حفاظت کا ذریعہ ہو جائے تو وہاں اس بدعت کو غنیمت سمجھنا چاہئے جب تک کہ ان کی پوری اصلاح نہ ہو۔ (خیر الارشاد لحقوق العباد ج۴)

وسعت اختیار کا اثر

میں مسلمانوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اگر کوئی بڑا ہندو یا عیسائی مسلمان ہو جایا کرے تو اس کو نچاتے نہ پھرا کرو ہاں اس کی خدمت اور خاطر کرو بلکہ ایسی دھوم دھام نہ کیا کرو، جس

سے کسی کو عجیب بات معلوم ہو کیونکہ کوئی رئیس ہو، بادشاہ ہو جو کوئی بھی اسلام لاتا ہے اپنی نجات اور اپنی فلاح کے لئے لاتا ہے، مسلمانوں پر کیا احسان کرتا ہے یہ تو جملہ معترضہ تھا میں کہہ رہا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی حکومت ہو تو خیر ورنہ غیر عادل حکومتوں کی یہی حالت ہے کہ ان میں رؤسا و امراء کی غریبوں کے مقابلہ میں بہت رعایت کی جاتی ہے تو غرباء نالش کر کے بھی مال داروں سے انتقام نہیں لے سکتے۔ اس لئے مال داروں کے ہاتھ سے مخلوق کی جان پر زیادہ ظلم ہوتا ہے اور ایک ظلم حکام کے ہاتھ سے یہ ہوتا ہے کہ کسی کے دو چار بیدیں بلاوجہ لگوادیں ان کی تو کون نالش کرتا ہے اور بعضے اس طرح ظلم نہیں کرتے تو یوں کرتے ہیں کہ مقدمہ میں ایک فریق سے رشوت لے کر کسی کا حق ضائع کر دیا، ایک ڈپٹی صاحب کی یہ حالت تھی کہ دونوں فریق سے رشوت لے لیا کرتے تھے مگر ان سے سب خوش تھے بلکہ ایماندار مشہور تھے کیونکہ جس فریق کے خلاف وہ فیصلہ کرتے تھے ان کی رشوت واپس کر دیا کرتے تھے اور بعضے یہ کرتے ہیں کہ جس نے زیادہ رشوت دیدی اس کے موافق فیصلہ کر دیا اور دوسرے کی رقم بھی ہضم کر لی مقدمہ تو حاکم کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس کے چاہے موافق کر دے حاکم کو مقدمہ کا بدلنا کیا مشکل ہے، ہیر پھیر کر جس طرح چاہے بنا دے۔ اسی وسعت خیال پر نظر کر کے میں مسلمانوں کو کہا کرتا ہوں کہ حکام وقت کو ناراض نہ کرو یہ طریقہ بہت مضر ہے اس پر بعض نوجوان کہا کرتے ہیں کہ ہم تو جو کچھ کرتے ہیں قانون کے اندر کرتے ہیں، خلاف قانون کچھ نہیں کرتے پھر حکام کیا کر سکتے ہیں؟ میں نے کہا کہ حکام کو تمہاری نیت تو معلوم ہے جب وہ یہ جانیں گے کہ یہ لوگ ہم کو ناراض اور تنگ کرنے کے لئے یہ حرکت کر رہے ہیں تو قانون ان کے ہاتھ میں ہے جس بات کو تم خلاف قانون نہیں سمجھتے ہو وہ اس کو بھی کسی ترکیب سے خلاف قانون کر دیں اور شریعت کا امر ہے۔

لاتلقوا بایدیکم الی التهلكة کہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو تو ایسا کام نہ کرنا چاہیے جس میں حاکم کی ناراضی ہو کیونکہ اس کا انجام قریب بہ ہلاکت ہے اور مدت دراز تک مسلمانوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور ایسے خطرات سے حفاظت نفس شرعاً مطلوب ہے مگر اتنا فرق ہے کہ عوام تو اپنی جان سمجھ کر اپنے نفس کی حفاظت کرتے ہیں اور اہل اللہ خدا کی امانت سمجھ کر حفاظت کرتے ہیں کہ اس کو خلاف منشاء حق صرف نہ کیا جاوے (اس لئے

عارف ایسے موقع میں جہاں شریعت نے حفاظت نفس کا حکم دیا ہو اپنی جان کی بہت حفاظت کرتا ہے گو عوام اس کو بزدلوں و ڈرپوک کہیں اور جہاں شریعت نے بذل نفس کا حکم دیا ہو وہاں اہل اللہ سے زیادہ جانبازی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا ۱۲ جامع) تو دو طبقے تو یہ ہیں جو ظلم میں زیادہ بدنام ہیں یعنی رؤسا اور حکام۔ (خیر الارشاد لحقوق العباد ج۴)

ایمان وکفر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے:

لا تکفرہ بذنب ولا تخرجہ عن الاسلام (مجمع الزوائد للهيثمي ١:١٠٦)

(یعنی مسلمان کو کسی گناہ کی وجہ سے نہ تو کافر کہو اور نہ اس کو اسلام سے خارج کہو)

بہت دنوں تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ دو جملے کیوں بیان فرمائے۔ صرف پہلا ہی جملہ کافی تھا دوسرے جملہ کی کیا ضرورت تھی مگر بہت دنوں کے بعد سمجھ میں آیا کہ ایک جملہ میں تو رد ہے خوارج (ایک فرقہ ہے) کا اور ایک میں معتزلہ (ایک فرقہ ہے) کا اول جملہ خوارج کا تو رد ہو گیا مگر معتزلہ کا رد نہ ہوتا کیونکہ وہ گناہ کی وجہ سے کفر میں نہیں داخل کرتے اس لئے دوسرا جملہ بھی بیان فرمایا کہ معتزلہ پر بھی رد ہو گیا اور لا تکفرہ بذنب (مسلمانوں کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ کہو) پہلے اس لئے فرمایا کہ دوسرے جملہ میں ترقی ہو کیونکہ اول لا تکفرہ بذنب سے تو یہ فرمایا کہ کافر نہ کہو تو اب ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ ہم تو کافر نہیں کہتے بلکہ اسلام سے صرف خارج کرتے ہیں تو اس کے رد کے لئے فرماتے ہیں کہ اسلام سے خارج بھی نہ کہو۔

دیکھیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرما رہے ہیں اب بہت سے لوگوں کی یہ حالت ہے کہ ذرا سی بات پر کافر کہہ دیتے ہیں، یہ ہرگز جائز نہیں کیونکہ علاوہ اور دلائل منع کے اس سے تکلیف بھی تو ہوتی ہے اگر کوئی کہے کہ ہم تو زبان سے نہیں کہتے بلکہ لکھ کر کہتے ہیں تو یہ بھی لسان (زبان) ہی سے ہے کیونکہ نقوش کی دلالت الفاظ پر اصطلاح سے ہوئی ہے اور اصطلاح زبان سے مقرر ہوئی تو مترجم اس کا بھی زبان ہی ہے تو لسانہ میں داخل ہے اور اسی کو فقہاء کہتے ہیں الکتابت کالنطق کہ لکھنا زبان سے کہنے کے مثل ہے اور اگر یہ دقیقہ کسی کی سمجھ میں نہ آوے تو چلئے جانے دیجئے آخر "یدہ" میں تو داخل ہے اور لا تکفرہ (اس کو کافر نہ کہو) کے بعد بذنب (کسی گناہ کی وجہ سے) اس لیے فرمایا کہ اگر کوئی بات صریح کفر کی ہو

اوراس میں احتمال دوسرا نہ ہو تو اس وقت کافر کہنے کی اجازت ہے لیکن اگر اس میں دوسرا احتمال بھی ہو جس کے اعتبار سے وہ بات کفر نہ ہو تو اس صورت میں کافر نہ کہے۔

چنانچہ فقہاء کہتے ہیں کہ اگر ننانوے وجہ کفر کی ہوں اور ایک وجہ عدم کفر کی ہو تو بھی کافر نہ کہو، آج کل بعض لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ننانوے عمل کفر کے ہوں اور ایک عمل عدم کفر کا الخ تو یہ مطلب نہیں اگر یہ مطلب ہوتا تو دنیا میں ایک بھی کافر نہ رہتا کیونکہ ہر شخص میں کوئی بات تو اچھی ہوتی ہی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک قوم میں مثلاً ننانوے توجیہ کفر کی اور ایک توجیہ عدم کفر کی ہو۔

مثلاً امام صاحب کے پاس ایک شخص آیا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ کوئی کافر جہنم میں نہ جاوے گا تو وہ اس کے کہنے سے کافر ہوا یا نہیں؟ امام صاحب نے شاگردوں سے پوچھا کہ اس کلام سے کوئی ایسے معنی ہو سکتے ہیں جس کی بناء پر یہ شخص اسلام سے خارج نہ ہو، شاگردوں نے کہا اس میں تو کوئی تاویل نہیں ہوسکتی یہ تو نص قطعی کا صریح انکار ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ کوئی کافر دوزخ میں جاتے وقت کافر نہ رہے گا کیونکہ اس وقت تو سب ایمان لے آئیں گے گو اس وقت کا ایمان مقبول نہ ہو۔ یہاں سے امام صاحب کی ذہانت کا خیال کیجئے اور عجب نہیں کہ امام صاحب نے یہ وہاں سے سمجھا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں کوئی بڑھیا نہ جاوے گی۔ جیسا کہ کافر ومنکر اور اس وقت کوئی منکر نہ ہوگا بلکہ سب مومن ہوں گے گو اس وقت کا ایمان مقبول نہ ہو۔ یہ ہے حاصل اس تاویل کا تو امام صاحب نے فرمایا کہ اس قول کا یہ مطلب ہوسکتا ہے پھر اس میں کفر کی کونسی بات ہے تو حاصل یہ ہوا کہ جس قول میں تاویل ہو سکے اور اس کی بناء پر مومن ہو سکے تو ایسی بات ہے اس کو کافر نہ کہہ دینا چاہیے اگر ننانوے مطلب کی بناء پر کفر ہو اور ایک مطلب کی بناء پر کفر نہ ہو تو یوں سمجھو کہ شاید وہی مطلب ہو۔ (کف الاذی ج۴)

تعمیر مساجد کی فضیلت

دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

من بنى لله مسجدا ولو كمفحص قطاة بنى الله له بيتا فى الجنة.

(المسند الامام احمد ۱ : ۲۴۱، تفسیر ابن کثیر ۸ : ۷۱)

(یعنی اگر کوئی قطاۃ پرندہ کے آشیانہ کے برابر بھی مسجد بنائے تو اس کیلئے جنت میں گھر بنے گا)

تو دیکھیے کتنے قلیل عمل پر کتنی عظیم فضیلت فرمائی۔ بعض لوگ جن کو شبہات نکالنے کی عادت ہے شاید یہ کہیں کہ یہ حضور کا کلام نہیں کیونکہ اتنی چھوٹی مسجد ہی نہیں ہوگی تو اگرچہ اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ تمام اہل زبان میں مبالغہ کلام کا حسن سمجھا جاتا ہے مگر ہم حدیث کا دوسرا مطلب بیان کرتے ہیں کہ اگر کسی نے مسجد میں مثلاً چار آنے دیئے جس سے عمارت میں اس کے حصہ میں گھونسلہ کے برابر جگہ آئی تو اس کو بھی جنت میں پورا گھر ملے گا۔ اگرچہ اس نے پوری مسجد نہیں بنوائی تو اگر کسی نے خدا کی راہ میں ایک پیسہ بھی دیا تب بھی نجات کے لیے ویسا ہی کافی ہے جیسا کہ ہزار دو ہزار، بلکہ غرباء کے دو چار پیسے امراء کے ہزاروں سے بڑھ جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چندہ کی ترغیب دی تھی تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تو اتنا لائے کہ اٹھ بھی نہ سکا اور ایک صحابی جو کے دانے لائے۔ منافقین دونوں پر ہنسے، ایک کو ریاکار بنایا، ایک کو بے شرم، حق تعالیٰ اس کو بھلا کیا دیکھ سکتے تھے۔ ایک قدسی میں فرماتے ہیں: میں نے تفسیر مظہری میں یہ حدیث دیکھی ہے کہ مجھے اپنے مقبول بندے کو چھیڑنے پر ایسا غصہ آتا ہے جیسے شیر کے بچوں کے چھیڑنے پر شیر کو۔ دوسری حدیث قدسی میں ہے: "**من عادلی ولیاً فقد اذنته بالحرب**" (کہ جو میرے ولی سے عداوت رکھے اس کو میری طرف سے اعلان جنگ ہے)

بس تجربہ کردیم دریں مکافات　　　با درد کشاں ہر کہ در افتادہ برافتاد

(اس دیر مکافات میں بہت تجربہ ہم نے کیا ہے کہ جو شخص اہل اللہ سے الجھا ہلاک ہوگیا)

اور فرماتے ہیں:

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد　　　تا دل صاحب دلے نامد بدرد

(کسی قوم نے اس وقت تک اللہ تعالیٰ کو ناراض نہیں کیا جب تک انہوں نے کسی اہل اللہ کو تکلیف نہیں پہنچائی)

ایک مقبول بندے کے ستانے پر شہر کے شہر تباہ کر دیئے ہیں۔ حق تعالیٰ اپنے مقبول بندے پر طعن کو نہیں دیکھ سکتے، فوراً اس کا بدلہ لیتے ہیں۔ اسی طعن کے بارے میں فرماتے ہیں:

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَ هُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ

کہ جو لوگ طعن کرتے ہیں ان لوگوں پر بھی جو رغبت ظاہر کرتے ہیں صدقات میں اور وہ

مومن ہیں اوران لوگوں پر بھی جونہیں پاتے خرچ کرنے کومگر اپنی طاقت کے موافق، تو جوان سے تمسخر کرتے ہیں، خدا ان کے تمسخر کا بدلہ لے گا اور وہ بدلہ یہ ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ کہ ان کو سخت عذاب ہوگا۔ آگے اس کواچھی طرح موکد فرماتے ہیں کہ آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں برابر ہے۔ اگر آپ ستر مرتبہ بھی استغفار کریں گےتو خدا تعالیٰ ان کو نہ بخشیں گے۔

اس سے کوئی یہ نہ سمجھیں کہ کوئی گناہ ایسا بھی ہے کہ وہ تو بہ و استغفار سے بھی نہیں بخشا جاسکتا کیونکہ اس آیت میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ آپ ان کے واسطے کتنا ہی استغفار کریں ہم نہیں بخشیں گے۔ بات یہ ہے کہ وہ لوگ خود استغفار نہ کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا و استغفار اسی وقت مفید ہو سکتی ہے کہ گناہ کرنے والا خود بھی توبہ کرنا چاہے۔ حق تعالیٰ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ یہ لوگ استغفار کریں یا نہ کریں ہم بخشیں گے۔ اگر یہ فرماتے تو شبہ کی گنجائش تھی کہ کیا بعضے گناہ استغفار سے بھی معاف نہیں ہو سکتے تو اگر وہ خود استغفار کرتے تو ایک مرتبہ "اللھم اغفرلی" کہنا بارود کی طرح گناہوں کو اڑا دیتا ہے۔ (حقوق السراء والضراء ج۴)

فضیلت صدقہ

صدقہ کی فضیلت خصوصیت محل سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ آج کل بہت سے یتیم ہیں، بہت سی عورتیں بیوہ ہیں اور یتیم اور بیواؤں پر رحم کرنا بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔ حدیث میں وارد ہے:

الساعی علی الارملة کالصائم یفطر والقائم لایفتر او کمال قال.

(الصحیح للبخاری ۷: ۸۰، ۸: ۱۰، ۱۱، الصحیح لمسلم الزھد: ۴۱)

(ساری رات کا جاگنا اور ساری عمر روزہ رکھنا جتنی فضیلت رکھتا ہے، اتنی ہی مساکین کی نگہداشت میں فضیلت ہے)

ارملہ کی فرد بیوہ عورتیں بھی ہیں اور حدیث میں وارد ہے: "**انا و کافل الیتیم کھاتین او کما قال**". (یعنی جو شخص یتیم کی کفالت کرے جنت میں وہ اور میں مثل ان دو انگلیوں کے ہوں گے یعنی سبابہ اور وسطی کی۔ حدیث میں یہ بھی مذکور ہے۔ "**وفرج بینھما**" کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد کے وقت دونوں انگلیوں میں کشادگی فرمائی تھی۔ اس تشبیہ سے حضور کا مقصود قرب کا بتلانا ہے کہ ایسے شخص کو جنت میں مجھ سے قرب حاصل ہوگا جیسا کہ سبابہ کو وسطیٰ سے قرب ہے۔

اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ وہ شخص حضور کے برابر ہو جائے گا۔ (معاذ اللہ)! کیونکہ اول تو یہ شبہ اسی سے زائل ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تشبیہ میں انگشت شہادت اور وسطیٰ استعمال فرمایا۔ اور ظاہر ہے کہ ان دونوں انگلیوں میں سے انگشت دوسری سے بڑھی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ باہم قرب بھی ہے۔ ایسے ہی سرور دو عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بوجہ نبوت و رسالت کے اس شخص سے بڑھے ہوئے ہیں مگر اس فضیلت کے ساتھ ہی اس عمل مقبول کی وجہ سے کافل یتیم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک قسم کا قرب بھی ہے۔

دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ میں کشادگی ظاہر کر دینے سے بھی یہ بتلا دیا کہ علاوہ فرق مراتب کے حضور میں اور اس میں حسی فرق بھی ہو گا تو مساوات کا وہم بالکل نہیں ہو سکتا۔ (حقوق السراء والضراء ج ۴)

زمین وسورج کی حرکت

کیا یہ مشاہدہ ہے کہ آفتاب کو سکون ہے، زمین کو حرکت ہے۔ خیر ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کس کو سکون ہے اور کس کو حرکت کیونکہ یہ قرآن کے مخالف نہیں مگر یہ سوچ لو کہ اتنا بڑا دعویٰ کس بنا پر ہے، دلیل کچھ بھی نہیں۔ مگر ہم کہیں گے ''اَلشَّمْسُ تَجْرِیْ'' (سورج چلتا رہتا ہے) چونکہ قرآن میں وارد ہوا ہے اس لیے آپ آفتاب کو ساکن محض ماننے سے گنہگار ہوں گے۔ زمین کو چاہے آپ ساکن نہ مانئے متحرک مانئے مگر آفتاب کو بھی متحرک ماننا پڑے گا۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو ''وَجَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ الخ'' (یعنی اور ہم نے زمین میں اس لیے پہاڑ بنائے کہ زمین ان لوگوں کو لے کر ہلنے نہ لگے) اسے تو زمین کا سکون ثابت ہوتا ہے۔ پھر یہ کیوں کہتے ہو کہ حرکت ارض کا ماننا قرآن کے خلاف نہیں۔ (الوقت ج ۴)

حقوق نفس کی رعایت

حدیث شریف میں ہے:

اذا غلب احدکم النعاس وھو یذکر اللہ فلیرقدا وکما قال علیه السلام (اتحاف السادة المتقین ۸: ۱۶۰)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس وقت تک نیند نہ آئے اس وقت تک تو

نفلیں تسبیح اور ذکر وغیرہ سب کچھ کرو اور جب نیند کا غلبہ ہونے لگے تو سو رہو "**فلیرقد**" (تو سو رہو) امر کا صیغہ ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس حالت میں ذکر لسانی بند کر دینا ضروری ہے۔ آگے اس کی حکمت بیان فرماتے ہیں:

لعله يستغفر فيسب نفسه.

یعنی ممکن ہے کہ وہ قصد تو استغفار کا کرے اور بجائے استغفار کے اپنے آپ کو کوسنے لگے کیونکہ اس وقت مارے نیند کے ہوش درست نہیں رہتا۔ لامحالہ کہے گا کچھ اور نکلے گا کچھ تو شاید دعا کے بدلے بدعا نکلے۔ چنانچہ علماء نے اس کی تفسیر میں مثال کے طور پر کہا بھی ہے کہ مثلاً وہ کہنا چاہتا ہے "**اللهم اغفرلی**" (کہ اے اللہ! مجھے بخش دے) تو ممکن ہے کہ بجائے اس کے "**اللهم اعفرلی**" مہملہ زبان سے نکلے۔ یعنی اے اللہ! مجھے تباہ کر دیجئے، برباد کر دیجئے، مٹی میں ملا دیجئے، صرف ایک نقطہ کے گھٹنے بڑھنے سے معنی کس قدر بدل گئے۔

تو یہ حدیث نص ہے کہ جب نیند کا غلبہ ہو تو زبان سے ذکر نہ کرے۔ پس اس وقت زبان سے ذکر ممنوع ہے۔ (الصلاح والاصلاح ج ۴)

فضائل امت محمدیہ

"**كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ**"

(تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے، حکم کرتے ہو نیکیوں کا اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہو)

اس آیت میں اس امت کی تین فضیلتیں بیان فرمائی ہیں جن میں فضیلت ایمان باللہ کی تو ہر شخص کے پاس اپنے لیے ہے اور باقی دو فضیلتیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی۔ یہ دوسروں کے نفع کے لیے ہیں کیونکہ اس سے دوسرے پر نفع کا اثر پہنچتا ہے اور مقتضاء قواعد کا یہ تھا کہ یہاں تو مومن باللہ کو مقدم فرماتے کیونکہ وہ اساس اعمال ہے مگر مؤخر کرنے میں غالباً یہ نکتہ ہے کہ عوارض پر نظر کر کے اصلاح گیر کا اہتمام زیادہ مقصود ہے کیونکہ اپنی ضرورت کا اہتمام تو ہر شخص خود ہی کرلے گا ورنہ فی نفسہ اپنی اصلاح غیر کی اصلاح سے مقدم ہے مگر اس تقدیم کے یہ معنی نہیں کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی اصلاح بھی واجب نہیں بلکہ یہ تو محض عمل

ترتیب ہے کہ پہلے اپنی اصلاح کرنا چاہیے پھر دوسرے کی کرے، یہ نہیں کہ اگر مقدم کام نہ کیا ہو تو مؤخر کو بھی نہ کرے کیونکہ دراصل یہ دو کام الگ الگ ہیں اور ایک دوسرے کا موقوف علیہ نہیں۔ ایک کو بھی ترک کرے گا تو اس ایک کے ترک کا گناہ ہوگا اور دوسرے کو ترک کرے گا تو دوسرے کے ترک کا گناہ ہوگا اور دونوں کو ترک کرے گا تو دونوں کے ترک کا گناہ ہوگا۔

تو یہ غلطی ہے کہ اپنی اصلاح نہ ہوئی تو دوسروں کو بھی تنبیہ نہ کرے۔ بعض اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

اَتَامُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ.

(لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھلاتے ہو)

وہ اس سے یہی سمجھے گا کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی اصلاح بھی نہ کرے کیونکہ ہمزہ تامرون پر انکار کے لیے داخل ہوا ہے تو امر بالبر (نیکی کا حکم) منکر ہوا۔ یعنی جس حالت میں تم اپنے نفسوں کو بھولے ہوئے ہو لوگوں کو امر بالبر کیوں کرتے ہو مگر یہ محض غلط ہے بلکہ ہمزہ مجموعہ پر داخل ہوا ہے اور انکار مجموعہ کے دوسرے جزو کے اعتبار سے ہے کہ اپنے کو اصلاح میں بھلانا نہیں چاہیے۔ اس آیت کا تو یہ جواب ہوگیا۔ (الصلاح والاصلاح ج۴)

اصلاح غیر کے مدارج

اصلاح غیر کے بقدر استطاعت مدارج ہیں۔ چنانچہ ایک درجہ یہ ہے کہ ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا'' (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ) اس درجہ کا حاصل اپنے خاص متعلقین کی اصلاح ہے۔ افسوس اس باب میں بھی ہم سے کتنی کوتاہی ہو رہی ہے خود تو نماز پڑھ بھی لیتے ہیں مگر کبھی بیوی کو، بچوں کو، نوکروں کو اور متعلقین کو نہیں کہتے، بچے اگر امتحان میں فیل ہو جائیں تو رنج ہوتا ہے مگر نماز قضاء کر دیں تو کچھ بھی پروا نہیں ہوتی۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ سات برس کے بچے کو نماز پڑھنے کا حکم دو اور دس برس کے بچے کو اگر کہنے سے نہ پڑھے تو مار کے پڑھاؤ، اگر کوئی دس برس کا بچہ سرپرست کی غفلت کی وجہ سے بے نمازی ہوگا تو اس کا سرپرست گنہگار ہوگا تو اگر اصلاح غیر کی ضرورت نہ ہوتی تو ''قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ'' (آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ) میں اھلیکم کے کیا معنی ہوں گے۔ دوسرا درجہ یہ ہے:

"وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جس کا کام صرف یہی ہو کہ لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے) اس درجہ کا حاصل تبلیغ عام ہے اور ایک جگہ ہے کہ "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ" (ایک دوسرے کے حق کی فرمائش کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو پابندی کی فرمائش کرتے رہتے ہیں) اس میں بھی تخصیص نہیں اہل وعیال کی۔ یہ تو قرآن میں اس امر ونہی کی تاکید ہے۔ اسی طرح حدیث میں تاکید ہے۔ ارشاد ہے: "کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته". (یعنی ہر ایک تم میں سے نگہبان ہے اور ہر ایک تم میں سے اپنی رعیت کے بارے میں پوچھا جاوے گا) اس سے بھی معلوم ہوا کہ دوسرے کی اصلاح بھی ضروری ہے، اگر دوسرے کی اصلاح ضروری نہیں ہے تو پھر ان آیات اور احادیث کے کیا معنی ہیں۔

غرض یہ مسئلہ اتنا بدیہی ہے کہ اب زیادہ تفصیل سے شرم آتی ہے مگر کیا کروں۔ اس وقت ایک ایسا واقعہ پیش آیا ہے جس کی خبریں اخباروں میں آپ کو بھی معلوم ہیں کہ ہمارے مسلمان بھائیوں کو دوسری قومیں مرتد بنا رہی ہیں۔ اس کے متعلق مجھے ایک آیت یاد آئی:

"وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"

اس کے ترجمہ سے اس وقت کی حالت کا اندازہ کر کے آپ کو عبرت ہوگی۔ ترجمہ یہ ہے (کہ کفار تو دل سے پسند کرتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ تا کہ سب برابر ہو جاویں ض جیسے ایک کبڑے سے کسی نے پوچھا تھا کہ تو اپنا اچھا ہونا چاہتا ہے یا دوسروں کو کبڑا ہونا، کہنے لگا کہ دوسروں کا کبڑا ہونا تا کہ میں بھی دوسروں کو اس نظر سے دیکھ لوں جس نظر سے لوگوں نے مجھ کو دیکھا ہے۔

تو کفار تو یہ چاہتے ہیں کہ تم سب ان کے برابر ہو جاؤ۔ آگے مسلمانوں کو ارشاد ہے کہ "فلا تتخذوا منهم اولياء" (ان سے دوستی اور اتحاد مت کرو) کیونکہ جب ان کی یہ حالت ہے کہ وہ دل سے تمہارا کافر ہونا پسند کرتے ہیں تو لامحالہ وہ تم سے مل کر اسی کی کوشش کریں گے۔ افسوس مسلمانوں کو تو ان سے ملتے ہوئے اس کا خطرہ بھی نہیں ہوتا کہ ان کو مسلمان بنا دیں اور وہ ہر وقت دل میں یہی خیال رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر بنا دیں۔

صاحبو! برائے خدا تم ان سے دوستی اور اتحاد مت کرو۔ ہاں تھوڑی سی اتنی

رعایت کر دیا کرو کہ وہ تمہارے اخلاق کے گرویدہ ہو کر اسلام کا اثر قبول کریں مگر افسوس وہ تو رات دن اس کوشش میں منہمک ہیں کہ پرانے مسلمانوں کو بھی کافر بنا دیں اور ہمیں اس کی بھی پروا نہیں کہ ہمارے جو بھائی پہلے سے مسلمان ہیں ان کو ہی اسلام کے اندر رکھنے کی کوشش کریں۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے تو کس جانفشانی سے اسلام پھیلایا تھا آج ہم اپنی غفلت سے اسے مٹا رہے ہیں۔ (الصلاح والاصلاح ج ۴)

اشاعت اسلام کا سبب

بعض اہل کفر کا مسلمانوں پر یہ بھی اعتراض ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے۔ اب ہمارا زور ہے ہم اس زور سے کام لے رہے ہیں مگر یہ بالکل ہی غلط ہے دراصل شمشیر کا استعمال مزاحمت کے روکنے اور مدافعت کے واسطے تھا یعنی حفاظت اسلام کے لیے تھا نہ کہ اشاعت اسلام کے لیے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے اس کا خوب ہی جواب دیا ہے کہ بزور شمشیر اسلام پھیلانے کے لئے شمشیر زنوں کی بھی تو ضرورت ہے تو وہ شمشیر زن کس شمشیر کے زور سے جمع ہوئے جنہوں نے بزور شمشیر اسلام پھیلایا۔ دراصل اسلام پھیلا ہے اخلاق سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اخلاق سے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے۔ چنانچہ سیر و تواریخ اس پر شاہد ہیں۔ اگر ہم بھی ویسے ہی پکے مسلمان ہو جائیں تو سچ جانئے کہ کفار ہمیں بھی دیکھ دیکھ کر مسلمان ہونے لگیں۔ (الصلاح والاصلاح ج ۴)

مسلمان اور کافر کا فرق

ایک شخص نے کسی کافر سے کہا تھا کہ مسلمان ہو جاؤ، اس نے کہا کہ میں ایسا مسلمان تو نہیں ہو سکتا جیسے بایزید ہیں کیونکہ اس پر قدرت نہیں اور ایسا مسلمان ہونا جیسے تم ہو، میں پسند نہیں کرتا اس سے تو میں کافر ہی اچھا۔

صاحبو! اس کافر کا یہ کہنا تو بالکل ہی لغو ہے، کافر تو مسلمان سے کسی طرح اچھا ہو ہی نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ ظالم مسلمان رحم دل کافر سے بھی بدرجہا یقیناً بہتر ہے اور رحم دل کافر کو مسلمان سے بہتر وہی کہے گا جسے دنیا کا بھی قانون معلوم نہیں۔ (الصلاح والاصلاح ج ۴)

حدیث شریف میں ہے کہ "لاینبغی للمؤمن ان یذل نفسه" (یعنی مومن کو

مناسب نہیں کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے) صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مومن اپنے آپ کو کس طرح ذلیل کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "**یتحمل من البلاء مالا یطیقه**" (ایسی بلا اپنے ذمہ لے جس کے تحمل کی طاقت نہیں ہے) (اصلاح والا صلاح ج۴)

صدقہ کی برکات

حدیث میں ہے: "**مانقص المال من صدقة قط او كما قال**". (مجمع الزوائد للهيثمي ۳: ۱۱۰)

(صدقہ سے مال کبھی کم نہیں ہوتا) اس کا یہ مطلب نہیں کہ دس روپے میں سے اگر دو روپے دے دو تو وہ آٹھ نہ رہیں گے دس ہی رہیں گے یا اسی وقت بیس ہو جائیں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مال میں برکت ہوگی اور کچھ دنوں کے بعد مال بڑھ جائے گا۔ ایک طریقہ برکت کا یہ بھی ہے کہ مال چوری سے اور دوسری آفتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ کیا تھوڑی بات ہے اور اگر کچھ بھی نہ ہوتا تو مسلمان کے لیے یہ کیا کم ہے کہ صدقہ سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ مسلمان کی شان سے نفع دنیا کی طلب بعید ہے۔ اس کو صدقہ خیرات سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی طلب کرنا چاہیے۔ حکام دنیا کے لیے لوگ کتنا خرچ کرتے ہیں، پھر خدا کے لیے خرچ کرنا کیوں مشکل ہے۔ پھر خدا تعالیٰ کے حقوق جو شرعاً مقرر ہیں کچھ زیادہ نہیں ہیں بلکہ بہت تھوڑے سے ہیں جن کا ادا کرنا بہت سہل ہے پھر جس عنوان سے اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق کا اس آیت میں ذکر فرمایا ہے اس نے تو اور بھی سہل کر دیا۔ چنانچہ اول تو یہ ارشاد ہوا کہ ان باغات اور زراعات کو اللہ تعالیٰ نے بھی پیدا کیا ہے۔ انشاء...... الخ میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب یہ خدا کا دیا ہوا، اسی کا پیدا کا ہوا ہے تو اللہ کے نام پر خرچ کرنا دشوار کیوں ہے۔

آں کہ جاں بخشد اگر بکشد رواست

(جس نے جان عطا کی اگر وہ اسے لے لیں تو جائز ہے)

دوسرے اس میں ایک اور نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ نعمت کے بیان سے منعم کے ساتھ مخاطب کو محبت ہو جاتی ہے اور محبت کے بعد محبوب کے نام کے دو مقتضی ہیں۔ ایک یہ کہ سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے تو بڑے شرم کی بات ہے کہ اس کے نام پر خرچ نہ کیا جائے اور اس کا شکر نہ ادا کیا جائے۔ دوسرے اس عنوان کو محبت پیدا کرنے میں بڑا دخل ہے اور محبت بھی اسباب یسر سے ہے۔ (العنبر ج۴)

قرآنی افادات

قرآنی آیت وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ میں ایک نکتہ عجیب اسی وقت سمجھ میں آیا ہے اور وہ میرے مقصد کی پوری دلیل ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے تو اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ یہ فرماتے **لاتقولوا علی عیسیٰ الا الحق**، یعنی عیسیٰ پر سوائے حق بات کے مت کہو۔ پھر علی اللہ کیوں فرمایا؟ پس سمجھئے کہ علی اللہ فرمانے میں اشارہ اس طرف ہے کہ جب مخلوق کی شان میں حد سے تجاوز کرو گے تو یہ ضرور خدا تعالیٰ کی تنقیص ہوگی۔ پس عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنا یہ تنقیص ہے باری تعالیٰ کی۔ یہاں سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ہم لوگ جو بدنام ہیں کہ یہ رسول اللہ کی مدح سے منع کرتے ہیں تو جو مدح حد کے اندر ہو اس کو ہم اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ ہاں ہم خدا تعالیٰ کی تنقیص کو منع کرتے ہیں پس رسول کی اتنی مدح کرنا کہ جس سے حق تعالیٰ کی شان میں بے ادبی ہو۔ یہ رسول کی تو ظاہراً مدح ہوگی لیکن واقع میں اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہوگی۔ ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص کسی کی اتنی مدح کرے کہ اس کے باپ کی اہانت ہو جاوے۔ پس ایسی مدح کو وہ بیٹا بھی پسند نہ کرے گا بلکہ اس سے ناراض ہوگا۔

پس **لاتقولوا علی اللہ الا الحق** سے صاف ظاہر ہو گیا کہ مدح کے اندر حد شرعی سے بڑھنا یہ خدا تعالیٰ کی تنقیص ہے۔ آگے جو ارشاد ہے اس سے میرا مقصود جو نکتہ کے عنوان سے بیان کیا ہے بہت صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ **لاتقولوا علی اللہ الا الحق** بھی اس مدح عیسوی ہی کے متعلق ہے اور وہ ارشاد یہ ہے۔

اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ

"یعنی مسیح عیسیٰ ابن مریم اور کچھ نہیں ہیں صرف اللہ کے رسول ہیں"۔

پس اگر آیت کے یہ معنی نہ ہوں جو میں نے بیان کئے ہیں تو درمیان میں **لاتقولوا علی اللہ الا الحق** (اور اللہ پر بجز حق بات کے مت کہو) بالکل بے ربط معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اول و آخر میں تو عیسیٰ علیہ السلام کا بیان ہے اور درمیان میں **لاتقولوا علی اللہ الا الحق** کے کیا معنی ہیں؟ پس صاف ظاہر ہے کہ مدعا یہی ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کی جزئیت کے قائل ہو گے تو اللہ تعالیٰ پر بہتان ہوگا اور اس سے تنقیص جناب باری تعالیٰ کی لازم آئے گی پس مدح بھی اسی وقت تک جائز ہوگی کہ حد سے نہ گزرے۔ (الظہور ج ۵)

ایک عوامی غلطی کا ازالہ

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ صوفیوں کے پاس کچھ علوم و احکام شریعت سے علیحدہ بھی ہیں سو یہ بالکل غلط ہے ان کا علم قرآن و حدیث سے ہی ہے۔ فرق اتنا ہی ہے کہ اور لوگ سمجھتے نہیں اور وہ حضرات سمجھتے ہیں اور یہ خیال لوگوں کا بہت پرانا ہے۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ بات مشہور ہوگئی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ علوم و احکام ایسے پہنچے ہیں کہ کسی دوسرے کو نہیں بتائے گئے لیکن اس کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار خود حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کا قول کافی ہے مگر ان سے پوچھے کون! سو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ کسی باہمت نے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھ بھی لیا۔ چنانچہ بخاری کی جو کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا۔

هل خصكم رسول الله صلى الله عليه وسلم بشئي دون الناس

یعنی کیا تم کو حضور نے ایسی خاص بات بتائی ہے جو اوروں کو نہیں بتائی۔

قال لا الا فهما اوتيه الرجل في القران.

فرمایا ہرگز نہیں مگر ہاں ایک سمجھ جو آدمی کو قرآن یعنی دین کے اندر عطا ہوتی ہے۔

پس حضرات صوفیہ و اہل اسرار کو حق تعالیٰ نے قرآن و حدیث کی سمجھ ایسی عطا فرمائی ہے کہ وہ اس سمجھ سے کام لے کر جب کسی کو سمجھاتے ہیں تو بعد ان کے بتانے کے سمجھ میں آ جاتا ہے کہ یہ قرآن و حدیث ہی ہے اور لوگوں کو بدوں ان کے بتائے سمجھ میں نہیں آتا اور یہی معیار ہے۔ ان تحقیقات کے صحیح اور ثابت ہونے کا کہ اگر بعد سمجھانے کے یہ روز روشن کی طرح معلوم ہونے لگے کہ یہ تحقیقات قرآن و حدیث کے خلاف نہیں تو وہ صحیح ہیں اور اگر بعد سمجھانے کے بھی مخالف معلوم ہوں تو غلط اور تصنیف یاراں ہے۔ (الظہور ج ۵)

گناہ کے تاریک اثرات

الحمد للہ! اللہ تعالیٰ نے آنکھیں عطا فرمائی ہیں گو بعض وقت نفس کے غلبہ و شرارت سے ان سے کام نہ لیں۔ پس ان آنکھوں سے ہم کو صاف نظر آتا ہے کہ جب کوئی بھی گناہ ہوا ہے۔ اس سے قلب میں ایک روگ پیدا ہوگیا ہے اسی روگ کی نسبت حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ

(یعنی ”بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کے رنگ کا غلبہ ہو گیا ہے“۔ اور اسی کی نسبت حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو قلب پر ایک داغ لگ جاتا ہے۔ اگر توبہ کر لے تو وہ مٹ جاتا ہے ورنہ بڑھتا ہے۔) مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

ہر گناہ رنگے ست برمراۃ دل   دل شود زیں رنگہا خوار و خجل
چوں زیادت گشت دل را تیرگی   نفس دوں را بیش گرد و خیرگی

(ہر گناہ دل کے آئینہ پر ایک زنگ ہے کہ دل ان زنگوں سے خوار و شرمندہ ہوتا ہے جب دل کی تاریکی زیادہ بڑھ جاتی ہے تو نفس کمینہ کو اس سے خیرگی ہوتی ہے۔ (السرور ج ۵)

ماہ ربیع الاول کی فضیلت

اس مہینہ کی اسلام میں بڑی فضیلت ہے اور یہ تمام مہینوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

ربیع فی ربیع فی ربیع   و نور فوق نور فوق نور

بہار پر بہار پر بہار ہے اور نور پر نور اس پر بھی نور ہے۔

باقی یہ گفتگو تو فضول ہے کہ ربیع الاول افضل ہے یا رمضان افضل ہے ایک عارف ایسے سوالات کی نسبت فرماتے ہیں کہ یہ سوال ایسا ہے جیسا کہ یہ سوال کیا جائے کہ پانی افضل ہے یا کھانا ظاہر ہے کہ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ تفضیل نوع واحد کے افراد میں ہوا کرتی ہے نہ کہ نوعین مختلفین میں کھانا اور پانی ایک نوع نہیں ہیں بلکہ دو نوع ہیں ہر نوع اپنے درجہ میں مستقل ہے ہر ایک کے خواص جدا ہیں پانی اپنے خواص میں افضل ہے اور کھانا اپنے خواص میں افضل ہے اس لئے ان میں تفضیل کا سوال ہی فضول ہے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ نوع واحد کے افراد میں بھی ہر فرد کا حسن الگ ہے اور اختلاف مذاق کے اعتبار سے یہ ہو سکتا ہے کہ ایک فرد کسی کے نزدیک حسین ہو دوسرے کے نزدیک حسین نہ ہو۔ (نور النور ج ۵)

لوح محفوظ کی مثال

مولانا محمد قاسم صاحب نے دیانند سرستی کے مقابلہ میں ایک دفعہ اس نے سوال کیا۔

مسلمان کہتے ہیں کہ لوح محفوظ میں اول خلقت سے قیامت تک کے تمام واقعات لکھے ہوئے ہیں اور واقعات تو لاتعد ولاتحصی ہیں تو وہ کتاب بہت ہی بڑی ہوگی پھر وہ رکھی کہاں جاتی ہوگی۔

یہ سوال ایسا ہی تھا جیسے دو شخصوں میں بحث ہوئی۔ ایک نے کہا کہ ہمارے دادا کے ہاں اتنا بڑا اصطبل تھا کہ اگر ایک کونہ میں گھوڑی نے بچہ دیا تو دوسرے کونہ تک پہنچتے ہی پہنچتے بوڑھا ہو جاتا ہے۔ دوسرے نے کہا جی ہاں پہلے لوگوں کے کارنامے ایسے ہی ہوتے تھے ہمارے دادا کے یہاں ایک بانس اتنا بڑا تھا کہ جب بارش نہ ہوتی تو وہ بادلوں میں اس سے سوراخ کر دیا کرتے تھے جس سے بارش ہو جایا کرتی تھی۔ پہلا شخص بولا کہ اتنا جھوٹ بھلا اتنا بڑا بانس رکھا کہاں جاتا ہوگا۔ کہا آپ کے دادا کے اصطبل میں رکھا جاتا تھا کیونکہ میرے دادا اور آپ کے دادا بہت دوست تھے۔

تو جیسے اس شخص کو اس بانس کے متعلق یہ اشکال ہوا کہ وہ کہاں رکھا جاتا ہوگا ایسے ہی دیانند کو لوح محفوظ پر شبہ ہوا کہ وہ کہاں رکھی جاتی ہوگی مولانا نے اس کا جلدی جواب نہیں دیا بلکہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے کہ لالہ جی! آپ کی کتنی عمر ہے؟ اس نے کہا ستر برس کی۔ مثلاً پوچھا کہاں کہاں تعلیم حاصل کی ہے کیا کیا پڑھا ہے؟ اور آپ کو اپنے بچپن کے واقعات بھی کچھ یاد ہیں؟ اس نے بیان کیا کہ میں نے پہلے وہاں تعلیم حاصل کی پھر وہاں اور میں نے اتنی کتابیں دیکھیں اور اتنی کتابیں پڑھیں۔ اور میں نے اتنے سال سیاحت کی۔ مولانا نے پوچھا کہ یہ سب واقعات آپ کو یاد ہیں کہا ہاں! اور بچپن کے واقعات بھی بہت یاد ہیں اور جوانی کے اور سیر و سیاحت و تعلیم وغیرہ کے واقعات تو گویا اس وقت میرے سامنے ہیں۔ غرض اس نے اپنے حافظہ کی بہت تعریف کی۔ مولانا نے پوچھا کہ یہ سب واقعات آپ کو محفوظ ہیں اس نے بڑے دعوے سے کہا جی ہاں۔ بجنسہ سب محفوظ ہیں۔ اب مولانا نے فرمایا کہ لالہ جی! اس ذرا سے دماغ میں جو ایک بالشت سے بھی کم ہے ستر برس کے واقعات اور کتابوں کے مضامین اور لوگوں کی باہمی تقریریں اور ابحاث کس طرح سما گئے اس پر وہ خاموش ہوا۔

مولانا نے فرمایا کہ لوح محفوظ کی نظیر تو خود آپ کے اندر موجود ہے آپ کا دماغ پھر حیرت ہے کہ آپ لوح محفوظ پر یہ سوال کرتے ہیں کہ وہ کہاں رکھی جاتی ہو گی۔ آپ کو کبھی اپنے دماغ پر شبہ نہ ہوا کہ اس ذرا سے دماغ میں اس قدر بے شمار واقعات و مضامین کس طرح محفوظ رہتے ہیں۔ (نور النور ج ۵)

ایک اشکال کا جواب

ایک اشکال پچھلے دنوں بہت مشہور ہوا تھا۔ وہ یہ کہ اخباروں میں شائع ہوا تھا کہ امریکہ میں ایک شخص کے دو دل ہیں اور اخباروں کو آج کل ایسا سمجھتے ہیں جیسے وحی آسمانی چاہئے تو یہ تھا کہ اس خبر میں اشکال کیا جاتا مگر وہ اخباری خبر تھی غلط کیسے ہو سکتی تھی۔ بعض مسلمانوں کو اس خبر سے قرآن پر اشکال ہو گیا کہ قرآن میں جو آیا ہے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ

یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔

کہ حق تعالیٰ نے کسی آدمی کے دو دل نہیں بنائے۔ یہ آیت اس خبر کے معارض ہے تو اس آیت کا کیا مطلب ہے۔ ہمارے بعض لکھے پڑھے لوگ بھی اس اعتراض سے متاثر ہو گئے۔ چنانچہ مجھ سے بھی ایک صاحب نے سوال کیا۔ میں نے کہا کہ قرآن میں ما جعل صیغہ ماضی آیا ہے جس سے زمانہ ماضی میں کسی کے دو دل ہونے کی نفی ہے زمانہ مستقبل میں ایسا ہونے کی نفی نہیں۔ سو نزول قرآن کے وقت تک تو کسی کے دو دل نہیں ہوئے اس لئے قرآن پر اشکال جب ہوگا جب کہ نزول قرآن کے وقت یا اس سے پہلے کسی کے دو دل ہوئے ہوں۔ سو اس کا جواب ہم اس وقت دیں گے جب کہ پہلے کسی معتبر دلیل سے آپ اس کو ثابت کر دیں۔ ابھی ہمارے ذمہ جواب ہی نہیں۔ بس اس جواب کے بعد کوئی آگے نہیں چل سکا۔

ایسے جاہلوں کو مختصر رستہ سے لے جانا چاہئے۔ علمی تدقیقات سے یہ لوگ نہیں سمجھتے (جیسا کہ بعض نے کہا ہے حق تعالیٰ نے جوف میں دو قلب ہونے کی نفی کی ہے تو اس شخص کے جوف میں دو قلب نہیں ہوں گے بلکہ ایک جوف میں ہوگا دوسرا دماغ وغیرہ میں ہوگا۔ اس جواب سے معترض ساکت نہیں ہو سکتا) اور ما جعل کو صیغہ ماضی کہہ کر جواب دیا گیا ہے۔ یہ مسکت بھی ہے اور صحیح بھی ہے اور اس کی ضرورت بھی بعد تسلیم خبر کے ہے ورنہ اصل بات تو یہ ہے کہ یہ خبر ہی غلط تھی کیونکہ اس شخص کے دل کو کسی نے دیکھا تھا یا دل دو ہی ہوں گے مگر مدرک ایک ہو تو دل وہی ہوگا۔ (المورد الفرخی فی المولد البرزخی ج ۵)

اجزائے آخرت

آخرت کے دو جزو ہیں ایک زمان آخرت تو وہ بعد قیامت کے شروع ہوگا اور ایک مکان آخرت وہ ابھی موجود ہے یعنی سموات۔ یہ شیخ ابن عربی کی تحقیق ہے۔

اس تحقیق سے انہوں نے ایک اشکال کا جواب بھی دیا ہے وہ یہ کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں رویت حق تعالیٰ ہوئی ہے۔ اس پر اشکال ہوتا ہے کہ آخرت سے قبل رویت باری تعالیٰ کی ممتنع عادی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے ہوئی۔

اس اشکال نے علماء کے دانت کھٹے کر دیئے۔ کوئی اس کا جواب ایسا شافی نہیں دے سکا جیسا شیخ اکبر نے دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور کو دنیا میں رویت نہیں ہوئی بلکہ آخرت میں ہوئی ہے اور آخرت کا جیسا ایک جزو زمان آخرت ہے ایک جزو اس کا مکان آخرت بھی ہے جو اس مکان دنیا سے مافوق ہے۔ معراج کے وقت آپ مکاناً آخرت میں تھے۔ اس سے ساری گتھیاں کھل گئیں۔

بہر حال معراج میں باوجود انتقال الی الآخرت کے مفارقت کا کسی کو رنج نہیں ہوا کیونکہ مفارقت دائمہ نہ تھی۔ (المورد الفرخی فی المولد البرزخی ج ۵)

عصاۃ کو بھی نجات اولیٰ حاصل نہیں تو دونوں میں فرق کیا ہوا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب کیا ہوگا کہ ان میں ناجی صرف ایک فرقہ ہے معلوم ہوا کہ فرقہ ناجیہ کو تو کبھی نہ کبھی نجات حاصل ہو جائے گی اور باقی بہتر فرق کو کبھی نجات حاصل نہ ہوگی تو یہ اہل بدعت کیونکر نجات پا سکتے ہیں۔ اگر اس کا التزام کیا جاوے تو اہل بدعت کی عدم تکفیر کے کیا معنی؟

جواب یہ ہے کہ مراد حدیث میں یہ ہے کہ وہ بہتر بوجہ فساد عقیدہ کے جہنم میں جائیں گے اور اہل حق جو کہ فرقہ ناجیہ ہے فساد عقیدہ کی وجہ سے جہنم میں نہ جائیں گے دونوں میں مابہ الفرق دخول للفساد والعقائد ہے۔ باقی دخول للعمل یہ دونوں میں مشترک ہے پس اس تقریر کے بعد اہل بدعت کا خلود ثابت نہ ہوا۔ اور اس تقریر کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ نص قطعی فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ سے معلوم ہے کہ اور جو کوئی ذرہ برابر برائی کرے گا اس کو بھی دیکھے گا اور جو کوئی ذرہ برابر بھلائی کرے گا اس کو بھی دیکھ لے گا تو جس شخص میں کچھ ایمان ہے اگرچہ فساد عقیدہ ہی کے ساتھ ہے تو اگر وہ بھی

ناجی نہ ہوتو وہ اس کی جزا کب پائے گا۔ آیا قبل دخول نار یا بعد دخول نار۔ قبل دخول نار تو محال ہے ورنہ لازم آتا ہے کہ وہ اول جنت میں جاوے اور پھر وہاں سے خارج ہو کے جہنم میں جاوے اور نصوص سے معلوم ہے کہ بعد دخول جنت کسی کو عذاب نہ ہوگا۔ اور اگر جنت کے سوا اور کہیں ثواب پاوے تو جنت سے پہلے کوئی اور موقع ثواب کا نہیں۔ بس یہی ایک صورت ہے کہ وہ اپنے ایمان قلیل کی جزا بعد دخول نار پائے کہ جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہو ورنہ اگر کہیں جزا نہ ملے تو لازم آئے گا کہ کوئی عمل صالح ایسا بھی ہوا جس کا کوئی صلہ کرنے والے کو نہ ملے اور یہ اس آیت کے خلاف ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اہل بدعت کو خلود ہوگا کبھی نجات نہ ہوگی بلکہ کبھی نہ کبھی تو نجات ضرور ہو جائے گی۔ گو اس سے پہلے عذاب بھی بھگتنا پڑے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ جو عذاب فساد عقائد سے ہو وہ اشد ہے اس عذاب سے جو فساد عمل سے ہو۔ چنانچہ احادیث اور بزرگوں کے اقوال سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اہل بدعت کو دوسرے فساق سے زیادہ سخت عذاب ہوگا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک جگہ میرا گزر ہوا تو کچھ ایسا معلوم ہوا کہ اہل قبور کو عذاب ہو رہا ہے ہم نے ان کے لئے دعا کی تو معلوم ہوا کہ اہل بدعت کے سوا سب کی اس وقت مغفرت ہو گئی۔

اس لئے یوں تو سب گناہوں سے مسلمان کو بچنا چاہئے کیونکہ مقصود اعلیٰ نجات اکمل ہی ہے اور وہ بدوں گناہوں سے بچے حاصل نہیں ہو سکتی مگر بدعت سے بہت زیادہ اجتناب ضروری ہے کیونکہ بدعت حق تعالیٰ شانہ کو بہت مبغوض ہے۔ اس لئے کہ دیگر اعمال تو لوگ حرام اور گناہ سمجھ کر کرتے ہیں اور افعال بدعت کو نیکی سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس سے توبہ کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ (راس الاربعین ج ۵)

صحبت کی برکات

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بارہا ایسا قصہ پیش آیا کہ وحی سے ان کو توافق ہو گیا۔ بعض دفعہ تو وحی ان کی رائے کے موافق نازل ہوئی اور بعض دفعہ بلفظ توافق ہوا کہ وحی انہیں الفاظ میں نازل ہوئی جو حضرت عمر کی زبان سے نکلے تھے مگر ان کو ایک دفعہ بھی یہ خیال نہ ہوا کہ میں کچھ ہوں اور مجھ پر بھی وحی آتی ہے بلکہ وہ اس کی حقیقت کو سمجھتے تھے کہ یہ محض حضور کی صحبت کی برکت ہے جو ہمارے قلب میں تھوڑی سی نورانیت حضور کے طفیل سے پیدا ہو گئی ہے کہ بعض دفعہ وہی بات دل میں آجاتی ہے جس کے موافق وحی نازل ہونے والی ہے بلکہ

حضرت عمر کو اس پر ناز تو کیا ہوتا بعض دفعہ کسی واقعہ میں جب ان کی رائے میں اور حضور کی رائے میں اختلاف ہوتا اور وحی حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق نازل ہوتی تو حضرت عمر بجائے خوش ہونے کے شرمندہ ہوتے اور کئی کئی دن تک شرمندہ رہتے۔

چنانچہ عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) کے قصہ موت میں حضرت عمر نے حضور سے گفتگو کی تھی کہ آپ اس منافق کے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں کیونکہ حق تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ ان منافقوں کی بابت آپ کتنا ہی استغفار کریں ہم ان کی مغفرت ہرگز نہ کریں گے (اور نماز جنازہ کی حقیقت دعاؤ استغفار ہی ہے تو ان کے لئے دعا نہ کرنا چاہئے) حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم خواہ ان کے لئے استغفار کریں یا ان کے لئے استغفار نہ کریں اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے ستر بار بھی استغفار کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہ بخشے گا۔)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر! اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے صراحۃ ان کے لئے استغفار کرنے سے منع نہیں فرمایا اور اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میرے ستر سے زیادہ استغفار کرنے سے حق تعالیٰ بخش دیں گے تو میں ستر سے زیادہ استغفار کرلوں گا۔ اس گفتگو کے بعد آپ نے نماز جنازہ پڑھادی۔ وہاں سے ہٹنے بھی نہ پائے تھے کہ وحی نازل ہوئی۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓي اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰي قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ

(اور ان میں اگر کوئی پر جائے اور اس پر کبھی نماز (جنازہ) نہ پڑھئے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو جیئے انہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ حالت کفر میں مرتے ہیں۔)

جس میں حضرت عمر کی رائے کی پوری موافقت تھی۔ حضور نے حضرت عمر سے فرمایا کہ اے عمر! حق تعالیٰ نے تمہاری رائے کو قبول فرمایا۔ حضرت عمر بہت ہی شرمندہ ہوئے کہ یہ کیا ہوا۔ میں نے حضور سے کیوں اختلاف کیا تھا۔ روایات میں حضرت عمر کا قول آتا ہے۔

فعجبت من جراء تی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رواہ البخاری

(پس مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس جرات پر حیرانی ہوئی۔)

بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو عبداللہ بن عمر سعد بن ابی سرح کے واقعہ میں توافق

بالوحی نہ تھا کیونکہ وہاں وحی نازل ہو چکی تھی صرف انعکاس تھا کہ آپ کے دل میں جو الفاظ منزلہ موجود تھے ان میں سے ایک جملہ اس کے قلب میں آ گیا اور یہ کچھ زیادہ عجیب بات نہیں۔ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کے دل میں جو بات ہوتی ہے پاس بیٹھنے والے پر اس کا عکس پڑ جاتا ہے اور اس کی زبان سے وہی بات نکل جاتی ہے جو پہلے شخص کے دل میں تھی۔ چنانچہ ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ میاں تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی ۱۲ جامع) اور حضرت عمر کے واقعہ میں وحی اب تک نازل بھی نہ ہوئی تھی۔ واقعہ اختلاف کے بعد وحی نازل ہوئی جو ان کی رائے کے مطابق تھی اور بعض دفعہ تو الفاظ بھی وہی ہوتے تھے مگر ان کو ایک دفعہ بھی اس پر ناز نہ ہوا بلکہ اس کو حضور ہی کی صحبت کی برکت سمجھتے تھے۔

غرض امتی اپنے کو مستقل سمجھنے سے بالکل کورا رہ جائے گا۔ سارے کمالات سلب ہو جائیں گے جیسا ابن ابی سرح کے واقعہ میں ہوا۔ پس کمالات امت کے لئے آپ واسطہ فی العروض ہی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے لئے واسطہ فی الثبوت ہیں۔ (الرفع والوضع ج ۵)

واقعہ حضرت یونس علیہ السلام

مولانا نے مثنوی دفتر سوم میں ایک مقام پر حدیث لاتفضلونی علی یونس بن متی (مجھے حضرت یونس بن متی علیہ السلام پر فضیلت نہ دو) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ۔

گفت پیغمبر کہ معراجک مرا نیست از معراج یونس اجتبا
آں من بالا و آں او بشیب زانکہ قرب حق برونست از حسیب
قرب تر پائیں ببالا جستن است قرب حق از حبس ہستی رستن است

پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ میری معراج حضرت یونس علیہ السلام کی معراج سے برگزیدہ نہیں ہے میری معراج عروجی تھی اور انکی نزولی اس لئے کہ قرب حق حساب سے باہر ہے قرب حق کی حقیقت ارتفاع مکانی نہیں ہے بلکہ قرب حق قید ہستی سے چھوٹنا ہے۔

اس تفسیر میں اشارہ اس طرف ہے کہ حدیث عام ہے جس میں وہ سب امور داخل ہیں جن میں تفصیل سے وہم تنقیص ہوسکتا ہے۔ پس مطلب حدیث کا یہ ہوا کہ جن باتوں میں تم کو میری فضیلت اور یونس علیہ السلام کے نقص کا شبہ ہو اس میں مجھ کو یونس علیہ السلام پر فضیلت نہ دو جن میں قصہ معراج بھی داخل ہے کہ حضور تو ساتوں آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ آپ کو

اس طرح معراج ہوئی اور یونس علیہ السلام عرصہ تک مچھلی کے پیٹ میں رہے ظاہر بینوں کو ان کی یہ حالت ناقص معلوم ہوتی ہے مولانا فرماتے ہیں کہ ان کی یہ حالت ناقص نہ تھی بلکہ یہ یونس علیہ السلام کی معراج تھی جو بصورت نزول واقع ہوئی پس حضور کی معراج کو یونس علیہ السلام کی معراج پر فضیلت نہ دو (یعنی ایسی فضیلت جس سے وہم ان کے نقص کا ہو) اور یہ مت سمجھو کہ معراج صرف حضور ہی کو ہوئی ہے۔ یونس علیہ السلام کو نہیں ہوئی۔ ایسا نہیں ہے بلکہ ان کو بھی ہوئی۔ مچھلی کے پیٹ میں ان کا جانا یہ بھی معراج ہی تھی کیونکہ معراج کی حقیقت ہے یہ حضور کو قرب حق اور صورت سے حاصل ہوا عروجاً بھی اور نزولاً بھی اور یونس علیہ السلام کو قرب حق اور صورت سے حاصل ہوا کہ وہ دریا میں ہوئے اور مچھلی کے پیٹ میں رہے۔

جس کا قصہ مشہور ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو عذاب الٰہی سے ڈرایا اور فرمایا کہ ایمان لے آؤ ورنہ اتنی مدت میں عذاب نازل ہوگا۔ جب وہ مدت قریب آئی تو آپ اس خیال سے کہ یہاں عذاب نازل ہوگا وہاں سے چل پڑے مگر حق تعالیٰ سے صریح اذن نہیں لیا۔

اور یہاں یہ قصہ ہوا کہ جب وہ تاریخ آئی' عذاب کی آمد شروع ہوئی۔ یہ آثار دیکھ کر لوگ گھبرائے اور ایمان پر آمادہ ہوئے اور یونس علیہ السلام کو تلاش کیا کہ ان کے ہاتھ پر ایمان لائیں۔ یہ نہ ملے تو انہوں نے کہا کہ اگر یونس علیہ السلام نہیں ہیں تو کیا ہوا ان پر اور حق تعالیٰ پر ایمان لانا تو ممکن ہے چنانچہ ایمان لے آئے اور عذاب ٹل گیا یونس علیہ السلام لوگوں سے اس بستی کا حال پوچھتے رہتے تھے۔ جب کسی نے عذاب کی خبر نہ سنائی اور پورا واقعہ معلوم نہ ہوا تو آپ کو خیال ہوا کہ اب اگر واپس بستی میں جاؤں گا تو وہ لوگ جھٹلائیں گے کہ تمہارے قول کے موافق عذاب تو نہ آیا۔ اس شرمندگی کی وجہ سے واپس نہ ہوئے بڑھے چلے گئے راستہ میں دریا پڑا اور آپ کشتی میں سوار ہوئے چلتے چلتے وہ کشتی چکر کھانے لگی ملاح نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ اس کشتی میں کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگا ہوا سوار ہے اس وقت یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں بھائی! میں اپنے آقا سے بدوں اجازت بھاگ آیا ہوں مجھے دریا میں ڈال دو۔ لوگوں نے ان کی صورت سے نیکی اور بزرگی کے آثار دیکھ کر اس کلام میں شبہ کیا بالآخر قرعہ اندازی ہوئی جس میں یونس علیہ السلام کا نام نکلا۔

چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ یونس علیہ السلام نے قرعہ اندازی کی تو وہی ہارے۔ پس لوگوں نے ان کو دریا میں ڈال دیا۔ وہاں ایک بہت بڑی

مچھلی تھی اس نے بحکم حق آپ کو نگل لیا اور قعر دریا میں پہنچی چالیس دن اس کے پیٹ میں رہے مگر ہضم نہیں ہوئے حق تعالیٰ نے حفاظت فرمائی مولانا اس کو معراج قرار دے کر فرماتے ہیں۔

قرب حق از حبس ہستی رفتن است　　قرب تر پستی ببالا رفتن است

(قرب پستی سے بالا جانے کا نام ہے اور قرب حق قید ہستی سے آزاد ہونے کا نام ہے۔)

قرب حقیقت ہے معراج کی اور ظاہر ہے کہ قرب حق تمام انبیاء علیہم السلام کو حاصل تھا تو حقیقی معراج سب کو حاصل تھی گو بعض کو صوری نہ ہوئی ہو اور ادریس علیہ السلام کو تو ایک قول پر صوری بھی ہوئی ہے اور مولانا رومی کی تحقیق کے موافق یونس علیہ السلام کو نزولی معراج ہوئی ہے۔ پس ان کو اس طرح قرب ہوا کہ اوپر سے نیچے بلائے گئے اور یہ ضروری نہیں کہ معراج بصورت نزول ناقص ہوا کرے تاکہ اس بناء پر معراج یونسی کو معراج محمدی سے مفضول کہا جاوے گو دوسرے دلائل سے آپ کی معراج سب معراجوں سے افضل ہے مگر محض نزول کو ناقص ماننا اس کی بناء نہیں ہے بلکہ صوفیہ کا مقولہ یہ ہے کہ عروج سے نزول افضل ہے۔ (الرفع والوضع ج ۵)

فرق ملکیت وتصرف

حق تعالیٰ ہمارے مالک ہیں یا نہیں اور پھر مالک ہیں تو مطلقاً یا بعض وجوہ سے یا یوں سمجھئے کہ ہم لوگ ان کی ملک تام ہیں یا ملک ناقص دوسرے یہ دیکھنا چاہئے کہ مالک کو حق ہوتا ہے تصرف کا یا نہیں یعنی حق تصرف مبنی مالکیت پر ہے یا نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ تصرف کرنا موقوف ہے مالک ہونے پر نیز مالک ہونا مقتضی ہے تصرف کرنے کو۔ یعنی جیسا کہ تصرف کرنا موقوف ہے مالک ہونے پر ایسے ہی مالک ہونا مقتضی ہے تصرف کرنے کو یعنی نہ تصرف ہوسکتا ہے بدوں مالکیت کے نہ ملکیت متحقق ہوتی ہے بدوں تصرف کے پہلا قضیہ تو بالکل صاف ہے حتیٰ کہ جہاں بھی تصرف صحیح ہوگا وہاں مالکیت کا ہونا ضروری ہے خواہ ناقص ہو یا تام۔

مثلاً حکام دنیویہ جو رعایا میں تصرف کرتے ہیں اسی بنا پر کہ وہ ایک درجہ میں اپنے آپ کو مالک سمجھتے ہیں گو وہ درجہ لغت میں ملکیت کا ہے یعنی حاکم مالک نہیں ہے صرف ملک ہے ملک کہتے ہیں حاکم کو اور بادشاہ کو اور بادشاہ مالک نہیں ہوتا کیونکہ لوگ اس کے بردے اور غلام نہیں البتہ ایک گونہ اس کو اختیار ہوتا ہے خاص مصالح کی وجہ سے بہرحال یہ ثابت ہوگیا کہ کہیں تصرف نہیں ہوتا بدوں ملکیت کے اگر ہے تو غصب اور ظلم ہے تو تصرف صحیح اور

تصرف بحق بدوں ملکیت کے نہیں ہوتا سو یہ تو بالکل صاف ہے البتہ اس میں ذرا اخفا ہے کہ ملکیت کا تحقق بدوں تصرف کے نہیں ہوتا کیونکہ ظاہراً تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مالک ہونے کے لئے یہ ضرور نہیں کہ تصرف بھی کرے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بادشاہ اور حکام بعض چیزوں کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگاتے غرض اس میں ذرا اخفا ہے۔

تو بات یہ ہے کہ ایک تو وہ مالک ہے جس کا علم ناتمام جس کی شفقت ناتمام جس کی حکمت ناتمام جس کا تصرف ناتمام جس کی ملک ناتمام ایسی ملکیت تو واقعی مقتضی نہیں تصرف کو اور ایک مالک وہ ہے کہ علم اس کا محیط ہر وقت اسے معلوم کہ کون چیز کس حالت میں ہے۔ قدرت اس کی پوری ہر قسم کے تصرف پر وہ قادر توجہ اس کی ایسی کامل کہ ایک قسم کی توجہ دوسری قسم کی توجہ سے مانع نہیں لایشغلہ شان عن شان ایک حال دوسرے حال سے اس کو غافل نہیں کرتا پھر حکم بھی علی الاطلاق کہ سب چیزوں کی مصالح کو محیط ادھر شفقت بھی عام اور تمام نہایت خیر خواہ ہر چیز کی جو مصلحت ہے اس کے موافق اس کو مکمل بھی کرتا ہے ایک مقدمہ تو یہ اور دوسرا مقدمہ یہ کہ تکمیل بلا تصرف نہیں ہوسکتی جو مالک اس شان کا ہوگا وہ ان صفات کی وجہ سے لازم ہے کہ ہر وقت اپنی مملوک چیز میں تصرف کرے۔ حق تعالیٰ کی چونکہ یہی شان ہے اور تمام صفات کمال کی اس میں موجود ہیں تو عادۃً ممکن نہیں کہ وہ ہر چیز میں ہر وقت تصرف نہ کرے۔

پھر تصرف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تصرف تشریعی ایک تصرف تکوینی کسی چیز میں یہ کہ مثلاً اس چیز کا موجود کرنا اس شے کو نشو و نما دینا اس کو صحت دینا اس کو مریض کرنا اس کو ہلاک کرنا اس کو معدوم کرنا یہ تو تصرف تکوینی ہوا۔

ایک تصرف تشریعی ہے یعنی یہ خطاب کرنا کہ فلاں چیز جائز ہے فلاں چیز ناجائز کسی شے کی نسبت امر کرنا کسی شے سے نہی کرنا۔ جب ان کے تصرفات عام ہیں۔ تو جیسا کہ تکوینی تصرف سے کوئی چیز کسی وقت خالی نہیں اسی طرح تشریعی کیفیت و تصرف سے بھی کوئی شے کسی وقت عقلاً خالی نہیں ہوسکتی ہاں اگر کوئی امر اس تصرف سے مانع ہو تو وہ اور بات ہے مثلاً مخاطب میں عقل نہ ہو بلوغ نہ ہو و مثل ذالک۔ پس انسان کو بھی سمجھنا چاہئے کہ وہ اس میں بھی ہر وقت متصرف ہیں۔ اسی تصرف کو اس آیت میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو مالک ہے سارے جہانوں کا۔

تو صلوٰۃ اور نسک تصرفات تشریعیہ ہیں اور محیا و ممات تصرفات تکوینیہ ہیں۔ اس سے ہر قسم کے تصرفات حق تعالیٰ کے لئے ثابت ہوئے۔

آگے فرماتے ہیں لاشریک لہ۔ اور کوئی شخص نہیں ہے جو ان تصرفات میں شریک ہو۔ ہر چیز میں حق تعالیٰ ہی متصرف ہیں اور کسی کا تصرف نہیں۔ تو ایسے تصرف کا انکار کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ضروری بات ہے کہ کسی امر میں بھی ہم کو مہمل نہیں چھوڑا گیا۔ تو لازم آ گئی یہ بات اور ثابت ہو گیا کہ کسی ایک حکم میں بھی ہم کو آزاد نہیں چھوڑا اور کوئی ایسی حالت نہیں جس سے شریعت نے تعرض نہ کیا ہو اب کیا حال ہے ان لوگوں کا جو کہتے ہیں کہ شریعت کا قانون ہماری حالت سے تعرض نہیں کرتا بلکہ بعض سے کرتا ہے بعض سے نہیں کرتا۔

غرض حق تعالیٰ کے قانون کو دنیوی قانون پر قیاس نہیں کر سکتے اس لئے وہاں جو حکام ہیں ان کا تصرف عام نہیں ہے کیونکہ ان کی ملکیت ناتمام ہے اور ملکیت اس وجہ سے ناتمام ہے کہ جو کمالات شرط ہیں ملکیت کے وہ ان میں ناتمام ہیں اور چونکہ حق تعالیٰ کے کمالات تام ہیں اس لئے ان کے صفات بھی عام اور تام ہونے چاہئیں غرض خدا تعالیٰ کا یہ تصرف ہے کہ ہم ان کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں نشو و نما پاتے ہیں صحت یاب ہوتے ہیں مریض ہوتے ہیں اسی طرح یہ بھی تصرف ہے کہ وہ ہم کو ہر حالت میں خطاب کرتے ہیں کہ افعل کذا ولاتفعل کذا۔ یہ کام کرو اور یہ کام نہ کرو یہ حاصل ہے آیت کا۔ (نقد اللبیب فی عقد الحبیب ج ۵)

انسانی تخلیق اور مقصد تخلیق

حق تعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہ فرماتے ہیں اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی ۔ یہاں صرف انسان کو خطاب کیا حالانکہ یہ ثابت ہے کہ جن و انس دونوں جزا و سزا پائیں گے اور جزا و سزا دونوں کو جب ہی ہو سکتی ہے جب دونوں مکلف ہوں۔ جب دونوں مکلف ہیں تو اس خطاب میں انسان کی تخصیص کیوں کی گئی۔ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی ۔

ہاں جنوں کے ثواب کے متعلق البتہ اختلاف ہے۔ چنانچہ امام صاحب کا قول مشہور اور کتب میں منقول ہے کہ وہ جنت میں نہ جائیں گے ان کی جزا یہی ہو گی کہ عذاب سے

نجات ہو جائے گی۔ یہ امام صاحب کا مشہور مذہب ہے۔ باقی جمہور کا مذہب یہ ہے کہ مومنین جن بھی جنت میں جائیں گے۔ دلیل امام صاحب کی یہ مشہور ہے۔

يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ

اس آیت میں جنوں کا قول حق تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے کہ جنوں نے آپس میں کہا تھا کہ کہا مان لو خدا تعالیٰ کے داعی کا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو عذاب الیم سے نجات دے گا۔ یہاں عذاب سے نجات دینے کا وعدہ ہے۔ یہ وعدہ نہیں ہے کہ جنت میں بھی داخل کرے گا۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ سکوت معرض بیان میں ہوتا ہے۔ یہاں جزا کا بیان ہے اگر جزا کچھ اور ہوتی تو اس کا بھی بیان ہوتا اور بیان ہے نہیں تو اور کچھ جزا بھی نہیں۔ تو جزا صرف یہ ہوئی کہ ان کو دوزخ سے نجات ہو جاوے گی۔ یہ ہے امام صاحب کا قول۔

جمہور کی دلیل یہ آیتیں ہیں۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ جنت کی نعمتیں یاد دلا کر فرماتے ہیں۔ کس کس نعمت کو تم دونوں جھٹلاؤ گے اے جن وانس اس سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نعمتیں دونوں کے لئے ہیں اور اس سے بھی زیادہ تصریح اس آیت میں ہے کہ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ۔ یہ آیت حوروں کے بارہ میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حوریں جن وانس دونوں کے لئے ہوں گی اور حوریں جنت کے اندر ہیں تو جنت میں جانا جنوں کا ثابت ہوا۔ اور ہر مجتہد دوسرے مجتہد کے استدلال کا جواب دے سکتا ہے۔

احقر کا گمان یہ ہے کہ امام صاحب کا مقصود نفی نہیں دخول جنت کی مومنین جن کے لئے۔ بلکہ یہ مقصود ہے کہ ہم بوجہ نص صریح نہ ہونے کے ایسا حکم نہیں کر سکتے اور غالباً اطفال کے باب میں بھی امام صاحب کا یہی قول ہے۔ واللہ اعلم۔ لیکن ظاہراً جمہور کا قول زیادہ جی لگتا ہے اور اس کے اختیار کرنے سے ترک تقلید کا کسی کو شبہ نہ ہو کیونکہ یہ مسئلہ فقہ کا نہیں ہے جس میں امام صاحب کے قول کی تقلید واجب ہو۔ یہ مسئلہ معاد کا ہے اور اس سے زیادہ اسلم یہ ہے کہ خدا کے سپرد کیا جائے۔ خدا جانے کیا ہوگا۔ جو ہوگا ہو رہے گا۔ بہر حال اس کا فیصلہ ہمارے اجلاس میں نہ آوے گا۔ ہم کو کاوش کی ضرورت نہیں۔

باقی جنوں کے مکلف ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں اور وہ ان آیتوں سے

ثابت ہے سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۔ (اے جن و انس ہم عنقریب حساب کے لئے خالی ہوے جاتے ہیں یعنی حساب لینے والے ہیں) جن و انس دونوں کو ثقل فرمایا۔ ثقل کے معنی ہیں جس پر ثقل یعنی بوجھ ہو۔ بوجھ سے مراد وہی بار تکلیف ہے۔ معلوم ہوا دونوں مکلّف ہیں اور دوسری آیت میں فرماتے ہیں۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ

قیامت میں جواب طلب کیا جائے گا دونوں سے اور پوچھا جائے گا کہ اے جن و انس کیا تمہارے پاس پیغمبر نہیں آئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی مکلّف ہیں۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس آیت یعنی اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۔ میں صرف انسان کا ذکر کیا گیا؟

اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن کی تبلیغ اول انسانوں ہی کو ہوئی پھر ثانیاً جنوں کو۔ ایک تو یہ جواب ہے سیدھا سادہ۔ دوسرے یہ کہ ہر چند کہ مکلّف انسان اور جن دونوں ہیں ہی۔ لیکن غور سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنی عنایت حق تعالیٰ کی انسان پر ہے اتنی جن پر نہیں ہے جن دوسرے درجہ پر ہے لہٰذا مخاطب ہونا بھی ان کا تبعاً للانسان ہے اور فضائل میں بھی وہ تابع ہیں انسان کے۔ چنانچہ جو لوگ قائل ہوئے ہیں اس بات کے کہ جن جنت میں جائیں گے وہ بھی کہتے ہیں کہ جنت کے گرد و پیش میں رہیں گے جیسے تابع لوگ ہوا کرتے ہیں۔ بہر حال وہ تابع ہیں۔ اس بنا پر خطاب میں ان کو شریک نہیں کیا گیا۔ لیکن اثر خطاب میں وہ داخل ہیں کیونکہ تابع متبوع کے اثر سے داخل خطاب میں ہوا کرتا ہے اور تابع ہونے کی دلیل یہ آیت ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ۔ (اور ہم نے بنی آدم کو مکرم کیا) صوفیہ کرام سمجھے ہیں اس راز کو کہ انسان مکرم کیوں ہے وہ راز یہ ہے کہ انسان مظہر اتم ہے حق تعالیٰ کا۔ اسی واسطے آیا ہے۔

ان الله خلق ادم على صورته (الصحيح لمسلم كتاب البر والصلة: ۱۱۵، الجنة: ۲۸، مسند الإمام أحمد ۲: ۲۴۴، ۲۵۱، ۳۲۳، ۴۳۴، ۴۶۳، ۵۱۹، فتح الباری لابن حجر ۱۱: ۳.)

اس کے لفظی معنی تو یہ ہیں کہ حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا لیکن یہ مسلم ہے کہ صورت کے معنی متبادر مراد نہیں کیونکہ اس سے تجسم لازم آتا ہے حق تعالیٰ کا۔ لامحالہ دوسرے معنی مراد ہوں گے جس کی حقیقت یہ ہے کہ صورت کے معنی ظہور ہیں۔ چنانچہ صورت متعارفہ کو جو صورت کہتے ہیں وہ بھی اس بنا پر کہ وہ ظہور ہے حقیقت ذی صورت کو۔

پس معنی یہ ہوئے کہ ایسی حالت پر پیدا کیا کہ خدا تعالیٰ کا اس حالت سے ظہور ہوا۔ تو علی صورتہ کے معنی ہوئے علیٰ ظہورہ۔ یہی معنی ہیں صوفیہ کے اس قول کے کہ انسان مظہر اتم ہے حق سبحانہٗ تعالیٰ کا۔ مطلب یہ کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ کا پورا پورا ظہور انسان کے ذریعہ سے ہوا۔ اس ظہور سے مراد وہی ظہور ہے جو **کنت کنزا مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق.** (میں مخفی خزانہ تھا بس میں نے پسند کیا کہ میں پہچانا جاؤں پس میں نے مخلوق کو پسند کیا) میں ہے کیونکہ لاعرف کے معنی کا حاصل یہی ہے لاظہر۔ یوں تو حق تعالیٰ کا مظہر ہر چیز ہے لیکن انسان خصوصیت کے ساتھ مظہر ہے۔ اسی واسطے کہا جاتا ہے کہ انسان مظہر اتم ہے۔ ایک تو یہ وجہ ہے انسان کے سب سے زیادہ مکرم ہونے کی۔ (نقد اللبیب فی عقد الحبیب ج ۵)

اصلاح نفس میں عمومی غفلت

لوگ اس مجاہدہ سے ہی گھبراتے ہیں اور جو اس کا قصد بھی رکھتے ہیں وہ منتظر بڑھاپے کے ہیں حالانکہ اس وقت آدمی قریب قریب معطل ہو جاتا ہے۔ پھر اخلاق ذمیمہ جو شباب میں راسخ ہو چکے ہیں وہ جدا مزاحمت کرتے ہیں کیونکہ جو خصلتیں جوانی میں جم چکتی ہیں وہ بڑھاپے میں بھی نہیں جاتیں۔ مگر پھر بھی لوگ کہا کرتے ہیں کہ جوانی میں کھانے پینے کے دن ہیں۔ جب بڑھاپا آئے گا تو اللہ اللہ کریں گے۔

یہ غلطی ہے دو وجہ سے۔ اول تو جس چیز کی عادت جوانی میں نہ ہو وہ بڑھاپے میں یوں بھی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے بڑھاپے میں قوت و ہمت نہیں رہتی۔ کسل بڑھ جاتا ہے۔ مشکل سے ٹھیل ٹھیل کے اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے نماز فرض کے لئے مشکل سے اٹھا جاتا ہے۔ ایک بزرگ کہتے تھے کہ یہ قول کہ

دریغا کہ عمر جوانی گئی   جوانی گئی زندگانی گئی

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگانی کیوں کر گئی۔ کیونکہ بڑھاپا آنے سے اور آرام سے بیٹھے رہتے ہیں۔ لڑکے بالے یا نوکر چاکر پنکھا جھل رہے ہیں پاؤں دبا رہے ہیں مگر جب بڑھاپا آیا تو واقعی سمجھ میں آ گیا کہ جوانی گئی زندگانی گئی کیونکہ نہ کھانے کی حلاوت نہ پینے کا مزہ نہ سونے کا چین نہ جاگنے کا لطف اگر دماغ میں یبوست غالب ہے تو سب لوگ سو رہے ہیں۔ یہ رات بھر اختر شماری میں مشغول ہیں نیند نہیں آتی۔ اور اگر رطوبت غالب ہے تو ہر وقت آنکھیں بند ہیں اونگھ

رہے ہیں۔ اٹھنا چاہتے ہیں مگر اٹھا نہیں جاتا پھر اس کے علاوہ کہیں ناک میں درد ہے کہیں کان میں درد ہے کبھی ٹانگ میں درد ہے کبھی برسات کی ہوا لگ کر کمر میں درد ہے۔

جوانی میں طاعات کرنے میں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ جب جوانی میں طاعات کا خوگر ہو جائے گا تو بڑھاپے میں عادت کی وجہ سے آسانی ہو جائے گی۔ اسے ہر شخص عقل سے سمجھ سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب بڑھاپا اتنا آ جائے کہ کچھ نہ کر سکے تو اس کے لئے حدیث شریف میں ہے کہ کوئی شخص صحت کی حالت میں نیک عمل کرتا ہو اور مرض میں نہ کر سکے یا حالت اقامت میں کرتا ہو سفر کی وجہ سے نہ کر سکے تو فرشتوں کو حکم کیا جاتا ہے کہ اس حالت میں بھی عمل پورا لکھنا۔ یہاں تو پنشن آدھی دی جاتی ہے اور وہاں پوری پنشن دی جاتی ہے بلکہ ایک ضمیمہ بھی اس پنشن کے ساتھ ملتا ہے۔ وہ کیا ہے عمل نہ کرنے کی حسرت کا اجر۔ کہ پڑے سو رہے ہیں سبحان اللہ، ثواب بھی لکھا جا رہا ہے۔ یہ جوانی کے عمل کی برکت ہے ورنہ یہ ثواب کیسے ملتا۔ یہ دلیل نقلی سے معلوم ہوا۔ غرض دلیل سے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ جوانی کے عمل سے بڑھاپے کا تدارک ہو سکتا۔ (الشریعت ج۶)

حقیقت نور

بات ذوق عارفین کے سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اعمال میں ایک برکت خاصہ ہے جس سے قلب میں نور پیدا ہوتا ہے اور وہ نور وہی ہے جس کے لئے تہجد کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی۔ **اللّٰھم اجعل فی قلبی نوراً** (سنن النسائی ۲۱۸:۲، سنن ابی داؤد، ۱۳۴۹) اے اللہ میرے قلب میں نور پیدا کر دے۔ **وفی سمعی نورا** اور میرے کانوں میں نور پیدا کر دے **وفی بصری نورا** اور میری آنکھوں میں نور پیدا کر دے **وفی لحمی نورا** اور میرے گودے میں نور پیدا کر دے۔ **وفی عظمی نورا** اور میری ہڈیوں میں نور پیدا کر دے **وفی شعری نورا** اور میرے بالوں میں نور پیدا کر دے **وفی عصبی نورا** اور میری رگوں میں اور پٹھوں میں نور پیدا کر دے **وفی لحمی نورا** اور میرے گوشت میں نور پیدا کر دے **وفی دمی نورا** اور میرے خون میں نور پیدا کر دے اور یہاں تک کہا کہ **اعظم لی نورا**۔ بڑھا اس نور کو میرے لئے **واجعلنی نورا** مجھے سراپا نور کر دے **واجعل من فوقی نورا** اور میرے اوپر نور کر دے **واجعل من تحتی نورا**

اور میرے نیچے نور کر دے **و عن یمینی نورا** میرے داہنے نور کر دے **و عن شمالی نورا** اور میرے بائیں نور کر دے اسی کا ترجمہ مولانا رومی نے کیا ہے۔

نور او در یمن و یسر و تحت و فوق بر سر و بر گردنم مانند طوق

(اس کا نور دائیں بائیں اوپر نیچے چہرے پر اور گردن میں مثل طوق کے)

وہ نور لالٹین کی روشنی نہیں بلکہ ایک کیفیت خاصہ ہے کیونکہ حقیقت نور کی یہ ہے کہ **ظاہر لنفسہ ومظہر لغیرہ** (یعنی خود بھی ظاہر اور دوسرے کو بھی ظاہر کر دے) **اللہ نور السموات والارض** (اللہ تعالیٰ نور دینے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا) میں بھی نور کے یہی معنی ہیں نور کے معنی چمک دمک کے نہیں ہیں۔ تو یہ ہوئی نور کی حقیقت کہ خود بین ہوتا ہے اور دوسرے حقائق کو بین کر دیتا ہے اور قلب کے اندر اس نور کے پیدا ہونے سے ظلمت دور ہو جاتی ہے کون سی ظلمت ظلمت کسل کی، ظلمت کینہ کی، ظلمت حسد کی، ظلمت کبر کی، ظلمت غصہ کی، ظلمت معصیت کی وغیرہ وغیرہ۔ اور اس کے اندر نشاط تازگی شگفتگی اور فرحت پیدا ہو جاتی ہے تو ایسا شخص بڑھاپے میں بھی نکما نہیں ہوتا۔ (الشریعت ج ۶)

انسانی سلامتی کا راستہ

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انسان کی سلامتی مقید رہنے میں ہے اور اطلاق مضر ہے کیونکہ اطمینان اور چین بدوں تقلید کے نہیں ہوتا مثلاً ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ جب بیمار ہوں گے تو فلانے طبیب کا علاج کریں گے۔ تو اطمینان ہے کہ طبیب موجود ہے بیماری کا خوف نہیں ہوگا اور نہ بیماری کے وقت سوچنا پڑے گا کہ کس کا علاج کریں اور اگر تقلید نہیں ہے تو پھر ہم کسی خاص طبیب کے پابند نہیں۔ اگر آج ذرا سا تغیر پیش آیا ایک طبیب سے رجوع کیا۔ دوسرا تغیر پیش آیا دوسرے سے رجوع کر لیا۔ تیسرا پیش آیا تیسرے سے رجوع کر لیا۔ تو اس میں دل کو چین نہیں ہوگا اور ہر وقت یہ فکر رہے گی کہ اب کے تغیر میں کس سے رجوع کریں۔ غرض تقلید سے اطمینان حاصل ہوتا ہے چاہے وہ طبیب دانشمند بھی نہ ہو۔ مگر تمہارے نفس کو تو اطمینان ہو جائے گا اور اگر وہ تقلید حقائق کے موافق ہو تو سبحان اللہ کیا کہنا ہے۔

اگر شریعت کا علم وحکمت کے موافق ہونے کا بھی دعویٰ نہ ہوتا جیسا کہ مدلول ہے **ولا تتبع اھوآء الذین لایعلمون** کا' تب بھی شریعت کا امر حکیمانہ ہوتا اور اب

تو جب کہ شریعت کا علم وحکمت کے موافق ہونا ثابت کر دیا گیا تو اس اتباع کا ضروری مصلحت وموجب طمانیت ہونا اور بھی ثابت ہو گیا۔ (الشریعت ج ٦)

ضرورت تقلید

یقین کے دو درجے ہیں ایک تقلیدی اور ایک تحقیقی۔ تقلیدی تو یہ کہ احکام کو بلا دلیل مان لو پھر ان احکام کی برکت سے تحقیقی یقین ہو جائے گا جیسے شروع میں الف ب کو محض استاد کے تقلید سے مان لیتے ہو اس کے بعد اسی تقلید کی بدولت بڑے بڑے دیگر علوم کے محقق بن جاتے ہو اگر شروع ہی میں یہ پوچھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ الف ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیشہ جاہل ہی رہو گے اس لئے پہلے کسی محقق کی تقلید کرو پہلے ہی سے محقق بننے کی کوشش مت کرو۔

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی   تا راہ بیں نہ باشی کے راہ بر شوی

(اے بے خبر کوشش کرتا کہ باخبر ہو جائے جب تک راستہ نہیں دیکھو گے رہبر کیسے بنو گے)

اور طریقہ محقق بننے کا یہی ہے کہ پہلے تقلید کرو۔

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق   ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

اس کے متعلق مجھے ایک حدیث یاد آئی کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالی میں حاضر ہوا اور کہا انی احبک یا رسول اللہ کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا اعلم ما تقول کہ جو کہہ رہے ہو سمجھ کر کہو (مطلب یہ کہ میری محبت آسان چیز نہیں اس میں بڑی آزمائش ہوتی ہے) اس نے عرض کیا کہ واقعی محبت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ فاعد للفقر تجافاً (المستدرک للحاکم ۴: ۳۳۱) (یعنی فقر و فاقہ کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لے) اور ارشاد فرمایا کہ جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے اس کی طرف فقر و فاقہ اس طرح آتا ہے جیسا کہ سیلاب نشیب کی طرف دوڑ کر آتا ہے جو میری حالت ہے وہی تمہاری ہوگی المرء مع من احب (آدمی قیامت کے دن اس کے ہمراہ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہوگا) اور اگر حضور جیسی حالت کسی کو بھی پیش نہ آئے تو حضور کے محبّ کو اس حالت سے محبت تو ضرور ہوگی۔ تو وہ اس کے آنے پر ہر وقت تیار تو رہے گا نیز جیسا میں اوپر کہہ چکا ہوں جب یہ شخص خدا کا محبوب ہوگا تو ہو اس کو مضرات سے ضرور بچائیں گے۔

حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ اپنے خاص بندوں کو دنیا سے اس طرح بچاتے ہیں

جیسے تم استسقاء کے مریض کو پانی سے بچاتے ہو۔ اس لئے دیندار کو ایک بددین کے برابر تمول تو ہرگز نہیں ہوگا مگر اس کو ایک دوسری دولت ایسی ملے گی کہ یہ تمول اس کے سامنے گرد ہے اور یہ وہی دولت ہے جس نے حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے تخت سلطنت چھڑا دیا مگر کوئی یہ نہ سمجھے کہ تخت چھوڑ دینا دولت باطنی کے ساتھ ہر ایک کو ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ اہل باطن دل سے تو ہمیشہ اس کو چھوڑ ہی دیتے ہیں یعنی اس کی طرف ان کو رغبت نہیں ہوتی۔ پھر جو منتہی ہوتے ہیں وہ ظاہر میں اس کو نہیں چھوڑتے کیونکہ وہ متحمل ہوتے ہیں چنانچہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس کے متحمل تھے۔ مگر اب عموماً طبائع اس کے متحمل نہیں۔

تو اگر ایک اہل اللہ کے پاس اچھا کپڑا نہ ہو تو اس کی ذلت کرنا کب جائز ہو سکتی ہے۔ سرکاری آدمی جس حال میں بھی ہو اس کی توہین جرم ہے۔ حق تعالیٰ حدیث قدسی میں فرماتے ہیں۔

من عادی لی ولیا فقد اذنته بالحرب (سنن ابن ماجه : ۳۹۸۹)

کہ جو کوئی میرے ولی سے عداوت رکھے تو اس کو اعلان جنگ سناتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت خدا کی محبت کا غیر نہیں کیونکہ حضور سے محبت اسی لئے ہے کہ وہ ذریعہ ہیں وصول الی اللہ (اللہ تعالیٰ تک پہنچنے) کا تو یہ تو بعینہ خدا کی محبت ہے تو یہ لا الٰہ کے تصور سے خارج نہ کی جائے گی۔

مولانا نے ایک مقام پر اس کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک شخص نے لعل سے پوچھا کہ تو کس کو زیادہ محبوب رکھتا ہے؟ اپنے کو یا آفتاب کو۔ اس نے کہا کہ جس کو زیادہ محبوب بتلاؤں اس سے دوسرے کا محبوب ہونا لازم آتا ہے کیونکہ اگر اپنے نفس سے محبت ہے تو بوجہ لعل ہونے کے وصف کے ہے اور اس کا یہ وصف آفتاب سے آیا ہے۔ تو آفتاب سے محبت ہوئی اور اگر آفتاب سے محبت ہے تو اسی لئے کہ اس نے یہ وصف میرے نفس کو عطا کیا ہے تو اپنے نفس کی محبت ہوئی۔

اس تمثیل سے یہ مسئلہ خوب حل ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی واسطے محبت ہے کہ آپ مظہر (ظاہر ہونے کی جگہ) صفات خداوندی ہیں۔ حق تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ آپ نور من انوار اللہ (انوار الٰہی کا ایک نور ہیں) آپ موصل (الی اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے) ہیں تو یہ بعینہ خدا ہی کی محبت ہے۔

حکم یا سفارش

حضرت بریرہؓ لونڈی تھیں۔ حضرت عائشہ نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا اور شرعی قانون یہ ہے کہ لونڈی جب آزاد ہو تو اس کو اختیار ہے کہ اپنے خاوند سے الگ ہو جائے۔ پس جب یہ آزاد ہوئیں تو اپنے شوہر سے علیحدہ ہو گئیں حضرت مغیث ان کا نام تھا۔ ان کی یہ کیفیت تھی کہ روتے ہوئے ان کے پیچھے پھرتے تا کہ حضرت بریرہؓ ان سے الگ نہ ہوں۔ ایک مرتبہ حضرت عباسؓ سے حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے اس پر تعجب ہے کہ مغیث تو بریرہ سے اس قدر محبت رکھتے ہیں اور بریرہ مغیث سے اس قدر بغض رکھتی ہیں۔ چنانچہ پھر بہ نفس نفیس خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہؓ سے مغیث کی سفارش کی کہ ان سے علیحدہ مت ہو۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ سفارش کرتے ہیں یا امر کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ امر تو نہیں کرتا۔ پس انہوں نے جواب دیا کہ جب امر نہیں ہے تو میں قبول نہیں کرتی۔

حضرت بریرہؓ کیسی قانون دان تھیں کہ دریافت کر لیا کہ امر ہے یا سفارش۔ اگر امر ہو تو اس کو قبول کرنا لازم ہے اور سفارش ہو تو نہیں۔ یہ ہے آزادی خیال تو کیجئے کہ کجا بریرہ اور کجا حضور صلی اللہ علیہ وسلم۔ مگر نہایت آزاد ہو کر سوال کرتی ہیں کیونکہ جانتی ہیں کہ شریعت نے جو دعویٰ کیا ہے اسی پر عمل بھی ہے اور یہ بھی ایک بڑا فرق ہے شریعت اور دوسرے قوانین میں کہ شریعت میں دعویٰ کے ساتھ عمل بھی ہے اور اور جگہ دعویٰ تو ہے مگر اس کے ساتھ عمل نہیں۔ (اتباع المنیب ج ۶)

آج کل کی حالت

آج کل لوگوں کی یہ حالت ہے کہ انہوں نے احکام شرعیہ کو صرف چھوڑا ہی نہیں بلکہ احکام سے مزاحمت کرتے ہیں۔ صدقہ فطر کے بارہ میں ایک لڑکے نے یہ کہا تھا کہ کیا اس گرانی میں بھی ڈیڑھ سیر ہی گیہوں واجب ہے۔ پہلے تو اناج ارزاں تھا اس وقت کم قیمت میں آتا تھا۔ اب اس قدر واجب ہونا چاہئے جتنا اس وقت میں آ جائے۔ غضب ہے احکام سلطنت میں کوئی شخص معارضہ نہیں کرتا اور احکام شرعیہ میں ہر شخص جسارت کرتا ہے۔

ایک مسئلہ فرائض کا میرے پاس آیا۔ اس میں ایک بیوی ایک بیٹی ایک عصبہ تھا۔ مسئلہ کا جواب سن کر بیوی اور بیٹی کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے (توبہ توبہ) یہ عصبہ کی

کہاں شاخ لگا دی۔ ان کی رائے یہ تھی کہ عصبہ نہ ہونا چاہئے میں نے ان سے پوچھا کہ اگر تم خود عصبہ ہو تو اس وقت کیا رائے دو۔ اس وقت تو یہی کہیں کہ سبحان اللہ شریعت میں کیسا عدل اور حق رسانی ہے کہ دور دور کے رشتے کی بھی رعایت رکھی ہے۔

ایک اور قصبہ کا قصہ ہے کہ ایک شخص کی ہمشیرہ کا نکاح کسی شیعی سے ہوا وہ ہمشیرہ مر گئی اور اس نے خاوند اور دو بھائی وارث چھوڑے۔ بھائی نے چاہا کہ خاوند کو حصہ نہ دوں۔ چنانچہ ایک استفتاء تیار کیا کہ شیعہ مرد کا نکاح سنیہ عورت سے ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ مکر اس لئے کیا کہ نکاح جائز نہ ہوگا تو وہ شوہر شوہر نہ ہوگا تو تمام جائیداد میرے ہی پاس رہے گی اور اس کی کچھ پروا نہیں ہوئی اور نہ غیرت آئی کہ اتنے دنوں تک بہن بلا نکاح ایک غیر مرد کے پاس رہی۔

شریعت کو لوگوں نے موم کی ناک سمجھ رکھا ہے جس طرح چاہا توڑ لیا۔ غرض اخیر فیصلہ ہوائے نفسانی پر کرتے ہیں اور اگر شریعت سے ملے تو شریعت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اگر شریعت سے حصہ نہ ملے تو عدالت میں جاتے ہیں کہ بھائی ہم تو گنہگار ہیں بال بچے والے ہیں۔ ہم سے شریعت پر کیسے عمل ہو سکتا ہے۔ شریعت پر تو وہ عمل کرے جس کے نہ جورو ہو نہ اولاد دم نقد ہو جس طرح چاہے اور دنیا دار کو تو ہر قسم کی ضرورتیں پیچھے لگی ہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے تاجر اور امراء کا خیال ہے کہ شریعت پر عمل کرنے سے دنیا کے کام اٹکتے ہیں۔ مال جاتا رہتا ہے کمائی نہیں ہو سکتی ہے۔

میں اس کے جواب میں ایک موٹی سی مثال پیش کرتا ہوں وہ یہ کہ مثلاً ایک حاکم مالک خزانہ ہے اور اس خزانہ کی کنجیاں اس حاکم کے پاس ہیں تو اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ خزانے میں سے کچھ مل جائے تو اس کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے ظاہر ہے کہ ہر عاقل یہی تجویز کرے گا کہ اس حاکم کو خدمت و اطاعت کر کے راضی کرنا چاہئے اور اگر اس کو ناراض کر دیا تو ہرگز نہ ملے گا بلکہ جو دیا ہے وہ بھی چھن جائے گا اسی طرح حق تعالیٰ خزائن کے مالک ہیں اور ان کی کنجیاں اسی کے قبضہ میں ہیں پس اگر آپ اس میں سے کچھ لینا چاہتے ہیں تو اس کی اطاعت اختیار کیجئے۔ جب وہ نافرمانی کی حالت میں بھی دیتے ہیں تو فرمانبرداری کی حالت میں کیوں نہ دیں گے اور ان کی شان رزاقیت تو وہ ہے کہ اگر رو رو کر یہ دعا کرو کہ ہم کو رزق نہ دو تو ان کو تمہارے ساتھ اس قدر محبت ہے کہ وہ یہ دعائیں ہرگز نہ قبول فرمائیں گے تو یہ کہنا کہ اتباع

شریعت سے دنیا نہ ملے گی اس کے تو یہی معنی ہیں کہ مالک خزائن کے راضی کرنے سے تو خزانہ نہ ملے گا اور ناراض کرنے سے ملے گا کیسی الٹی بات ہے۔ (شرط الایمان ج ۶)

معرفت کی لذت

حضرت معرفت ایسی لذیذ شے ہے کہ عارفین کے نزدیک جنت اور حوروں میں بھی وہ مزہ نہیں جو اس میں ہے۔ اور اس سے نعمائے دنیا کا کہ ان میں معرفت بھی ہے نعمائے جنت سے افضل ہونا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ جنت میں یہ معرفت ایسی ہوگی کہ وہاں کی نعمت سے زیادہ لذیذ ہوگی۔ تو خود جنت کی بعض نعمتیں بعض سے افضل ہوئیں۔ باقی ہم جیسوں سے کوئی پوچھے ہم تو یوں کہیں کہ روٹیوں میں زیادہ مزہ ہے نماز میں کیا مزہ ہے! اور فقہاء نے ہم جیسے ضعفاء کے لیے وسعت بھی دے دی ہے کہ اگر کھانا سامنے ہو نماز ہونے لگے تو روٹی پہلے کھالو نماز بعد میں پڑھ لینا تا کہ نماز فراغت سے پڑھی جائے ورنہ ساری نماز میں روٹی ہی کا خیال رہے گا کیونکہ تمہارے نزدیک روٹی میں مزہ زیادہ ہے۔ اور اسی لیے شریعت سے تعجیل افطار کا حکم دیا ہے کہ نماز مغرب سے پہلے افطار کر لینا چاہیے اور حضورؐ نے یہ بھی فرمایا ہے۔

للصائم فرحتان فرحته عند فطره و فرحته عندلقاء الرحمن

(الصحیح البخاری ۹: ۱۷۵)

کہ روزہ دار کو دو خوشیاں ہیں ایک افطار کے وقت ہوتی ہے دوسری اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت ہوگی۔ ہم لوگوں کو افطار کے وقت خوشی اسی کی ہوتی ہے کہ کھانے کو ملا، منہ کا تالا کھل گیا مگر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو جو مسرت تھی وہ اس بات پر تھی کہ منزل پوری ہوگئی۔ خدا کا حکم ادا ہوگیا۔

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست   آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما

(اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم خیریت سے دوست تک پہنچ گئے ہماری اس ہمت مردان پر آفرین ہے) (الغالب للطالب ج ۶)

فضیلت شب براءت

شب براءت کی بڑی فضیلت ہے شب قدر کے قریب قریب برابر اس کی فضیلت

احادیث میں آئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض نے سورۂ دخان میں لیلۃ مبارکۃ کی تفسیر شب برات سے کردی ہے اور وجہ اس کی یہ ہوئی کہ لیلۃ القدر اور شب براءت کے فضائل احادیث میں ملتے جلتے سے ہیں یہی دیکھ کر انہوں نے قرآن میں بھی لیلۃ مبارکۃ سے شب براءت ہی سمجھ لی۔ مگر یہ خلاف ظاہر ہے کیونکہ آیت میں لیلۃ مبارکۃ کی صفت یہ مذکور ہے کہ اس میں نزول قرآن ہوا ہے اور شب براءت میں نزول قرآن ہونے کا کہیں ثبوت نہیں۔ اس لئے راجح یہ ہے لیلۃ مبارکۃ سے قرآن میں تو لیلۃ القدر ہی مراد ہے مگر اس میں شک نہیں کہ شب براءت کی بھی بڑی فضیلت ہے اس رات میں اور راتوں سے زیادہ عبادت کرنا چاہیے اور صبح کو روزہ رکھا جائے۔

تو جو بات **اذا انتصف شعبان** (سنن ابی داؤد ۲۳۳۷، مشکوٰۃ المصابیح ۱۹۷۴) سے اشارۃً معلوم نہ ہوئی تھی دوسری احادیث سے صراحۃً معلوم ہوگئی کہ نصف شعبان سے پہلے روزہ مشروع ہے بلکہ مسنون ہے۔ (الیسر مع العسر ج ۶)

خود سے خیر خواہی

میں ایک انجمن میں بلایا گیا اس کی حالت جو تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ نہ اس کے ممبروں کی آمدنی شریعت کے موافق ہے نہ اعمال ان کے درست ہیں ترک صلوٰۃ و شرب خمر تک میں بعضے مبتلا ہیں۔ میں نے داعی سے کہا کہ غرض اہل انجمن کی خیر خواہی قوم بیان کی جاتی ہے لیکن اگر وہ خیر خواہ قوم ہیں تو اپنے خیر خواہ کیوں نہیں اور جب انہوں نے اپنی اصلاح نہیں کی تو کیسے مان لیا جائے کہ ان کو قوم پر توجہ ہے۔

صاحبو! لیڈران قوم کو متوجہ کرتا ہوں کہ جب تک وہ اپنی اصلاح نہ کریں گے اس وقت تک ان کی خیر خواہی کسی درجے میں موثر نہ ہوگی نہ ان کی خیر خواہی کو کوئی تسلیم کرے گا اسی کو تو فرماتے ہیں۔

اتامرون الناس بالبر و تنسون انفسکم وانتم تتلون الکتٰب

کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے ہو کتاب کی۔ (تکمیل الاسلام ج ۶)

کمال اسلام

اسلام کامل یہ ہوا کہ عقائد بھی درست اور کتاب و سنت کے موافق ہوں اور اعمال یعنی

دیانات و معاملات، گواہی، وکالت، تجارت، زراعت اور معاشرت مثلاً کھانا، پینا اٹھنا بیٹھنا اور اخلاق باطنہ صبر و شکر و اخلاص یہ سب کے سب موافق شریعت کے ہوں۔ یہ پانچ چیزیں ہیں جن کے مجموعے کا نام اسلام کامل ہے۔ اگر ان میں سے ایک جزو بھی کم ہو تو وہ اسلام ایسا ہے جیسا کوئی شخص حسین ہو لیکن اس کے ناک نہ ہوں۔ (تکمیل الاسلام ج ۶)

باہمی ہدیہ کا تبادلہ

حدیث میں ہے تہا دو اتحابو (السنن الكبرى للبيهقي ٦:١٦٩) (ہدیہ دو آپس میں محبت بڑھاؤ) تو ہدیہ دینے کی مصلحت حضورؐ نے ازدیاد محبت قرار دیا ہے اور ازدیاد محبت اس وقت ہوتا ہے جب ہدیہ لے کر جی خوش ہو اور جی اس وقت خوش ہوتا ہے کہ جب اشراف نفس نہ ہو ورنہ مسرت نہیں ہوتی۔ بلکہ انتظار کی جو کلفت تھی وہ رفع ہوگئی۔ تو اس حدیث سے بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہدیہ میں اشراف کی نوبت نہیں آنی چاہئے۔ دوسرے اسی حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ بیعت کے وقت ہدیہ نہ لینا چاہئے کیونکہ اس کی بھی وہی حالت ہوتی ہے جیسا کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ بھائی آج کل کے پیروں کی یہ حالت ہے کہ اگر کوئی دیہاتی ان کے سامنے سر کھجلانے لگے تو پیر صاحب کا خیال ہوتا ہے کہ شاید پگڑی میں سے روپیہ نکال کر دے گا۔ واقعی بالکل سچ ہے۔ (تجارت آخرت ج ۶)

ہدیہ میں خلوص کی ضرورت

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آپ کو ایک اونٹ دیا۔ آپؐ نے اس کے عوض میں کئی اونٹ اس کو دیئے مگر وہ شخص راضی نہ ہوا۔ اس پر حضور کو سخت رنج ہوا اور آپؐ نے خطبہ فرمایا کہ فلاں فلاں خاندان کے سوا کسی سے ہدیہ نہ لوں گا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ اس شخص نے دنیوی غرض سے ہدیہ دیا تھا اور اسی حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ اکثر لوگوں سے اول ملاقات میں ہدیہ نہ لینا چاہئے کیونکہ اول ملاقات میں یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ ہدیہ دینے والے کی کیا نیت ہے۔ اسی لئے میں نے اپنا یہ معمول مقرر کرلیا ہے کہ جو نیا شخص آتا ہے اس سے میں ہدیہ نہیں لیتا۔ البتہ اگر قرائن قویہ سے خلوص ثابت ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔

لا يرد طيب فانه خفيف المحمل (كنزل العمال ١٧٣٥٥)

اچھے ہدیہ کو واپس نہ کیا جائے کیونکہ وہ ہلکا بوجھ ہے۔

اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رد کرنے کی علت طیب کے خفیف

اکمل ہونے کو قرار دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ علت نہ پائی جائے بلکہ اس کے برخلاف طبیعت پر گرانی اور بار گزرے تو ایسی چیز کا واپس کر دینا جائز ہوگا۔

میں نے اس کا ایک تخمینی معیار مقرر کر لیا ہے وہ یہ کہ کسی شخص سے اس کی ایک دن کی آمدنی سے زیادہ ہدیہ نہ لیا جائے اور جب ایک دن کی آمدنی کے برابر ایک مرتبہ لے لیا تو پھر دوسرا ہدیہ ایک مہینہ گزرنے سے پہلے نہ لیا جائے گویا اگر کسی شخص کی تنخواہ تیس روپے ماہوار ہے تو اس سے مہینہ بھر میں صرف ایک روپیہ ہدیہ میں لینا مضائقہ نہیں۔ اور اگر کوئی کہے کہ جب ایک شخص جوش طبیعت سے اس سے زیادہ دینا چاہتا ہے تو انکار کی کیا ضرورت۔ تو سمجھو کہ جس جوش میں مصالح کی رعایت نہ ہو وہ جوش نہیں بلکہ جنون ہے جس کی اصلاح کرنی واجب ہے۔ (تجارت آخرت ج ٦)

اصول شریعت

اصول شریعت کے چار ہیں۔

(۱) قرآن شریف (۲) حدیث شریف (۳) اجماع (۴) قیاس

پس جب کسی حکم کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں حکم شریعت سے ثابت ہے اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ یہ حکم ان چاروں میں سے کسی ایک سے ثابت ہے ہاں اگر کسی ایک سے بھی ثابت نہ کر سکے تو حکم شرعی کہنا غلط ہوگا۔ (تقویم الزیغ ج ٦)

ایک عوامی اشکال کا حل

ایک شخص نے ڈھاکہ میں مجھ سے کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ انگریزی خوان طالب علم نہایت باہمت، عالی حوصلہ، جری جفاکش ہوتے ہیں اور عربی خواں طالب علم نہایت پست ہمت، تنگ خیال، سست، کم حوصلہ ہوتے ہیں۔ مقصود ان کا یہ تھا کہ یہ فرق عربی اور انگریزی کے اثر سے ہے۔ یعنی پست ہمتی وغیرہ عربی کے آثار ہیں اور علو حوصلگی وغیرہ انگریزی کے آثار ہیں۔ میں نے کہا جناب علو حوصلگی وغیرہ صفات جس قدر ہیں علو خاندان پر موقوف ہیں یعنی جو عالی خاندان ہوگا اس میں یہ صفات ہوں گے۔ وہ خواہ عربی پڑھے یا انگریزی اور جو عالی خاندان نہ ہوگا اس میں یہ صفات نہ ہوں گی اگرچہ وہ انگریزی اعلیٰ پایہ کی ڈگری حاصل کرے بلکہ اکثر واقعات اور

مشاہدات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پست خاندان آدمی اگر عربی پڑھ لیں تو کم وبیش ان کے اخلاق درست ہو جاتے ہیں اور اگر انگریزی پڑھیں تو بالکل ہی برباد ہو جائیں۔ عربی و انگریزی کے آثار کا پورا مقابلہ اس وقت ہوسکتا ہے کہ ایک خاندان کا ایک طبیعت کے دو بچے لئے جائیں۔ ایک کو انگریزی شروع کرائی جائے دوسرے کو عربی اور دس برس کے بعد دونوں کا موازنہ کیا جائے اور جب کہ خوش قسمتی سے انتخاب ہی ایسا پاکیزہ ہو کہ عربی کے لئے جولاہے تیلی اور انگریزی کے لئے شرفاء تو عربی کہاں تک اپنا اثر کرے اور کس حد تک ان کی پستی کو مٹائے اور اگر شرفاء میں سے کوئی بچہ عربی کے لئے دیا بھی جاتا ہے تو ایسا کہ جو کہ بالکل ہی کودن ہو۔ تو جب عربی میں سارے کودن ہی کودن منتخب ہوں گے تو پھر ان سے علو حوصلگی کی کیا امید ہوگی اور میں نے ان سے کہا کہ آپ میرے ہمراہ چلئے تو میں آپ کو دکھلاؤں کہ علماء ایسے ہوتے ہیں۔

غرض ایسے علماء سے ایک ضرر یہ پہنچ سکتا ہے اور میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر اس پر بھی کسی کو کمال حاصل ہو تو وہ اس دنائت و خست سے ضرور دور ہوگا۔ سو ایسے لوگوں کو جب غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ عالم ہی نہیں ہیں کیونکہ علم کمال ہے اور کمال خاصہ ہے استغناء دیکھئے بڑھئی راج لوہار جب اپنے فن میں کامل ہو جاتے ہیں تو کیسے مستغنی ہو جاتے ہیں۔ تو کیا علم ان ذلیل کاموں کے برابر بھی اثر نہیں رکھتا۔ ضرور رکھتا ہے اور بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ جس میں استغناء نہیں اس کے کمال ہی میں کمی ہے۔ (تقویم الرایغ ج ۶)

اتفاق کی ضرورت وصورت

اتفاق پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ اپنے اعمال درست کرو اور جو لوگ اپنے اعمال درست کر چکے ہیں ان کے پاس آمد و رفت رکھو مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لو کہ بزرگوں کی خدمت میں اگر جاؤ تو نیت محض اپنی اصلاح کی کر کے جاؤ بعض لوگ بزرگوں کی خدمت میں جاتے ہیں لیکن نیت ان کی محض وقت پورا کرنا اور دل بہلانا ہوتی ہے۔ اور علت اس کی یہ ہے کہ بزرگوں کے پاس جا کر دنیا بھر کے قصے جھگڑے اخبار شروع کر دیتے ہیں ایسے لوگ اپنا بھی نقصان کرتے ہیں اور ان بزرگ کا بھی وقت ضائع کرتے ہیں بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ وہ اصلاح ہی کی نیت سے جاتے ہیں لیکن عجلت پسند ہونے کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ دو ہی دن میں ہماری اصلاح ہو جائے۔ ان لوگوں کی بالکل وہ مثال ہے۔

الحائک اذا صلی یومین منتظر الوحی

جولاہا جب دو دن نماز پڑھ لیتا ہے تو وحی کا منتظر ہو جاتا ہے۔

ایسے لوگوں کے جواب میں ہمارے حضرت حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ یہ کیا کم فائدہ ہے کہ تم کو خدا کا نام لینے کی توفیق ہوگئی اور فرمایا کرتے تھے کہ بھائی اگر واقعی کچھ بھی حاصل نہ ہو تب بھی طلب نہ چھوڑنی چاہئے۔

یابم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم　　　حاصل آید یا نہ آید آرزوئے می کنم

کچھ ملے یا نہ ملے جستجو میں لگا رہوں گا اور کچھ حاصل ہو یا نہ ہو میں آرزو کرتا رہوں گا۔

(تقویم التبلیغ ج ۶)

رہبر کامل کی ضرورت

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ذاکر کو تقلیل غذا سے منع فرمایا تھا۔ انہوں نے اپنے کچھ حالات بیان کیے۔ تو مولانا نے فرمایا کہ دماغ میں پیش آ گیا ہے جنون کا مقدمہ ہے۔ تم تقلیل غذا موقوف کر دو اور دماغ کا علاج کرو۔ مگر وہ تو ان کشفیات کو کمال سمجھے ہوئے تھے اس لئے مولانا کے قول پر اعتماد نہ کیا۔ بالآخر جنون ہو گیا اور سارے اذکار و اشغال موقوف ہو گئے۔ پھر یہ حالت تھی کہ بالکل ننگے بیٹھے رہا کرتے۔

اس لئے میں کہتا ہوں کہ اپنے اعضاء کو سرکاری مشین سمجھ کر کبھی تیل بھی دیا کرو۔ دودھ گھی بھی کھایا کرو۔ اس حیثیت سے ان سے محبت کرنا۔ حفاظت کرنا اور جب ان سے خدا تعالیٰ کے احکام کی تعمیل ہو جائے تو ان پر ان کی تعریف کرنا سب محمود ہے۔ یہی مطلب ہے اس شعر کا۔

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست　　　آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما

(العید والوعید ج ۶)

امت پر کمال پر شفقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین شخصوں پر بددعا کی ہے کہ ان کی ناک رگڑی جائے ذلیل و خوار ہو جائیں۔ اب سمجھ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کیسی ہو گی۔ شاید اس پر کوئی طالب علم یہ کہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے نہیں ڈرتے کیونکہ آپ رحمۃ للعالمین ہیں دوسرے آپ نے حق تعالیٰ سے یہ بھی عرض کیا ہے۔

انما انا بشر فایما مومن اذیته او شمته او جلته او لعنته فاجعلهما له صلٰوۃ وزکوٰۃ و قربته تقربه الیک (مسند الامام احمد بن حنبل ۲: ۴۸۸)

اے اللہ! میں بشر ہی ہوں (اس لئے عوارض بشریہ مجھے بھی لاحق ہوتے ہیں) تو جس شخص کو میں ایذا دوں یا برا بھلا کہوں یا سزا دوں یا کسی پر لعنت (بد دعا) کروں تو اس کو اس کے حق میں رحمت اور گناہوں سے) پاکیزہ اور قربت کا سبب بنا دیجئے کہ اس کے ذریعے سے آپؐ اس کو اپنا مقرب بنالیں۔ تو جب آپؐ نے اپنی بد دعا کے متعلق خود یہ دعا کی ہے کہ وہ سبب رحمت و قرب بن جایا کرے تو پھر آپ کی بد دعا سے کیا ڈر؟ (العید والوعید ج ۶)

عبادت کی ضرورت واہمیت

عبادت ایسی ضروری چیز ہے کہ غایت خلق جن وانس کی بھی ہے اور یہاں جن کو بھی انسان کے ساتھ ذکراً شریک کیا گیا ہے اور دوسرے اکثر مقامات میں باوجودیکہ جن بھی انسان کی طرح تمام احکام شرعیہ کے مکلف ہیں مگر پھر بھی تعبیر میں جو جن کا ذکر نہیں آتا تو وہ اکتفاء ہے۔ لہٰذا انسان ہی کا ذکر آتا ہے ورنہ احکام شرعیہ دونوں ہی میں مشترک ہیں۔ اس آیت سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ آفرینش کی غایت محض عبادت ہے اب اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ بجز اس کے اور کوئی مقصود ہی نہیں تمام مقاصد کا انحصار کر کے فرمایا کہ صرف عبادت کیا کریں اور اس حصر سے باوجودیکہ سب غایت کی نفی ہو گئی مگر پھر بھی جن غایات کی مقصودیت کا باعتبار عادات کے کچھ شبہ ہو سکتا تھا۔ اس مقام پر ان سب کی نفی تصریحاً بھی فرمادی۔ کلام الٰہی میں ہمارے عادات ومحاورات کی بے حد رعایت کی گئی ہے۔ بعض غایات کو تو انسان بھی غایت نہیں سمجھتا، اس کی نفی کی ضرورت نہ تھی۔ جن کو مقصود سمجھنے کا احتمال تھا، صرف انہیں کی نفی کی گئی۔ (العبادۃ ج ۷)

دنیا کو مقصود نہ بنایا جائے

ایک بہت بڑی جماعت ایسی بھی تھی جو اس طرح دنیا کو مقصود بنائے ہوئے ہے اس لیے اس کا تدارک فرماتے ہیں۔

مَا اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ ای لانفسهم ولا لعیالهم وَمَا اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ ای وما اردت بخلقهم ان یطعمونی.

"یعنی میں نے اس لیے نہیں پیدا کیا کہ وہ اپنے اور اپنے عیال کے لیے رزق ڈھونڈیں نہ اس لیے پیدا کیا کہ وہ مجھے کھلاویں۔"

یہاں ایک نکتہ سمجھنا چاہیے کہ اطعام حق کے غایت ہونے کا تو احتمال ہی نہ تھا، پھر اس کی نفی کی کیا ضرورت تھی۔ سو نکتہ یہ ہے کہ یہاں دونوں میں دو غایتوں کی نفی کو قرین فرمایا، ان میں ایک ایسا امر ہے کہ اس کے غایت ہونے کا احتمال ہی نہیں اور ایک میں اس کا احتمال تھا سو دونوں کو قریب فرمانا اشارہ اس طرف ہے کہ جیسا ایک امر یقیناً منفی ہے۔ ایسا ہی دوسرے کو سمجھو کیونکہ دونوں کی علت مشترک ہے چنانچہ اس علت کو اس طرح ذکر فرمایا کہ "ان اللہ ھو الرزاق" یعنی وہ تو خود بڑے رازق ہیں کہ تم کو اور تمہارے عیال کو سب کو رزق دیتے ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ.

"اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجئے اور خود بھی اس پر قائم رہیے، ہم آپ سے رزق کا سوال نہیں کرتے، ہم آپ کو رزق دیتے ہیں۔"

یہ آیت بھی اس کے قریب قریب ہے۔ خلاصہ یہ کہ نہایت تاکید و اہتمام کے ساتھ اس مقصود کو ثابت فرما دیا کہ انسان کو حق جل وعلیٰ شانہ نے صرف عبادت کے واسطے پیدا کیا ہے تو عبادت اتنا بڑا امر اہم ہے۔ (العبادۃ ج ۷)

حقیقت علم

جن علماء کے فضائل نصوص میں وارد ہیں وہی علماء ہیں جو درویش بھی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓءُ

"یعنی خوف خشیت خدا سے صرف علماء ہی کو حاصل ہے۔"

اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ مراد ہیں کیونکہ خشیت کاملہ ان ہی میں ہے۔ اسی طرح علماء کو ورثۃ الانبیاء کہا گیا ہے۔ اس بناء پر کہ انبیاء نے نہ دینار چھوڑا نہ درہم نہ زراعت نہ تجارت، انہوں نے صرف علم چھوڑا تو جن کے پاس یہ علم موروث انبیاء ہوگا وہی لقب عالم کا مستحق ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ انبیاء کا علم، یہ علم رسمی نہ تھا، علم حقیقی و قلبی تھا جس کی شان یہ ہے۔

علم چوں برتن زنی مارے شود   علم چوں بردل زنی یارے شود

دوسرے محقق کہتے ہیں:

علم رسمی سربسر قیل است و قال   نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال
علم چہ بود آن کہ راہ بنمایدت   زنگ گمراہی زدل بربایدت
ایں ہوس ہا ازسرت بیروں کند   خوف وخشیت دردلت افزون کند

اور ہماری حالت کیا ہے اسے بھی بیان کرتے ہیں:

تو ندانی جز یجوز ولا یجوز   خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز
ایّھا القوم الذی فی المدرسہ   کلما حصلتموہ وسوسہ
علم نبود غیر علم عاشقی   مابقی تلبیس ابلیس شقی

تو حضرت وہ علم جو انبیاء نے چھوڑا وہ یہ ہے جس کے خواص آپ نے سنے اور جو اس علم کے حامل ہیں وہ ہیں نائب رسول اور ورثۃ الانبیاء تو حقیقت میں درویش بھی علماء ہوئے، غرض دو طبقے ایسے ثابت ہوئے جن کی اصلاح سب سے مقدم ہے کیونکہ ان کا اثر سب سے زیادہ ہے اس لیے اگر یہ گمراہ ہوں گے تو سب کو گمراہ کریں گے۔ سو افسوس یہ ہے کہ عبادت کے متعلق یہ طبقے بھی غلطیوں میں مبتلا ہیں تو عوام کیوں کر غلطیوں سے بچتے۔ (آثار العبادۃ ج ۷)

رحمت حق

قارون نے جب ایک فاحشہ کو بہکایا کہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ تہمت لگانا حق تعالیٰ نے اس کو توفیق دی کہ مجمع عام میں سچ کہہ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ آیا اور زمین سے فرمایا کہ یا ارض خذیہ کہ اے زمین! پکڑ اس قارون کو، چنانچہ وہ دھنسنا شروع ہوا، اس نے پکارا اے موسیٰ مجھے چھوڑ دے، آپ نے جوش میں پھر فرمایا یا ارض خذیہ (اے زمین اسے پکڑ) وہ چلاتا تھا اور آپ برابر یا ارض خذیہ (اے زمین اسے پکڑ) فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ بالکل دھنس گیا۔ بعد میں حق تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! آپ اس وقت بہت غصہ میں تھے اس لیے ہم نے بھی نہیں کہا لیکن اگر وہ بجائے آپ کے ہم کو پکارتا تو ہم تو چھوڑ دیتے، کیا انتہا ہے اس رحمت کی کہ:

اگر خشم گیرد بکردار زشت   چو باز آمدی ماجرا در نوشت

(اگر برے کام پر غصہ آئے تو جب واپس آئے توبہ کرنے، ماجرا لپیٹے) (اسرار العبادۃ ج ۷)

نظام زکوٰۃ

ایک ڈپٹی کلکٹر جو بخل میں مشہور تھے کہتے تھے کہ جب خدا نے حقوق مالیہ کی فہرست بتا دی ہے تو یہ غلو ہے کہ اس سے زیادہ کا اہتمام کریں۔ اس لیے وہ زکوٰۃ سے ایک پیسہ زیادہ نہ دیتے تھے حالانکہ ایسے ذہین لوگوں کا انتظام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرما دیا ہے کہ:

ان فی المال لحقا سوی الزکوٰۃ ثم تلی لیس البر ان تولوا وجوھکم. الایہ ''تمہارے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی حق ہے''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت سے استدلال کیا کیونکہ اس میں

اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ

''اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں محتاجوں اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے والوں کو''

اول فرمایا ہے اس کے بعد ''اقام الصلوۃ واتی الزکوٰۃ'' یعنی انفاق کا ایک مرتبہ تو یہ فرمایا کہ مال دیا قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں کو۔ پھر دوسرا عمل یہ فرمایا کہ زکوٰۃ دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مال دینے سے اور مراد ہے اور زکوٰۃ دینے سے اور۔ اس کو سمجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ان فی المال لحقا سوی الزکوٰۃ'' اس لیے ہمیں یہ حقوق سمجھ کر فرائض کے علاوہ اور بھی کچھ کرنا چاہیے۔ چہ جائیکہ جن کاموں کو ضابطہ میں اور فہرست میں لکھ دیا ہو ان کو بھی چھوڑ دیں بلکہ ان کو تو سب سے پہلے کرنا چاہیے۔ (اسرار العبادۃ ج ۷)

اہل اللہ کے مراتب

حضرت سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ جو معاصر ہیں حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے فرماتے ہیں جب ارواح کو جمع کیا گیا تو ہر ایک سے پوچھا گیا کیا چاہتے ہو تو جو جس کی سمجھ میں آیا وہ اس نے مانگا، جب اس ناچیز کی نوبت آئی اور پوچھا گیا کیا چاہتے ہو، میں نے کہا:

اریدان لا ارید واختار ان لا اختار

''یعنی میں یہی تجویز کرتا ہوں کہ کچھ تجویز نہ کروں اور یہی چاہتا ہوں کہ کچھ نہ چاہوں۔''

فاعطانی مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر من اهل هذا العصر

''پس مجھے وہ چیزیں عطا ہوئیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی کے دل میں ان کا وسوسہ ہی آیا، اس زمانہ والوں سے۔''

مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کا رتبہ حضرت غوث اعظمؒ سے بھی بڑھا ہوا ہو۔ ممکن ہے کہ اکثر اہل عصر مراد ہوں اور ایک حیثیت سے یہ بڑھے ہوئے ہوں اور ایک حیثیت سے وہ۔ اس بارہ میں گو نص تو ہے نہیں جو کسی ایک شق کا جزم کیا جاوے اور یہی فیصلہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں بھی ہے جن کی افضلیت مطلقہ منصوص نہیں ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کہ آپ تو علی الاطلاق سب سے افضل ہیں، باقی انبیاء کے تفاضل میں بھی یہی فیصلہ ہے کہ ایک فضیلت کے اعتبار سے ایک افضل ہوں اور دوسری فضیلت کے اعتبار سے دوسرے۔ (اسرار العبادۃ ج ۷)

کفر اور اس کی اقسام

حدیث ہے: **من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر.**

''جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا۔''

اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ نماز کا عمداً ترک کرنا یہ بتلاتا ہے کہ اس شخص کو اس کی فرضیت کا اعتقاد نہیں یعنی کامل اعتقاد نہیں بلکہ اعتقاد میں نقص ہے۔ اس نقص کی وجہ سے اس پر کفر کا اطلاق کیا گیا جو مقابل ہے ایمان کا۔ جب ایمان اعتقاد کامل کا نام ہوگا تو اس کا ارتفاع کفر سے مسمّی ہوگا۔ نیز ایک حدیث میں ہے:

لایزنی الزانی حین یزنی وھو مومن.

''زنا کرنے والا زنا نہیں کرتا مگر اس حال میں کہ وہ مومن کامل نہیں ہوتا۔''

یہ سب نصوص صوفیاء کی اصطلاح کے مویدات ہیں تو صوفیاء کے نزدیک تو گویا اعتقاداً بھی ہم گناہ کو مضر نہیں سمجھتے کیونکہ عمل اس کے خلاف ہے اور جس اعتقاد کے خلاف عمل ہو وہ ان کے یہاں اعتقاد ہی نہیں البتہ فقہاء کے نزدیک یعنی ان کی اصطلاح کے موافق ہمارا ان کو مضر سمجھنا یہ اعتقاد ہے مگر عملاً وحالاً ان کے نزدیک بھی مضر ہونے کا اعتقاد

نہیں ہے جبھی تو صغیرہ پر جرأت ہے تو غفلت کا ایک درجہ تو یہ ہوا جس کو درجہ ضعیف کہا جاتا ہے مگر وہ اقوی کے مقابلہ میں ضعیف ہے ورنہ فی نفسہ یہ بھی قوی ہے۔

دوسرا درجہ غفلت کا کفر جحود یا عناد ہے۔ یہ اقوی و اقبح ہے۔ ہر چند کہ اس درجہ سے بحمد اللہ خدا تعالیٰ نے ہم کو محفوظ رکھا ہے مگر دوسرا درجہ معصیت کا جس میں ایسی غفلت ہو کہ مطلوب کا استحضار نہ ہو اس میں ہم بھی مبتلا ہیں اور اس سے خالی نہیں ہیں۔ اب جس درجہ کی غفلت ہوگی اسی درجہ کی مذمت ہوگی۔ گو درجہ کفر کی مذمت ہم میں نہ ہو مگر مطلق مذمت وشکایت سے تو ہم بھی صاف اور بری نہیں ہیں۔ (دواء الغفلت ج ۷)

شب برأت

ایک حدیث میں آیا ہے کہ لیلۃ شعبان کی یہ فضیلت ہے کہ اس میں بندوں کے اعمال بلند کئے جاتے ہیں یعنی قبول کئے جاتے ہیں اور آیا ہے۔ فیھا تقسم ارزاقکم یعنی اس رات میں تمہارے رزق بانٹے جاتے ہیں۔

اور اس میں یہ بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ اس سال کے اندر اندر پیدا ہونے والے ہیں اور جتنے مرنے والے ہیں وہ فرشتوں کو بتلا دیئے جاتے ہیں اور ایک حدیث میں ہے جو ضعیف ہے موضوع نہیں اگرچہ روایت قوی نہیں کہ عالم غیب میں ایک درخت ہے اور اس میں پتے ہیں۔ تو جو شخص اس سال میں مرنے والا ہوتا ہے تو ایک پتا (جس کا تعلق اس شخص سے ہے) اس درخت کا گر جاتا ہے۔

میں نے ایک لڑکی کے سامنے یہ روایت بیان کی جو میرے گھر میں کی شاگرد ہے اور ماشاء اللہ اب وہ بال بچوں والی ہے تو ہر سال قبل شب برأت اس کا خط آتا ہے کہ میرے لئے دعا کیجئے کہ میرا پتا نہ گرے اس درخت سے بھلا میری اس دعا سے کیا ہوتا ہے جو ہونا ہوگا وہ تو ہو ہی گا۔ مگر دعا کرنے میں مضائقہ نہیں۔

اتنا مضمون صحاح کی روایت میں ہے کہ اس سال جو مرنے والے ہوتے ہیں وہ تجویز کر لئے جاتے ہیں اور ایک حدیث میں ہے کہ حق جل وعلا شانہ اس رات میں آسمان دنیا کی طرف توجہ فرماتے ہیں (خاص طور پر) شام سے صبح صادق تک اور فرماتے ہیں۔

الامن مستغفر فاغفرله الامن مسترزق فارزقه.

کیا کوئی مغفرت چاہنے والا ہے کہ میں اس کو بخش دوں کیا کوئی روزی مانگنے والا ہے کہ میں اس کو رزق دوں۔

غرض یہ کہ الا کذا الا کذا (اسی طرح اور بھی مضمون ہے) اور استغفار کی طرف متوجہ فرمانے کے ساتھ استرزاق کی طرف متوجہ فرمانے کا اس وقت اہتمام سے اس لئے بیان کیا کہ لوگوں کا گمان ہے کہ خدا کی اطاعت سے رزق کم ملتا ہے تو اس حدیث میں تقدیم استغفار اور تاخیر استرزاق سے معلوم ہوگیا کہ استغفار اور معاصی سے پاک ہونا کہ اطاعت کی ایک فرد ہے اس کو برکت رزق میں دخل ہے۔ (شعبان ج ۷)

غیبی نظام رزق

میں نے مولانا فتح محمد صاحب مرحوم سے جو میرے ابتدائی کتابوں کے استاد تھے سنا ہے کہ ایک شخص نے ضد باندھی کہ کھانا نہ کھاؤں گا۔ دیکھوں کیسے زبردستی کھانا پڑے گا چنانچہ اس نے کھیت چھوڑ دیا جنگل چلا گیا اور کئی روز تک کھانا نہ کھایا۔ اگرچہ اس نے یہ حماقت کی اور اگر ایسی حالت میں اس کو رزق نہ ملتا تو اس کی وجہ یہ ہوتی کہ اس کی قسمت میں رزق نہیں رہا تھا مگر اللہ تعالیٰ سب کی مرادیں پوری کرتے ہیں یہ جا رہا تھا ایک قبر راستہ میں پڑی جس پر سولہ لڈو رکھے ہوئے تھے۔ نفس کی سرکشی کے احتمال سے وہاں سے بھاگا کہ ایسا نہ ہو کہ نفس اس کی طرف متوجہ ہو جاوے اور میرا عہد ٹوٹ جاوے اتفاق سے ڈاکوؤں کی جماعت جو تعداد میں سولہ تھی چھپی ہوئی آ رہی تھی وہ اتفاق سے ادھر ہی کو گزرے دیکھا کہ ایک شخص بھاگا جاتا ہے سمجھے اس کے پاس گنیاں ہوں گی اور وہ بھی سولہ تھے اور لڈو بھی سولہ تھے وہ سمجھے کہ اس شیرینی میں اس نے زہر ملا دیا ہے۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ یہ سب لڈو اسی کو کھلاؤ اور لوٹ لو۔ یہ وہاں سے دوڑا مگر کئی روز کا بھوکا تھا، ان لوگوں نے پکڑ لیا اور اس کو گرا کر تمام لڈو چمٹے سے منہ کھول کر اسی کے پیٹ میں اتارے۔ اس نے توبہ کی۔

آنچہ نصیب است بہم می رسد   گرنہ ستانی بہ ستم می رسد

جو قسمت میں ہوتا ہے وہ ضرور پہنچتا ہے اگر خوشی سے نہ لو تو زبردستی پہنچتا ہے۔ (شعبان ج ۷)

شرارت نفس

چنانچہ حدیث میں ہے **لایحل لمؤمن ان یھجراخاہ فوق ثلثۃ ایام.** (کنز العمال: ۲۴۷۹۴) کسی مومن کو حلال اور جائز نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دن اور تین رات سے زیادہ چھوڑے رہے بھائی کا لفظ شفقت کے لئے فرمایا کہ بھائی کو لائق نہیں کہ بھائی کو چھوڑے (پس یہ کلمہ لانے سے حدیث پر عمل ہونا سہل ہو اور رغبت میں ترقی ہو) ہاں اگر تین دن تک منہ پھلائے رہے تو اجازت دے دی (گو بہتر یہ ہے کہ بالکل ہی کینہ نہ رکھے اور تین دن تک اجازت مقید ہے امور دنیویہ کے ساتھ اگر کوئی کسی بددین سے اس کی بددینی کی وجہ سے چھوڑ دے تو اگر وہ فاسق ہمیشہ بددین رہے اور دوسرا شخص ہمیشہ اس کو چھوڑے رہے تو اجازت ہے اور ثواب ہوگا اور بعض مواقع پر واجب ہے)

یہاں تک یہ ثابت کیا گیا کہ شریعت نے ہماری طبیعت کی بڑی رعایت فرمائی ہے اگر کوئی شبہ کرے کہ طبیعت تو نماز سے بھاگتی ہے اور شریعت نے اس کے چھوڑنے کی اجازت نہیں دی اور یہاں طبیعت کی رعایت نہیں کی صاحبو! نماز ایسی چیز ہے کہ اس میں رعایت مضر ہے اور اس کے چھوڑنے کی اجازت مناسب ہی نہیں کیونکہ اس رعایت کی ایسی مثال ہے جیسے کسی نے زہر کھالیا ہو اور اس سے کوئی کہے کہ تو تریاق کھالے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نہیں کھاتا پھر اس کی رعایت کرکے کہنے لگیں کہ اچھا مت کھا تا کسی کے حلق میں زخم ہے اور اس کو دوا کرنے کیلئے کہا جاتا ہے وہ منظور نہیں کرتا اور اس میں اس کی رعایت کی جاوے تو اگر ایسا کیا تو یہ ظلم ہے یا رحم ہے۔

پس نماز بھی ایسی ہی چیز ہے کہ اس کے چھوڑنے کی اجازت دینے میں بڑا ضرر ہے بندہ کا ہاں اس میں بھی یہ رعایت کی گئی ہے کہ اس کے اوقات میں توسیع کردی صبح کی نماز کا وقت طلوع صبح صادق سے آفتاب نکلنے تک ہے جو سوا گھنٹہ سے بھی زیادہ ہوتا ہے اگر اس قدر وقت میں بھی سرکار کی طبیعت درست نہ ہو تو ایسے سرکار کی ترکاری پکالیوے ظہر کا وقت دن ڈھلنے سے دو مثل یا ایک مثل تک ہے علی اختلاف الاقوال اور عصر کا وقت ظہر کا وقت نکلنے کے بعد سے آفتاب غروب ہونے تک ہے اور عشاء کا وقت بعد مغرب سے آدھی رات تک بلا کراہت ہے۔ (شعبان ج ۷)

تلقین نماز

اس کے بعد طلوع صبح صادق تک مکروہ ہے۔ مغرب کے وقت کو عوام الناس بہت تنگ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ تنگ نہیں بلکہ جو مقدار صبح کے وقت کی ہے یعنی طلوع صبح صادق سے طلوع آفتاب تک وہی مقدار مغرب کے وقت کی ہے ہاں تاخیر کرنا بلاضرورت مکروہ ہے (تارے چٹک آنے کے بعد مغرب کا وقت مکروہ ہو جاتا ہے) ہاں کسی نے نہ پڑھی ہو تو مکروہ وقت میں بھی پڑھ لے اس لئے کہ قضا پڑھنے سے ادا پڑھنا اچھا ہے گو مکروہ وقت میں ہو۔

یہ بیان مغرب کے متعلق میں نے اس لئے کیا کہ رمضان شریف آنے والے ہیں افطار میں لوگ بہت تنگی کرتے ہیں کہ روزہ داروں کو کھانے پینے بھی نہیں دیتے فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں سو دق نہیں کرنا چاہئے۔ یہ وقت اتنا تنگ نہیں ہے پس امام کو تمام مقتدیوں کی رعایت چاہئے اور جماعت اس وقت تک قائم نہ کرے جب تک کہ سب لوگ فارغ نہ ہو جائیں (یہ غرض نہیں ہے کہ اس قدر تاخیر کی جاوے کہ وقت جاتا رہے بلکہ بقدر ضرورت اپنی حاجت پوری کر کے جماعت قائم کر لی جاوے)

حدیث میں کھانے کے بارے میں وارد ہوا ہے۔

اذا حضر العشاء والعشاء فابدوا بالعشاء

یعنی جس وقت شام کا کھانا سامنے آجاوے تو پہلے کھانا کھالو اور پھر نماز پڑھو۔

کیا ٹھکانا ہے اس رعایت کا اور شریعت کے احکام میں ظاہری مصلحت بھی ہے باطنی بھی ناسوتی مصلحت بھی اور ملکوتی بھی ظاہری اور ناسوتی مصلحت تو یہ ہے کہ کھانا گرم اور حلوا نرم موجود تھا۔ خواہش کھانے کی تھی ضرور تھا کہ اسی میں دل لگا رہتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے سامنے ایسی حالت میں حضور قلب کیسے ہوسکتا تھا اور کس قدر خرابی ہے کہ خدا تعالیٰ کے سامنے ایسی حالت میں حاضر ہو تو اگر اجازت نہ ہوتی تو تم کہہ سکتے تھے اور عذر کر سکتے تھے کہ ہم طبعاً معذور ہیں دل تو وہاں لگا ہے ہم کیسے حضور قلبی سے حاضر ہوں پس تم کو اجازت دے دی کہ پہلے حلوا کھائیے اور پھر جلوا دیکھئے غرض دونوں مصلحتیں ملحوظ رکھی گئیں جو ظاہر کے دیکھنے والے ہیں انہوں نے یہ مصلحت سمجھی کہ پیٹ بھر گیا اور جو اہل باطن ہیں انہوں نے یہ مصلحت سمجھی کہ وہ حضرت پروردگار کے قابل ہوگئے اور ان میں حضور کی استعداد پیدا ہوگئی۔

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد   برنگ اصحاب صورت رابو ارباب معنی را

اس کے عالم حسن کی بہار دل وجان کو تازہ رکھتی ہے رنگ سے اہل ظاہر کے دل وجان کو اور بو سے ارباب حقیقت کے دل وجان کو۔ (شعبان ج ۷)

آخری جنتی

حدیث میں ہے کہ ایک شخص سب سے اخیر میں دوزخ سے گھسٹتا ہوا نکلے گا اور وہ جہنم میں شور وغل کرے گا کہ اے اللہ میں ہی کیوں رہ گیا۔ حکم ہوگا کہ اس کو یہاں سے نکال کر دوزخ کے کنارہ پر بٹھا دو۔ پس ایسا ہی ہوگا اور اس کا منہ دوزخ کی طرف ہوگا۔ لپٹ لگے فریاد کرے گا۔ حکم ہوگا کہ دوزخ کی طرف اس کی پشت کر دو۔ پشت کرنا تھا کہ اب جنت نظر آنا شروع ہوئی اور اس کی ایک درخت پر نظر پڑے گی تو عرض کرے گا کہ اے اللہ! اس درخت تک پہنچا دیجئے۔ پھر دوسرے درخت پر نظر پڑے گی اس کے لئے بھی یہی تمنا کرے گا۔ ارشاد ہوگا یہ کیا ابھی تو ایک ہی درخت تک کی فرمائش تھی اب دوسرے درخت کی فرمائش ہوگئی، مگر اس پر غلبہ خواہش کا ہوگا اور صبر نہ کر سکے گا۔ پس عرض کئے جائے گا۔ غالباً حضرت امام حسن بصری جو تابعی ہیں یا اور کوئی بزرگ اس حدیث کو بیان کر کے فرمانے لگے کہ کاش میں وہی شخص ہو جاؤں۔ ان پر کس قدر خشیت تھی۔ اپنے کو کس قدر کم درجہ کا سمجھتے تھے کہ اے اللہ میں ہی وہی شخص ہو جاؤں کہ کبھی دوزخ سے نکل جاؤں گا۔ (شعبان ج ۷)

بدعات کے زہریلے اثرات

بدعت میں سنکھیا چھپی ہوئی ہے۔ سمیات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو برنگ سم دوسری برنگ شیرنی جیسے لڈو میں زہر ملا ہوا سے ہی معصیت کے بھی دو رنگ ہیں ایک تو برنگ معصیت اور دوسرا برنگ عبادت۔ جس طرح تعطیل عدالت کا بڑھا دینا بظاہر تو خیر خواہی تھی مگر حقیقت میں عداوت تھی اس لئے کہ اس میں تبدیلی تھی حکم عدالت کی۔

دوستی بے خبر جوں دشمنی ست   حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

بے وقوف کی دوستی حقیقت میں دشمنی ہے۔ حق تعالیٰ ایسی خدمت سے جس میں ان کے حکم میں تغیر لازم آوے، بے پرواہ ہیں۔

اللہ پاک ہے بدعت سے اس کو حاجت نہیں کہ آپ بدعت کی صورت میں عبادت پیش کریں۔ اس شب میں بھی بعض بدعات ہیں، جن کا بیان آتا ہے اور بعض کھلی معصیت اور بعض مستحبات۔ مستحب تو اس شب کے متعلق تین حکم جو حدیث میں وارد ہوئے ہیں۔ دو قول حدیث میں۔

صوموا نهارها و قوموا ليلها

(اس کے دن میں روزہ رکھو اور رات میں شب بیداری کرو)

اور ایک فعلی حدیث میں وہ یہ کہ آپ بعد عشاء بقیع الغرقد میں (جو مدینہ منورہ میں ایک قبرستان ہے) تشریف لے گئے اور وہاں مردوں کے لئے دعائے مغفرت فرمائی۔ حضرت عائشہ کے پوچھنے پر آپ نے فرمایا تھا کہ میرے پاس جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہاں جا کر مردوں کے لئے دعائے مغفرت کریں۔ یہ روایت ترمذی اور نسائی میں ہے۔ یہ تو ثابت ہے حدیث سے۔ پھر اس پر حاشیہ چڑھایا گیا اور اس پر در حاشیہ اور پھر بر حاشیہ۔ اول حاشیہ تو موضح اور مفسر تھا مغیر نہ تھا اور اس میں جائز ہے کہ کوئی مفتی خلاف کرے مگر ہمارے اساتذہ نے خلاف نہیں کیا اور وہ حاشیہ یہ تھا کہ جس طرح حدیث سے استغفار ثابت ہے اسی طرح مردوں کو نفع پہنچایا جاوے۔ قراءۃ قرآن سے صدقات سے۔ اور یہ تینوں بھی مساوی نہیں استغفار تو متفق علیہ ہے معتزلہ بھی اس کے قائل ہیں۔ اور اہل بدعت بھی۔ باقی قراءۃ قرآن میں بعض اہل سنت بھی اور معتزلہ صدقات میں بھی اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا ثواب نہیں پہنچتا۔ منکرین وصول ثواب عبادت بدنیہ کے عدم نص سے استدلال کرتے ہیں اور معتزلہ اس نص سے **لیس للانسان الاماسعی** (انسان کو اپنی ہی کوشش کا نفع ملتا ہے)

جواب اول کا ورود بعض نصوص کا اس کے اثبات میں جب حضرت ابو ہریرہؓ نے کسی سے کہا تھا کہ مسجد عشار میں دو رکعت پڑھ کر کہہ دے هذا لابی هریرة (یہ ابو ہریرہ کے لئے ہیں) اور ثانی کا جواب یہ ہے کہ یہ حصر حقیقی ہے یا اضافی۔ اگر حقیقی ہے تو اس استغفار سے بھی ثواب حاصل نہ ہوگا حالانکہ یہ تم بھی نہیں کہتے ہو۔ پس حصر اضافی ہے اور مسئلہ مذکورہ مستقل دلیلوں سے اپنے موقع پر ثابت ہے۔ یہ اس کا موقع نہیں اور اہل سنت والجماعت میں حضرت امام اعظم صاحب تو قائل ہیں کہ عبادت مالی و بدنی دونوں کا نفع مردوں کو پہنچتا ہے اور بعض فقط عبادت مالیہ کے نفع پہنچنے کے قائل ہیں جیسا کہ ذکر کیا گیا۔ (شعبان ج ۷)

ماہ صفر کی عید

حیدر آباد میں ماہ صفر کے آخری چہار شنبہ کی عیدی کا دستور ہے۔ حضور نظام کے استاد مولوی محمد زمان خان صاحب سے حضور نظام نے بچپن میں عرض کیا کہ عیدی دیجئے جیسی مشہور ہے۔ آخری چہار شنبہ آیا ہے۔ غسل صحت نبی نے پایا اور اصرار کیا مولوی صاحب نے عیدی کیا دی۔ اس میں تبلیغ بھی کر دی اور عید کی نفی بھی کر دی۔

آخری چار شنبہ ماہ صفر　　ہست چوں چار شنبہائے دگر
ماہ صفر کا آخری چہار شنبہ مثل دوسرے چار شنبوں کے ہے۔
نہ حدیثے شدہ راں وارد　　نہ درو عید کرد پیغمبر
اس میں نہ کوئی حدیث آئی ہے نہ اس میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عید منائی۔

مولوی صاحب کو حضور نظام نے اکیس اشرفیاں نذر دیں۔ عید کیا تھی بقر عیدی تھی کہ وہ عید ہی ذبح ہو گئی۔ تو دیکھو انہوں نے نفی بھی کر دی اور جو قسمت کا تھا وہ بھی مل گیا۔ (شعبان ج ۷)

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا

ہم نے حق تعالیٰ کی تعریف کی۔ یعنی جن چیزوں کو ہم عیب سمجھتے ہیں ان سے حق تعالیٰ کے بری ہونے کا دعویٰ کیا، لیکن حق تعالیٰ کی شان کے مناسب جو پاکی ہے وہاں ہمارا تو کیا ذہن پہنچتا، سید الحامدین صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ عرض کر رہے ہیں:

لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک.

’’اے اللہ! میں آپ کی ثناء کا احاطہ نہیں کر سکتا، آپ ویسے ہی ہیں جیسے آپ نے خود اپنی تعریف کی۔‘‘

یعنی اگر کوئی آپ کی تعریف کر سکتا ہے تو وہ خود آپ ہی ہیں کیونکہ تعریف حقیقی کے لیے معرفت بالکنہ شرط ہے اور معرفت بالکنہ کس کو حاصل ہو سکتی ہے۔ بجز خود ذات حق کے تو ہم تو کیا چیز ہیں، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا عجز ظاہر فرما رہے ہیں۔ یہی معنی ہیں اس فرمانے کے۔

من نگردم پاک از تسبیح شاں　　پاک ہم ایشاں شوند و درفشاں

(میں ان کی تسبیح و تقدیس بیان کرنے سے پاک نہیں ہوتا بلکہ اس تسبیح کرنے سے وہ خود پاک ہوتے ہیں) (شرائط الطاعت ج ۷)

صاحبو! اجمالاً اتنا سمجھ لو کہ بزرگوں کے قول کی تقلید کرنا چاہیے ان کے افعال کی نہیں کرنا چاہیے۔ (شعبان فی شعبان ج ۷)

اس وقت لوگ کہتے ہیں کہ علم کو بہت ترقی ہے سو علم کو بے شک ترقی ہے مگر کون سے علم کو یہی ریل تار فوٹو گراف بس ان کو ترقی ہے مگر حقیقت میں خود ان کو علم کہنا ہی غلطی ہے اس کو صنعت کہیئے۔ تدبیر کہیئے گو بالمعنی الاعم (اعم معنی کے اعتبار سے) علم ہی سہی۔ یوں بعضے علوم وہ بھی ہیں جن کی شان میں حدیث ہے۔

ان من العلم لجهلا بعض علوم جہل ہوتے ہیں مگر علم مطلوب واقعی میں تو وہی ہے کہ

علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت		زنگ گمراہی زدل بزد آیدت

واقع میں علم وہی ہے جو تم کو محبوب حقیقی کی راہ پر لگادے اور تمہارے دل سے گمراہی کا زنگ دور کردے۔

ایں ہوس ہا از سرت بیروں کند		خوف وخشیت در دلت افزوں کند

خواہشات نفسانی و شیطانی کو تمہارے سر سے نکال کر اللہ تعالیٰ کا خوف و خشیت تمہارے دل میں زیادہ کردے۔

اگر کہا جاوے کہ علم کے معنی جاننے کے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ کل ایک مہتر کو بھی حق ہو گا کہ وہ اپنے کو ذی علم کہے کیونکہ صحت کے لئے صفائی کی ضرورت اور مہتر صفائی کے فن کو جانتا ہے مگر آپ اس کو علم نہیں کہتے تو جس طرح آپ اس کو علم نہیں کہتے ہم ریل تار فوٹو گراف وغیرہ جاننے کو علم نہیں کہتے۔ ہاں صنعت ہے اور ضروری ہے۔ (المال والجاہ ج ۸)

اسلامی حدود کی وضاحت

حدیث میں ہے **لعن الله السارق يسرق البيضة فتقطع يده و يسرق الحبل فتقطع يده** (یعنی اللہ چور پر لعنت کرے کہ وہ ایک انڈا چراتا ہے اور اس پر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور ایک رسی چراتا ہے اور اس پر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے)

اس حدیث میں اشکال یہ ہوتا ہے کہ ایک انڈا چرانے سے یا رسی چرانے سے ہاتھ کہاں کاٹا جاتا ہے۔ ہاتھ کاٹنے کا نصاب تو اس سے زیادہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک

انڈے اور ایک رسی پر ہاتھ کاٹنے پر فرما رہے ہیں۔ ہمارے (یعنی حنفیہ کے) نزدیک قطع ید کا نصاب دس درہم ہیں دوسرے ائمہ کے نزدیک اس کی اور مقدار ہے۔ بہر حال اہل مذاہب متبوعہ میں کوئی ایسا نہیں کہ جس کے نزدیک اس کا کوئی نصاب نہ ہو اور انڈے اور رسی چرانے پر اہل مذاہب متبوعہ میں سے کسی کے نزدیک بھی قطع ید نہیں آتا۔ اس لئے اس حدیث کا ماول کرنا واجب ہوا کہ اس کو ظاہر سے منصرف کیا جاوے پس بعض نے کہا کہ بیضہ سونے کا مراد ہے جس کی قیمت نصاب سے بھی زائد ہے اور بعض نے کہا کہ بیضہ سے مراد خود ہے خود لوہے کی ٹوپی ہوتی ہے جس کو سر پر پہن لیتے ہیں تاکہ تلوار اثر نہ کرے وہ اتنی قیمت کی ہو سکتی ہے جس پر قطع ید آوے اسی طرح بعض نے حبل سے مراد حبل سفینہ لیا ہے کہ وہ اتنی قیمت کی ہو سکتی ہے بعض نے کہا ہے کہ اتنی حقیر چیز پر قطع ید ابتدائے اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا یہ سب بعید تاویلیں ہیں۔ ہمارے استاد رحمہ اللہ نے جو تاویل فرمائی ہے وہ جی کو لگتی ہے اور ظاہر حدیث سے کچھ بعید بھی نہیں تو جب تک کہ متبادر معنی بن سکیں غیر متبادر کی طرف کیوں جائیں۔

میرے استاد فرماتے ہیں کہ حدیث میں بیضہ اور حبل کے وہی معنی مراد ہیں جو متعارف ہیں۔ یعنی انڈا اور رسی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس سے معصیت کی عادت ہوتی ہے اور بڑی معصیتوں کا باب کھلتا ہے جو چور بدمعاش ہوتے ہیں وہ اول چوری پیسہ پیسہ سے شروع کرتے ہیں جب وہ کھپ گیا آگے جرات ہوئی پھر اور آگے چلے یہاں تک کہ ایک روز اس کی نوبت پہنچی کہ ہاتھ کاٹ دیا گیا یعنی کسی زمانہ میں انڈا یا رسی چرائی تھی آج یہاں تک نوبت پہنچی کہ اتنا مال چرایا کہ جس پر قطع ید کا حکم آ گیا یہ مطلب ہے اس حدیث کا۔

مثلاً ایک شخص سو روپیہ قرض لینے آیا مگر ہمیں تجربہ نہیں اس کا کہ یہ شخص معاملہ کا کیسا ہے تو ہمیں اس گمان کرنے میں کچھ حرج نہیں کہ نہ معلوم یہ شخص کیسا نہیں کیسا ہے۔ دین دار ہے یا نادہندہ۔ اگر ہم جھوٹ بھی بول دیں کہ روپیہ ہمارے پاس نہیں ہے تو بھی گناہ نہ ہوگا کیونکہ یہ شخص اپنے کو ضرر سے بچا رہا ہے۔ دوسرے کو ضرر نہیں دے رہا۔ اس جھوٹ سے گناہ نہیں ہوتا یہی معنی ہیں۔

دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز

(مصلحت آمیز جھوٹ فتنہ پھیلانے والی سچائی سے اچھا ہے)

کے اور یہ عام نہیں ہے کہ ہر مصلحت میں جھوٹ بول دیا کرے۔ مصلحت سے

مطلق مصلحت مراد نہیں بلکہ جس دروغ میں دوسرے کا ضرر نہ ہو اور اپنا یا کسی اور کا اس سے ضرور دفع ہوتا ہو شیخ نے اس کو مصلحت سے تعبیر کیا ہے۔

مثلاً کوئی شخص کسی ظالم کے خوف سے چھپا ہوا ہے اور اس کو معلوم ہے اور وہ ظالم تلاش کرنے آیا اور اس سے پوچھا اس نے کہہ دیا کہ مجھ کو خبر نہیں تو یہ جائز بلکہ واجب ہے خلاصہ یہ ہے کہ دوسروں سے بدگمانی معاملہ کے اعتبار سے ہو نہ اعتقاداً۔ ہاں اپنے نفس سے ہر حالت میں بدگمان رہے۔

حضرت ابوبکر ؓ کا سارا گھر لے لیا کیونکہ وہ صدیق اکبر بھی تھے۔ وہاں نہ طبع پر ناگواری کا شائبہ تھا نہ تکلیف سے متاثر ہونے کا اس لئے لے لیا کیونکہ وہ تو آپ کے اندر فنا ہو گئے تھے غیریت بالکل اٹھ گئی تھی پھر ان میں یہ احتمالات کس طرح ہو سکتے تھے۔

ایک حدیث کی تشریح

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **لاتکفروہ بذنب ولا تخرجه من الایمان**

یعنی کسی مسلمان کو کافر مت بناؤ کسی گناہ کی وجہ سے اور اس کو ایمان سے خارج مت کرو۔

حضور نے دو جملے ارشاد فرمائے ایک لاتکفروہ بذنب اور دوسرا لاتخرجہ من الایمان بظاہر دوسرے جملہ کے بیان کرنے کی حاجت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ لاتخرجہ من الایمان تو لاتکفر بذنب میں خود ہی آ گیا۔ کیونکہ جب مسلمان کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ ہوا۔ تو خروج من الایمان بھی نہ پایا گیا۔ پھر دوسرا جملہ ارشاد فرمانے کی کیا ضرورت تھی۔

سو اس کا راز یہ ہے کہ آپ کے بعد دو متبوع فرقے بڑے بڑے پیدا ہونے والے تھے جن کا فتنہ عظیم تھا۔ ایک خوارج دوسرے معتزلہ خوارج کا مذہب یہ ہے کہ مسلمان گناہ کبیرہ کی وجہ سے کافر ہو جاتا ہے اور معتزلہ کہتے ہیں کہ کبیرہ کے ارتکاب سے کافر تو نہیں ہوتا مگر مومن بھی نہیں رہتا۔ بین بین حالت ہو جاتی ہے نہ اس کو کافر کہہ سکتے ہیں نہ مومن۔ آپ نے ان دونوں فرقوں پر نکیر فرمائی۔ پہلے جملہ میں تو خوارج کا رد ہے اور دوسرے میں معتزلہ کا۔ اس لئے آپ نے دو جملے ارشاد فرمائے۔ (خیر الاثاث للاناث ج ۸)

جب میں نواب صاحب ڈھاکہ کے یہاں جاتا تھا وہ میری وجہ سے گھی کم ڈلواتے تھے۔ کیونکہ ہم لوگوں کے مذاق میں زیادہ گھی ڈالنے سے کھانے کا مزہ ہی باقی نہیں رہتا۔

مگر وہاں نواب صاحب کے چچا سے معلوم ہوا کہ ہمارے یہاں تو سیر بھر گوشت میں سیر بھر گھی پڑا کرتا ہے میں نے کہا اتنا گھی تو ہمارے یہاں بیلوں کو دیا جاتا ہے میں نے یہ بھی کہا کہ قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ گھی کوئی زیادہ مرغوب چیز نہیں۔ مجھ سے پوچھا گیا قرآن مجید سے کیسے معلوم ہوا۔ میں نے جواب دیا کہ قرآن مجید نے جنت میں چار نہریں بتلائی ہیں۔ ایک پانی کی ایک دودھ کی ایک شراب طہور کی ایک شہد کی۔ اگر گھی بھی مرغوب ہوتا تو ایک نہر اس کی بھی مذکور ہوتی۔ (خیر الاثاث للاناث ج ۸)

مصائب اختیاریہ

حق تعالیٰ فرماتے ہیں لاتلقوا بايديكم الى التهلكة (اپنے آپ کو ہلاکت کے ہاتھوں میں مت ڈالو) اور رسول فرماتے ہیں۔

لا ينبغي للمؤمن ان يذل نفسه قالوا يا رسول الله صلى الله عليه وسلم و كيف يذل نفسه قال يتحمل من البلاء لما لايطيقه. (الحدیث)

نص قرآنی سے معلوم ہوا کہ جس ہوس کا نتیجہ ہلاکت ہو وہ ممنوع ہے وہ دین نہیں ہے اور حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان کو اپنے آپ کو ذلیل کرنا بھی جائز نہیں گو ہلاکت بھی نہ ہو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مسلمان اپنے آپ کو کیونکر ذلیل کرتا ہے؟ فرمایا ایسی بلا کو سر دھرلے جس کے تحمل کی طاقت نہیں۔ اس سے بھی تجاوز عن الحد کی مذمت معلوم ہوئی۔

یہ تو مصائب اختیاریہ کے متعلق شریعت کی تعلیم تھی۔ اگر اس پر عمل کیا جائے تو اختیاری مصائب سے جو پریشانی ہوتی ہے وہ کبھی پاس نہ آسکے۔ (علاج الحرص)

یہاں سے اس حدیث کا مطلب واضح ہو گیا ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ (دنیا کی محبت سب برائیوں کی جڑ ہے) حب دنیا ہی کا نام تو حرص ہے اور عورتوں میں یہ مرض مردوں سے زیادہ ہے۔ ان کو زیور کپڑے اور برتنوں کی بہت حرص ہے پھر اس سے ریاء و تفاخر بھی پیدا ہوتا ہے جب محفل میں بیٹھیں گی تو کسی بہانہ سے اپنے کرن پھول اور کنگن دکھانا چاہیں گی۔ کنگن تو ہاتھوں میں ہوتے ہیں وہ تو سب بے تکلف دیکھ لیتے ہیں البتہ کرن پھول اور طوق گلوبند وغیرہ دوپٹہ سے مستور ہوتے ہیں تو جو ان میں ثقہ نہیں ہیں وہ تو بدلالت قال دکھلاتی ہیں کہ اے فلانی! دیکھئے میرے کرن پھول کیسے ہیں؟ اچھے بھی

بنے ہیں گلوبند عمدہ بھی ہے جس سے سب سمجھ جاتی ہیں کہ مقصود یہ جتلانا ہے کہ ہمارے پاس یہ چیزیں بھی ہیں اور جو ثقہ بھی ہیں وہ بدلالت قال تو نہیں دکھلاتیں مگر بدلالت حال دکھلاتی ہیں کہ بیٹھے بیٹھے ان کے کان میں یا گلے میں کھجلی اٹھتی ہے بار بار کان اور گلا کھجلاتی ہیں مگر یہ کھجلی اول دل میں ہوئی تھی پھر کان میں ہونے لگی۔ (علاج الحرص ج ۸)

حدیث میں آیا ہے۔ **اذادخل رمضان صفدت الشیاطین**

(کہ جب رمضان آتا ہے تو شیاطین قید کر دیئے جاتے ہیں)

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ پھر رمضان میں گناہ کیوں ہوتے ہیں اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ سب قید نہیں ہوتے بلکہ بڑے بڑے شیاطین قید ہوتے ہیں جس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض روایات میں مردۃ الشیاطین (بڑے بڑے شیاطین) آیا ہے تو چھوٹے قید نہیں ہوتے اور رمضان میں صدور معاصی انہی کی وجہ سے ہوتا ہے مگر میرے نزدیک اگر سب بھی قید ہو جائیں تب بھی کچھ اشکال نہیں کیونکہ معاصی کا سبب تقاضائے نفس بھی ہے پس شیاطین کے قید ہو جانے کے بعد جو گناہ ہوتے ہیں ان کا منشاء تقاضائے نفس ہے۔ (علاج الحرص ج ۸)

بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

حضرت خواجہ عبیداللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بڑا ساز و سامان تھا۔ سلطنت جیسے ٹھاٹ تھے مگر مال سے بے تعلقی کی یہ حالت تھی کہ ایک فقیر نے آپ کا امتحان لینا چاہا کہ دیکھو ان کو مال سے کتنا تعلق ہے اس نے ایک دن خواجہ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت میرا جی چاہتا ہے کہ اس سال آپ کے ساتھ حج کروں اس نے دل میں سوچا ہوگا کہ خواجہ صاحب انتظام ریاست کا عذر کر کے کچھ طویل میعاد مقرر کریں گے مگر وہاں کیا دیر تھی خواجہ صاحب فوراً رومال جھاڑ کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا بہت اچھا چلو۔ فقیر نے کہا' حضرت ریاست کا تو کچھ انتظام فرما دیجئے۔ فرمایا یہ تو خدا کا مال ہے' وہ خود اس کی حفاظت کر لیں گے میں تو ایک برائے نام محافظ ہوں اگر میں نہ ہوں گا تو وہ کسی دوسرے کو میری جگہ مقرر کر دیں گے مجھے انتظام کی ضرورت نہیں اس نے کہا اچھا میں ذرا کمبل اور کپڑے گھر سے لے آؤں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا بس اسی پر اپنے کو دنیا سے بے تعلق سمجھتے ہو مجھے تو اتنی بڑی ریاست کی بھی فکر نہ ہوئی اور تمہارا دل ابھی تک کمبل اور کپڑوں ہی میں اٹکا ہوا ہے۔ درویش اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ (علاج الحرص ج ۸)

طلب جنت کا ذریعہ

حدیث قدسی میں فرماتے ہیں **اعدت لعبادی الصالحین مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر قلب بشر**. میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیز تیار کی ہے کہ نہ کسی نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی نہ کسی کے دل میں اس کا خیال تک گزرا۔ حالانکہ خیال بڑی وسیع چیز ہے۔ مگر بروئے حدیث وہ چیزیں اسباب آخرت پر متفرع ہوتی ہیں جو خیال میں بھی نہ آسکیں۔ اب سوچئے کہاں تک سوچیں گے جمال باغ نہریں خادم ماکولات ومشروبات وغیرہ جہاں تک بھی آپ کا خیال پہنچے پھر ایک مرتبہ ایسا نکا لئے کہ خیال سے بھی باہر ہو اور عقل اس کے ادراک سے قاصر ہو مگر وہاں ملے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اگر فضل ہوا آخرت میں ترتب اثر تو کیا اس اثر کا وعدہ ہے کہ سبب سے اور اس سے کچھ نسبت بھی نہیں جمال اور باغ وغیرہ میں بھی ایسے مراتب نکل سکتے ہیں کہ خیال سے باہر ہوں اور بعض نتیجے وہاں کے وہ ہیں کہ ان کا صرف لفظ ہی سنا ہے ماہیت تو عقل میں بھی نہیں آتی۔ وہ رویت الٰہی ہے غرض ترتب اثر یقینی ہوا کیونکہ وعدہ فرمایا ہے باری تعالیٰ نے کہ اثر ہم ضرور متفرع کریں گے تم ذرائع کو حاصل کرو۔ (وعظ میرٹھ ج ۸)

حب دنیا کی حقیقت

مال را گر بہر دیں باشی حمول   نعم مالٌ صالح گفت آں رسولؐ

"اگر مال و دولت کو دین کیلئے حاصل کرو تو ایسے مال کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھا مال فرمایا ہے"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **نعم المال الصالح للرجل الصالح** (اچھا نیک رال نیک آدمی کا مال ہے) مال سے مدرسہ بنا سکتا ہے۔ مساکین کی خدمت، طلباء کی اعانت کرسکتا ہے، حقوق ادا کرسکتا ہے۔ دوسری قوم کے مقابلہ میں اپنی قوم کی اس سے مدد کر سکتا ہے۔ کتنے نفع کی چیز ہے۔ کون کہتا ہے کہ مال مضر ہے البتہ حب مال مضر ہے پس ہاتھ میں رہے۔ قلب میں نہ رہے۔ یہ حالت ہو کہ دل بیار دست بکار۔

حاصل یہ ہوا کہ وہ شخص دنیادار نہیں جس کے قلب میں تو محبت ہو خدا اور رسول کی اور ہاتھ میں مال رکھتا ہو۔ جس کی علامت یہ ہے کہ اگر لاکھ روپے ملتے ہوں اور دین کا نقصان ہوتا ہو تو وہ دین کے

مقابلہ میں لاکھ روپے پر لات مار دے۔ سو ایسا شخص وہی ہو سکتا ہے کہ جس کے دل سے دنیا کی محبت نکل جائے۔ جب محبت دنیا کی دل سے نکال دے گا تو پھر دنیادار نہ ہوگا۔ (وعظ الحیوۃ ج ۸)

جنت اور اس کی وسعت

میں نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ سے عرض کیا کہ حضرت جب سارے جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے اور جنت پھر بھی خالی رہے گی اور حق تعالیٰ سے وہ عرض کرے گی کہ مجھے بھریئے کیونکہ آپ نے مجھے بھرنے کا وعدہ فرمایا تھا تو حق تعالیٰ جنت کو بھرنے کے لئے اسی وقت ایک نئی مخلوق کو پیدا فرمائیں گے تو یہ نئے لوگ بہت اچھے ہوں گے کہ ان کو مفت جنت مل گئی فرمایا کیا اچھے ہوں گے ان کو جنت سے خاک بھی لذت نہ ہو گی وہ تو سمجھیں گے کہ زندہ ہو کر یوں ہی چین ہوتا ہوگا جیسا جنت میں ہو رہا ہے اچھے ان شاء اللہ تعالیٰ ہم ہوں گے کہ جنت میں دنیا کی تکالیف جھیل کر پہنچیں گے ہم کو جنت کی نعمتوں سے زیادہ حظ آئے گا کہ وہاں قدم رکھتے ہی بے ساختہ زبان سے نکلے گا۔

الحمد لله الذى اذهب عنا الحزن ان ربنا لغفور شكور الذى احلنا دار المقامة من فضله لا يمسنا فيها نصب و لا يمسنا فيها لغوب

سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ہم سب سے رنج والم دور کر دیا بے شک ہمارا رب بڑا بخشنے والا قدردان ہے جس نے ہمیں محض اپنے فضل سے دار المحن سے نکالا جہاں سے نکل کر ہم نے نہ تکان محسوس کی اور نہ ہمیں خستگی و درماندگی پہنچی۔ (مظاہر الاموال ج ۸)

صحت واطمینان کی نعمت

ہم لوگ تو اس زمانہ کے اعتبار سے آج کل بادشاہ ہیں کیونکہ حدیث میں ہے۔

اصبح معافى فى جسده امناً فى سربه عنده قوت يومه فكانما حيزت له الدنيا بحذا فيرها

کہ جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ بدن میں صحت اور نفس میں بے فکری ایک دن کا کھانا پاس ہو اس کو تمام دنیا مل گئی۔

جب صحت و اطمینان کے ساتھ ایک دن کا کھانا گھر میں موجود ہو، تو یوں سمجھو کہ تمام دنیا گھر میں آ گئی۔ اگلے دن کی فکر نہ کرو۔ (مطاہرالاموال ج ۸)

مترس از بلائے کہ شب درمیانست

چندہ کا طریقہ

لگ لپٹ کر چندہ نہ مانگنا چاہئے جس سے دوسروں کو علماء پر احتیاج کا شبہ ہو کیونکہ یہ طریقہ شریعت کے خلاف ہے یہاں تو یہ حالت ہے۔

ہر کہ خواہد گو بیاؤ ہر کہ خواہد گو برو
دارو گیرد حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

”جب دل چاہے آؤ جب دل چاہے چلے جاؤ اس دربار میں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں“

بلکہ یہ طریقہ شرافت کے بھی خلاف ہے شریف آدمی کو احتیاج بھی ہو جب بھی وہ لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتا۔ چنانچہ ایسے ہی فقراء کی شان قرآن میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

للفقرآء الذین احصر و افی سبیل اللّٰہ لا یستطیعون ضرباً فی الارض یحسبھم الجاھل اغنیآء من التعفف تعرفھم بسیماھم لایسئلون الناس الحافاً

ہم نے عرب میں سائلوں کی یہ حالت دیکھی ہے کہ جہاں ان سے کسی نے اللہ اکبر کہہ دیا تو فوراً اللہ کریم کہتے ہوئے چل دیئے اس لفظ کے سننے کے بعد دوبارہ ہرگز نہیں مانگتے۔ اب اگر کسی کو دینا ہو تو خود دوڑ کر انہیں دے دے وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ اور جو لوگ سر ہو جاتے ہیں وہ اکثر ہندوستان کی نسل ہیں عرب نہیں ہیں۔ مگر وہاں رہ کر صورت عربوں کی سی بنا لی ہے۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جن کو عربی بولنا بھی نہیں آتی۔ (مطاہرالاموال ج ۸)

نا اہل کو منتظم یا مہتمم بنانا

حدیث میں ہے اذا وسد الامر الیٰ غیر اھلہ فانتظر الساعۃ (جبکہ کام کو اسکے غیر اہل کے سپرد کرو تو قیامت کا انتظار کرو)

آج کل یہی حالت ہے کہ نا قابل کے کام سپرد کر دیتے ہیں اور اہل کے اس واسطے سپرد نہیں

کرتے کہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو آپ اہل کہتے ہیں ان کے کرتے پاجامے پھٹے ہوئے ہیں۔ وضع قطع غیر مناسب ہے۔ ایسے لوگوں سے ہماری مجلس کی بے قدری ہوگی۔ (تاسیس البنیان)

چوری اور ہیرا پھیری

ایک بزرگ کے ہاتھ پر ایک چور نے چوری سے توبہ کی۔ اور خانقاہ میں رہنے لگا۔ صبح کو خانقاہ والوں کے جوتے گڑبڑ ہو جاتے۔ کسی کا ایک کہیں پڑا ہے دوسرا کہیں پڑا ہے۔ لوگوں کو دس پندرہ منٹ تک جوتوں کی تلاش میں پریشانی ہوتی اور اتنی دیر تک اچھی خاصی رونق ہو جاتی سب کو فکر ہوئی کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ پھر اس نو وارد پر شبہ ہوا۔ مگر چونکہ اہل اللہ تھے۔ اس لئے بدگمانی نہ کی بلکہ تفتیش شروع کی۔ آخر ایک رات پکڑے گئے اور صبح کو شیخ کے سامنے حاضر کئے گئے۔ کہ حضرت یہ نو وارد خانقاہ والوں کے جوتے گڑبڑ کر دیتا ہے۔ نہ معلوم اس کو اس میں کیا مزا آتا ہے اور ہم کو بے فائدہ پریشانی ہوتی ہے۔

شیخ نے پوچھا۔ نو وارد نے کہا کہ حضرت میں آپ سے پالیسی نہیں کرتا بلکہ صاف صاف اپنا فرض بیان کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں پہلے چوری کا عادی تھا جس سے اب توبہ کر لی ہے۔ مگر جب رات کو دو بجتے ہیں تو نفس تقاضا کرتا ہے میں اس کو دباتا ہوں کہ بزرگوں سے بیعت ہو کر ان کی مخالفت کرنا چھوڑ دو وہ پھر تقاضا کرتا ہے۔ میں پھر روکتا ہوں۔ گھنٹہ بھر تک میری اس کی جنگ ہوتی ہے۔ آخر کار مصالحت پر فیصلہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ صلح میں کچھ دینا پڑتا ہے کچھ دوسرے کو دبایا جاتا ہے۔ تو میں نفس سے کہتا ہوں کہ چوری میں دو باتیں ہوتی ہیں ایک چیز کا اٹھانا دوسرے اسے لے جانا۔ تو ان دونوں میں ایک کام کر لے ایک کام چھوڑ دے۔ اسلئے خانقاہ والوں کے جوتے گڑبڑ کر دیتا ہوں کہ ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیتا ہوں۔ اب اگر یہ بھی ممنوع ہے تو میں اس سے بھی توبہ کر لوں گا۔ مگر اندیشہ ہے کہ جب نفس کا تقاضا زیادہ ہوگا تو چوری میں مبتلا ہو جاؤں گا۔

شیخ نے کہا کہ تم جوتے گڑبڑ کر دیا کرو۔ تم کو جائز ہے۔ بلکہ تم پر واجب ہے کیونکہ چوری سے وقایہ ہے اور خانقاہ والوں سے کہا تم اس تکلیف کو گوارا کر لو تم کو ثواب ملے گا۔

(العصر والصلوٰۃ ج۹)

تعزیت کا اچھا طریقہ

ایک اعرابی نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے موقع پر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا تھی۔ آج کل اگر کوئی ایسا مضمون بیان کرے تو لوگ کہیں گے۔ لیجئے تسلی دینے آئے تھے ڈھیلا سا مار گئے۔ آج کل تو تعزیت اُس کو کہتے ہیں کہ بیٹھتے ہی رونے لگو۔ یا رونے کی صورت بنالو اور یوں کہو کہ یہ خبر سن کر بہت ہی غم اور صدمہ ہوا۔ تمہارے دل پر کیا گزری ہوگی۔ ہائے! یہ کیسا گھر برباد ہوگیا جس سے غم زدہ کا دل اور پاش پاش ہوجاتا ہے خصوصا عورتوں کے کلمات تو ایسے زہر آلود ہوتے ہیں کہ ان کے متعلق تو میں فتویٰ دیتا ہوں کہ غم کے وقت ان کے کلمات سننا جائز نہیں۔ مجھے تو ایک مرتبہ عورتوں کے کلمات تعزیت سن کر اختلاج قلب ہوگیا تھا جس کی مضرت دور تک پہنچ گئی تھی۔ ان کا سننا صحت جسم اور صحت دین دونوں کے لئے مضر ہے اب اس اعرابی کا مضمون سنئے۔ کہتا ہے ۔

اصبر نکن بک صابرین فانما صبر الرعیة بعد صبر الراس

اے عبداللہ بن عباس! صبر کیجئے تا کہ آپکو دیکھ کر ہم بھی صبر کا سبق سیکھیں...... کیونکہ آپ مقتداء ہیں اور مقتداء کے صبر سے ہی رعیت کو صبر کا سبق حاصل ہوتا ہے اگر مقتداء بے صبر بن جائے تو رعیت کیوں کر صابر ہوگی۔"

سبحان اللہ! کیسی عجیب تعلیم ہے جس کو سن کر مقتدا پوری طرح صبر کے لئے آمادہ ہوجائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ آپکو اول تو اپنے علم کی وجہ سے صبر کرنا چاہئے۔ اگر یہ نہ ہو تو کم ازکم ہمارے ہی خیال سے صبر کیجئے۔ آگے کہتا ہے۔

خیر من العباس اجرک بعده والله خیر منک للعباس

حضرت عباسؓ کے انتقال سے جو آپ کو غم کو ہوا اور اس پر اجر ملا وہ اجر آپ کے حق میں حضرت عباس سے بدرجہا بہتر ہے عباس کو لے کر کیا کرو گے۔ وہ تو دنیا ہی میں کام آتے اور ثواب تو جنت تک آپ کو پہنچا دیگا۔ اور حضرت عباسؓ کے لئے خدا تعالیٰ آپ سے بہتر ہیں۔ وہ آپ سے جدا ہو کر خدا کے پاس پہنچ گئے۔ پھر کاہے کا غم کہ نہ آپ کا نقصان ہوا نہ ان کا بلکہ دونوں کا نفع ہی ہوگیا۔ (الصبر والصلوٰۃ ج ۹)

ایک بزرگ کا کشف

عبدالکریم جیلیؒ کا کشف ہے کہ ایک دریا زمین و آسمان سے باہر ہے جس کی ایک موج ساتوں آسمان و زمین سے دس لاکھ حصہ زیادہ ہے۔ مگر اس کی موج آسمان و زمین کے ساتھ ٹکرا جائے تو سب غرق ہو جائیں۔ مگر ملائکہ اس کی موجوں کو تھامے ہوئے ہیں۔ تا کہ آسمان و زمین سے نہ ٹکرائیں اور اس دریا میں نہ معلوم کتنی مخلوق دریائی ہوگی۔ تو حق تعالیٰ کی کیسی قدرت ہے کہ اپنی تمام مخلوق کی حفاظت اور کافی انتظام فرماتے ہیں اور واقعی اگر وہ حفاظت نہ فرمائیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔

چنانچہ اس حفاظت پر اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک رات اندھیرے میں خانقاہ سے میں اپنے گھر گیا تو گھر کا راستہ بھول گیا اور کسی کے گھر پہنچ گیا بڑی دقت سے راستہ ملا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور عظمت منکشف ہوئی۔ (السمر بالصمر ج۹)

پتھر کا گریہ

سیر میں ایک پتھر کی حکایت لکھی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا اس پر گزر ہوا۔ دیکھا کہ زار زار رو رہا ہے پوچھا کیوں روتا ہے کہا جب کہ میں نے یہ آیت سنی ہے۔

وقودھا الناس والحجارة کہ جہنم کا ایندھن آدمی بھی ہیں اور پتھر بھی۔

اس وقت سے مارے خوف کے رو رہا ہوں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ! اس پتھر کو جہنم میں نہ ڈالا جائے۔ وہاں سے وحی آ گئی کہ ہم نے آپ کی دعا قبول کر لی۔ اس پتھر کو جہنم میں نہ ڈالا جائے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کی تسلی کر دی۔ بہت خوش ہوا اور رونا موقوف کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھ گئے۔ ایک مدت کے بعد موسیٰ علیہ السلام پھر یہاں سے گزرے تو دیکھا پھر رو رہا ہے۔ پوچھا اب کیوں روتا ہے جب کہ تیری تسلی کر دی گئی۔ اور تجھ کو بشارت مل گئی کہا اے موسیٰ علیہ السلام وہ بشارت رونے ہی کی بدولت ملی تھی اب رونے کو کیوں چھوڑوں جس کی بدولت اتنی بڑی دولت ملی ہے۔ (السمر بالصمر ج۹)

اولاد اور شفاعت

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے تین بچے مر گئے

ہوں وہ اس کے لئے جہنم کی آگ سے آڑ بن جائیں گے۔ کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے دو بچے مرے ہوں، فرمایا وہ بھی۔ پھر کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کا ایک ہی بچہ مرا ہو۔ فرمایا وہ بھی پھر کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ جس کا ایک بھی بچہ نہ مرا ہو۔

قال انا فرط لا متی ولن یصابوا بمثلی

فرمایا تو میں اپنی امت کا آگے جا کر سامان کرنے والا ہوں اور میری موت جیسا حادثہ میری امت پر کوئی نہ آئے گا۔ اس لئے ان کے واسطے میری وفات کا صدمہ ہی مغفرت کو بس ہے۔

نفدیک باباء ناوامھاتنا یا رسول الله

فلو ان رب الناس بقی محمدا سعدنا ولکن امره کان ماضیا

"اگر اللہ تعالیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو باقی رکھتے تو یہ ہماری سعادت تھی مگر خدا کا حکم نافذ تھا اس لئے وہ اس جہان سے چلے گئے۔

یعنی میں آگے جا کر اپنی امت کے لئے مغفرت کی سعی وسفارش کروں گا۔

اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ جیسے بے اولادوں کے لئے حضور کی شفاعت کافی ہے۔ ایسی ہی اولاد والوں کے لئے بھی کافی تھی اولاد کی شفاعت کی کیا ضرورت تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کو زیادت تسلی کے لئے اس کی ضرورت تھی دو وجہ سے ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ادب وخوف کے ساتھ شفاعت فرمائیں گے اور بچہ ضد کے ساتھ شفاعت کرے گا۔ یہ بچے جس طرح یہاں والدین پر ضد کرتے ہیں۔ قیامت میں اللہ تعالیٰ پر بھی ضد اور ناز ونخرے کریں گے چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ بچہ جنت کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو جائے گا۔ اس سے کہا جائے گا اندر جاؤ کہے گا نہیں جاتے۔ پوچھیں گے کیوں؟ کہے گا جب تک ہمارے ماں باپ ہمارے ساتھ نہ ہوں گے اس وقت تک ہم جنت میں نہیں جا سکتے تو اس سے حق تعالیٰ فرمائیں گے۔

ایھا الطفل المراغم ربه ادخل ابویک الجنة

"اے اپنے پروردگار سے ضد کرنے والے بچے جا اپنے ماں باپ کو بھی جنت میں لے جا۔"

دوسرے عقلاً عدد بڑھنے سے زیادہ قوت ہوتی ہے گو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو انضمام ضمیمہ کی ضرورت نہیں۔ آپ تنہا ہی اکفی ہیں۔ مگر طبعاً عدد بڑھنے سے تسلی زیادہ ہوتی ہے۔

نیز حدیث میں آتا ہے کہ جب کسی مسلمان کا بچہ مرتا ہے اور ملائکہ اس کی روح کو لے کر آسمان پر پہنچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے ارشاد فرماتے ہیں۔

اخذ تم ولد عبدی قالوا اللھم نعم ثم یقول ھل قبضتم ثمرة فؤاد عبدی قالوا اللھم نعم فیقول فماذا قال عبدی قالو اللھم حمدک وصبر فیقول ابنوا العبدی بیتا فی الجنة وسموہ بیت الحمد کمال قال.

کیا تم نے میرے بندہ کے بچہ کو لے لیا۔ وہ کہتے ہیں اے اللہ ہاں! پھر فرماتے ہیں کیا تم نے میرے بندہ کے جگر گوشہ کو لے لیا وہ کہتے ہیں اے اللہ ہاں!۔ پھر فرماتے ہیں کہ میرے بندہ نے کیا کہا فرشتے عرض کرتے ہیں اے اللہ اس نے آپ کی حمد کی (مراد شکر ہے) اور صبر کیا۔ اس پر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں (کہ گواہ رہو کہ میں نے اپنے بندہ کو بخش دیا اور) اس کے لئے جنت میں ایک محل تیار کرو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔

یہ تو چھوٹوں کے مرنے پر وعدہ ہے جس سے ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ بچوں کے مرنے پر نعم البدل عطا فرماتے ہیں۔ یعنی مغفرت اور جنت کا محل اور بڑوں کے مرنے پر بھی اسی طرح اجر و ثواب کا وعدہ ہے۔ (الجبر بالصبر ج۹)

کمال فہم وفراست

ہارون رشید جو مسلمانوں کا بڑا بادشاہ اور خلیفہ تھا۔ عید کے دن جشن کیا اور یہ اعلان کر دیا کہ دربار میں جتنی چیزیں موجود ہیں اس میں سے جس چیز پر جو شخص ہاتھ رکھ دیگا وہ اسی کی ہو جائے گی۔ درباریوں نے اس اعلان کے بعد ہاتھ رکھنا شروع کر دیا۔ کسی نے جوہرات پر ہاتھ رکھا کسی نے سونے چاندی پر۔ ایک باندی نے جو ہارون رشید کو پنکھا جھل رہی تھی۔ خلیفہ کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا۔ خلیفہ نے اس حرکت پر برہم ہو کر سوال کیا کہ یہ کیا حرکت ہے کہا حضور کا اعلان عام تھا کہ جو جس پر ہاتھ رکھ دے وہ اسی کی ہے۔ اس میں کوئی استثنا نہ تھا تو میں نے دیکھا کہ یہ درباری بے وقوف ہیں جو سونے چاندی اور جواہرات پر ہاتھ رکھ رہے ہیں تو میں نے سوچا کہ ایسی چیز پر ہاتھ رکھنا چاہئے جس کے ہاتھ میں سب چیزیں ہیں اس لئے میں نے حضور پر ہاتھ رکھ دیا کہ جب آپ میرے ہوں گے تو سب چیزیں میری ملک ہو جائیں گی۔

اس جواب کو سن کر ہارون بہت خوش ہوئے اور (فرمایا کہ میں تیرا ہو گیا) واقعی باندی بہت سمجھ دار تھی تو بتلایئے ان واقعات مصیبت میں کیا یہ بات تھوڑی ہے کہ ان کے ذریعہ سے خدا ہم کو ملتا ہے جس کی جنت ہے اور دوزخ بھی۔

شاید کسی کے دل میں یہ وسوسہ آیا ہو کہ دوزخ ہماری ہوگئی تو کیا نفع ہوا۔ کیا ہم دوزخ میں رہیں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ افسوس آپ نے بات کو سمجھا ہی نہیں دنیا میں جیل خانہ بادشاہ کی ملک ہوتا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ بادشاہ جیل خانہ میں رہتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم جس کو چاہو گے بخشوالو گے اور جہنم سے نکلوالو گے۔ (الجبر بالصبر ج ۹)

آمد وخرچ کا طریقہ

شیخ الٰہی بخش صاحب رئیس میرٹھ کا مقولہ ہے کہ آمدنی کی فکر سے زیادہ خرچ کی فکر لازم ہے اگر خرچ کی فکر ہو تو تھوڑی بھی کافی ہو جاتی ہے اور خرچ کا انتظام نہ ہو تو بہت آمدنی بھی کافی نہیں۔ آج کل لوگوں کی زیادہ پریشانی کا سبب یہی ہے کہ وہ اپنے خرچ کا انتظام نہیں کرتے۔ اس لئے پچاس اور ساٹھ کی تنخواہ بھی ان کو قلیل معلوم ہوتی ہے۔ (الجبر بالصبر ج ۹)

عقل کیا ہے؟

کسی مجذوب سے پوچھا گیا کہ عقل کیا ہے؟ کہا جو خدا کو پاوے پوچھا خدا کون ہے؟ کہا جو عقل میں نہ آوے۔ مطلب یہ ہے کہ عقل وہ ہے جو ہمیشہ اس کی جستجو میں لگی رہے اور اس سے کبھی غافل نہ ہو۔ غرض یہ بات ماننا پڑے گی کہ عقل کے لئے بھی ایک حد ہے جس سے آگے وہ نہیں چل سکتی۔ (الامتحان ج ۹)

رحمت خداوندی

اللہ تعالیٰ کو اپنے بندہ کے غم کے ناگوار ہونے کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

ما ترددت فی شیء ترددی فی قبض نفس عبدی ارید لقاءه وهو یکره الموت ولن یلقانی حتی یموت. او کما قال

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے کسی کام میں ایسا تردد نہیں ہوتا جیسا اپنے بندے کی جان قبض

کرنے میں تردد ہوتا ہے (اس کی تفسیر ہم نہیں کر سکتے بلکہ اس کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتے ہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کے ساتھ کس قدر تعلق ہے کہ موت سے جو اس کو تکلیف ہوتی ہے وہ بھی ان کو گوارا نہیں حالانکہ موت ضروری اور لابدی ہے)

دوسروں کو بھی حکم ہے کہ مصیبت زدہ کو تسلی دیں چنانچہ تسلی دینے کی فضیلت حدیث میں بہت آئی ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی شفقت و رحمت کی دلیل ہے کہ خود بھی اپنے بندے کو تسلی دیتے ہیں اور کوئی دوسرا تسلی دے تو اس کو ثواب عطا فرماتے ہیں حدیث میں ہے:

من عزي ثكلى كسي بردا في الجنة او كما قال

جو ایسی عورت کو تسلی دے جس کا بچہ مر گیا ہو اس کو جنت میں (بڑھیا) چادر یا لباس پہنایا جائیگا۔

من عزى مصابا فله مثل اجره او كماقال

جس نے کسی مصیبت زدہ کی تسلی کی اسکو مصیبت زدہ کے برابر ثواب ملے گا۔ (آداب المصاب ج۹)

آداب عیادت

حدیث میں تاکید ہے کہ جب بیمار کے پاس جاؤ تو **نفسو اله في اجله** یعنی اس کو تسلی دو کہ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے یا ابھی تمہارا وقت نہیں آیا ہے حضورؐ ایک مریض کی عیادت کو تشریف لے گئے تو فرمایا **لا باس طهور ان شاء الله** اس احمق نے کہا بل حمی تفراجی خوف کیوں نہیں۔ بڈھے آدمی کو بخار چڑھا ہی نہیں ضرور اچھا نہ ہوں گا۔ آپؐ نے فرمایا اچھا ایسا ہی ہوگا۔ بالآخر وہ مر گیا۔ فال بد ایک قسم کی ناامید ہے رحمت حق سے سو بھی اس کا اثر برا ظاہر ہوتا ہے۔

ہمارے وطن میں ایک لڑکی ہے۔ بچپن میں جب اس سے کوئی کہتا کہ تیرا بیاہ کب ہوگا تو وہ کہتی کہ بس اب کیا ہوگا۔ آخر اس کے بیاہ کی ایسی مشکل پڑی کہ اللہ اللہ کر کے بڑی مدت میں ہوا

احکام کے اسرار

تفسیر مظہری میں ایک حدیث سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بعضے میرے بندے ایسے ہیں کہ اگر ان کو تندرست و متمول رکھوں تو وہ کفر کرنے لگیں۔ چنانچہ اس حدیث کے آخر میں فرماتے ہیں۔ **و ذالک بانی اعلم بعبادی** . بعض کی نسبت ارشاد ہے **و لو بسط الله الرزق لعباده لبغوا في الارض** جیسا حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو توڑا تھا۔ بظاہر کوئی مصلحت نہ تھی۔ چنانچہ حضرت موسےؑ نے اعتراض کیا۔ مگر اس میں کتنی بڑی مصلحت نکلی۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حکمت و مصلحت سے بھرا ہوتا ہے۔ **فعل الحکیم لا یخلوا عن الحکمۃ۔** چنانچہ ایک مصلحت یہ ہے کہ اہل مصیبت کو وہ وہ درجے ملیں گے کہ اغنیاء یہ تمنا کریں گے کہ کاش! ہمارا بدن ...... قینچیوں سے کاٹا جاتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم خود بلا مانگو۔ تم تو عافیت ہی مانگو۔ اگر وہ مراتب اور عافیت دونوں دے دیں۔ تو ان کے یہاں کس چیز کی کمی ہے۔ حضورؐ بیماری سے بچنے کی بھی دعا مانگتے تھے اور عافیت کی بھی۔ تم بھی ہر مراد مانگو۔ (دواء الضیق ج۹)

مباح کی حد

حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ عید کے دن دو نابالغ لڑکیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گا رہی تھیں۔ حدیث میں اس کے ساتھ ہی یہ بھی آتا ہے **ولیستا بمغنتین** کہ وہ گانے والیاں نہ تھیں یعنی انکو با قاعدہ گانا نہیں آتا تھا۔ یوں ہی بے قاعدہ محض خوشی کے طور پر گا رہی تھیں۔ پس اس سے مطلق غنا کے جواب پر استدلال نہیں ہوسکتا۔

غرض حدیث میں آتا ہے کہ وہ لڑکیاں گا رہی تھیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ آئے جب بھی وہ گاتی رہیں پھر حضرت عمرؓ آئے تو ان کو دیکھ کر وہ خاموش ہوگئیں اور گانا بند کردیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر تبسم فرمایا اور فرمایا اے عمرؓ! شیطان تم سے بھاگتا ہے خدا کی قسم! اگر تم ایک راستہ کو چلو گے تو شیطان اس راستہ کا چلنا چھوڑ دے گا۔

اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ غنا حرام تھا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہ منع فرمایا اور جائز تھا آپؐ نے ان کے قطع غنا پر یہ کیوں فرمایا شیطان عمرؓ سے بھاگتا ہے۔

اس کا بھی جواب اسی قاعدہ سے نکلتا ہے کہ ہر شے کی حد ہے۔ مباح کی بھی ایک حد ہے اور یہ غنا حد مباح کے اندر تھا۔ مگر اس وقت مباح کی حد ختم ہو چکی تھی کہ حضرت عمرؓ اتفاقاً تشریف لے آئے اور ان کے دیکھتے ہی گانے والیاں خاموش ہوگئیں۔ اگر وہ خاموش نہ ہوتیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما دیتے۔ مگر حضورؐ کو تعجب و تبسم اس پر ہوا کہ حضرت عمرؓ کی صورت دیکھتے ہیں بدوں ان کے کچھ کہے گانے والیاں خود ہی چپ ہوگئیں۔

اس پر حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو بشارت دی کہ شیطان تم سے بھاگتا ہے (اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ غنا اس وقت بھی حد مباح پر تھا۔ مگر یہ ایسا مباح ہے جس کو شیطان اپنی کامیابی کا وسیلہ بنایا کرتا ہے کمافی

الحدیث والشعر من مزامیر ابلیس اور حضرت عمرؓ کا رعب ایسا تھا کہ ان کے سامنے ایسا مباح واقع نہ ہو سکتا تھا جس میں شیطان کا کچھ بھی حصہ ہو ویجوز مثل ھذا المباح بحضرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم لکونہ شارعاً لحدود المباح والحرام ونحوھما۔ (الاجر النبیل ج ۹)

اولاد نہ ہونے کی حکمت

اگر کسی کے بالکل ہی اولاد نہ ہو وہ یوں سمجھے کہ میرے لئے یہی حکمت ہے نہ معلوم اولاد ہوتی تو کن کن مصائب کا سامنا ہوتا۔ چنانچہ خدا نے مجھے اولاد نہیں دی۔ میں اس کو اپنے واسطے عین حکمت سمجھتا ہوں۔

حضرت حاجی صاحب سے میرے گھر میں خالہ نے دعا کے واسطے عرض کیا تھا کہ اشرف علی کے اولاد ہو جائے۔ حاجی صاحب مجھ سے فرمانے لگے کہ بھائی تمہاری خالہ اولاد کے لئے دعا کرنے کو کہتی تھی۔ دعا سے کیا انکار ہے لیکن میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ جیسا میں ہوں ایسے ہی تم رہو۔ میں نے دل میں کہا کہ بس تو خیر صلا ہے اگر آپ دعا بھی کریں گے جب بھی اولاد نہ ہوگی کیونکہ دلی منشا تو یہ ہے اور

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں　　　　مید ہد یزداں مراد متقیں

"تو ایسا چاہتا ہے اور خدا ایسا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کی مراد پوری فرماتا ہے۔"

میں نے کہا حضرت بس! میں وہی چاہتا ہوں جو آپ چاہتے ہیں۔

اولاد نہ ہونے میں بعض کے لئے ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ اس شخص کے تعلقات دنیا میں نہیں بڑھتے۔ اور اولاد والے کے تعلقات بہت بڑھ جاتے ہیں چنانچہ ہماری پھوپھی صاحبہ میرے لئے اس طرح دعا کیا کرتی تھیں کہ اے اللہ! میرے بھتیجے کا بھی سا اچھا دنیا میں رلا دے (یعنی اولاد دیدے) میں غصے ہوتا تھا کہ تم مجھے کوستی ہو دنیا دار بنانا چاہتی ہو مگر یہ عنوان بتلا رہا ہے کہ اہل عرف کے نزدیک دنیا کے اندر وہی پھنستا ہے جو صاحب اولاد ہو اور اس سے خود سمجھ لو کہ جو صاحب اولاد نہ ہو وہ کیا ہوگا۔ وہ دنیا سے بے تعلق و بے لوث ہوگا۔ بلکہ یوں کہئے کہ اللہ والا ہوگا۔ اب تم خود سمجھ لو کہ اللہ والا ہونا اچھا یا دنیا والا ہونا اچھا۔ مگر یہ بعض کے اعتبار سے ہے ورنہ بعضے اولاد والے بے تعلق رہتے ہیں اور بعض بے اولاد دنیا دار ہوتے ہیں۔ (الاجر النبیل ج ۹)

چنانچہ اگر میرے اولاد ہوتی تو شاید میرے لئے تکلیف کا سبب ہوتی کیونکہ مجھے تعلقات سے پریشانی ہوتی ہے۔ نیز مجھے انتظام کا ہیضہ ہے بدانتظامی سے مجھے سخت الجھن ہوتی ہے۔ اور اولاد کا انتظام سب سے زیادہ دشوار۔

عبادت وطاعت کا فرق

حضرت حاجی صاحب کے سامنے آیت **وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون**۔ پر اشکال کیا گیا کہ اس میں جن وانس کی تخصیص کی کیا وجہ ہے۔ خدا تعالیٰ کی عبادت تو ساری ہی مخلوق کرتی ہے کچھ جن وانس کی تخصیص نہیں۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ایک تو عبادت ہے اور ایک طاعت ہے اول ایک مثال سے ان دونوں مفہوموں میں فرق سمجھ لو۔ وہ یہ کہ ایک تو نوکر ہے اور ایک غلام۔ نوکر کا کام تو معین ہوتا ہے خواہ ایک یا متعدد مثلاً باورچی ہے کہ اس کیلئے کھانا پکانے کی خدمت معین ہے یا سپاہی ہے یا مکان پر بازار اور گھر کام کرنے کے واسطے کوئی نوکر ہے تو جس خدمت کے واسطے یہ لوگ نوکر ہیں ان سے وہی خدمت لی جاسکتی ہے۔ خود آقا بھی اس کا لحاظ رکھتے ہیں۔

حتیٰ کہ اگر باورچی سے آقا کہے کہ یہ خط لے کر گنگوہ چلے جاؤ تو نوکر ضابطہ میں انکار کر سکتا ہے۔ اور غلام کی کوئی خدمت معین نہیں ہوتی۔ بلکہ تمام خدمات اس کے ذمہ ہیں جس کا بھی حکم ہو جاوے۔ چنانچہ ایک وقت اس کو آقا کا پاخانہ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ اور ایک وقت میں آقا کی پوشاک پہن کر آقا کا قائم مقام اور نائب بن کر جلسہ میں یا دربار میں جانا پڑتا ہے۔ غرضیکہ غلام کو کسی وقت بھی کسی خدمت سے انکار نہ ہوگا۔

اسی طرح جن وانس کے تمام مخلوق کی طاعت معین ہے ہر شے مخلوقات میں سے ایک خاص کام پر معین ہے کہ اس کے سوا دوسرا کام اس سے نہیں لیا جاتا۔ مگر انسان کی کوئی خدمت معین نہیں۔

چنانچہ ایک وقت میں انسان کا سونا عبادت ہے۔ ایک وقت میں پاخانہ پھرنا بھی عبادت ہے مثلاً جماعت تیار ہو اور پیشاب پاخانہ کا زور ہو تو اس وقت پیشاب وغیرہ سے فراغت حاصل کرنا واجب ہے اور نماز پڑھنا اس وقت حرام ہے اگر پیشاب پاخانہ سے فراغت حاصل نہ کی تو حرام فعل کا مرتکب ہوا۔ اس وقت اس کا بیت الخلاء میں جانا عبادت ہے۔

ایک وقت تو انسان کی یہ حالت ہے اور ایک وقت انسان کی یہ شان ہے کہ مظہر حق بنا ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی زبان سے مردہ دل زندہ ہوتے ہیں۔

غرض جو شان غلام کی ہوتی ہے وہی شان انسان کی ہے۔ عبد شدن کے لئے انسان ہی ہے باقی تمام مخلوق ذاکر شاغل ہے۔ مگر عابد صرف انسان ہی ہے۔ یہ کسی خاص حالت اور خاص کام کو اپنے لئے تجویز نہیں کرسکتا بلکہ حضرت حق جس حالت میں رکھیں اس میں اس کو رہنا چاہیئے۔ کمبل اوڑھائیں تو کمبل اوڑھے دوشالہ اوڑھائیں تو دوشالہ اوڑھے۔ بھوکا رکھیں تو بھوکا رہے۔ گھی دودھ کھلائیں تو گھی دودھ کھائے یہی شان تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ (سلوۃ الحزین ج۹)

حضرت موسیٰؑ اور عزرائیل

وہ موت کا واقعہ یہ ہوا کہ عزرائیلؑ موسیٰ علیہ السلام کے پاس قبض روح کے واسطے تشریف لائے آپ نے ان کے ایک طمانچہ مارا۔ بعض ملاحدہ نے اس قصہ سے انکار کیا ہے۔

اصل قصہ یہ ہے کہ یہ لوگ انبیاء کے مراتب سے واقف نہیں موسیٰؑ کے طمانچہ سے عزرائیلؑ کی آنکھ پھوٹ گئی۔ تو عزرائیل حق تعالیٰ کے حضور میں پہنچے اور عرض کیا انہ لا یرید الموت کہ موسیٰؑ تو موت سے گریز کرتے ہیں اور انہوں نے مجھے اس طرح مارا۔

یہاں پر اشکال یہ ہے کہ کیا موسیٰؑ کو خدا کے حکم سے انکار تھا جواب یہ ہے کہ موسیٰؑ نے ان کو پہچانا نہیں کیونکہ اس وقت عزرائیلؑ بہ شکل بشر آئے تھے۔

انبیاء کا ادب یہی ہے کہ فرشتے ان کے پاس اپنی قاہرانہ صورت میں نہ آویں۔ بلکہ کسی بشر کی صورت میں آویں۔ اس لئے عزرائیلؑ بشر کی صورت میں آئے تھے۔ موسیٰؑ نے پہچانا نہیں اور ایک طمانچہ رسید کیا۔

اگر یہ شبہ کیا جاوے کہ فرشتوں میں تو بڑی قوت اور طاقت ہوتی ہے موسیٰؑ کے طمانچہ سے ان کی آنکھ کیسے پھوٹ گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰؑ میں قوت زیادہ تھی۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہ مسلم ہے کہ فرشتوں میں قوت زیادہ ہوتی ہے مگر اصل اور غالب یہ ہے کہ جس نوع کی صورت میں وہ آتے ہیں اس وقت اسی نوع کے برابر قوت ہوتی ہے۔ جب فرشتہ شکل بشر میں ہوگا تو اس وقت اس میں بشر سے زیادہ قوت نہ ہوگی۔ اسی طرح جنات بھی جس شکل میں ہوں گے اسی جیسی قوت ہوگی۔ (سلوۃ الحزین ج۹)

تکثیر جماعت کا اثر

جس زمانہ میں طاعت کی فضیلت زیادہ ہوتی ہے اس زمانہ میں معصیت کی عقوبت بھی سخت ہوتی ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں بدعات وغیرہ سے سخت احتراز لازم ہے۔ مثلاً بعض لوگ اس زمانہ میں تعزیہ کی رسمیں کرتے ہیں جو بے اصل ہیں۔ اور بعضے لوگ جو ذرا مہذب ہیں وہ اس سے تو بچتے ہیں مگر مجالس میں جو کہ اس زمانہ میں ہوتی ہیں شرکت کرتے ہیں۔ میں اس وقت ان لوگوں کو نہیں کہتا جن کے مشرب اور مذہب میں یہ مجالس محبوب ہیں میرا خطاب صرف اہل سنت والجماعت سے ہے۔ اور گو اس شرکت میں اہل سنت والجماعت کے عقائد تو عام طور سے وہ نہیں ہوتے جو شیعہ کے ہوتے ہیں بلکہ کوئی تماشہ کی نیت سے چلا جاتا ہے کسی کو وہ لوگ خود بلاتے ہیں۔ اس لئے مروت سے چلا جاتا ہے بعضوں کی اور خاص غرضیں بھی ہوتی ہیں۔ مگر سب صاحب خوب سن لیں حدیث میں صاف موجود ہے۔ **من کثر سواد قوم فھو منھم**

کہ جس نے کسی قوم کی جماعت کو زیادہ کیا (خواہ عقیدۃً اسے برا سمجھتا ہو) قیامت کے دن وہ انہی کے ساتھ ہوگا۔

اس پر مجھے ایک بزرگ کی حکایت یاد آئی کہ ہولی کا زمانہ تھا سب جانوروں پر رنگ لگا ہوا تھا۔ وہ بزرگ جا رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک گدھا بیٹھا ہے اور اس پر رنگ نہیں ہے اور بیچارے گدھے پر کون رنگ لگاتا۔ دیکھ کر ان بزرگ نے مزاحاً فرمایا کہ تو ہی خالی ہے۔ تجھے کسی نے نہیں رنگا یہ کہہ کر پان کھا رہے تھے پیک اس پر تھوک دی کہ لا تجھے میں رنگ دوں بعد مرنے کے عذاب میں گرفتار ہوئے اور اس کی پوچھ ہوئی کہ تم ہولی کھیلے تھے تو کسی جماعت کی تکثیر کرنا اور اس کی زیادتی کرنا سرسری بات نہیں ہے اور پکڑ سے خالی نہیں۔

غرض تکثیر جماعت خواہ استہزاء ہو یا بطور تماشہ یا دل جوئی وغیرہ کے ہو غرض کسی صورت سے ہو ہر صورت میں بروئے قانون قیامت کے دن پوچھ ہوگی اور قیامت میں انہی کے ساتھ حشر ہوگا اس لئے نہ خود مجلس کرنا جائز ہے نہ کسی کی مجلس میں جانا جائز ہے۔

بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ ان ایام میں امام حسینؓ کی شہادت کا قصہ کوئی کتاب لے کر پڑھتے ہیں اور دوسروں کو سناتے ہیں یہ فعل بھی تخصیصاً ان ایام میں کرنا جائز نہیں اس لئے کہ شریعت میں غور اور تدبر کرنے سے شریعت کا مقصود واقعات مصیبت میں ازالہ غم اور رفع غم معلوم ہوتا ہے اور یہ قصہ

پڑھ کر اور سن کر یا سنا کر غم کا تازہ کرنا مقصود ہے تو یہ اچھا خاصا شریعت کا مقابلہ ہے اسی قسم کی باتوں کی جس کی شریعت میں کچھ اصل نہ ہو بدعت کہتے ہیں شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں۔

ولیکن میفزائے بر مصطفےٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر کچھ مت بڑھا۔ (تحریم المحرم ج ۹)

مضامین قرآن کی اقسام

کلام اللہ میں دو قسم کے مضمون ہیں۔ ایک تو مضمون ہے تذکیر کا۔ قرآن کے جتنے حصہ میں یہ مضمون ہے وہ تو نہایت آسان ہے کسی کو بھی اس کے سمجھنے میں دقت نہیں۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ **ولقد یسرنا القرآن للذکر** (اور ہم نے قرآن کو نصیحت کیلئے آسان کر دیا ہے) اس بات کو صاف طور پر بتلایا جا رہا ہے کہ وہ حصہ قرآن کا اتنا سہل کیا گیا ہے کہ ہر شخص اس سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے اور واقعی وہ حصہ ہے بھی ایسا ہی کہ کسی کو بھی اس کے سمجھنے میں کسی قسم کی دقت نہیں ہوتی مثلاً قیامت کا ہونا، عذاب، ثواب کا پایا جانا، جنت و دوزخ کا موجود ہونا۔ اسی طرح اور عقائد ہیں کہ ان کو ایسی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے بتلایئے تو کہ ان امور کے سمجھنے میں کسی کو کیا دقت ہے اور انہی کا سمجھانا منکر کو دلائل عقلیہ سے ضروری بھی ہے۔

رہے باقی احکام ان کا ایسے دلائل سے سمجھانا ضروری نہیں ہے۔ اسی وجہ سے دین کے دو جزو قرار دیئے جاتے ہیں۔ ایک اصول ایک فروع۔ اصول تو وہی ہیں جن کا سمجھا دینا ضروری ہے۔ پس وہ ایسے سہل کئے جائیں کہ کسی کو بھی ان کے سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ فروع جن کا دلائل سے سمجھانا ضروری نہیں۔ ایک تو قرآن میں یہ مضمون ہے اور دوسرا مضمون ہے احکام غامضہ کا جس میں اجتہاد کی ضرورت ہے۔

ہاں ترجمہ کی نسبت میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر ترجمہ پڑھایا جاوے تو خود مطالعہ کرنے کی اجازت نہ دی جاوے بلکہ کسی واقف کار سے سبقاً سبقاً پڑھا جاوے اور جو مضامین دقیق ہوں ان کے اجمال پر اکتفا کیا جاوے۔ معلم بھی ان کی تفصیل نہ بیان کریں بلکہ اجمال کے ساتھ ان کا مطلب بیان کر دیں۔ تفصیل کی کاوش نہ کریں۔ جتنی بات سمجھ میں آسکتی ہے اس کے بتلانے پر اکتفا کریں اور خود مطالعہ کر کے امتحان دے دیا کرو۔ استاد سے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر کہا جاوے کہ اقلیدس پیچیدہ ہے۔ اس لئے استاد سے پڑھنے کی ضرورت ہے اور قرآن

شریف ایسا نہیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ قانون بھی تو ایسا پیچیدہ نہیں ہے۔ قانون ہی کی کتاب لیجئے اور خود اس کا مطالعہ کیجئے ضرور آپ اس کے سمجھنے میں غلطی کریں گے اور جو استاد سے پڑھے ہوں وہ غلطی نہ کریں گے۔ قانون دان ہی جانتا ہے قانون کی باتوں کو۔

قانون کتاب کی ایک خاصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک امر کے متعلق ایک جگہ اجمالی ہوتا ہے دوسری جگہ اس کی تفصیل ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن شریف میں بھی ایسا واقع ہوا ہے کہ ایک حکم کو دو مقام سے تعلق ہے۔ ایک موقع میں تو اس کو اجمالاً بیان کیا ہے اور دوسری جگہ اس کی تفصیل کردی ہے جب تک تفصیل کے موقع کو سمجھے ہوئے نہ ہوگا تو یہاں کیا سمجھے گا اور کہیں ایسا ہے کہ کچھ تفصیل اس موقع پر ہے اور کچھ دوسرے موقع پر۔ پس اس کے سمجھنے کی کیا ضرورت ہے کہ دونوں موقعوں کا علم ہو اور یہ بات واقف کار ہی جان سکتا ہے کہ اس کا ذکر کتنی جگہ ہوا ہے۔ خود مطالعہ کرنے والا کیا جانے گا۔ بس یہ ہوگا کہ ایک موقع میں مجمل دیکھ کر اس کو الجھن پیدا ہوگی اور شکوک واقع ہوں گے اور یہ کچھ کلام اللہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہر فن میں یہی ہے۔ (الصلوٰۃ ج ۱۰)

اللہ تعالیٰ کی بندوں سے محبت ولطف

حق تعالیٰ کی بندوں سے اس قدر محبت ہے۔ حتیٰ کہ حق تعالیٰ کے عتاب تک میں بھی عنایت ہوتی ہے چنانچہ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

ولو یؤاخذ اللہ الناس بما کسبوا ما ترک علیٰ ظھرھا من دآبۃ .

اگر اللہ میاں لوگوں کے اعمال پر مواخذہ کرتے تو کسی جاندار کو زمین پر نہ چھوڑتے۔

بظاہر یہ کلام بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ مقدم اور تالی میں بظاہر علاقہ نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ ظاہر تو ہے کہ یوں فرماتے: **ولو یؤاخذ اللہ الناس بما کسبوا ما ترک علیھما من بشر .**

کہ اگر آدمیوں سے مواخذہ فرماتے تو زمین پر کسی آدمی کو نہ چھوڑتے۔

نہ یہ کہ مواخذہ تو صرف آدمیوں سے فرماتے اور ہلاک جانوروں کو بھی کر دیتے۔ بظاہر یہ بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ سو بات یہ ہے کہ عین عتاب میں بھی ان کا شرف بتلایا ہے کہ مقصود بالخلق انسان ہی ہے اور دوسری چیزیں اسی کے واسطے بنائی گئی ہیں تو اگر ان سے مواخذہ کرتے تو ان میں سے کسی کو نہ چھوڑتے اور جب ان کو نہ رکھتے تو جانور نرے کیا کرتے۔

کیا رحمت ہے کہ عتاب میں بھی ہمارا شرف بیان کیا جارہا ہے کہ انسان ہی اشرف المخلوقات ہے حق تعالیٰ کا انعام دیکھئے کہ جوتیاں لگائیں مگر قدر و منزلت نہیں گھٹائی بھلا ایسا آقا مل سکتا ہے۔ ایسے آقا کا یہی ادب اور یہی معاملہ ہے جیسا ہم کر رہے ہیں۔ (الصلوٰۃ ج ۱۰)

اقسام افعال

افعال کی دو قسمیں ہیں۔ وجودی اور عدمی وجودی جیسے افعال وجودیہ نماز وغیرہ، عدمی جیسے ترک ریا وغیرہ، عدم سے مراد عدم محض نہیں بلکہ وہ افعال جو ترک اختیاری ہوں افعال وجودیہ کا۔ سو بعض عبادات تو ایسی ہیں جس میں افعال وجودیہ کم ہیں اور افعال عدمی زیادہ جیسے روزہ۔ کیوں کہ اس میں تین جزو عدمی ہیں۔ ایک ترک کھانے کا، دوسرے ترک پینے کا۔ تیسرے ترک جماع کا۔ اور ایک جزو ہے وجودی اور وہ ان تینوں چیزوں کا عزم اور نیت ہے اور بعض عبادات میں تو باوجودیکہ وہ مرکب ہیں وجودیات اور عدمیات سے مگر غلبہ وجودیات کو ہوتا ہے۔ جیسے نماز وغیرہ۔ اور جو افعال عدمیات کی قبیل سے ہیں۔ ان کے کرنے میں زیادہ مشقت نہیں ہوتی کیونکہ اس میں کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ بلکہ ایک شئے کو عدم اصلی پر باقی رکھا جاتا ہے۔ اور افعال وجودی میں مشقت زیادہ ہے کیوں کہ ایک شے کو وجود کی طرف لانا ہوتا ہے۔ (ندا رمضان ج ۱۰)

ایک علمی بحث

ایک بات طلباء کے کام کی یاد آئی۔ وہ یہ ہے کہ مجسمہ (ایک فرقہ ہے جو خدا تعالیٰ کے جسمانی ہونے کا قائل ہے) نے الرحمن علي العرش استویٰ، اللہ تعالیٰ نے عرش پر باعتبار صفت رحمانیہ کے تجلی فرمائی، کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ خدا تعالیٰ عرش پر ایسے ہی بیٹھے ہیں جیسے ہم چوکی پر بیٹھے ہیں۔ ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی کچھ قدر نہ جانی اور عرش کو انہوں نے بڑھا دیا۔ کیونکہ مستقر بفتح القاف عادۃً مستقر باکسر القاف سے اوسع (یعنی جس چیز پر قرار پکڑا جاتا ہے وہ زیادہ وسیع ہوتی ہے قرار پکڑنے والی چیز سے) ہوتا ہے۔ حالانکہ عرش کو ذات باری تعالیٰ سے کوئی بھی نسبت نہیں۔ ایسی بھی نسبت نہیں ہے جیسے رائی کے دانہ کو ہم سے ہے۔ اگر کوئی رائی کا دانہ ہمارے قدم کے نیچے پڑا ہو تو کیا عاقل کہہ سکتا ہے اور کیا یہ محاورہ صحیح کہا جا سکتا ہے کہ ہم اس پر بیٹھے ہیں۔ رائی کا دانہ بیچارہ کیا چیز ہے۔ پس عرش کہاں اور خالق عرش کہاں۔ پس معنی اس آیت کے یہ نہیں ہیں جو مجسمہ نے سمجھے ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ پھر کیا معنی ہیں تو سلف صالحین نے اس آیت اور جو اس کے مشابہ

اور آیات ہیں ان کے بارہ میں یہ فرمایا ہے کہ ان کے معنی کی تعیین نہ کرو۔ اور ان کے معانی کو اللہ کے حوالے کرو۔ صرف اتنا اعتقاد رکھو کہ جو کچھ مراد ہے وہ حق ہے اور اسلم طریقہ آیات متشابہات میں یہی ہے۔ باقی متاخرین نے اس میں کچھ تاویل فرمائی ہے بعض نے یہ کہ استویٰ کے معنی استول ہیں اور معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر غالب ہیں۔ اور ایک تاویل احقر کیا کرتا ہے کہ استوی علی العرش بمعنی بر تخت نشستن کنایہ ہے نفاذ امور و تصرف فی الامور میں تصرف کرنا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ اس کے بعد مدبر الامر (وہ ہر امر کی تدبیر کرتا ہے) کا آنا بطور اس کے تفسیر کے ہوسکتا ہے۔

(اور دوسرے مقام میں ہے **الله الذی خلق السموت والارض فی ستة ایام ثم استویٰ علی العرش** ، اللہ ہی ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر تخت پر قائم ہوا استویٰ میں ضمیر اللہ کی طرف ہے۔ سو وہاں حسب قاعدہ **القرآن یفسر بعضه بعضا** بعض جز قرآن کا بعض جز کی تفسیر کرتا ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں بھی مراد تجلی الٰہی بہ اعتبار صفت رحمانیہ کے ہے فافہم) ایک تاویل ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب وغریب فرمائی۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا۔ **الله علی العرش استویٰ** (اللہ عرش پر بیٹھے ہیں) تاکہ یہ لازم نہ آئے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھے ہیں بلکہ الرحمٰن فرمایا ہے۔ پس مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت عرش کو محیط ہے اور عرش تمام عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ پس حاصل یہ ہے کہ اللہ کی رحمت تمام چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے پس اس تاویل سے۔

یہ آیت۔ **وسعت رحمتی کل شیء** ۔ میری رحمت ہر چیز سے وسیع ہے۔

کی مرادف ہوگی۔ اور عرش کی خصوصیت اس لئے ہوگی کہ تعلق رحمت کا اولاً بلا واسطہ اس کے ساتھ ہوا ہے اور دوسری اشیاء کے ساتھ بواسطہ اس کے ہے پس حاصل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کی تجلی اس پر اولاً ہوتی ہے۔ (الصیام ج ١٠)

تجلی کے معنی

یہاں سے تجلی کے معنی بھی واضح ہوگئے کہ تجلی کے معنی یہ ہیں کہ کسی صفت کا تعلق متجلی لہ (جس کیلئے تجلی کی گئی ہے) سے ہوجائے۔ تجلی کے معنی چمک دمک کے نہیں ہیں جیسے عوام سمجھتے ہیں۔ (الصیام ج ١٠)

حلال وحرام

اللھم اجعل رزق آل محمد قوتا. کہ اے اللہ آل محمد کا رزق بقدر قوت کیا جائے۔

اور قدر قوت وہ ہے جس سے بقدر کفایت گزر ہوجائے کچھ فاضل نہ ہو اور اس میں شک

نہیں کہ ازواج مطہرات بھی آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہیں۔ اس لئے یہ دعا ان کو بھی شامل تھی اور اسی طرح ذریت بھی داخل ہیں۔ بلکہ اصل مقتضائے لغت یہ ہے کہ ازواج مطہرات تو آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں اصالۃً داخل ہوں اور ذریت طبعاً داخل ہو کیونکہ آل کہتے ہیں اہل بیت کو یعنی گھر والوں کو اور گھر والوں کے مفہوم میں بیوی سب سے پہلے داخل ہے۔ پس یہ احتمال نہیں ہوسکتا کہ ذریت تو آل میں داخل ہوں اور ازواج داخل نہ ہوں۔

بعض لوگوں کو ایک حدیث سے شبہ ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت علی و فاطمہ و حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اپنی عبا میں داخل فرما کر فرمایا

اللهم هولاء اهل بيتى (کہ اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں)

اس سے بعض عقلمندوں نے یہ سمجھا ہے کہ ازواج مطہرات اہل بیت میں داخل نہیں۔ حالانکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ یہ بھی میرے اہل بیت میں سے ہیں۔ ان کو بھی **انمايريد الله ليذهب عنكم الرجس اهل البيت ويطهركم تطهيرا** کی فضیلت میں داخل کر لیا جائے۔ یہاں حصر مقصود نہیں کہ بس یہی اہل بیت ہیں اور ازواج مطہرات اہل بیت نہیں ہیں اور یہ جو اس حدیث کے بعض طرق میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو عباء میں داخل فرما کر یہ دعا کی تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ مجھے بھی ان کے ساتھ شامل فرما لیجئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنی جگہ ہو۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ تم کو عباء میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں تم تو پہلے ہی سے اہل بیت میں داخل ہو دوسرے حضرت علیؓ حضرت ام سلمہؓ سے اجنبی تھے ان کے ساتھ حضرت ام سلمہؓ کو عبا میں کیونکر داخل کیا جا سکتا تھا۔ یہ تو اشکالات کا جواب تھا۔

اصل مدعا کے لئے دلیل اول تو لغت ہے کہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں ازواج اولاً داخل ہیں دوسرے قرآن کا محاورہ یہی ہے۔ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں جب کہ ملائکہ نے ان کو ولد کی بشارت دی اور حضرت سارہ کو اس بشارت پر تعجب ہوا، ملائکہ کی طرف سے یہ قول نقل فرمایا ہے۔

قالوا اتعجبين من امر الله رحمة الله وبركاته عليكم اهل البيت انه حميد مجيد

ترجمہ: فرشتوں نے کہا کہ کیا تم خدا کے کاموں میں تعجب کرتی اور (خصوصاً) اس خاندان کے لوگو تم پر اللہ کی (خاص) رحمت اور اس کی (انواع اقسام) کی برکتیں (نازل) ہوتی رہتی ہیں بے شک وہ (اللہ تعالیٰ) بڑی تعریف کے لائق (اور) بڑی شان والا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں اہل بیت میں حضرت سارہ علیہا السلام یقیناً داخل ہیں کیونکہ خطاب انہی سے ہے معلوم ہوا کہ اہل بیت میں ازواج بھی داخل ہیں۔ (التسوان فی رمضان ج ۱۰)

مسلمات کی خصوصیات

قرآن کریم میں ہے: **مسلمات مؤمنات قانتات تائبات عبدات سائحات.** وہ اسلام والیاں ہوں گی اور ایمان والیاں اور خشوع خضوع والیاں، اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنے والیاں اور عبادت اور سائحات ہوں گی۔ سائحات کی تفسیر عنقریب آتی ہے۔ یہ تو تشریعی صفات ہیں آگے تکوینی صفات مذکور ہیں ثیبٰت و ابکاراً۔

اس مقام پر ایک اشکال طالب علمانہ ہے۔ وہ یہ کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ازواج مطہرات سے خیر و بہتر عورتیں موجود تھیں۔ اگر نہیں تھیں تو یہ دھمکی کیسی؟ اور اگر تھیں تو یہ بظاہر بہت بعید ہے کہ ان سے بہتر عورتیں دنیا میں ہوں اور حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کمتر تجویز فرمائیں۔

دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال فیض وقوت تاثیر صحبت پر نظر کر کے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یافتہ عورتوں سے بہتر کوئی ایسی عورت ہو سکے جس نے ابھی تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل نہیں کی اور خود نص میں بھی تو ہے **یانسآء النبی لستن کاحدمن النسا ان اتقیتن** (اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیو تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو) اس آیت میں قلب ہے مطلب یہ ہے **لیس احد من النساء کمثلکن** کہ کوئی عورت تم جیسی نہیں ہے اگر تم متقی ہو۔ اور ازواج مطہرات کا متقی ہونا معلوم ہوا کہ ان کے مثل کوئی عورت دنیا میں اس وقت نہ تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تب نہ ہو اور تقدیر اس طرح ہو۔

یانساء النبی دینات کغیر کن .

اس اشکال کا جواب میں نے ایک عالم کے خادم سے سنا ہے۔ وہ اپنے شیخ سے نقل کرتے تھے کہ انہوں نے یہ فرمایا کہ ازواج مطہرات کی خیریت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے نکاح ہی کی وجہ سے تھی۔ قبل از نکاح تو وہ اور دوسری عورتیں یکساں تھیں۔ پھر اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دے دیتے تو ان سے خیریت کم ہو جاتی اور دوسری جس بیوی سے نکاح کر لیتے نکاح کے بعد وہ ان سے بہتر ہو جاتی۔ پس خیرا منکن بالفعل کے اعتبار سے نہیں فرمایا گیا بلکہ مایؤول کے اعتبار سے فرمایا گیا ہے۔

اب کوئی اشکال نہیں یہ جواب مجھے بہت پسند آیا۔ (المسنون فی رمضان ج ۱۰)

روزہ کی فرحت

چنانچہ اکثر علماء نے حدیث **للصائم فرحتان فرحة عند الفطر وفرحةعند لقاء الرحمن** کی تفسیر میں یہی فرمایا ہے کہ افطار کے وقت جو فرحت ہوتی ہے وہ اتمام عمل کی وجہ سے ہوتی ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام لے لیا۔ اور روزہ تمام آفات سے منزہ ہو کر پورا ہو گیا۔ اور بعض نے فرحت افطار کا سبب ظاہری بیان کیا ہے کہ افطار کے وقت زوال جوع اور تناول غذا و شراب سے خوشی ہوتی ہے اور یہ اختلاف تفسیر اختلاف مذاق پر مبنی ہے۔ لوگوں کے مذاق مختلف ہیں۔ کسی کو افطار کے وقت کھانے پینے کی خوشی ہوتی ہے اور کسی کو اتمام عمل کی۔

جیسے حدیث میں اہل جنت کی صفت یہ آئی ہے **یلھمون التسبیح کمایلھمون النفس.** تسبیح کا انہیں الہام ہوگا جیسے سانس بلا اختیار آتا ہے اسی طرح سبحان اللہ سبحان اللہ! یا اللہ یا اللہ بے اختیار ان کے منہ سے نکلا کرے گا۔ کسی وقت غفلت طاری نہ ہوگی۔ بعض اولیاء کی شان دنیا میں بھی ایسی ہی رہی ہے کہ ان پر کبھی غفلت طاری نہیں ہوئی۔ وہ ہمیشہ ذاکر ہی رہے اور چونکہ خود ہر وقت ذکر میں مشغول رہے انہیں اہل دنیا کی غفلت کا احساس ہی نہیں ہوا اور خبر بھی نہیں ہوئی کہ دنیا میں اہل غفلت بھی موجود ہیں۔ جب کسی کو معصیت میں مبتلا دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت متنبہ ہوئے اور حیرت سے پوچھا کہ اللہ اکبر! کیا ایسے بھی لوگ دنیا میں ہوا کرتے ہیں جو حق تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوں۔

اس پر ایک لطیف نکتہ بعض اہل لطائف نے کیا ہے۔ بعضے نکتے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ علوم تو نہیں ہوتے محض نکتے دل خوش کن ہوتے ہیں لیکن اگر متاید ہوں نصوص سے تو ان میں بھی ایک علم کی شان پیدا ہو جاتی ہے دعویٰ تو نہیں کیا جاتا۔ احتمال کا درجہ ہے ایک محمل ہے یہ

بھی۔ یہ جو حدیث میں ہے کہ جب مومن دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کے پاس فرشتے آ کر تین سوال کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی سوال ہوتا ہے۔

ما تقول فی حق هذا الرجل ۔ یعنی یہ کون بزرگ ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو ہمارے پیغمبر ہیں۔ جو ہماری ہدایت کے لئے حق تعالیٰ کے یہاں سے بینات لائے اور آیات لائے یہ ہے مضمون حدیث کا۔

یہاں یہ سوال کیا گیا ہے کہ ہذا محسوس باشارہ حسیہ کے لئے ہے وہاں قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہوں گے۔ جو ہذا سے پوچھا جائے گا۔

جمہور نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ہر مومن کے ذہن میں اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم حاضر ہوں گے علم ضروری کے طور پر۔ حق تعالیٰ کی تائید سے اس کی یہ صورت ہوگی کہ مومن کے قلب میں اس وقت علم ضروری کے طور پر یہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پوچھ رہے ہیں۔ یہ جواب بالکل کافی ہے لیکن بعض اہل لطائف اس طرف بھی گئے ہیں۔ یہ تھا تو احتمال کے درجہ میں مگر عشاق نے محقق کرلیا ہے شوق میں۔ اس کا دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں تمنا اور شوق کے درجہ میں کیا حرج ہے اگر اس امید سے متلذذ ہو۔

وہ کہتے ہیں کہ یہ کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ اس کے اور رسولؐ کے درمیان میں جتنے حجاب ہیں وہ سب اٹھا دیئے جائیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ نما ہوں گے۔ اب چونکہ یہ شخص مشرف بالزیارت ہے اور پہچانتا ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لئے فرشتوں کے سوال کا جواب آسانی کے ساتھ دے رہا ہے۔

اور یہ رفع حجاب تو ہے اس میں بھی دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضورؐ اپنی جگہ پر رہیں یہ اپنی جگہ پر رہے اور درمیان کے حجاب اٹھیں اور یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کرم فرمائیں۔ بعض عشاق شدت شوق میں اس طرف چلے گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود مومن کی قبر میں تشریف لائیں گے۔ بعضے عشاق نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر موت کی تمنا اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے شوق میں کرے تو جائز ہے ہی شوقاً الی لقاء رسول اللہ بھی تمنا موت کی جائز ہے کچھ حرج نہیں۔

استاذی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ بہت زندہ دل تھے ان

پر شوق کی حالت غالب تھی صاحب حلال بزرگ تھے اس حدیث کے متعلق کسی طالب علم نے سوال کیا تھا کہ قبر میں جو رسول اللہ کی زیارت مشہور ہے اس کی کیا اصل ہے۔ یہ سن کر مولانا پر حالت طاری ہوگئی اور یہ شعر پڑھا

کششے کہ عشق دارد نہ گذاردت بدیں ساں   بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

(وہ کشش جو عشق اپنے اندر رکھتا ہے اُس کی خاصیت یہ ہے کہ محبوب اگر جنازہ پر نہ آئے گا تو مزار پر ضرور آئے گا)

اور فرمایا کہ مقتضی تو اس تعلق کا جو ہم کو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اتنی طویل ہوتی کہ آپ ہر امتی کے جنازہ پر خود تشریف لا کر نماز جنازہ پڑھتے مگر خدا کی حکمتیں ہیں آپ کی وفات ہی میں مصلحت تھی۔ خیر! اگر یہ دولت حاصل نہ ہوسکی تو کیا عشق کی خاصیت خالی جاسکتی ہے اگر جنازہ پر نہیں تو مزار ہی پر لا کر کھڑا کر دیا کہ دیکھ لو یہ وہی محبوب ہیں جن کے شوق اور محبت میں تم نے عمر گنوادی۔ اور اپنے آپ کو فنا کر دیا۔

مگر یہ سب مشتاقین کے نکات ہیں اور ممکن ہے کہ ان کے گمان کے موافق ان کے اس شوق کو پورا بھی کر دیا جائے کیا عجب ہے کہ گو یہ زیارت عام نہ ہو لیکن حق تعالیٰ بعض خاص خاص عشاق کی کشش شوق میں یہ خاصیت محقق کر دیں اور ان کی اس امید کو انا عند ظن عبدی بی کی بناء پر پورا کر دیں تو کچھ بعید نہیں ہے۔ (رمضان فی رمضان ج ۱۰)

محبت رسول

مرا از زلف تو موئے بسندست   ہوس را رہ مدہ بوئے بسندمست

(مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زلف کی خوشبو کافی ہے اس سے زیادہ کی ہوس مجھے نہیں ہے)

یہ شعر شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر لکھا ہے اللہ اکبر! کیا موقع پر لکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بال ایک صحابی نے تراشے۔ پھر آپ کے حکم سے وہ سب لوگوں کو تقسیم کیے گئے اس حدیث کے نقل کرنے کے بعد شیخ لکھتے ہیں کہ بڑے خوش قسمت تھے وہ لوگ! لیکن ہم بھی بدقسمت نہیں خیر! اگر بال ہم تک نہیں پہنچے تو ہم کو یہ بھی کم نہیں کہ اس واقعہ کی خبر تو پہنچ گئی اور اس مقام پر انہوں نے یہ شعر لکھا ہے۔

مرا اززلف تو موئے بسندست   ہوس رارہ مدہ بوئے بسندست

(مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زلف کی خوشبو کافی ہے اس سے زیادہ کی ہوس مجھے نہیں ہے)

واقعی عاشق صادق کی یہی شان ہے جس کو ہر چیز میں چاہے کسی درجہ کی ہو اپنے محبوب ہی کا جلوہ نظر آتا ہے کہتے ہیں نا۔

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست   یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(جو کچھ جہاں میں دیکھتا ہوں یا تو ہے یا تیری خوشبو ہے)

ہر درجہ پر قانع ہیں اس واسطے کہ محبوب سے کچھ تو تعلق ہے۔

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست   یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(جو کچھ جہاں میں دیکھتا ہوں یا تو ہے یا تیری خوشبو ہے)

تو غرض شیخ کہتے ہیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال ہم تک نہیں پہنچے تو خیر یہی سہی خبر تو پہنچی

بلا بودے اگر ایں ہم بہ بودے (اگر یہ بھی نہ ہوتا تو بڑی مصیبت ہوتی)

یعنی اگر محبوب کی حکایتیں بھی ہم تک نہ پہنچتیں تو کیا ہوتا پھر کون سی تسلی تھی عاشق کے لئے۔ اس سے زیادہ اگر ہو جائے عنایت ہے ورنہ ہمارا حق تو اتنا بھی نہیں یہ نہایت تواضع کی بات ہے۔ عاشق صادق کی عبدیت لازم ہے اور عبدیت کا خاصہ ہے کہ بلند پروازی نہیں رہتی جو کچھ بھی عطا ہو جائے اپنی حیثیت سے زیادہ سمجھتا ہے وہ بزبان حال یا بزبان قال یہ کہتا ہے۔

ادائے حق محبت عنایتے ست زادوست   وگرنہ عاشق مسکین بہ ہیچ خرسندست

(رمضان فی رمضان ج ۱۰)

شان صحابہ

ایک صحابیؓ سے کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک پوچھا تو آپؓ کہتے ہیں کہ ارے یہاں دیکھا تھا کس نے نظر بھر کر جو بیان کردوں بیٹھ کر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حلیہ تھا۔ ہمت ہی نظر بھر کر دیکھنے کی کبھی نہ ہوئی۔

ایک کافر رئیس کی شہادت ملاحظہ ہو جو حدیبیہ میں صحابہؓ کی حالت دیکھ کر اپنی قوم کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا حالت ہے اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس نے بہت سے واقعات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادب وعظمت کے بیان کرکے مختصراً یہ حالت بیان کردی کہ

لا یحدون النظر الیہ۔   یعنی گھور کر نہیں دیکھ سکتے

اور گھورنا کسے کہتے ہیں نظر بھر کر دیکھنے کو۔ غرض کسی کی ہمت نہیں تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر بھر کر دیکھ لے۔ بس! یہ حالت تھی صحابہ کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً صحابہؓ نظر بھر کر نہیں دیکھتے تھے۔ اور یہ تو ہمت کس کی ہوسکتی تھی کہ نظر سے نظر ملا کر دیکھے۔ تو عشاق کی شان یہ ہوا کرتی ہے کہ تھوڑے سے پر بھی راضی ہو جاتے ہیں وہی شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ کا مذاق۔

مرا از زلف تو موئے بسند ست   ہوس رارہ مدہ بوئے بسند ست

(مجھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زلف کی خوشبو کافی ہے اس سے زیادہ کی ہوس نہ ہونی چاہیے)

تو میں کہتا ہوں کہ رویت نہ ہو رویت کی قابلیت ہی عطا ہو جائے گو فی الحال رویت حاصل نہیں لیکن وعدہ تو ہے گو ادھار ہی سہی۔ وہ بھی کافی ہے ایک عاشق کہتا ہے۔

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم   کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد

(اگرچہ دور پڑا ہوں لیکن اس امید پر خوش ہوں کہ شاید ہمارا محبوب حقیقی ازراہ کرم ہمارا ہاتھ دوسری بار پکڑ کر اپنی بارگاہ کی طرف جذب فرمائے)

حبش میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو پیدا کر دیا۔ یہاں گمان بھی نہ تھا کہ ایسا بڑا شخص پیدا ہوگا کسی کو خبر نہ تھی کہ یہاں بلالؓ پیدا ہوں گے جو محبوب اور مقبول ہوں گے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ ایسے کہ جو خدا کے محبوب ہیں اور ان کا اتنا بڑا درجہ ہوگا کہ ان کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرمائیں گے کہ اے بلالؓ! تم کون سا عمل کرتے ہو کہ جب میں شب معراج میں سیر کرتا ہوا جنت میں پہنچا تو میں نے اپنے آگے آگے تمہاری جوتیوں کی کھسکھساہٹ سنی۔

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نعوذ باللہ حضرت بلالؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑھ گئے۔ نہیں! بلکہ آگے آگے جو جا رہے تھے خادم کی حیثیت سے جا رہے تھے صورتاً آگے تھے معنیً آگے نہ تھے جیسے ارجاع الضمیر قبل الذکر ہوتا ہے کہ وہاں گو مرجع موخر ہے ذکراً لیکن رتبۃً مقدم ہے تو بھائی نحو میں تائید بھی اس کی موجود ہے اور دنیا میں بھی تو بہت سے امراء ایسے ہوتے ہیں جن کے آگے آگے خادم چلتے ہیں۔ اسی طرح حضرت بلالؓ جنت میں گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آگے چل رہے تھے مگر تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم۔ لیکن یہ رتبہ کیا کچھ کم ہے کہ خادم کی وہ قسم بنے جو مخدوم کے آگے آگے چلتی ہے۔ (رمضان فی رمضان ج ۱۰)

نور کی حقیقت

لوگ ''نور'' چمک کو سمجھتے ہیں۔ حالانکہ نور کہتے ہیں اس کو جو ظاہر لنفسہٖ ومظہر لغیرہٖ ہو یعنی جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسرے کو بھی ظاہر کر دے۔ بس حقیقت یہ ہے نور کی۔ اب اللہ نور السموت کی تفسیر میں استعارہ کی تاویل کی حاجت ہی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ سموت اور ارض کو ظاہر بھی کر رہا ہے اور ان کے واسطہ سے خود بھی ظاہر ہے بہر حال نور اس کو کہتے ہیں جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسرے کو بھی ظاہر کرے۔

تو اب وہ شبہ نہیں رہا کہ ہم نے تو نماز پڑھی تھی کوئی نور نہیں پیدا ہوا۔ ہم تو روزہ رکھتے ہیں کوئی نورانیت قلب میں محسوس نہیں ہوتی۔ طاعت میں کوئی نور نظر نہیں آتا۔ اب یہ شبہ رفع ہو گیا کیونکہ نور چمک دمک کا نام نہیں ہے۔ بلکہ نور وہ ہے جس کی میں نے ماہیت عرض کی کہ ظاہر لنفسہٖ ومظہر لغیرہٖ۔ خیر عوام کیا سمجھیں اس کو لیکن اس کی علامتیں اور آثار ہیں جن سے وہ نور کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ اگر آگ دکھائی نہیں دیتی تو دھواں تو دکھائی دیتا ہے۔ دھوئیں سے تو پہچان سکتے ہیں کہ آگ موجود ہے آثار کیا ہیں اس نور کے؟

ترمذی کی حدیث ہے اس آیت کی تفسیر میں **فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام** کہ جب شرح صدر ہوتا ہے تو نور قلب میں داخل ہوتا ہے کسی نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما علامۃ نور کے داخل ہونے کی کیا علامت ہے فرمایا **التجانی عن دارالغرور والانابۃ الیٰ دار الخلود**۔ دنیا سے تعلق کا کم ہو جانا اور متوجہ ہو جانا آخرت کی طرف۔

یہ علامت ہے نور قلب کی۔ تو بھائی اس علامت سے ہی سمجھ لو کہ طاعت میں نور ہے یا نہیں۔ تو طاعت میں مشغول ہونے سے یہ علامتیں پاؤ گے اور معصیت کے بعد اس کے خلاف پاؤ گے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ معصیت میں ظلمت ہے اور طاعت میں نور ہے۔ اس طرح نور و ظلمت ہونا طاعت کا اور معصیت کا تم پر منکشف ہو گا اور اگر منکشف نہ ہو تو اس کی وجہ یہ ہو گی کہ کبھی خالص طاعت کو اختیار کر کے دیکھا نہیں امتحان ہی کے طور پر چند روز خالص طاعت میں گزار لو۔ پھر معصیت کے بعد جو کیفیت ہو اس کو یاد رکھ لو۔ خود فرق معلوم ہو جائے گا۔

انسانی تخلیق

حدیث میں ہے کہ جب حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنا چاہا

تو ملائکہ نے عرض کیا کہ وہ تو کھائیں گے بھی پئیں گے بھی **فاجعل لهم الدنيا ولدار الآخرة.** ان کے حصہ میں دنیا کر دیجئے ہمارے حصہ میں آخرت ۔ ارشاد ہوا کہ ہرگز نہیں ۔ بھلا جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے اور جس کو صرف کن کہہ کر پیدا کیا ہے دونوں کو برابر کر دوں یعنی تم کو کہ صرف کن کہہ کر پیدا کیا ہے اور انسان کو جن کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے کیسے برابر کر دوں ۔

اب رہا یہ کہ دونوں ہاتھوں سے پیدا کرنے کے کیا معنی ہیں ۔ سو اس کا حقیقی علم تو حق تعالیٰ ہی کو ہے باقی حاصل مطلب یہ ہے کہ انسان کو خاص توجہ اور عنایت اور اعتنا کے ساتھ پیدا کیا ہے ۔ یعنی خلاصہ ارشاد کا یہ ہے کہ ان کی نوع بلحاظ مجموعہ کے ملائکہ کی نوع سے بڑھی ہوئی ہے ۔ یہ نہیں کہ ہر فرد ہر فرد سے افضل ہے یہاں سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ انسان ملائکہ سے بھی افضل ہے ولو باعتبار بعض الافراد ۔ اور کیا یہ بات فضیلت ظاہر کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ فرشتوں کو تو انسان کی خدمت سپرد کی گئی لیکن اس کو ان کی کوئی خدمت سپرد نہیں کی گئی ۔ یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ سارے کام انسان کے ملائکہ کے سپرد ہیں ۔ یہاں تک کہ خود ان کی خدمت بھی اور ان کی چیزوں کی خدمت بھی ۔ ان کی جس گھاس کو بیل کھاتے ہیں اس کی بھی ۔ کیونکہ قوت نامیہ سے کام لینے والے وہ ملائکہ ہیں جو مدبرات ہیں ارض وسمٰوٰت کے ۔ یہاں تک کہ نطفہ میں بھی ملائکہ ہی تصرف کرتے ہیں ۔ جس وقت نطفہ قرار دیا ۔ اسی وقت ایک فرشتہ فوراً متعین کر دیا گیا پہلے اس نے علقہ بنایا پھر عرض کیا اب کیا کروں ۔ پھر مضغہ بنایا پھر عرض کیا اب کیا کروں غرض اخیر تک برابر فرشتہ تصرفات کرتا رہتا ہے ۔

اطباء سمجھتے ہیں کہ قوت مولدہ کام کرتی ہے چلو بیٹھو بھی ۔ قوت بیچاری کام کیا کر سکتی ہے ۔ جب تک کوئی قوت سے کام لینے والا نہ ہو ۔ یہ صاحب حکماء کہلاتے ہیں ! یہ حکماء ہیں؟ حمقاء ہیں کہ طبیعت کو عدیمۃ الشعور بھی مانتے ہیں اور ایسے افعال بدیعہ کو بھی اس کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ جب بہت لتاڑ پڑی کہ بھلا کوئی عدیمۃ الشعور ایسے افعال بھی کر سکتا ہے تو اخیر میں ذرا متاخرین کو ڈھیلا ہونا پڑا اور کہنا پڑا کہ ضعیفۃ الشعور ہے ۔ مگر پھر بھی اعتراض باقی ہے ۔ یعنی ان کے قول کا حاصل تو یہ ہوا کہ طبیعت بے عقل تو نہیں کم عقل ہے لیکن وہ اعتراض تو پھر بھی باقی ہے کہ کم عقل سے ایسے افعال بدیعہ کیسے صادر ہو سکتے ہیں بلکہ اب اعتراض اور قوی ہو گیا

کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بے عقل کا تصرف تو ایک نوع احد پر چلتا رہتا ہے۔ جیسے مشین کہ ایک مرتبہ گھمادینے سے کام کرتی رہتی ہے تو جو عدیم الشعور ہے وہ کام کو اتنا نہ بگاڑے گا لیکن جو کم شعور ہے وہ بہت بگاڑے گا مشین سے کام اتنا نہیں بگڑتا جتنا اناڑی سے۔

سو واقعی ان حکماء نے یہ کیا حماقت کی بات کہی۔ بس سیدھی بات یہ ہے کہ مسلمان ہو جاؤ اور اس کے قابل ہو جاؤ کہ اللہ میاں فرشتوں سے یہ سب کام لیتے ہیں۔ پھر کوئی اشکال ہی باقی نہیں رہتا۔

فقیہ کون ہے؟

فقیہ وہ شخص ہے جس میں خداداد ملکہ اجتہاد کا ہو۔ جو شخص ایک مسئلہ بھی نہ جانتا ہو وہ فقیہ ہو سکتا ہے اور جو شخص ایک لاکھ مسئلے جانتا ہو وہ فقیہ نہیں ہو سکتا۔ تفقہ اور چیز ہے اور ضبط جزئیات اور چیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ علماء نے فیصلہ کر دیا ہے اور علماء نے کیا فیصلہ کیا ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ وعظ کہنے کا اہل ہر شخص نہیں ہے کیونکہ ہر منصب کا وہی اہل ہو سکتا ہے جو اس منصب کے شرائط کا جامع ہو۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ ایک آدھ کتاب دیکھی اور واعظ بن گئے (اور جا کر منبر سنبھال لیا۔ حضرت اس منبری کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ منصب منصب نبوت ہے جو انبیاء علیہم السلام کے سچے وارث ہیں وہی اس کے اہل ہیں)۔ (رمضان فی رمضان ج ۱۰)

نزول قرآن

کلام مجید کا نزول دو طرح ہوا ہے۔ ایک نزول تدریجی جو کہ ۲۳ برس میں حسب ضرورت نازل ہوتا رہا۔ اور جس کا ثبوت علاوہ کتب سیر کے خود کلام مجید سے ہوتا ہے۔ **لولا انزل علیه القران جملة واحدة کذلک لنثبت به فوادک ورتلنه** ترتیلا۔ یہ آیت مشرکین نصاریٰ کے اس اعتراض پر نازل ہوئی تھی کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں تو ان کو کوئی کتاب پوری کی پوری دفعۃً آسمان سے کیوں نہیں دی گئی۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی۔ خدا تعالیٰ ان کفار کے اعتراض کا جواب ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ **کذلک لنثبت به فوادک** جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے کلام مجید کو بتدریج ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس لئے نازل کیا ہے کہ اس تدریج کے ذریعہ سے آپ کے دل کی تثبیت اور اس کا محفوظ کر لینا اور سمجھ لینا آسان ہو جائے۔

واقعی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس قدر تثبیت فواد اور ضبط وفہم بتدریج نازل کرنے میں ہوسکتا ہے نزول دفعی میں نہیں ہوسکتا۔ دفعۃً نازل کرنے میں احکام جزئیات کا سمجھنا امت کے لئے اس لئے دشوار ہوگا کہ جب دفعۃً نازل کیا جائے گا تو یقیناً اس کے احکام امور کلیہ ہوں گے اور ان پر جزئیات کو منطبق کرنا پڑے گا۔ سو جب تک کہ نبی زندہ ہیں اس وقت تک سوال کرنے سے بآسانی تعلیم ہو جائیگی لیکن نبی کی وفات کے بعد چونکہ ان کا منطبق کرنا محض امت کے اجتہاد پر رہ جائے گا۔ اس لئے بہت سی غلطیوں کا ہونا ممکن ہے جیسا کہ نصاریٰ اور یہود سے ہوئیں۔

اس تفاوت کی ایسی مثال ہے کہ ایک مریض کسی طبیب کے پاس آئے اور اپنی حالت بیان کر کے حکیم سے کہے کہ میں آپ کے پاس تو رہ نہیں سکتا۔ نہ میں وقتاً فوقتاً آکر آپ کو اپنی حالت کی اطلاع کر سکتا ہوں۔ آپ میری حالت کے مناسب کئی نسخے مجھے لکھ دیجئے۔ جوں جوں میری حالت متغیر ہوتی جائے اور مرض میں کمی یا بیشی ہو میں اس کے مناسب نسخوں کو بدل کر استعمال کرتا جاؤں۔ پس اس صورت میں اگرچہ طبیب کتنا ہی ماہر ہو۔ اور کتنے ہی غور وخوض سے نسخوں کی تجویز کرے لیکن اس مریض کی حالت اس مریض کے برابر بہتر نہیں ہوسکتی جو کہ روزانہ طبیب کے پاس آتا ہے، اپنی حالت بیان کرتا ہے پچھلا نسخہ دکھلاتا ہے اور روزانہ اس میں تغیر وتبدل کمی بیشی کرا لے جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ پہلی صورت میں تمام تغیرات کے لئے طبیب نے نسخہ جات لکھ دیئے لیکن تغیرات کی تعیین اور ان کا فہم یہ محض مریض کی رائے پر رہا جو کہ رائے العلیل ہونے کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ زیادتی صفرا کی ہو اور وہ سودا کا ہیجان سمجھ جائے اور چستی سنبھالنے کی ہو اور وہ مرض کی کمی سمجھ جائے۔

اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ جس قدر عام اور تام فائدہ جزئی حالت کے دیکھنے اور حسب ضرورت تغیر تبدل کرنے میں ہے۔ امور کلیہ سمجھا دینے میں اس قدر فائدہ نہیں۔ اس میں بہت سی غلطیاں ممکن ہیں۔ بس خدا کا ہم پر بڑا فضل ہے کہ اس نے کلام مجید جزءً جزءً نازل فرمایا کہ علماء امت نے اس کو اچھی طرح سمجھا۔ اس کے اسباب نزول پر پوری نظر کی اور اس کو اپنے ذہن میں لے لیا۔

یہاں بظاہر دو شبہات ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ جب تدریجی نزول میں اس قدر فائدہ اور دفعی نزول میں اس قدر نقصان کا احتمال ہے تو خدا نے قرآن سے پہلی

کتب کو دفعۃً کیوں نازل فرمایا۔ جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ مصلحت اور فرق غلط ہے یا امم سابقہ کے مصالح کی رعایت نہیں کی گئی۔

اس کا جواب تو یہ ہے کہ شرائع سابقہ چونکہ چند روزہ تھیں اور اس زمانہ کے اکثر ایام میں ان کے نبی یا ان کے خاص اصحاب ان میں موجود رہتے تھے جن سے تمام جزئیات حل ہو جاتی تھیں۔ اس لئے کتب سابقہ کا دفعۃً نازل ہونا ان لوگوں کے لئے مضر نہیں ہوا۔

دوسرا شبہ یہ ہے کہ باوجود قرآن کے تدریجاً نازل ہونے کے فہم قرآن میں غلطیاں اب بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ اختلاف مجتہدین سے صاف معلوم ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس اختلاف اور خطا میں اور امم سابقہ کے اختلاف اور غلطیوں میں بڑا فرق ہے۔ ان سے زیادہ اور مضر غلطیاں ہوئی تھیں اور اس امت سے ایسی غلطیاں نہیں ہوئیں۔ وجہ یہ کہ اسباب نزول نصوص کی تفسیر ہے، جس کو تعیین مراد میں خاص دخل ہے اور ظاہر ہے کہ تعیین مراد کے بعد کے غلطی خفیف ہوگی اور عدم تعیین مراد کی صورت میں عظیم ہوگی۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بلا تعیین مراد ان لوگوں پر احکام کیسے متوجہ ہوئے۔ بات یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے بیان سے تعیین ہو جاتی تھیں۔ سو اول تو انہوں نے اس کی حفاظت نہیں کی۔ دوسرے یہ کہ بیان بھی مواقع سوال ہی میں ہوتا ہے اور سوال کا ہر جگہ اذن تھا۔ مگر قلت توجہ سے ان لوگوں کو اس کی نوبت بھی کم آئی اور اس امت میں جو تعیین مراد کے بعد اختلاف پیش آیا۔ اس میں حکمت تھی توسیع مسالک کی۔ پس وہ رحمت ہوا۔ پس دونوں میں فرق ظاہر ہو گیا۔ (احکام العشر الاخمیرہ ج ۱۰)

قرآنی آیت کی تشریح

حق تعالیٰ نے اکل و شرب (کھانے پینے) کا ذکر مستقل طور پر کیوں کیا۔ حالانکہ فھو فی عیشۃ راضیہ (وہ شخص نہایت چین میں ہوگا) میں یہ بھی داخل ہو چکا تھا تو اس افراد بالذکر کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان کھانے پینے کا سب سے زیادہ عاشق ہے اور اس کے سوا جتنی مستیاں ہیں وہ سب اسی کے تابع ہیں مثلاً اگر کسی شخص کو جو کسی عورت یا امرد پر عاشق ہو چار پانچ دن کھانے پینے کو نہ دیا جائے پھر اس سے پوچھا جائے کہ بتلاؤ روٹی اور پانی لائیں یا عورت اور امرد کو بلائیں۔ تو وہ اس وقت روٹی اور پانی ہی کی درخواست کریگا۔ اور عورت

اور امرد کے عشق کو بھول جائیگا۔ اسی طرح اور سارے مطلوبات کو دیکھ لیا جائے تو سب کا مدار اسی پر ہے چنانچہ اسی کیلئے نوکری اور ملازمت کی جاتی ہے اور اسی کے لئے تیری میری غلامی کی جاتی ہے بعض دفعہ آدمی اس سے گھبرا کر یوں بھی کہنے لگتا ہے کہ یہ دوزخ کہاں کا لگ گیا۔ مگر پھر بھی اس دوزخ کے بھرنے سے چارہ نہیں۔ ایک وقت بھرنے کے بعد پھر دوسرے وقت کے لئے فکر ہے کہ شام کو اسے کس چیز سے بھرا جائے گا۔ اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمارے جذبات کی کس قدر رعایت فرمائی ہے۔ (عصم الصنوف ج ۱۰)

حق تعالیٰ کی توجہ

اپنے ساتھ حق تعالیٰ کے برتاؤ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ کس کرم کے ساتھ تربیت فرماتے ہیں ہمارے اور مربی ہیں اول تو ان میں زیادہ تر وہ ہیں جو اپنی اغراض کو صاحب حاجت کی اغراض پر مقدم رکھتے ہیں۔ البتہ والدین اس سے کس قدر مستثنیٰ ہیں کہ وہ اولاد کے جذبات کی بے غرضانہ رعایت کرتے ہیں۔ گو بعض دفعہ وہ بھی اپنے جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ مگر حق تعالیٰ چونکہ کسی چیز سے مغلوب نہیں ہیں وہ تو بندہ کے ساتھ بالکل اسی کے جذبات کی رعایت سے معاملہ فرماتے ہیں۔ (عصم الصنوف ج ۱۰)

اہل جنت کا عیش

قیامت میں اصحاب الیمین سے کہا جائے گا **کلوا واشربوا هنیئًا بما اسلفتم فی الایام الخالیه**، (جو تم نے ایام ماضیہ میں کئے تھے) کہ کھاؤ پیو ان اعمال کے عوض میں جو تم نے ایام خالیہ میں کیے ہیں۔ ایام خالیہ کی ایک تفسیر ابن عدی و بیہقی نے وہ نقل کی ہے جو پہلے سے میرے دل میں تھی اور اسی کی بنا پر میں نے اس آیت کو بیان کے لئے اختیار کیا تھا۔ مگر مجھے تلاش تھی کہ اس کی تائید سلف کے کلام سے بھی مل جائے۔ بدوں تائید سلف کے میں قرآن کے ایک لفظ کی تفسیر بھی گوارا نہیں کرتا۔ تفسیر بالرائے سے ڈر لگتا ہے۔ ہاں نکات ولطائف بیان کرنے کا مضائقہ نہیں۔ کیونکہ وہ تفسیر میں داخل نہیں۔ بلکہ امر زائد کی قبیل سے ہیں۔

بہر حال مجھے تلاش تھی کہ ایام خالیہ سے میں نے جو سمجھا ہے اس کی تائید منقول سے مل جائے۔ اول اور تفاسیر دیکھیں جلالین وغیرہ مگر کسی میں اس کی موافقت نہ ملی۔ پھر اخیر میں درمنثور

میں تلاش کیا تو اس میں ابن منذر وابن عدی اور بیہقی کی تخریج سے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن رفیع نے **بمااسلفتم فی الایام الخالیه** (جوتم نے ایام ماضیہ میں کئے تھے) کی تفسیر میں فرمایا ہے:

> **هوالصوم** (وہ روزہ ہے) **(قلت وعزاه القمی فی تفسیر الیٰ مجاهد والکلبی قالا هی ایام الصیام قال القمی فیکون الاکل والشرب فی الجنة بدل الامساک عنهما فی الدنیا اه**

(کھانا پینا جنت میں دنیا میں کھانے پینے سے رکنے کا بدل ہو جائے گا) (ص ٣٤ ج ٢٩)

اگر یہ تائید نہ ملتی تو بڑی فکر ہوتی اور مجھے کوئی دوسری آیت تلاش کرنا پڑتی۔ مگر دل اسی کے بیان کو چاہتا تھا کیونکہ اول ذہن میں یہی آئی تھی اور اس کے متعلق ہی ایک خاص مضمون ذہن میں بھی آ گیا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ تائید مل گئی اور مجھے دوسری آیت تلاش کرنا نہ پڑی۔

اب سنیئے کہ مشہور تفسیر تو ایام خالیہ کی ایام ماضیہ ہے اور میرے دل میں یہ بات آئی تھی کہ ایام خالیہ سے مراد وہ ایام ہیں جو طعام وشرب سے خالی تھے یعنی ایام صیام، چنانچہ سلف کے کلام سے بھی اس کی تائید ہوگئی۔ دوسرے عقلی طور پر یہ ظاہر ہے کہ جزا مناسب عمل ہو اور نصوص میں غور کرنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور صوفیاء نے تو اس کو کشفی طور پر بیان کیا ہے۔ اس قاعدہ سے بھی صوم کا عوض اکل وشرب ہی ہونا چاہیے۔ (عصم الصنوف ج ١٠)

واقعہ معراج کی ایک جزئی

قصہ معراج میں یہ بھی آیا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حالت عروج میں موسیٰ علیہ السلام پر گزرے اور سلام وغیرہ کر کے آگے بڑھے تو موسیٰ علیہ السلام رونے لگے کسی نے پوچھا کہ آپؑ کیوں روتے ہیں تو فرمایا کہ میں اسلئے روتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے بعد مبعوث ہوئے ہیں اور یہ میرے سامنے جوان لڑکے ہیں مگر ان کی امت جنت میں میری امت سے زیادہ داخل ہوگی۔

اس پر بعض جہلاء کو شبہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حسد ہوا یہ بالکل غلط ہے۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام کو اپنی امت کی کوتاہی پر حسرت وافسوس ہوا کہ انہوں نے میری ویسی اطاعت نہ کی جیسی امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ علیہ السلام کی اطاعت کریگی **(قلت اوبکی تحسرا علی مافات منه من رؤیته تعالیٰ مع تمنیه ایاها**

وتشرف بها محمد صلى الله عليه وسلم فى الاسراء والله تعالىٰ اعلم

۱۲) اوران جہلاء کے خیال کی تردید خودواقعہ معراج ہی میں موسیٰ علیہ السلام کے اس دوسرے واقعہ سے ہوتی ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اپنی امت کے لئے تخفیف کی درخواست کیجئے۔ اگر معاذ اللہ! ان کو حسد ہوا ہوتا تو وہ تخفیف کی درخواست کیلئے کیوں کہتے۔ بلکہ وہ پچاس کے حکم سے خوش ہوتے کہ اچھا ہے ان کی امت پر پچاس نمازیں فرض ہوں تا کہ وہ نباہ نہ سکیں اور جنت میں زیادہ نہ پہنچیں۔ مگر نہیں انہوں نے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حال پر نہایت شفقت فرمائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار تخفیف کی درخواست کرائی۔ یہاں تک کہ اخیر میں پانچ نمازیں رہ گئیں تو موسیٰ علیہ السلام نے اس میں بھی تخفیف کی درخواست کی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بس میں بار بار مراجعت کرنے سے شرما گیا ہوں اس وقت حق تعالیٰ کی طرف سے ندا آئی

امضيت فريضتي وخففت عن عبادي هن خمس وهي خمسون

کہ میں نے اپنا فریضہ بھی پورا کر دیا اور بندوں سے تخفیف بھی کر دی یہ پانچ نمازیں ہیں اور حقیقت میں یہ پچاس ہی ہیں۔ کیونکہ ایک بمنزلہ دس نمازوں کے ہے۔

اسی وقت سے یہ قاعدہ مقرر ہوا ہے کہ ایک حسنہ (اس میں تنبیہ تھی ایک عالم کی غلطی پر جنہوں نے اسی باب میں اپنے وعظ میں کہا تھا کہ رمضان میں ایک فرض شریف ستر فرضوں کے برابر ہے اور ایک نیکی دس گنی ہوتی ہے اور پانچ اوقات کی نماز پچاس نمازوں کے برابر معراج میں ہو چکی ہے تو پچاس کو پچاس میں پھر ستر میں ضرب دیا تو ایک لاکھ پچاس ہزار حاصل ہوئے پھر اس کو جماعت کے ثواب میں ضرب کیا تھا اور کئی لاکھ تک پہنچایا) پر دس کا ثواب ملے گا پہلے یہ قاعدہ نہ تھا جن صاحبوں نے **الحسنة بعشر امثالها** کی تضعیف کو تضعیف لیلۃ المعراج سے علیحدہ سمجھا ہے یعنی یہ سمجھا کہ لیلۃ المعراج میں جو پانچ نمازوں پر پچاس کا وعدہ ہوا ہے۔ ایک تضعیف تو یہ ہے کہ پھر ان پچاس میں عشر امثال کی تضعیف الگ ہوگی۔ انہوں نے صحیح نہیں سمجھا۔

تو دیکھئے انبیاء علیہم السلام کی بھی تسہیل وتخفیف کا کتنا اہتمام ہے اور یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی محبت کا اثر ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام میں جو شفقت ورحمت ہے وہ حق تعالیٰ ہی کی شفقت ورحمت کا ظل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موسیٰ علیہ السلام کے کہنے سے نمازوں میں تو تخفیف کی درخواست کی اور اس وقت آپ کو معلوم ہوگیا کہ میری امت پہلے لوگوں سے کمزور ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس سے تخفیف کی درخواست کر کے پانچ کرالیں لیکن روزہ کا عدد تیس سے تین نہیں کرایا۔

اس سے صاف میرے دعوے کی تائید ہوتی ہے یعنی اس سے بھی معلوم ہوگیا کہ روزہ سال بھر میں ایک مہینہ کا کچھ دشوار نہیں ورنہ ایک تجربہ ہو جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں بھی تخفیف کی ضرور درخواست کرتے اور تیس دن کے تین کرالیتے اور اگر عدد بھی کم نہ کراتے تو کم از کم کیفیت ہی میں تخفیف کرالیتے۔ (عصم الصوف ج ۱۰)

وضو کی برکات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ہے کہ وضو سے گناہ دھلتے ہیں تو عجب نہیں ہے کہ یہ انشراح اور نور جو وضو کے بعد ہر مومن کو محسوس ہوتا ہے یہ اسی کا اثر ہے۔ اس لئے کہ گناہ سے ظلمت، کدورت اور سیاہی کا قلب پر ہو جانا تو حدیث سے معلوم ہوتا ہی ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب آدمی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک دھبہ سیاہ لگ جاتا ہے حتیٰ کہ گناہ کرتے کرتے سیاہی قلب کو محیط ہو جاتی ہے۔ پس جب کہ گناہ سے ظلمت ہوتی ہے تو وضو سے گناہ معاف ہو کر اس ظلمت میں کمی ہوتی ہے اس لئے اس کا احساس ہوتا ہے اور اسی کی خبر دی گئی ہے کہ وضو سے گناہ دھلتے ہیں۔ (التہذیب ج ۱۰)

مثالی ازدواجی زندگی

افک کے قصہ میں جب حضرت عائشہؓ کی برات نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابشری یاعائشه! فقد براک الله یعنی خوش ہوائے عائشہ! اللہ تعالیٰ نے تم کو بری کردیا۔

اس پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اے عائشہؓ کھڑی ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کرو۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ کیوں کروں میں تو اپنے اللہ کی حمد بیان کروں گی۔

دیکھئے! بظاہر تو یہ کلمہ بے ادبی کا ہے لیکن حقیقت اور منشا اس کا حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کی محبت ہے۔ حضرت عائشہؓ کا قلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے لبریز تھا اور جیسے محبوب ناز کیا کرتا ہے کبھی محبّ بھی کرتا ہے۔ لیکن ہر شخص کا حوصلہ نہیں ہے کہ ایسی بات کہے یا جی میں لائے۔ اس لئے کہ۔

چوں نداری گرد بدخوئی مگرد   نازراروئے بباید ہمچو درد

(ناز برداری کیلئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے اگر تو ایسا حسین نہیں ہے تو بری عادات چھوڑ دے)

اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اے عائشہؓ! مجھے معلوم ہو جاتا ہے جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو اور جس وقت راضی ہوتی ہو تو اس طرح قسم کھاتی ہو لا و رب محمد، (قسم ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی) اور جب ناراض ہوتی ہو تو کہتی ہو لا و رب ابراہیمؑ۔ (قسم ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رب کی) حضرت عائشہؓ نے فرمایا **یارسول الله! لااھجر الااسمک** یعنی یارسول اللہ! میں اس وقت صرف آپ کا نام ہی چھوڑ دیتی ہوں یعنی دل میں تو آپ ہی بسے ہوئے ہیں لیکن صرف نام مبارک زبان سے ترک کر دیتی ہوں۔ (التہذیب ج ١٠)

فرائض ونوافل سے قرب حق

فرائض کی نسبت حدیث قدسی میں آیا ہے کہ میرا بندہ جس قدر فرض ادا کرنے سے مقرب بنتا ہے اس قدر کسی شے سے نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرض بہت بڑی شے ہے اور نوافل کی نسبت ارشاد ہے: **لایزال عبدی یتقرب الی بالنوا فل حتی احببته فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصربه ویده التی یبطش بها**

"یعنی میرا بندہ ہمیشہ نوافل سے قرب تلاش کرتا رہتا ہے حتی کہ میں اس کو چاہنے لگتا ہوں اور جب میں اس کو چاہتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے سنتا ہوں اور میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے دیکھتا ہے اور میں ہی اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے پکڑتا ہے"

اس کا یہ مطلب نہیں اللہ میاں توبہ توبہ اس کا کان آنکھ ہاتھ ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان اعضاء سے اس سے کوئی کام حق تعالیٰ کے خلاف مرضی نہیں ہوتا۔ اب غور کیجئے کہ

فرائض کی خاصیت یہ بیان فرمائی کہ جس قدر قرب ان سے ہوتا ہے اس قدر کسی عبادت سے نہیں ہوتا۔ اور نوافل کے بارہ میں یہ ارشاد فرمایا شیئا شیئا حاصل ہوتا رہتا ہے جیسا لایزال یتقرب اس پر دال ہے تو حاصل اس کا یہ ہے کہ زیادت قرب دو قسم کی ہے ایک کیفیہ اور ایک کمیہ کا اور وہ دونوں مطلوب ہیں تو فرائض سے تو کیف کے اعتبار سے قرب بڑھتا ہے اور نوافل سے کمیہ بڑھتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص سرکاری عہدہ دار ہے تو نفس قرب تو اس کو اپنا منصبی کام انجام دینے سے حاصل ہوگا۔ اور اگر یہ کام نہ کرے تو قرب ہی نہ ہوگا تو یہ منصبی کام بہت بڑی شی ہے کہ اس نے اس کو سرکاری آدمی بنادیا ہے اب وہ چاہتا ہے کہ میرا قرب حاکم سے اور بھی زیادہ بڑھ جائے تو وہ حاکم کے خوش کرنے کے لئے ایسا کام اختیار کریگا کہ وہ کام اس کے ذمہ نہیں ہے مثلاً اس کے لئے ڈالی لے جائے اور تحائف بھیجے نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ حاکم کا بہت مقرب ہوجائے گا۔ حتی کہ حاکم کے پاس بیٹھنا بھی اس کو نصیب ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس تشبیہ سے پاک ہیں لیکن بطور تمثیل کے سمجھنا چاہیے کہ عاشق کو نفس قرب کیفی سے تسلی نہیں ہے وہ اپنی استعداد کے اعتبار سے کمال قرب کی کا طالب ہوتا ہے مثلاً محبوب نے اپنے پاس خوش ہوکر بٹھلالیا تو وہ کھسکتا ہوا اور آگے مل کر بیٹھنا چاہتا ہے اس لئے حق تعالیٰ نے دو عبادتیں مقرر فرمائی ہیں۔ فرض اور نفل قرب کیفی کا تعلق تو فرض کے ساتھ ہے۔ فرض کے بعد کوئی درجہ کیف کا باقی نہیں رہتا۔ اور کمیہ کا تعلق نفل سے ہے اور کمیت قرب کے مراتب بے شمار ہیں۔ جس قدر بھی مراتب طے کریگا ختم نہ ہوں گے اور نہ سیری ہوگی۔ برابر دل چاہتا رہے گا کہ اور بڑھے اور بڑھے۔ (التہذیب ج۱۰)

ممنوعات شرعیہ کی حکمت

یہ بات اہل علم کے سمجھنے کی ہے کہ قرآن کی تعلیم کا اکثر طرز یہ ہے کہ ممنوعات میں انہی چیزوں سے صراحۃً منع کیا گیا ہے جن سے تقاضا طبیعت انسانیہ کو خود نفرت ہے اس سے صراحۃً منع نہیں کیا گیا چنانچہ اکل ربوا سے شراب پینے سے منع کیا گیا ہے مگر پیشاب پاخانہ کھانے سے منع نہیں کیا گیا کیونکہ اس کا تقاضا تھا اس کا تقاضا نہ تھا ایک مقدمہ تو یہ ہوا اب دوسرا مقدمہ اس کے ساتھ یہ ملاؤ کہ جس چیز کا تقاضا طبیعت میں ہو اس سے رکنا مشقت و دشواری کا سبب ہے یہ مقدمہ عقلی اور بدیہی ہے اب سمجھئے کہ جب قرآن میں نظر

بد سے منع کیا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ طبائع میں اس کا تقاضا ہے اور جس کا طبیعت میں ہو اس سے روکنا سبب مشقت ہے تو آیت کا تو خود یہی مطلب ہوا کہ باوجود مشقت کے اس گناہ سے بچو مگر آجکل کے دیندار یوں چاہتے ہیں کہ بغیر مشقت کے سب کچھ ہو جائے اسی کی میں شکایت کر رہا تھا کہ یہ کیسی طلب دین ہے جس میں راحت کی طلب ہے حالانکہ طالب دنیا ذرا سی مردار دنیا کے لئے جان و دل سے مرتے کھپتے رہتے ہیں اور طالب دین کو بغیر مشقت کے حصول دین و اصلاح اعمال کا انتظار ہو رہا ہے افسوس

بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

اس راہ کا فرق تو دیکھو کہ کہاں سے کہاں تک ہے۔ (المجاہدہ ج۱۱)

حقوق اللہ کی حقیقت

حدیث شریف میں ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت کا ذکر آیا کہ وہ بہت نمازیں پڑھتی ہے، بہت روزے رکھتی ہے، بہت قرآن پڑھتی ہے "ولکن توذی جیرانھا" لیکن زبان دراز ہے، اپنے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچاتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: "ھی فی النار" وہ دوزخی ہے اور یہ بھی پوچھا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عورت ہے کہ وہ بہت نماز روزہ تو نہیں کرتی یہ نہیں کہ فرض نماز روزہ بھی نہ کرتی تھی مطلب یہ تھا کہ بہت نفل نمازیں نہ پڑھتی تھی اور بہت نفل روزے نہ رکھتی تھی جیسے ایک عورت نے مجھ سے کہا کہ مولوی جی میں آٹھ وقت کی نماز پڑھتی ہوں۔ میں نے کہا کہ کم بخت اللہ تعالیٰ نے تو پانچ وقت کی نماز فرض کی اور تو آٹھ وقت کی پڑھتی ہے۔ اگر تہجد، اشراق اور اوابین کی نفلیں مراد ہیں تو کہاں نفل نماز کہاں فرض نماز ان کو ان میں کیوں ملاتی ہے، یوں کیوں نہ کہہ دیا کہ میں یہ یہ نفلیں پڑھتی ہوں، فرضوں کیساتھ نفلوں کو بھی آپ نے ملا دیا اور ہانک دیا کہ میں آٹھ وقت کی نماز پڑھتی ہوں تاکہ یوں معلوم ہو کہ آٹھوں نمازیں ایک ہی درجہ کی ہیں۔ (تکمیل الاعمال بتبدیل الاحوال ج۱۱)

تعلق مع اللہ

"وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ" یعنی خدا نے مدد دی ان کو ایک روح کے ساتھ وہ روح کیا ہے نسبت باطنی خدا کے ساتھ۔ اس سے ایسی قوت قلب میں پیدا ہوتی ہے کہ اگر سارا عالم

بھی مخالف ہو جائے تو بھی کچھ پروا نہیں ہوتی۔ تعلق مع اللہ سے ایک نور قلب میں پیدا ہوتا ہے اس نور کو روح اس لیے کہہ دیا کہ اس سے قلب میں حیات پیدا ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ کے ساتھ ایسا تعلق بڑھتا ہے کہ بس یہ شان ہو جاتی ہے۔

موحد چہ بر پائے ریزی زرش   چہ شمشیر ہندی نہی برسرش
امید وہراسش نباشد زکس   ہمین است بنیاد توحید وبس

(موحد کے قدموں پر سونا نچھاور کر دیا اس کے سر پر ہندی تلوار رکھ دو امید وخوف اس کو کسی سے نہ ہو گا بس توحید کی بنیاد یہی ہے) (طریق القلندر رج ۱۱)

انسانی احتیاج

قرآن کریم میں ہے فرماتے ہیں: ”وکانا یاکلان الطعام“ یعنی مسیح اور ان کی والدہ خدا کیسے ہوتے یہ تو دونوں کھانا کھاتے تھے۔ اس میں اول تو یہ بات بتلائی کہ کھانا کھانے والا بھوک سے زیادہ عاجز ہو کر غذا کا محتاج ہوتا ہے اور خدا احتاج اور عاجز نہیں ہوتا۔ دوسرے اس میں اس طرف سے بھی اشارہ ہے کہ کھانا کھانے والے کو بول وبراز کی حاجت ہوتی ہے اور بول وبراز کا کرنے والا خدا کیا ہوتا خدائی کی شان کے لائق یہی حرکات ہیں تو دیکھیے حاجت بول وبراز کو کیسے لطیف پیرایہ میں اشارۃً ادا فرمایا، صراحتاً ذکر نہیں کیا۔ مولانا محمد قاسم صاحب نے ایک عیسائی کے سامنے یہ مضمون پیش کیا تھا تو اس نے کہا کہ پیشاب پاخانہ کا نام نہ لو۔ حضرت مسیح کے ذکر میں ایسی گندگی باتیں لانا بے ادبی ہے، مولانا نے کہا پیشاب پاخانہ کا نام بے ادبی ہے تو بول وبراز سہی الفاظ کے بدلنے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔ اس حقیقت کا وجود الوہیت کے منافی ہے غرض پاخانہ میں بیٹھ کر اصلی حالت انسان کی کھل جاتی ہے اس وقت اپنے آپ کو دیکھ کر سمجھ جاؤ کہ ہم کیا چیز ہیں جو شخص دن رات میں دو تین مرتبہ نجاست میں آلودہ ہوتا ہے تو وہ کیا بڑا ہو سکتا ہے صفائی ستھرائی بھی جو کچھ نظر آتی ہے وہ بھی حق تعالیٰ کی ایک کارسازی ہے کہ پانی جیسی ایک ایسی چیز پیدا کر دی ہے جس سے گندگی کا ازالہ کر لیا جاتا ہے اگر پانی نہ ہو تو ہر وقت سنے ہی رہیں۔ اس وقت بڑائی معلوم ہو اب تو یہ ہے کہ پاخانہ میں تھوڑی دیر رہنا پڑتا ہے سب سے علیحدہ ہو کر جو کچھ گت بن گئی پھر پانی سے صاف ہو کر آ بیٹھے اگر نجاست دور کرنے کی کوئی ترکیب نہ ہو تو بدبو ہر وقت آیا کرتی اس وقت

یہ بات خوب پھبتی کہ جانتا نہیں کہ ہم کون ہیں اگرچہ اس زمانہ میں سنار رہنا ہی بعض لوگوں کے نزدیک معیوب نہیں جو لوگ فیشن کے دلدادہ ہیں ان کو دیکھ لیجئے۔ (ادج قنوج ج۱۱)

جان وایمان کی حفاظت

ارشاد ہے: "لَاتُلْقُوْا بَاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ" کہ اپنی جان کی حفاظت کرو، مصائب نوائب سے بچو، اپنی نفوس کو قتل مت کرو، جان بوجھ کر مصیبت میں نہ پھنسو۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "**ان لنفسک علیک حقا ان لعینک علیک حقا**" (بے شک تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے، تیری آنکھ کا تجھ پر حق ہے) جب نفس اور جان کا ہم پر حق ہے تو اس کی حفاظت کیوں نہ ضروری ہوگی، انسان جان اور زندگی ہی کے ذریعے سے مدارج کمالات کو طے کرتا ہے ہر دنیوی و دینی طبعی و شرعی ترقی اسی پر موقوف ہے تمام افعال و اعمال کا موقوف علیہ یہی ہے تو اس کی حفاظت کیسی کچھ ضروری ہوگی اس طرح وہ پریشانی بھی ممنوع ہے جس سے اعضاء ظاہری و باطنی قلب وغیرہ پر کچھ برا اثر ہو ان کی حفاظت بھی ضروری ہے کیونکہ یہ اعضاء مقدمہ و آلہ ہیں روح اور جان کے ساتھ مقصود اصلی مرغوب ہوتا ہے اسی طرح اس کے مقدمات بھی ہوتے ہیں، مقدمات کا احترام اور ان کی نگہداشت مقصود ہی کی نگہداشت ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں کسی شخص نے تسبیح دیکھی، کہا حضرت آپ کو تسبیح کی کیا حاجت ہے یہ تو مبتدیوں کے واسطے موزوں ہے، فرمایا اسی کی بدولت تو ہم کو یہ دولت ملی ہے اسی کی وجہ سے تو آج واصل الی اللہ ہوئے ہیں اور اسی کو چھوڑ دیں، ایسے رفیق کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہ تو کفران اور ناشکری ہے کہ جس چیز کی وجہ سے نعمت غیر مترقبہ حاصل ہو اس سے ہی اعراض کیا جائے اسی طرح یہ اعضاء اور نفس مطلوب بالذات یعنی قرب حق کے لیے آلہ ہے لہٰذا ان کی حرمت و عزت بھی ضروری ہے، خوب کہا ہے

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است　　افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہردم ہزار بوسہ زنم دست خویش را　　کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

(مجھے اپنی آنکھوں پر ناز ہے کہ انہوں نے تیرا جمال دیکھا ہے اور میں اپنے پیروں پر رشک کرتا ہوں کہ وہ تیرے کوچہ میں پہنچے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو ہزار بوسہ دیتا ہوں کہ ان سے تیرا دامن پکڑ کر اپنی طرف کھینچا ہے) (دستور سہارنپور ج۱۱)

تکبر حرام ہے

حق تعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہ فرماتے ہیں: "اِنَّ اللّٰہَ لَایُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ" (اللہ تعالیٰ کسی متکبر فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتے) نیز صحیح مسلم میں جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کے قلب میں رائی برابر تکبر ہوگا وہ جنت میں نہ جائے گا حق تعالیٰ نے حدیث قدسی میں فرمایا ہے "الكبرياء ردائي والعظمة ازاري فمن ناز عني فيها قصمته" (بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری تہہ بند ہے پس جو شخص ان دونوں کو مجھ سے چھیننا چاہے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا) ان نصوص سے معلوم ہوگیا کہ تکبر حرام ہے اب اس میں خوشامد کرتے ہیں ہر قسم کی ذلت برداشت کرتے ہیں وہ بھی دنیا ہے حالانکہ اذلال النفس منہی عنہ ہے اس لیے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "لَایَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا" (وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے) یعنی مانگنے میں اصرار وابرام نہ کرو لوگوں پر بوجھ نہ ڈالو دیں دیدیں اور نہ دیں تو کچھ زور نہیں اجارہ نہیں آج کل کے مدعی درویشوں کو دیکھے پیٹ کے لیے الحاف کو گوارا کرتے ہیں، اکثر لوگ ان کے سوال سے خواہ تہذیب سے ہو یا بے تہذیبی سے تنگ ہوتے ہیں، یہی الحاف ہے میرے خیال میں اگر حاجت بھی ہو تو صلحاء غرباء سے سوال کرلے اور ان روسا امراء کے تو پاس بھی نہ پھٹکے، ان سے تو دور ہی رہنا مصلحت ہے ان میں محض ظاہری تہذیب ہوتی ہے ورنہ دل میں حقیر سمجھتے ہیں ان کو چھوڑنا چاہیے۔ (دستور سہارنپور ج۱۱)

تعلیم انبیاء علیہم السلام

انبیاء کی تعلیم ایسی ہوتی ہے جیسے بعض اطباء جڑی بوٹیوں سے علاج کیا کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ طبیب بڑا ماہر ہے جو ایک معمولی گھاس سے بڑے سے بڑے مرض کا علاج کردے مگر اس کی قدر وہی کرسکتا ہے جو اس کے علاج پر ایک دفعہ عمل کرکے اس کے فائدہ کا مشاہدہ کرچکا ہو ورنہ ظاہر ہے لوگ تو یہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ بھی کوئی علاج ہے جس میں جنگل کی گھاس ہی بتلادی جو ایک پیسہ کو بھی نہیں پوچھی جاتی مگر حقیقت میں فن دانی اسی کا نام ہے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور کام جلدی ہوجائے۔ ہمارے استاد علیہ الرحمۃ (مولانا محمد

یعقوب) صاحبؒ اکثر جڑی بوٹیوں سے علاج بتلا دیا کرتے تھے۔ مولانا علم طب میں بھی بڑے ماہر تھے اور آپ کے نسخہ میں زیادہ تر اجزاء نہ ہوتے تھے۔ اکثر تو مفردات بتلا دیا کرتے تھے ورنہ دو یا تین سے زیادہ اجزاء نہ ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک رئیس کو یہ دوا بتلائی کہ جامن کی کونپلوں کو سیاہ مرچوں میں پیس کر استعمال کریں یہ واقعہ تو میں نے ناتمام سنا ہے یہ معلوم نہیں کہ ان حضرات نے اس کو استعمال کیا یا نہیں۔ دوسرا واقعہ مکمل سنا ہے وہ یہ کہ ایک مرتبہ مولانا انبہٹہ تشریف لے گئے' مولانا کی دوسری شادی انبہٹہ ہی میں ہوئی تھی اس لیے وہاں جانا آنا رہتا تھا' ایک رئیس کو وہاں معدہ کا کچھ مرض تھا جس کے علاج انہوں نے بہت کیے تھے مگر کسی علاج سے نفع نہ ہوا۔ جب مولانا وہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے حضرت سے بھی رجوع کیا' مولانا نے ان کو یہ دوا بتلائی کہ اکاس بیل کو دودھ میں پکا کر استعمال کریں چونکہ ایک معمولی دوا تھی جس میں ایک پیسہ بھی خرچ نہ تھا کیونکہ اکاس بیل خودرو بہت ملتی ہے اس لیے اس رئیس کو اس کی قدر نہ ہوئی۔

وہ یہ سمجھے کہ میرے مرض کے لیے تو ایسے نسخے کی ضرورت ہے جس میں بہت سے روپے خرچ ہوں اس معمولی دوائی سے مجھے کیا آرام ہوگا۔ مولانا کو بھی آثار سے معلوم ہوگیا کہ اس شخص نے میرے نسخے کی قدر نہیں کی' فرمایا اس کو معمولی نہ سمجھو تمہارے مرض کی یہی ایک دوا ہے کہ اس کو استعمال کر کے دیکھو مگر اس نے پھر بھی توجہ نہ کی جب مریض کو طبیب پر اعتماد نہ ہو تو اس کی جوتی کو غرض پڑی ہے کہ اس کی خوشامد کرے پھر مولانا کو کون سی فیس ملتی ہے جو وہ خوشامد کرتے۔ مولانا بھی خاموش ہو رہے۔ اتفاق سے اس محلّہ کی مسجد میں ایک نابینا ملا جی مؤذن تھے جن کی بزرگی کے لوگ معتقد تھے انہوں نے صبح کو اس رئیس کے روبرو خواب بیان کیا کہ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا اور دریافت کیا کہ حضرت اس مرض کے لیے کوئی دوا بتلا دیجئے تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی صرف ایک دوا ہے اور وہی دوا بتلائی جو حضرت مولانا نے بتلائی تھی۔ یہ خواب مولانا سے بیان کیا گیا مولانا نے پوچھا کہ حافظ جی دیکھو میں ہی تو نہ تھا تو حافظ جی کیا کہتے ہیں ہاں حضرت آواز تو ایسی ہی تھی۔ مولانا نے فرمایا بھائی جب تم نے جاگتے میں میرا کہنا نہ مانا' آخر میں نے سوتے میں بتلا دیا تو دیکھئے مولانا کے ارشاد کی قدر اسی لیے نہ ہوئی کہ بظاہر وہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی تھی۔ (ترک مالایعنی ج ١١)

خدمت دین

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو سب سے زیادہ عاشق تھے ورنہ بقیہ صحابہ کے حضور کی وفات کے شدۃ صدمہ سے ہوش بجا نہ تھے جب صدیق اکبرؓ نے یہ کیفیت دیکھی تو فوراً منبر پر تشریف لے گئے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر خاص نظر تھی۔ جب ان کو منبر پر دیکھا سب منبر کے گرد جمع ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعد حمد ونعت فرمایا:

"**الا ان من کان منکم یعبد محمدا فان محمد قدمات ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لایموت**" (یعنی آگاہ ہوجاؤ' بے شک جو تم میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کیا کرتا تھا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو وفات پا گئے ہیں اور جو اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ زندہ ہے ان کو موت نہ آئے گی) اور اس کے بعد یہ آیت

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْخَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْقُتِلَ
انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا

یعنی نہیں ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم مگر ایک رسول ان سے پہلے بھی بہت رسول گزر چکے ہیں کیا پس اگر وہ مر جائیں گے تو تم اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے اور جو شخص پھر جائے گا تو وہ اللہ کا ہرگز کچھ نہ بگاڑے گا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فانی ہونا بیان فرمایا اور جس کے واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تھے اس پر استقامت کی تعلیم فرمائی اور اس کے بعد حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "وَمَا كَانَ لَنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا" یعنی کسی جان کے لیے یہ نہیں ہے کہ وہ بغیر حکم الٰہی کے مر سکے اور آپ نے آیت بھی پڑھی۔ "اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ" صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ کلام سن کر ہماری یہ حالت ہوئی کہ گویا ہم نے یہ آیت پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ ابتداء میں کلام اللہ سن کر جو حالت قلب کے تاثر کی ہوا کرتی ہے اس کو سن کر وہی حالت ہوگئی اور ہوش سے آ گئے اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ غور کرنا چاہیے کہ حضور جس کام کے لیے تشریف لائے تھے یعنی دین حق کی اشاعت اور احیاء وہ کام ہم کو کرنا

چاہیے چنانچہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس شغل کو لے کر نہیں بیٹھے اور سب کے سب فوراً خدمت دین میں مصروف ہوگئے۔ چنانچہ غزوات اور فتوحات اور تفسیر اور حدیث اور فقہ اور علوم کی اشاعت خدمات دین اس درجہ تک کیں کہ نادان آدمی کو دیکھ کر سرسری نظر سے یہ خیال ہوسکتا ہے کہ جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں نہیں ہوئے تھے وہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور بعد کے علماء نے کیئے حالانکہ یہ غلط ہے اس لیے بنیاد حضور ہی نے رکھی تھی اور بنیاد رکھنا ہی کسی کام کی مشکل کام ہے اور جب بنیاد رکھی جائے اور بنیاد درست ہوجائے تو آگے اس کے چلانا کون سا مشکل کام ہے اسی مشکل کے موقوف علی الرسول ہونے کے مضمون کو حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ”لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ“ یعنی جو لوگ کافر ہوئے ہیں اہل کتاب اور مشرکین سے وہ اپنے کفر سے باز آنے والے نہیں تھے یہاں تک کہ ان کے پاس دلیل روشن آئی اور وہ دلیل اللہ کی طرف سے ایک عظیم الشان رسولؐ ہیں جو پاک صحیفوں کی تلاوت کرتے ہیں کہ ان صحیفوں میں لکھے ہوئے مضبوط مضمون ہیں۔ غرض صحابہ نے اس صدمہ جانکاہ کا وظیفہ نہیں کیا حالانکہ صحابہ کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی محبوب نہیں تھا اور اسی وجہ سے صدمہ بے حد سخت تھا پس ہم کو بھی چاہیے کہ ہم صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اقتدا کریں۔ (رفع الموانع جلد ۱۱)

نسخہ کیمیا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ”**اصيب بمصيبة فليتعز بمعصيتي**“ یعنی جس کو کوئی مصیبت پہنچے اس کو چاہیے کہ میری مصیبت سے وہ تسلی حاصل کرے یعنی میری وفات سے جو میری امت کو صدمہ پہنچا ہے اس کو یاد کرے یعنی یہ سوچے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اس میرے محبوب سے بھی زیادہ محبوب ہیں جب آپؐ ہی اس حیات ظاہری میں نہ رہے اور اس پر ہم نے صبر کرلیا تو اس کی کیا پرواہ ہے اس پر وہ شخص شبہ کرسکتا ہے جو یہ کہے کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت ہی نہیں لیکن مسلمان تو ایسا کہہ نہیں سکتا۔ بفضلہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اپنی جان‘ اولاد اور مال سے زیادہ محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اور جس کو نہیں اس کی طرف ہمارا روئے سخن نہیں ہے۔ غرض ان طریقوں کے اختیار کرنے سے

مصیبت کا جو زیادہ ناگواری کا درجہ ہے وہ نہ رہے گا ورنہ مصیبت اپنی اپنی حد سے بڑھ کر حضرت حق سے مانع ہوجائے گی اور یہ اور زیادہ مصیبت پر مصیبت ہوگی۔ (رفع الموانع ج۱۱)

مجاہدہ اور ترقی

مجاہدہ سے ترقی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ملائکہ کون مدارج میں ترقی نہیں ہے کیونکہ ان میں مجاہدہ متصور نہیں اور بشر میں مجاہدہ بوجہ میلان اور رغبت معاصی کے متصور ہے اس لیے ان کے مدارج میں بسبیل لاتقف عند حد ترقی ہوتی رہتی ہے۔ حکیم ترمذی ایک بزرگ گزرے ہیں جوانی میں ان پر ایک عورت عاشق ہوگئی تھی اور ہر وقت ان کی تلاش اور جستجو میں رہتی۔ آخر کار ایک دن موقع پر ایک باغ میں ان کو دیکھا اور وہ باغ چاروں طرف سے چار دیواری کی وجہ سے بند تھا۔ وہاں پہنچ کر ان سے اپنے مطلب کی درخواست کی، یہ گھبرائے اور گناہ سے بچنے کی غرض سے بھاگ کر دیوار سے کود پڑے، اس قصہ کے بعد ایک روز بڑھاپے کے زمانے میں وسوسے کے طور پر خیال آیا کہ اگر میں اس عورت کی دل شکنی نہ کرتا اور اس کا مطلب پورا کر دیتا اور پیچھے توبہ کر لیتا تو یہ گناہ بھی معاف ہوجاتا اور اس کی دل شکنی بھی نہ ہوتی۔ (سیرت صوفی ج۱۱)

نعمت رزق

ہم مسلمان ہیں، ہم نعمت اسلام سے نوازے گئے ہیں۔ اگر ہم اس کو نعمت سمجھتے تو جیسے اور نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں، اس کا بھی شکر ادا کرنا چاہیے تھا، بلکہ سب سے زیادہ کرنا چاہیے تھا، کیونکہ دین و دنیا کی ساری بہبودی اسی کی بدولت ہے۔ مگر یہاں ایک مرتبہ بھی زبان پر نہیں آتا کہ الٰہی تیرا شکر ہے۔ اور مستقلاً تو کیا شکر کرتے، دوسری نعمتوں کے ساتھ منضم کر کے بھی اس پر شکر نہیں کرتے۔ حالانکہ شارع علیہ السلام نے اس کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ اگر تم سے مستقلاً اسکا شکر ادا نہ ہو سکے تو دوسری نعمتوں ہی کے ساتھ ملا کر کر لیا کرو۔ چنانچہ کھانے کے ساتھ حکم ہے کہ کھانے پر شکر کرتے وقت نعمت اسلام کا بھی شکر ادا کرو۔ کھانے کے بعد جو دعاء آئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔ **الحمد لله الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین.** (سنن الترمذی: 3396) اور ہمیں مسلمان بنایا۔ یعنی تمام حمد اس ذات کیلئے ہے جس نے ہم کو کھانے کو دیا، پینے کو دیا، اور ہمیں مسلمان بنایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں تعلیم دی ہے کہ کھانے پینے کے ساتھ اس کو بھی بڑھا دو۔ **وجعلنا من المسلمین.**

مگر نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہم اس نعمت کے ساتھ اس قدر بے اعتنائی اور لاپروائی کرتے ہیں کہ اس وقت بھی نعمت اسلام پر شکر نہیں کرتے۔ (الاتمام لنعمۃ الاسلام ج ۱۲)

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے تفسیر مظہری میں ایک عجیب تفسیر کی ہے۔ عام مفسرین نے تو یہ تفسیر کی ہے کہ یہ معمول ہے ارزق مقدر کا یعنی وارزق من کفر کہ میں کافر کو بھی رزق دوں گا۔ آگے اس کی تفصیل ہے **فامتعه قليلا ثم اضطره الىٰ عذاب النار** (پس ایسے شخص کو تھوڑے روز تو خوب آرام برتاؤں گا پھر اس کو کشاں کشاں عذاب میں پہنچاؤں گا) اس تفسیر کے موافق گویا من کفر پر جملہ ختم ہو گیا۔ **فامتعه قليلا** (پس اس کو تھوڑے روز آرام پہنچاؤں گا) الخ الگ جملہ ہے۔ اور قاضی ثناء اللہ صاحب نے کہا ہے کہ من مبتدا ہے اور فامتعہ خبر ہے یا یوں کہو کہ من شرطیہ ہے اور امتعہ اس کی جزا ہے۔ خواہ من کو مبتدا مانو یا شرطیہ، اور امتعہ کو خبر بناؤ یا جزا دونوں جائز ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ جملہ مستقلہ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جو کفر کرے گا اس کو دنیا سے متمتع کروں گا' اور قلیلاً قید واقعی ہے۔ کما قال تعالیٰ **قل متاع الدنيا قليل**. (آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں کہ دنیا کا ساز و سامان بہت کم ہے) اب اس پر ایک سوال ہوتا ہے کہ اس تقریر کا تو حاصل یہ ہوا کہ جو کفر کرے گا اسی کو متاع حاصل ہو گی تو کیا کفر سبب تمتیع کا ہے؟ قاضی صاحب نے اس کا جواب دیا ہے۔ کہ دنیا کو مومن سے کم مناسبت ہے اور کافر سے زیادہ مناسبت ہے۔ یہ ایسی بات ہے جیسے ارشاد ہے **الخبيثت للخبيثين والخبيثون للخبيثت** (گندی عورتیں گندے مردوں کے لائق ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لائق) کہ خبیث کو خبیث ہی ملا کرتا ہے۔ دنیا خسیس ہے اور کفار بھی خسیس ہیں۔ لہٰذا ان میں باہم تناسب ہے۔ اور مومن شریف ہے اور دنیا خسیس ہے' لہٰذا ان میں باہم تناسب نہیں ہے۔ میں نے اسی تفسیر پر دعویٰ کیا تھا کہ کفار کا دنیا سے تناسب نقل سے ثابت ہے۔ اس لئے تدابیر باطلہ کفار کیلئے مفید ہیں۔ بخلاف اہل اسلام کے ان کیلئے تو وہی تدابیر نافع ہوں گی جو اسلام کے مناسب ہیں' وہ تدابیر کیا ہیں وہ وہ ہیں جو اللہ میاں نے بیان فرمائی ہیں جن کو میں نے اب بیان کیا ہے کہ اپنی اصلاح کرو' اخلاق کو درست کرو' عقائد و اعمال کو سنوارو' اس سے فائدہ یہ ہو گا کہ دوسرے کو تمہارے بہکانے کی طمع نہ ہو گی' دست درازی کی ہمت نہ ہو گی۔ یہ تو اپنا ذاتی فائدہ ہے اپنے نفس کی

حفاظت ہے، آگے دوسرا درجہ اشاعت اسلام کا ہے اس سے بھی اس میں کامیابی ہوگی۔ کیونکہ اسکا حسن ایسا ہے کہ دوسروں کے دل بھی کھینچتا ہے۔ اگر تمہارے اندر اسلام کے پورے اوصاف پائے جائیں گے۔ اسکے انوار و برکات تم میں جمع ہو جائیں، تو دوسری قومیں خود ہی اسکے اندر آ جائیں گی۔ زیادہ بولنے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ (الاتمام لنعمة الاسلام ج ۱۲)

حکمت اور موعظت حسنہ

بعض تو وہ لوگ ہیں کہ دعوت کو ضروری نہیں سمجھتے ہیں اور بعض وہ ہیں کہ ضروری تو سمجھتے ہیں مگر جنگ و جدال کرنے لگتے ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے دونوں کی اصلاح فرمائی ہے کہ دعوت تو کرنا چاہیے وہ تو ضروری ہے، اس میں فرقہ اول کی اصلاح ہوگئی۔ آگے فرماتے ہیں کہ دعوت تو ہو مگر ایک خاص طریقہ سے۔ آگے وہ طریقہ بتلاتے ہیں کہ طریقہ دعوت کا یہ ہے کہ حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ لوگوں کو بلاؤ۔ نرمی سے سمجھاتے رہو۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کا امر فرمایا ہے۔ ایک حکمت دوسرے موعظت حسنہ۔

اول یہ سمجھو کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے۔ سو حکمت تو کہتے ہیں علم کو، اور موعظت حسنہ کہتے ہیں ترغیب و ترہیب و ترقیق قلب کو یعنی ان کو علمی مضامین سے بلاؤ۔ مضامین علمیہ ان کے کانوں میں ڈالتے جاؤ اور ان مضامین کو ترغیب و ترہیب سے موثر بناؤ۔ اسی کو فرماتے ہیں کہ حکمت و موعظت حسنہ کے ساتھ بلاؤ اور یہ حکمت مقابل ہے مناظرہ و جدال کا گو وہ بھی علمی مباحث سے ہوتا ہے مگر وہ حکمت نہیں بلکہ حکمت اثبات مدعا کا نام ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک تو ہوتا ہے اثبات مدعا اور ایک جواب ہوتا ہے نقیض مدعا کا۔ یعنی ایک تو ہے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنا، دوسرے معترض کے اعتراض کا جواب دینا، اس کے خدشات کو دفع کرنا، تو حکمت تو اثبات مدعا ہے اور جواب دینا نقیض مدعا کا یہ جدال ہے۔ تو اصل مفید چیز تو دعوت کرنا ہے حکمت کے ساتھ، لیکن اس میں اگر کبھی جدال واقع ہو جاوے، تو اس کے بھی خاص طریقے ہیں۔ سو آگے ان طریقوں سے خصم کے اعتراض دفع کرنے کی تاکید ہے۔ غرض دعوت الی الاسلام کیلئے حکمت تو لازم ہے۔ بلا حکمت کے دعوت ہوتی ہی نہیں۔ باقی جدال لازم نہیں یہ ضروری نہیں کہ جہاں دعوت ہو وہاں جدال بھی

ہو۔ تو مطلب یہ ہے کہ دعوت میں مضامین علمی بیان کرو۔ فوائد علمیہ سناتے جاؤ۔ اپنے دعوے کو دلائل علمیہ وعقلیہ سے ثابت کرو اس کی خوبی اس کے محاسن بیان کرو لیکن اگر اس میں کوئی دوسرا اعتراض کرے کوئی نقض وارد کرے، تو اس وقت ضرورت ہوگی مباحثہ کی۔ تو اس وقت مباحثہ کرو مگر احسن طریقہ سے اسی کو فرماتے ہیں وجادلہم بالتی ہی احسن (اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے) یعنی اس طرح جواب دو کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو، لعن وطعن نہ ہو، خشونت نہ ہو۔ کسی پر طعن نہ کرو، کسی کو ملامت نہ کرو، کسی کی ہجو نہ ہو۔ ایسے مباحثہ حسنہ سے مخاطب کو رنج وملال نہ ہوگا بلکہ وہ اثر پذیر ہوگا۔ یعنی مضامین کے بیان میں کبھی خشونت ہو جاتی ہے، کبھی غصہ اور تیزی کے لہجہ سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس کی ممانعت فرماتے ہیں کہ ایسے طریق اختیار نہ کرو جس سے مخاطب بھڑک اٹھے، اس کے بدن میں آگ لگ جائے۔ سو ایک تقریر تو مقام کی یہ ہوئی۔

دوسری تقریر یہ ہے کہ موعظت بھی ایک مستقل طریق ہے۔ تو اس وقت حاصل مقام کا یہ ہوگا کہ اگر مخاطب میں علمی قابلیت دیکھو اس کے اندر سمجھ کا مادہ ہو تو وہاں حکمت کے ساتھ بلاؤ، اس کو مضامین علمیہ سناؤ اور اگر استعداد علمی نہ ہو تو موعظت سے کام لو۔ کیونکہ وعظ کیلئے چنداں ذہین فہیم ہونے کی ضرورت نہیں۔ وعظ کا اکثر مضمون عام فہم ہوتا ہے، کیونکہ موعظۃ حسنہ اس کو کہتے ہیں، جس سے قلب میں نرمی پیدا ہو، رقت طاری ہو، تو معنی یہ ہوئے کہ جنت کی ترغیب دو۔ دوزخ سے ترہیب کرو، نعمائے جنت وآسائش وراحت بہشت کو بیان کرو، اس سے رغبت پیدا ہوگی۔ اور دوزخ کے درکات اور تکالیف وعذاب سے ڈراتے رہو اور اس کے بعد بھی اگر کوئی شبہ کرے تو اس کیلئے حکم ہے جادلہم بالتی ہی احسن کہ ان سے مجادلہ کرو احسن طریقہ سے، جس کی تفسیر اوپر گذر چکی۔

آگے ان ربک ہو اعلم (بے شک آپ کا پروردگار خوب جانتا ہے) الخ بڑھا کر مجموعہ میں ایک باریک بات بتلا دی وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ طرز تعلیم فرمایا ہے کہ ان کو حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ بلاؤ یعنی نرمی سے سمجھاؤ۔ کوئی خشونت نہ ہو، درشتی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ طرز وہی اختیار کر سکتا ہے جس کے اندر شفقت ہو۔ اگر وہ شفیق نہیں تو اس کو منت سماجت کی کیا پڑی؟ دیکھو جب استاذ شفیق ہوتا ہے تو چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ پڑھ لے۔ طرح طرح

سے اس کو سمجھاتا ہے، کبھی پیسہ دیتا ہے، کبھی مٹھائی کھلاتا ہے، پیار کرتا ہے، چمکارتا ہے کہ میاں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ سبق پڑھو دیکھو اگر پڑھو گے تو درجات ملیں گے۔ تو اس طریق کی تعلیم فرمانا گویا شفقت کا حکم فرمانا ہے مگر اس حکم شفقت میں ایک اشکال بھی تھا وہ یہ کہ شفقت کی وجہ سے جس طرح ابتدائے تعلیم میں نرمی اختیار کرتا ہے ایسے ہی انتہا میں ناکامی سے رنج بھی زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی بچہ کے ساتھ محنت اور جان کاہی کی جاوے اور پھر بھی ناکامی ہو تو بڑا رنج ہوتا ہے کہ ہائے ہماری ساری محنت برباد گئی، خاک ہی میں مل گئی۔ پھر رنجیدہ ہو کر کام سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس لئے اس اشکال کے عملی علاج کیلئے آگے **ان ربک هو اعلم** (بے شک آپ کا پروردگار خوب جانتا ہے) میں اس شفقت کو اعتدال پر لانے کا طریقہ بتلاتے ہیں۔ اور وہ طریقہ ایک مراقبہ ہے واقعی اخلاق کی میزان سوائے خدا کے کسی نے نہیں بتائی ان کی تعلیم میں افراط تفریط نہیں ہے بالکل اعتدال ہی اعتدال ہے۔ کیونکہ افراط بھی مضر ہے اور تفریط بھی۔ چنانچہ اگر حد سے زیادہ شفقت ہو تو یہ بھی مضر۔ کیونکہ اس سے آخر کو بددل ہو جاوے گا اور کام بھی چھوڑ بیٹھے گا، اور اگر تفریط ہے یہ بھی مضر کیونکہ شفقت کی تعلیم کا اور اثر ہوتا ہے اور بے شفقت کا اور اثر۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر اس کی ایک میزان بتا دی تا کہ کسی جانب میں کمی بیشی نہ ہو۔ دونوں پہلو برابر رہیں۔ چنانچہ اول فرماتے ہیں **ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة** (آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی راہ کی طرف علم اور نصیحت کی باتوں سے بلائیے) اس میں تو شفقت کے ساتھ تعلیم کا امر ہے کیونکہ اگر ابتداء میں شفقت نہ ہو تو ایسی تعلیم کم نفع دے گی اور اس کے بعد افراط فی الشفقت کی ممانعت ہے، اس کیلئے یہ مراقبہ بتلاتے ہیں کہ **ان ربک هو اعلم بمن ضل عن سبیله وهو اعلم بالمهتدین** (بیشک آپ کا پروردگار خوب جانتا ہے اس شخص کو جو اپنے رستہ سے گم ہوا اور راہ چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے) گویا اس کے معنی یہ ہیں کہ **لا تحزن علیهم ان لم یومنوا** (اگر وہ ایمان نہ لائیں تو ان پر غم نہ کریں) یعنی آپ کا فرض منصبی تو دعوت کرنا ہے وہ آپ نے کر دی اب اگر وہ ایمان نہیں لاتے آپ کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تو آپ غمگین نہ ہوں، کیونکہ ایمان لانا یا نہ لانا یہ تو خدا کے قبضہ قدرت میں ہے۔ آپ کے اختیار میں نہیں، پھر آپ غمگین کیوں ہیں؟

اس مضمون کے استحضار سے غلو فی الشفقت نہ ہوگا جوکہ مضر ہے اور اس کے مضر ہونے کا ایک راز ہے وہ یہ کہ شفقت سے حزن ہوگا' اور حزن کا خاصہ یہ ہے کہ اس سے قلب ضعیف ہوجاتا ہے اور بددل ہوکر آدمی کام چھوڑ دیتا ہے کہ اتنا تو سر مارا اور پھر بھی ناکامی ہوئی چھوڑو اور اس قصہ ہی کو الگ کرو' اس سے کیا فائدہ؟ تو شدت شفقت کی وجہ سے یہ بات ہوگی اور اس سے سلسلہ تبلیغ کا بند ہوجائے گا۔ اس لئے غلو کا بھی علاج کردیا۔ خلاصہ یہ کہ مسلم کی تبلیغ کا کام شفقت سے ہوتا ہے۔ مگر شفقت سے تبلیغ کی صرف تکمیل ہوتی ہے یہ خود بنفسہٖ مقصود نہیں' بلکہ اصل مقصود تبلیغ ہے۔ (الاتمام لنعمۃ الاسلام ج ۱۲)

نعمت اسلام کا حق

نعمت کا حق یہ ہے کہ اس کو کامل طور پر حاصل کیا جائے تو اسلام کا بھی ہم پر یہ حق ہوا کہ ہم اسے کامل طور پر حاصل کریں اب سمجھئے کہ اسلام کیوں کہ کامل ہوتا ہے تو شریعت نے بتلادیا ہے کہ جیسے اسلام بغیر صوم وصلوٰۃ کے کامل نہیں ہوتا ایسے ہی اور ایک چیز ہے کہ اس کے بدون بھی اسلام کامل نہیں ہوتا اس کا بیان یہ ہے کہ ہم نے جو احکام کو دیکھا تو جہاں **اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ** کا حکم ہے یعنی نماز ادا کرو۔ زکوٰۃ دو۔ اور **کتب علیکم الصیام** یعنی تم پر روزہ فرض ہے اور **اتموا الحج والعمرۃ للہ** (اور حج وعمرہ کو اللہ کے واسطے پورا پورا کرو) یعنی حج کا بھی حکم ہے۔ یہ سارے احکام تو ہم پر فرض ہیں ہی نماز روزہ حج زکوٰۃ سب ہی کے ادا کرنے کا حکم ہے اور **اتل ما اوحی الیک من الکتاب** (جو کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی گئی ہے اس کو پڑھا کیجئے) میں تلاوت قرآن کا بھی حکم پایا۔ ان احکام کے ساتھ ہی ایک حکم یہ بھی فرمایا ہے وامر بالمعروف وانہ عن المنکر یعنی دوسروں کو بھی بھلائی کا حکم کرو اور برائی سے روکو اور یہ حکم احکام مذکورہ کے مقابل نہیں بلکہ جہاں نماز کا حکم ہے وہاں ہی امر بالمعروف کا بھی حکم ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ یٰبُنَیَّ اقم الصلوۃ وامر بالمعروف وانہ عن المنکر (اے میرے بیٹے نماز کو قائم کرنا اور نیک کاموں کا حکم دینا اور بُرے کاموں سے منع کرنا) اور ارشاد ہے **والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض یا مرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویقیمون الصلوٰۃ ویوتون الزکوٰۃ ویطیعون اللہ ورسولہ اولٰئک سیر حمھم اللہ ان اللہ عزیز حکیم**

(اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور برے کاموں سے منع کرتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اسکے رسول) اور جہاں جنت کا وعدہ ہے وہاں نماز کے ساتھ امر بالمعروف کا وصف بھی مذکور ہے۔ چنانچہ آیت بالا میں ان اوصاف کے بعد ہی ارشاد ہے۔ وعد اللہ المؤمنین و المومنات جنات (اللہ تعالیٰ نے مؤمنین اور مؤمنات سے بہشتوں کا وعدہ فرمایا ہے) جہاں ان کے اور فضائل بیان کئے گئے ہیں اس کے ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہیں سو حکم تو یہ ہے کہ جیسے اور احکام فرض ہیں ایسے ہی امر بالمعروف بھی فرض ہے مگر حالت ہماری یہ ہے کہ اس کا بالکل خیال ہی نہیں اول تو ہم لوگوں کو خود دین ہی کی طرف توجہ نہیں اور جو دیندار ہیں بھی ان کی حالت یہ ہے کہ صرف اپنی کملی کی تو خیر مناتے ہیں مگر دوسروں کی خبر نہیں کسی کو نہ نیک کام کی ترغیب دیتے ہیں اور نہ برائی سے روکتے ہیں۔ گویا یہ حکم قرآن میں ہے ہی نہیں اور غیروں کو تو کیا کرتے خود اپنے گھر والوں سے بھی پوچھ گچھ نہیں کرتے ؟ حالانکہ جیسے اپنے اوپر عمل کرنا فرض ہے ایسے ہی اپنے اہل و عیال کو عمل کیلئے کہنا بھی فرض ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں قوا انفسکم و اھلیکم نارا (اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ) اور خاص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے وامر اہلک بالصلوٰۃ یعنی خود بھی نماز ادا کیجئے اور اپنے گھر والوں کو بھی حکم کیجئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والے کیا نماز نہیں پڑھتے تھے؟ ان جیسا تو نمازی بننا مشکل ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جو آپ کا حکم ہوا ہے کہ اہل بیت کو نماز کا حکم کیجئے تو اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص کرتا بھی رہے اسے بھی کہتے رہو۔ دیکھو جب بچہ قرآن ختم کرتا ہے تو جو شفیق استاد ہوتا ہے وہ اس سے کہتا رہتا ہے کہ بھائی اس کو بھول مت جانا بلکہ دو ایک منزل ہمیشہ پڑھتے رہنا۔ شفیق استاد یہ نہیں کرتا کہ میں نے تو اب ختم کرا دیا آگے وہ جانے اس کا کام جانے یا تم نے اپنے کسی عزیز کو حساب سکھلایا ہو تو اسے کہتے رہتے ہو کہ دیکھو روزانہ ایک دو سوال نکال لیا کرو۔ نہیں تو بھول جاؤ گے اور پھر اس پر بس نہیں کرتے بلکہ روز یا دوسرے تیسرے دن اس سے پوچھتے رہتے ہو کہ سوال نکالا تھا یا نہیں اگر کسی دن اس نے سستی کی تو ڈانٹتے ہو اسی طرح اپنی اولاد اور اپنے بچے کو بیماری میں آپ نے سکھلا دیا کہ تم کو فلاں چیز مضر ہے۔ دماغ خراب کرتی

ہے اس سے پٹھے خراب ہو جاتے ہیں رطوبت پیدا کرتی ہے کھٹائی مت کھانا وہ یہ یہ نقصانات کریگی اور وہ سمجھ بھی گیا کہ یہ شے مضر ہے مگر پھر بھی تم دوسرے تیسرے دن کہتے رہتے ہو دیکھو کبھی کھٹائی نہ کھانا اب وہ کہتا ہے کہ میں نے تو سمجھ لیا ہے سن لیا ہے پھر روزانہ کہنے کی ضرورت کیا؟ تو اس سے کہتے ہو کہ بھائی محبت کا تقاضا ہوتا ہے اس لئے کہتا ہوں یہ نہ ہو کہ کبھی غلطی سے کھا جاؤ۔ اور نقصان کرے تو۔ اسی طرح حق سبحانہ وتعالیٰ نے حضورؐ کو فرمایا کہ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کیجئے باوجودیکہ حضرات ازواج مطہرات اس کی نہایت پابند تھیں اور ایسی کامل ولیات تھیں کہ ان کے فضائل قرآن میں جابجا موجود ہیں ایک مقام پر تو یہ تصریح ہے کہ۔

یا نساء النبی لستن کاحد من النساء کہ تم اور عورتوں جیسی نہیں ہو۔ کیا اسی طرح بے نمازیوں کے فضائل ہیں ایسا خطاب ہوسکتا ہے ہرگز نہیں مگر پھر بھی حکم ہوتا ہے۔ **وامر اھلک بالصلوٰۃ** اپنے گھر والوں سے نماز کیلئے کہتے رہو کہنا مت چھوڑو واقعی کہنے کی بڑی برکت ہے۔ (الاتمام لنعمۃ الاسلام ج ۱۲)

سکوت کا اثر

بعض اوقات کچھ نہ کہنے کا بھی اثر ہوتا ہے چنانچہ میں ایک دفعہ ریل میں سفر کر رہا تھا اس میں ایک ڈپٹی کلکٹر بھی سوار تھے جب نماز کا وقت آیا ہم نے ریل میں نماز پڑھی اور وہ ویسے ہی بیٹھے رہے۔ میرے ایک دوست کہ وہ بھی ڈپٹی کلکٹر تھے اس سفر میں رفیق تھے انہوں نے مجھ سے کہا کہ ان کو تم سے محبت معلوم ہوتی ہے تم ان سے کہو تو نماز پڑھ لیں گے میں نے کہا کہ مجھے کہنے کی کیا ضرورت ہے، یہ کوئی بچے ہیں کہ میں کہوں گا تو سمجھیں گے ورنہ نہیں سمجھیں گے۔ بالآخر ہم نے ان سے کچھ نہیں کہا اور نماز پڑھ لی اور حقیقت میں سب کچھ کہا مگر اس طریقہ سے کہا کہ دوسروں کو علم بھی نہ ہوا اور اثر ہوگیا۔ اب ان کا یہ گمان تھا کہ جب یہ نماز پڑھ کر بیٹھیں گے تو بولیں گے بھی نہیں۔ مگر میں پھر ویسے ہی بشاشت سے باتیں کرنے لگا اس سے ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ پکے نمازی ہو گئے پھر وہ ہمارے ضلع میں پولیس کے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے تھے اور وطن میں مجھ سے ملے تھے مجھ سے یہ بھی کہا میرا جی چاہتا ہے کہ تمہارے پیچھے نماز پڑھوں اس وقت نماز ایک دوسرے امام پڑھاتے تھے میں نے ان سے اجازت لے لی کیونکہ وہ تو دراصل میرے ہی نائب تھے تو کہنے کا بھی طریقہ ہوتا ہے کہنا کبھی

صریح ہوتا ہے کبھی تدبیر سے موقع محل کا خیال کرنا چاہیے مگر فکر کہنے کی ہو۔ اگر اسی دھن میں لگے رہو تو یہ طریقے بھی معلوم کرنے کا شوق ہوگا مگر یہاں تو یہ فکر ہی نہیں بلکہ اپنی خیر منائی جاتی ہے اور نصیحت کریں گے بھی تو برے طریقہ سے جیسے دوسرے کے سر پر کلہاڑی ماردی جاوے اس کی بھی پرواہ نہیں کہ کس طرح کہنے سے فائدہ ہوگا؟ کیوں کہ نصیحت کے بھی اقسام ہیں کبھی نصیحت قالی ہوتی ہے کبھی حالی مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ تفسیر زباں روشن گرست لیک عشق بے زباں روشن ترست

اگر چہ زبان کا بیان روشن گر ہے لیکن عشق بے زبان زیادہ روشن ہے۔ (الاتمام لنعمۃ الاسلام ج ۱۲)

نور علم

قلب میں نور ہونا شرط ہے اور وہی نور علم ہے حقیقت میں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

شکوت الیٰ وکیع سوء حفظی فاوصانی الیٰ ترک المعاصی
فان العلم فضل من اللہ وفضل اللہ لا یعطیٰ العاصی

میں نے حضرت وکیعؒ سے سوء حافظہ کی شکایت کی۔ انہوں نے مجھے گناہوں کے چھوڑنے کی نصیحت کی پس علم اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہے جو گناہگار کو عطا نہیں ہوتا۔

پس علم وہ ہے جو گناہ کرنے سے زائل ہو جاتا ہے اور گنہگار کو حاصل نہیں ہوتا۔ اگر محض الفاظ دانی کا نام علم ہوتا تو وہ معاصی کے ساتھ بھی جمع ہو جاتا ہے بلکہ کفر کے ساتھ بھی ورنہ بیروت اور جرمن میں عیسائی عربی کے ادیب کیسے ہوتے۔ ان کا حافظہ بھی قوی ہے ذہن بھی تیز ہے۔

پس معلوم ہوا کہ علم اس کا نام نہیں ہے حقیقت میں علم کی حقیقت نور ہے جس کی نسبت قرآن میں ہے قد جاء کم من اللہ نور و کتاب مبین (تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور ایک کتاب واضح) اسی کو روح بھی فرمایا ہے وایدھم بروح منہ۔ (اور ان کو اپنے فیض سے قوت دی ہے) بس حقیقت میں یہی چیز علم ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے کتابیں زیادہ نہیں پڑھی تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے قلب میں ایک نور بخشا تھا کہ جس چیز کو بیان فرماتے تھے۔ بالکل صحیح فرماتے تھے اور اب کسی کو کتنا ہی تبحر ہو جاوے مگر وہ علم نصیب نہیں جو امام صاحب کو حاصل تھا۔ اس حالت میں اگر کوئی کہنے لگے کہ میں ابو حنیفہؒ سے علم میں زیادہ ہوں تو وہ جاہل ہے۔ اس کو حقیقت معلوم نہیں کہ علم کہتے ہیں کس کو۔ عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند　　ہزار نکتہ باریک تر ز مو اینجاست
نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند　　نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

ہر وہ شخص جو اپنے چہرہ کو روشن کرے ضروری نہیں کہ وہ دلبری بھی جانتا ہو ہر وہ شخص جو آئینہ رکھتا ہو ضروری نہیں۔ اس میں بال سے زیادہ باریک نکات ہیں ہر وہ شخص جو سر منڈاتا ہو ضروری نہیں کہ وہ دلبری بھی جانتا ہو۔ (الاتمام لنعمة الاسلام ج ۱۲)

حفاظت دین کا نظام

خدا نے اپنے دین کی حفاظت خود کی ہے حدیث میں ہے **لایزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق منصورین لا یضرهم من خذلهم** (سنن ابن ماجة: 10) کہ اس امت میں ہمیشہ ایک گروہ حق پر قائم رہ کر اہل باطل پر غالب رہے گا ان کا مقابلہ کوئی نہ کر سکے گا اس لئے تحریف محرفین سے کچھ ضرر دین کو نہیں پہنچتا حدیث میں طائفہ کا جو لفظ آیا ہے غالباً اشارہ اس طرف ہے کہ وہ جماعت قلیل ہوگی مگر موید من اللہ ہوگی خدا کی طرف سے اس کی تائید ہوگی اگر کوئی ان کا ساتھ نہ دے تو ان کو کچھ ضرر نہ ہوگا بلکہ ان کی منصوریت کی شان یہ ہوگی کہ اگر کوئی ان کی مخالفت کرے وہ خود مخذول ہوگا خاذل تو کیا ہوتا عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں۔

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات　　بادرد کشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

اس دیر مکافات میں بہت تجربہ ہم نے کیا ہے کہ جو شخص اہل اللہ سے الجھا ہلاک ہوگیا۔

اور مولانا فرماتے ہیں۔

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد　　تا دل صاحب دلے نامد بدرد

کسی قوم نے اس وقت تک اللہ تعالیٰ کو ناراض نہیں کیا جب تک انہوں نے کسی ولی اللہ کو اذیت نہ پہنچائی۔

ان کی یہ شان ہے ان کی منصوریت کا یہ اثر ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے **من عادیٰ لی ولیاً فقد اذنته بالحرب** (السنن الکبریٰ للبیہقی 346:3) کہ جو ہمارے کسی ولی سے عداوت کرے ہم اس کو اعلان جنگ سناتے ہیں۔ لڑائی کا الٹی میٹم دیتے ہیں۔ پھر کیا خدا کا کوئی مقابلہ کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ غرض وہ اتنے قوی ہوتے ہیں۔ ظاہر میں تو بہت پست اور ضعیف مگر باطن میں بڑے رفیع اور قوی۔ مولنا اسی اثر کو فرماتے ہیں۔

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید
ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے جنات اور انسان اور جو بھی اسے دیکھتے ہیں اس سے ڈرتے ہیں۔ (الاتمام لنعمۃ الاسلام ج ۱۲)

تہذیب اخلاق کا شرعی نظام

حکماء نے بھی اقرار کیا ہے کہ تہذیب اخلاق جیسی شریعت نے کی ہے اس کے بعد کسی اور بیان کی ضرورت نہیں رہی چنانچہ مشاہدہ ہے حکماء کی کتابوں کو دیکھئے پھر قرآن وحدیث کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ تہذیب اخلاق میں شریعت نے اس قدر تدقیق کی ہے کہ حکماء اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے چنانچہ شریعت میں طلب رضاء کی بھی تعلیم ہے جس کو فلاسفہ نے چھوا بھی نہیں۔ یہ رضا جڑ ہے سارے اخلاق کی اور جس کا ایک بین اور نقد نفع تو یہ ہے کہ جو خدا سے ہر حال میں راضی ہوگا اس کو کبھی پریشانی اور ناگواری نہ ہوگی۔

یہ کتنی راحت ہے اس سے بڑھ کر اور کیا راحت ہوگی جیسا مشاہدہ سے معلوم ہوسکتا ہے کہ صاحب شریعت کو ہر چیز میں راحت ہے۔

حضرت بہلول نے کسی بزرگ سے دریافت کیا کہئے کیا حالت ہے کہا اس شخص کی حالت کیا پوچھتے ہو کہ دنیا میں اس کی خواہش کے خلاف کوئی کام نہیں ہوتا ظاہر ہے کہ وہ ہر وقت خوش رہیگا یہی میری حالت ہے حضرت بہلول نے کہا یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ کوئی ایسا شخص ہو کہ کوئی بات اس کے خواہش کے خلاف نہ ہو۔ فرمایا یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی کام بلا ارادہ حق نہیں ہوتا ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے مشیت ایزدی سے ہوتا ہے پس اگر کسی نے اپنے ارادے کو خدا کے ارادے میں فنا کردیا ہو تو جو کام خدا کی مشیت وارادہ کے موافق ہوگا وہ اس کے ارادہ خواہش کے موافق بھی ہوگا مثلاً یہ شخص بیمار ہوا اور معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کا یہی ارادہ ہے تو یہی اس شخص کی بھی۔۔۔ مرضی ہوگی یعنی وہ یہ سمجھے گا کہ اگر ہمارا بیمار ہونا خدا کو پسند ہے تو ہم کو بھی پسند ہے اس لئے کوئی کام دنیا میں اس شخص کی مرضی کے خلاف نہیں ہوگا یہ ہے رضاء کی تعلیم جس میں بے شمار منافع ہیں۔

پھر شریعت نے اس میں بھی ایک دقیقہ رکھا ہے وہ یہ کہ رضاء کے اختیار کرنے میں بھی دو طرح کی نیت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ رضا اختیار کرنے سے راحت حاصل ہوتی ہے، حکمائے شریعت کہتے ہیں کہ یہ درجہ طلب رضا کا خفی شرک ہے کیونکہ یہ شخص طالب

راحت ہے مقصود اس کا راحت ہے اور ظاہر ہے کہ راحت خدا نہیں بلکہ غیر خدا ہے تو یہ شخص غیر خدا کا طالب ہوا۔ اور ایک اس نیت سے رضا اختیار کرتا ہے کہ بندہ کے ذمہ خدا کا یہ حق ہے کہ وہ جو حکم کر دے اس پر بندہ راضی رہے سو یہ درجہ مطلوب ہے اور یہ شخص موحد کامل ہے مومن ہے عارف ہے اب بتلائے ہے کوئی حکیم ارسطو۔ سقراط۔ بقراط اس دقیقہ کو سمجھنے والا؟ وہ تو اس گرد کو بھی نہیں پہنچے۔ (الاتمام لنعمة الاسلام ج ۱۲)

فضیلت اسلام

اسلام کی فضیلت اس درجہ کی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی بھی فضیلت نہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ فضیلت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ فضیلت ہے کہ اگر وہ حاصل نہ ہو تو ضرر کچھ نہیں یہ درجہ فضیلت استحباب کا ہے۔ ایک درجہ فضیلت کا وہ ہے کہ اگر اس کو حاصل نہ کیا جائے تو ضرر ہوتا ہے اس کا حاصل کرنا ضروری اور ترک کرنا ناجائز ہے۔ یہ فضیلت فرض کہلاتی ہے اور ایک درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے وہ یہ کہ تمام فرائض کی تحصیل کسی خاص فضیلت کی تحصیل پر موقوف ہو کہ بدون اس کے کوئی فرض ادا نہیں ہو سکتا۔ سب کی صحت اس پر موقوف ہے یہ درجہ بھی گو فضیلت فرض ہی کا ایک فرد ہے لیکن تمام افراد میں سب سے اعلیٰ ہے۔ یہ درجہ اسلام و ایمان کو حاصل ہے کہ اس کا حاصل کرنا خود بھی فرض ہے اور تمام فرائض کا موقوف علیہ بھی ہے۔ اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اسلام کی فضیلت کا کتنا بڑا درجہ ہے۔ آج کل عام طور پر مستحبات میں فرض سے زیادہ فضیلت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ نوافل و مستحبات کا جو پابند ہو، اس کی بہت تعریف کی جاتی ہے، گو وہ فرائض کو اچھی طرح بھی نہ ادا کرتا ہو اور جو شخص محض فرائض و واجبات پر اکتفا کرتا ہو مگر ان کو اچھی طرح ادا کرتا ہو، اس کی زیادہ قدر نہیں کی جاتی نہ بہت تعریف ہوتی ہے۔ یوں سمجھتے ہیں کہ اونہہ یہ کرتا ہی کیا ہے۔ مگر حقیقت اس کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرض کی فضیلت مستحبات و نوافل سے بڑھی ہوئی ہے اور ثواب بھی اسی میں زیادہ ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کی کیا فضیلت ہوگی کہ وہ ضروری ہے اور مستحب ضروری نہیں۔ تو فرض کا وہ درجہ ہے جو غذا کا درجہ ہوتا ہے اور نوافل و مستحبات کا درجہ چٹنی کے مثل ہے اور ظاہر ہے کہ غذا کو چٹنی سے زیادہ فضیلت ہے، محض چٹنی بدوں غذا کے بے سود ہے،

امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ اگر ایمان پر خاتمہ چاہتے ہو تو ہمیشہ نعمت ایمان پر خدا کا شکر

کرتے رہو۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا وعدہ ہے **لئن شکرتم لازید نکم** اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں نعمت کو بڑھاؤں گا اسے زیادہ کروں گا۔ سبحان اللہ یہ نہیں فرمایا **لئن شکرتم لا اسلبنکم یالا انقصنکم** کہ اگر شکر کرو گے تو میں نعمت سلب نہ کرونگا یا کم نہ کرونگا بلکہ لازیدنکم فرمایا جس میں زیادت کا وعدہ ہے وعدہ زیادت سے نقصان کی نفی ہوگئی اور نفی نقصان سے سلب کی نفی بدرجہ اولیٰ ہوگئی کیا بلاغت ہے کہ ایک لفظ ایسا فرمادیا جس سے نقصان وسلب دونوں کی نفی بھی ہوگئی اور ترقی کا وعدہ بھی ہوگیا۔ کوئی کلام ایسا بلیغ ہے جس کے ایک لفظ سے اتنے معانی حاصل ہوتے ہوں اگر خدا فہم دے تو قرآن کا لفظ لفظ اعجاز سے بھرا ہوا ہے جب شکر پر وعدہ زیادت ہے تو جو شخص نعمت ایمان پر شکر ادا کرتا رہے گا اس کا ایمان کبھی زائل یا کم نہ ہوگا بلکہ دن بدن بڑھتا رہے گا۔ پس یہ درد دستور العمل بنانے کے قابل ہے اگر اپنا ایمان دنیا سے سلامت لے جانا چاہتے ہو تو ایمان کا شکر کبھی نہ بھولو۔ (محاسن الاسلام ج ۱۲)

ایک اعتراض کا جواب

ایک عالم نے میرے سامنے اعتراض کیا کہ دیکھئے صاحب فلاں مولنا نے ذبیحہ گاؤ کو شعار اسلام کہہ دیا۔ میں نے کہا وہ کیا کہتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو شعار اسلام فرمایا ہے۔ کہنے لگے حضور نے کہاں فرمایا۔ میں نے کہا۔ مسلم کی روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ **من صلی صلوتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فذلک المسلم الذی له ذمة الله وذمة رسولہ الحدیث** ("موسوعة أطراف الحديث النبوی الشریف") (جو ہماری نماز پڑھے ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے اور ہمارا ذبیحہ کھائے وہ مسلمان ہے اس کیلئے اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) اس میں حضورؐ نے مسلمان کی علامتیں بیان فرمائی ہیں کہ جس شخص میں یہ علامتیں موجود ہوں۔ اس کو مسلمان سمجھنا چاہیے کہ جو ہماری نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کا استقبال کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے وہ مسلمان جس کیلئے خدا اور رسول کی پناہ وعہد ہے۔ پس جہاں آپ نے صلوٰۃ واستقبال قبلہ کو علامت اسلام قرار دیا ہے وہیں اکل ذبیحتنا بھی فرمایا ہے تو جو اعتراض آپ کو ان مولنا صاحب پر ہے کہ انہوں نے کھانے پینے کی چیز یا ایک جانور کے ذبح کو شعار اسلام کہہ دیا وہی اعتراض حدیث پر وارد ہوتا ہے کہ حضور نے صلوٰۃ واستقبال قبلہ کیساتھ اکل ذبیحہ کو کیسے بیان فرمادیا۔

شاید کوئی یہ کہے کہ اس میں تو مطلق ذبیحہ مسلم کے کھانے کو علامت اسلام بتلایا گیا ہے اس سے ذبیحہ بقر کا کھانا علامت اسلام معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس میں بقر کا لفظ وارد نہیں ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ فہیم شخص کے لئے تو ذبیحتنا ہی بقرہ پر دلالت کرنے کے لئے کافی ہے چنانچہ عنقریب آتا ہے اور بدفہم کے لئے خود لفظ بقرہ کا مذکور ہونا بھی ناکافی ہے۔

چنانچہ میرٹھ میں ایک وکیل صاحب نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اسلام میں گائے کا ذبیحہ کہیں نہیں بلکہ بکری کا ذبیحہ ثابت ہے۔ چنانچہ دیکھیے اس عید کا نام ہی بکر عید ہے۔ یعنی بکرے کی عید، اس ظالم نے بقر کو بکرے کی عربی سمجھا۔ واقعی جب ایسے ایسے ذہین دنیا میں ہونگے تو پھر ذبیحہ گاؤ کی دلیل شریعت میں کیوں ملے گی۔ اسی طرح اگر آپ بھی لفظ بقر حدیث میں ہونے کے بعد بھی تاویل کرنے لگیں تو پھر اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہوگا کہ۔

جواب جاہلاں باشد خموشی (محاسن الاسلام ج ۱۲)

اہل اسلام کا ترقی کا راستہ

مسلمان کبھی دوسری قوموں کا اتباع کر کے ترقی نہیں کرسکتا اگر وہ مسلمان ہے۔ مسلمان کی ساری عزت اسی میں ہے کہ وہ اپنے طریقہ پر قائم رہے اور کسی حال میں احکام شریعت سے تجاوز نہ کرے۔ اسی سے فلاح ہوتی ہے گو سامان کم ہو اور اس کے خلاف میں فلاح نہیں گو سامان زیادہ ہو۔

دیکھیے اس کی تائید میں ایک باریک نکتہ بتلاتا ہوں وہ یہ کہ مسلمانوں کو مکہ میں رہتے ہوئے قتال کی اجازت نہیں ہوئی۔ مدینہ میں پہنچ کر اجازت ہوئی۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ ظاہر میں یہ سمجھتے ہیں کہ قلت جماعت وقلت اسباب اس کا سبب تھا یہ خلاف تحقیق ہے۔ کیونکہ مدینہ ہی میں پہنچ کر کیا جماعت بڑھ گئی تھی؟ کفار کا پھر بھی غلبہ تھا۔ مدینہ کی تمام جماعت تمام عرب کے مقابلہ میں کیا چیز تھی۔ بلکہ اگر یہ دیکھا جائے کہ تمام کفار عالم کے مقابلہ میں یہ اجازت ہوئی تھی۔ تب تو مدینہ کیا سارا عرب بھی قلیل تھا۔ اسی طرح مدینہ پہنچ کر سامان میں کیا زیادتی ہوگئی تھی۔ کفار ہمیشہ نہایت ساز وسامان سے مقابلہ کرتے تھے اور مسلمانان مدینہ کی یہ حالت تھی کہ بعض مواقع میں ایک ایک سواری میں سات آٹھ آدمی شریک ہوتے تھے بعض دفعہ چند آدمیوں میں ایک ہتھیار مشترک ہوتا تھا پس یہ کہنا بالکل واقع کے خلاف ہے کہ مدینہ

میں جا کر جماعت وسامان کی زیادت اس اجازت کا سبب ہوئی۔ نصوص سے خود معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کفار کے مقابلہ میں اکثر مواقع میں اس قدر کم ہوتی تھی کہ ملائکہ کا جوڑ لگایا جاتا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے **وانزل جنود الم تروھا** (اور لشکروں کو اتارا جس کو تم نے نہیں دیکھا) اور ارشاد ہے **بلی ان تصبرو اوتتقوا ویاتوکم من فورھم ھذا یمددکم ربکم بجمسة الاف من الملئکة مسومین** (ہاں کیوں نہیں اگر مستقل رہو گے اور متقی رہو گے اور وہ لوگ تم پر ایک دم سے پہنچیں گے تو تمہارا رب تمہاری امداد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو خاص وصف بنائے ہوں گے) اور یہ صورت ملائکہ کی مکہ میں رہتے ہوئے بھی ممکن تھی مگر پھر بھی اس صورت کو اختیار کر کے وہاں اجازت نہ دی گئی تو اس کی کوئی اور وجہ بتلانی چاہیے۔ اہل ظاہر اس کی شافی وجہ نہیں بتلا سکتے۔

محققین نے فرمایا ہے کہ اصل بات یہ تھی کہ مکہ میں عام مسلمانوں کے اندر اخلاق حمیدہ اخلاص وصبر وتقویٰ کامل طور پر راسخ نہ ہوئے تھے۔ اس وقت اگر اجازت قتال کی ہو جاتی تو سارا مقابلہ جوش غضب وانتقام للنفس کے لئے ہوتا محض اخلاص واعلاء کلمۃ اللہ کیلئے نہ ہوتا اور اس حالت میں وہ اس قابل نہ ہوتے کہ ملائکہ کی جماعت سے ان کی امداد کیجاوے اور حمایت الٰہی ان کے شامل حال ہو۔ چنانچہ آیت مذکورہ میں **بلی ان تصبروا وتتقوا** (ہاں کیوں نہیں اگر مستقل مزاج اور متقی رہو گے) کی شرط بتلا رہی ہے کہ حمایت الٰہی اسی وقت متوجہ ہوتی ہے جب کہ مسلمان صبر وتقویٰ میں راسخ ہوں (اور تقویٰ کے معنی ہیں احتراز عما نہی اللہ عنہ وامتثال ما امر بہ جس میں اخلاص اور احتراز عن الریاء وعن شائبۃ النفس بھی داخل ہے ۱۲ جامع اور مدینہ میں پہنچ کر یہ اخلاق راسخ ہوگئے تھے مہاجرین کو مکہ میں رہنے کی حالت میں کفار کی ایذاء پر صبر کرنے سے نفس کی مقاومت سہل ہوگئی نیز قوت غضب نفسانی ضعیف بلکہ زائل ہوگئی تھی۔ پھر ہجرت کے وقت جب انہوں نے اپنے وطن واہل وعیال ومال ودولت سب پر خاک ڈال دی تو ان کی محبت الٰہی کامل ہوگئی اور

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو تیری خنجر آزمائی کیلئے دوستوں کا سر سلامت رہے۔

اور اس میں راز یہ ہے کہ اہل اللہ نے ایک سے تعلق جوڑ لیا ہے بس ان کو اگر خوف ہے تو اسی کا ہے۔ امید بھی ہے تو اسی سے ہے۔ اس لئے ہر حال میں وہ خوش رہتے ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے واقعہ میں وہ خلاف حق کچھ نہیں کرتے چاہے کام ہو یا نہ ہو۔ (محاسن الاسلام ج ۱۲)

استقبال قبلہ کا راز

استقبال قبلہ کا راز یہ ہے کہ عبادت کی روح دل جمعی اور یک سوئی ہے۔ بدوں یکسوئی اور دل جمعی کے عبادت کی صورت ہوتی ہے روح نہیں پائی جاتی اور یہ ایسی بات ہے جس کو تمام اہل ادیان تسلیم کرتے ہیں اب سمجھئے کہ اجتماع خواطر میں اجتماع ظواہر کو بہت بڑا دخل ہے۔ اسی لئے نماز میں سکون اعضاء کا امر ہے۔ التفات و عبث سے ممانعت ہے۔ صف کے سیدھا کرنے کا امر ہے۔ کیونکہ صف کو ٹیڑھا کرنے سے قلب پریشان ہوتا ہے۔ عام قلوب کو اس کا احساس کم ہوگا کیونکہ ان کو دل جمعی اور یک سوئی بہت کم نصیب ہے مگر جن کو نماز میں دل جمعی کی دولت نصیب ہے ان سے پوچھئے کہ صف ٹیڑھی ہونے سے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے۔ صوفیہ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ صف غیر منظم سے قلب کو خلجان و پریشانی ہوتی ہے اس دل جمعی کے لئے سجدہ گاہ پر نظر جمانے کی تاکید ہے کیونکہ جگہ جگہ نظر گھمانے سے بھی قلب کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی۔ اور یہی اصل ہے تمام اشغال صوفیہ کی جو مراقبات و اشغال تعلیم کرتے ہیں۔ ان سے محض یہی یک سوئی و جمعیت قلب پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔

ہمارے حضرتؒ کے پاس ایک بڈھا آیا کہ حضرت دعا فرما دیجئے کہ بیوی بہت بیمار ہے جاں بلب ہے تندرست ہو جاوے۔ فرمایا کہ بھائی مرتی ہے، مرنے دو خدا کا شکر کرو کہ ایک مسلمان جیل خانہ سے چھوٹتا ہے۔ جہاں وہ جاتی ہے تم بھی پہنچ جاؤ گے میں نے کہا لو! بڑے میاں آئے تھے بیوی کو بچانے اپنے مرنے کی بھی بشارت لے چلے۔ لو اور آؤ دعا کرانے۔ پھر کہنے لگا حضرتؒ اگر وہ مر جائے گی تو میری روٹی کون پکائے گا فرمایا ہاجی وہ ماں کے پیٹ سے روٹی ہی پکاتی تو آئی تھی۔ اللہ اکبر ہر امر میں حقیقت پر نظر تھی غرض جب نظر معرفت کی کامل ہو جائے گی پھر پریشان ہو اس کی بلا بہر حال یہ آثار تھے تعلق کے اور بے تعلقی کے کہ بے تعلقی سے دونوں جہان کی مصیبتیں وابستہ ہیں افسوس ہے کہ اس کے بعد بھی ہم کو فکر نہ ہو۔ (احسان اسلام ج ۱۲)

حقیقت اسلام

اسلام تعلق مع اللہ کا نام ہے اور مَنْ اَسْلَمَ (جس نے سپرد کیا) سے یہی مقصود ہے پس اس حقیقت پر اگر مفصل نظر کرو تو اب معلوم ہوگا کہ اسلام کیسی حسین چیز ہے اسلام وہ چیز ہے کہ

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

(سر سے پیر تک جس جگہ نظر کرتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے۔) خدا کی قسم جس پہلو سے لو نہایت راحت بخش اور مصالح کی رعایت کرنے والا مذہب ہے میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اس کی تعریف کرسکوں۔

قلم بشکن سیاہی ریز وکاغذ سوز و دم درکش   حسن ایں قصہ عشق است در دفتر نمی گنجد

(قلم توڑ سیاہی کو پھینک کاغذ کو جلا اور خاموش رہ اے حسن یہ عشق کا قصہ ہے دفتر میں نہیں سما سکتا) کسی محقق کے پاس چند روز رہ لو اس وقت آنکھیں کھلیں کہ اسلام کیا چیز ہے اسلام وہ مذہب ہے جس نے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں تک کی تعلیم دی ہے کہ جب تین آدمی کسی مجلس میں بیٹھے ہوں تو دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں کہ تیسرے کی دلشکنی ہوگی وہ سمجھے گا کہ بس مجھ سے مخفی رکھتا ہے ہاں جب چار ہو جائیں تو کچھ حرج نہیں کہ وہ دونوں بھی سرگوشی کرسکتے ہیں اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ شاید دوسرے سے مخفی رکھتا ہو اور لیجئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صحابی حاضر ہوئے آواز دی آپ نے پوچھا مَن کون ہے انہوں نے کہا اَنَا میں ہوں آپ نے فرمایا اَنَا اَنَا میں میں یہ بھی کوئی جواب ہوا۔ کتنی معقول بات فرمائی پہلی آواز سے آپ نے نہیں پہچانا۔ اس لئے پوچھا کہ کون ہے اس کے جواب میں میں ہوں کہنا غلطی ہے اس واسطے کہ اس سے مزید پتہ نہ معلوم ہوا جو آواز پہلے معلوئی ہوئی تھی وہی اب بھی معلوم ہوئی اگر آواز سے پہچانتے تو پہلے ہی پہچان لیتے اور یہاں تک تعلیم فرمائی کہ قانون بتلا دیا جب کسی کے گھر جاؤ تو پہلے دروازہ پر اجازت لے لو کہ السلام علیکم فلاں حاضر ہوا اگر جواب نہ آوے پھر اجازت مانگو پھر کہو تیسری بار اجازت مانگو تین دفعہ کے بعد بھی اگر کوئی نہ آوے نہ جواب دے تو لوٹ جاؤ شکایت مت کرو برا مت مانو کتنی اچھی تعلیم فرمائی ہے باب اخلاق کا خلاصہ یہ ہے

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد   کسے را با کسے کارے نباشد

(وہ جگہ بہشت ہے جہاں کوئی تکلیف نہ ہو کسی کو کسی سے تنگی ہو۔) (احسان الاسلام ج ۱۲)

علوم کشفیہ کا مطالعہ:

میں محقق ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ محض شفقت کی بناء پر کہتا ہوں کہ میرا عمر بھر کا تجربہ یہ ہے کہ علوم کشفیہ کا مطالعہ مضر ہے ان کا مطالعہ کبھی نہ کرے نہ ان کی تحقیق کے درپے ہو۔ ہاں اجمالاً اہل کشف کی بزرگی کا معتقد رہے اور اجمالاً ان کی تصدیق بھی کرے۔ مگر تفصیل کی فکر میں نہ پڑے۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو بڑے رتبہ کے ہیں وہ تو بے دھڑک فرماتے ہیں۔ کہ شیخ اکبر از مقبولان الٰہی نظر می آید مگر علوم او نا مقبول اند (شیخ اکبر مقبولان الٰہی میں سے معلوم ہوتے ہیں مگر ان کے علوم نا مقبول ہیں) مگر مشکل ہماری ہے کہ ہم شیخ کی باتوں کو نامقبول کیسے کہیں ہمارا تو یہ رتبہ نہیں۔ سو الحمدللہ کچھ دن ہوئے ہیں کہ اس اشکال کا جواب سمجھ میں آ گیا۔ مگر ایک مسئلہ سمجھ میں آ جانے کے بھروسہ دوسرے مسائل کا مطالعہ یہ سمجھ کر نہ کرنا چاہیے کہ ہم کو تو دامن چھڑانا آتا ہے کیونکہ بعض دفعہ ایسا خار لگتا ہے کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے وہ دامن کو بھی پھاڑ کے رکھ دیتا ہے اور خود نہیں نکلتا۔ دیکھو اگر ایک شخص کو نگاہ نیچی کر لینے کی مشق ہے تو اس کو یہ تو مناسب نہیں کہ اس کے بھروسہ خود قصد کر کے بازار میں ایسی جگہ کو نکلا کرے جہاں بازاری عورتوں کا مجمع رہتا ہے۔

صاحبو! بہتر تو یہی ہے کہ بازار ہی میں نہ جائیے تا کہ کوئی عورت نظر ہی نہ پڑے ورنہ کبھی تو ایسی نظر پڑے گی کہ یہ ساری مشق رکھی رہ جائے گی۔ تم ہزار نگاہ نیچی کرنا چاہو گے وہ پھر اوپر کو آنکھ اٹھاوے گی اور نگاہ نیچی کر بھی لی تو ایک بار کی نظر سے بعض دفعہ دل پر ایسا تیر لگتا ہے کہ عمر بھر دل سے نہیں نکلتا۔ پھر یوں کہو گے۔

درون سینہ من زخم بے نشان زدۂ   بحیرتم چہ عجب تیر بے کمان زدہ

(تو نے میرے سینہ میں بے نشان زخم مارا ہے۔ حیرت ہے کہ کیا عجیب تیر بلا کمان کے مارا ہے۔)

اسلئے اہل تجربہ کا قول ہے راہ راست رو اگر چہ دور است (سیدھے راستہ پر چلو اگر چہ دور ہو۔)

اس قول پر اہل اقلیدس کو شبہ ہوا ہے کہ خط مستقیم تو بوجہ اقصر الخطوط الواصلہ بین النقطتین (دو نقطوں کے درمیان جو خطوط ہیں ان سب سے چھوٹے خط کو خط مستقیم کہتے ہیں) ہونے کے اقرب الطرق (راستوں میں قریب تر) ہوگا۔ وہ دور کیونکر ہو سکتا ہے؟ اسی خرابی کا نتیجہ ہے کہ محاورات کو تدقیقات پر محمول کرنے لگے۔ محاورہ میں راہ راست کہتے ہیں راہ بے خطر کو۔

مطلب یہ ہے کہ جس راستہ میں خطرہ نہ ہو۔ اس کو اختیار کرو اگرچہ دور ہی کیوں نہ ہو۔ اب کچھ شبہ نہیں پس علوم کشفیہ کا مطالعہ ہرگز نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ خطرہ سے خالی نہیں۔ بلکہ صرف علوم معاملہ کا مطالعہ کرے کہ وہ بے خطر ہیں۔ اور میں نے وہ قول کشف صحیح کے مامون عن التلبیس ہونے کا قصداً نہیں دیکھا تھا بلکہ نظر سے گذر گیا اور آفت آ گئی اور کہیں حاشیہ یا شرح میں اس کا حل بھی نہ تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ باوجود کسی شخص کی عدم اعانت کے اشکال حل ہو گیا۔

وہ حل یہ ہے کہ ہم نے مانا کہ صاحب کشف صحیح تلبیس سے مامون ہو جاتا ہے لیکن باوجود امن عن التلبیس کے حجت شرعیہ اس کو لازم نہیں۔ کیونکہ ایسی نظائر موجود ہیں جہاں باوجود امن عن التلبیس کے شرعاً ایک شئے حجت نہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ابصار بالنظر گو اکثر اوقات مامون عن التلبیس ہے۔ جس کی نگاہ درست ہو اس کا ابصار عموماً غلطی نہیں کرتا۔ مگر پھر بھی وہ شرعاً حجت نہیں۔ نہ اس کے مقتضاء پر اعتقاد واجب ہے نہ اس کے خلاف کا احتمال گناہ ہے۔ مثلاً ہم کو چاند سورج سے چھوٹا نظر آتا ہے مگر اس پر اعتقاد لازم نہیں۔ ممکن ہے کہ واقع میں بڑا ہو اور ہم کو چھوٹا نظر آتا ہو۔ ہاں وہ مواقع مستثنٰی ہیں جن میں شریعت نے ابصار کو حجت مانا ہے۔ جیسے رویت ہلال وغیرہ اس نظیر کا ذہن میں آنا تھا کہ بادل سا پھٹا اور اشکال کی ظلمت رفع ہو کر دل میں نور چمکا اور حق تعالیٰ کا بار بار شکر ادا کیا ورنہ دل پر پہاڑ سا رکھا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر پہاڑ پر یہ ثقل ہوتا تو پھٹ جاتا۔ بس خطرات میں قصداً پڑ کر پھر نکلنا یہ عقلمندی نہیں، بلکہ سلامتی اسی میں ہے کہ خطرات کے پاس نہ جاؤ۔ (الدوام علی الاسلام والاعتصام بالانعام ج ۱۲)

اطمینان و تشفی کا راستہ

میں بقسم کہتا ہوں کہ اطمینان اور تسلی اسی سے ہوتی ہے کہ میں اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بلا دلیل مانتا ہوں۔ اسرار اور حکم کے درپے ہونے سے پوری تسلی نہیں ہوتی۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے معقولی اور فلسفی ہیں۔ متکلم بھی بڑے درجے کے ہیں۔ اخیر عمر میں اپنی عمر بھر کا تجربہ بیان کرتے ہیں۔

نِهَايَةُ اَقْدَامِ الْعُقُوْلِ عِقَالُ وَلَمْ نَسْتَفِدْ مِنْ بَحْثِنَا طُوْلَ عُمْرِنَا
وَغَايَةُ سَعْيِ الْعَالَمِيْنَ ضَلَال سِوٰى اَنْ جَمَعْنَا فِيْهِ قِيْلَ يُقَال

(دنیا والوں کی کوشش کا خلاصہ ضلال ثابت ہوا بجز بک بک اور قیل قال کے کچھ حاصل نہ ہوا عمر یوں ہی ضائع کی)

کہ ہم کو عمر بھر کی بحث سے سوائے قیل وقال کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ان ہی امام رازی کا قصہ سنا گیا ہے کہ یہ شیخ نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے گئے تھے۔ شیخ نے بیعت کیا۔ اور ذکر وشغل تعلیم کر کے ایک حجرہ میں رہنے کا امر کیا یہ ذکر وشغل میں مصروف ہو گئے تو چند روز کے بعد یہ محسوس ہوا کہ دل میں سے کوئی چیز نکل کر بھاگی جارہی ہے شیخ سے عرض کیا فرمایا یہ آپ کا منطق وفلسفہ ہے جو قلب سے نکل رہا ہے۔ انہوں نے کہا حضرت میں نے تو اس کو بڑی محنت سے حاصل کیا تھا اس کا قلب سے محو ہونا تو مجھے گوارا نہیں۔ فرمایا اس کے عوض تم کو حق تعالیٰ دوسرے علوم عطا فرمائیں گے جو حقیقی علوم ہیں اور یہ تو کتابی علم ہے وہ وہبی علم ہوگا۔

بینی اندر خود علوم انبیاء   بے کتاب و بے معید و اوستا

(بے کتاب و بے مددگار واستاد کے اپنے اندر انبیاء جیسے علوم پاؤ گے)

مگر امام رازی کو گوارا نہ ہوا۔ شیخ نے کہا پھر تمہیں اختیار ہے چنانچہ یہ ذکر وشغل چھوڑ کر درس وتدریس میں مشغول ہو گئے۔ اتفاق سے شیخ کی زندگی ہی میں امام کی وفات کا وقت آ گیا اور نزع کی حالت میں شیطان ان کے پاس آیا اور کہا تم دنیا سے جارہے ہو توحید بھی سالم لے چلے ہو کہا ہاں الحمد للہ میری توحید سالم ہے۔ شیطان نے کہا ذرا مجھے تو بتلاؤ تمہارے پاس توحید کی کیا دلیل ہے۔ امام رازی نے کتاب التوحید میں توحید کے سو دلائل لکھے تھے وہ بیان کرنا شروع کئے اور شیطان کم بخت نے ایک ایک دلیل کو توڑنا شروع کیا یہاں تک کہ ان کے تمام دلائل کو توڑ دیا۔ اب تو امام رازی کا رنگ فق ہو گیا۔ شیطان نے کہا کہ یہ تو آپ کی توحید کا حال تھا جو رکن اعظم اسلام ہے۔ جس میں آپ جہل مرکب کے اندر مبتلا تھے۔ اس پر دوسرے مسائل کو بھی قیاس کرلو۔ یہ واقعہ شیخ نجم الدین کبریٰ کو منکشف ہو گیا۔ اس وقت شیخ وضوء کر رہے تھے۔ امام رازی کی پریشانی دیکھ کر شیخ گھبرا گئے اور فرمایا کہ اس وقت ایک بہت بڑے عالم کا ایمان خطرہ میں ہے۔ ایک خادم جو حضرت کو وضوء کرا رہا تھا بولا کہ حضرت پھر آپ دستگیری فرمایئے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی جگہ سے ایک چلو پانی امام رازی کی طرف پھینکا۔ حالانکہ وہ بہت دور دراز فاصلہ پر تھے مگر شیخ کی کرامت تھی کہ حق تعالیٰ نے وہ چلو بھر

پانی امام رازی کے منہ پر پہنچا دیا جس سے ان کے حواس بجا ہوئے۔ پھر شیخ نے کہا کہ شیطان سے یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ "نامعقول میں بلا دلیل خدا کو واحد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا رسول صلی اللہ علیہ وسلم مانتا ہوں" بطور کرامت ہی کے یہ آواز بھی ان کے کان میں پہنچی۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کو جمعہ کا خطبہ پڑھتے ہوئے منکشف ہوا کہ لشکر اسلام دشمن کے نرغہ میں ہے اور دشمن غالب ہوا چاہتا ہے، تو آپ نے خطبہ ہی میں جوش سے فرمایا

یَاسَا رِیَۃُ الْجَبَل یَاسَارِیَۃُ الْجَبَل کہ اے ساریہ (یہ سردار لشکر کا نام ہے) پہاڑ کی پناہ اور حق تعالیٰ نے یہ آواز مدینہ سے لشکر اسلام میں پہنچا دی جو اس وقت شام یا عراق میں تھا اور حضرت ساریہؓ نے حضرت عمرؓ کی آواز سن کر پہاڑی مورچہ پر قبضہ کر لیا جس کے بعد دشمن کی فوج کے حوصلے پست ہو گئے اور لشکر اسلام کو فتح ہوئی۔ ایسا ہی یہاں ہوا اور امام رازی نے شیطان کو بھی جواب دیا کہ "او نامعقول میں بلا دلیل کے خدا کو واحد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا رسول صلی اللہ علیہ وسلم مانتا ہوں" یہ جواب دینا تھا کہ شیطان دم دبا کر بھاگا اور حضرت شیخ نے خادم کو بشارت دی کہ الحمد للہ امام رازی شیطان کے جال سے نکل گئے۔

دست پیر از غائباں کوتاہ نیست دست او جز قبضہ اللہ نیست

(پیر کا ہاتھ (توجہ) غائبوں سے کوتاہ نہیں ہے۔ اس کا سوائے اللہ کے دوسرے کے قبضہ میں نہیں ہے۔)

اس میں علم غیب کا دعویٰ نہیں ہے کہ پیروں کو (معاذ اللہ) مریدوں کا حال ہمیشہ معلوم ہو جاتا ہے بلکہ بات یہ ہے کہ یہ حضرات مقبولان الٰہی ہیں تو جو ان سے وابستہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو محروم نہیں رکھنا چاہتے۔ جس کے طرق مختلف ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک طریق یہ بھی ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ ان مشائخ کو کشف کے ذریعے سے اطلاع دے دیتے ہیں اور ان کو حکم دیتے ہیں کہ اس شخص کی امداد کرو اور کبھی شیخ کو اطلاع بھی نہیں ہوتی۔ کوئی لطیفہ غیبی شیخ کی صورت میں آ کر مدد کر جاتا ہے۔ بس اصل یہ ہے کہ اگر ابتلاء اللہ کی طرف سے وارد ہے تو لطفاً انہی کی طرف سے درمان بھی ہے۔ (الدوام علی الاسلام والاعتصام بالانعام ج ۱۲)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ

حضرت حذیفہؓ صاحب سر یعنی حضور کے راز دار کہلاتے تھے۔ ان کو حضورؐ نے بتلا دیا

تھا کہ فلاں فلاں شخص کا خاتمہ کفر پر ہونے والا ہے گو یہ زبان سے اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر دل میں ان کے اسلام نہیں ہے اور جس طرح حضورؐ نے عام طور سے اس کو ظاہر نہیں کیا تھا اسی طرح حضرت حذیفہؓ نے بھی اس کو راز میں رکھا اور کسی پر ظاہر نہیں کیا اور یوں فرمایا کرتے تھے کہ مجھے وہ باتیں معلوم ہیں کہ اگر میں زبان سے نکالوں لقطع هٰذَا الْبُلْعُوْمُ یعنی میرا گلا کاٹ دیا جائے مطلب یہ ہے کہ ایسوں کی حالت مجھے معلوم ہے جن کی نسبت کسی کو بھی برا خیال نہیں ہو سکتا۔ اگر میں زبان سے نکال بیٹھوں تو لوگ میرے ہی دشمن ہو جائیں اور میرا گلا کاٹ دیں۔ (الاسلام الحقیقی ج ۲)

خشیت صحابہؓ:

صحابہ کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ ان کو یہ بات معلوم ہے اس وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ جب کوئی جنازہ آتا تو یہ دیکھ لیتے کہ اسکے ساتھ حضرت حذیفہؓ بھی ہیں یا نہیں اگر حضرت حذیفہؓ نہ ہوتے تو حضرت عمرؓ بھی اس کی نماز میں شریک نہ ہوتے اس خیال سے کہ حضرت حذیفہؓ کا بدوں عذر شریک نہ ہونا خالی از علت نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص بھی شاید ان ہی میں سے ہے جن کا خاتمہ ایمان پر ہونے والا نہ تھا اور حضرت عمرؓ کی خشیت دیکھئے کہ باوجودیکہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور ان کا تقویٰ طہارت علم سب کو معلوم ہے مگر خوف کی یہ حالت تھی کہ کبھی کبھی حضرت حذیفہؓ سے پوچھتے کہ سچ بتانا کہ میرا نام تو اس میں نہیں لیا گیا جن کی نسبت منافق ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ یہ حضرت عمرؓ کی خشیت تھی ورنہ یہ تھوڑا ہی تھا کہ حضرت عمرؓ کو حدیث کے سچا ہونے میں کچھ شک تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کلام میں دس آدمیوں کو نام بنام جنت کی بشارت دی تھی ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے تو حدیث نبویؐ میں یہ بشارت سننے کے بعد ان کو اپنے ایمان پر کوئی شک تھوڑا ہی ہو سکتا ہے پھر اس سوال کی وجہ کیا تھی۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ جس کو حق تعالیٰ کی عظمت وقدرت منکشف ہو جاتی ہے وہ یہ تو بخوبی سمجھ جاتا ہے کہ وہاں وعدہ خلافی نہیں ہو سکتی۔ ایک ذرا سے با اختیار حاکم کے یہاں بھی ایسا نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ احکم الحاکمین کے یہاں کہ جہاں کسی قسم کی روک ٹوک اور مجبوری ہے نہیں پھر وہاں وعدہ خلافی ہو تو کیوں ہو مگر عظمت وقدرت پر نظر ہونے سے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اگر وہ وعدہ پورا نہ کریں تو کسی کا کیا اجارہ ہے وعدہ کرنے سے قدرت سلب نہیں ہو گئی پس جیسا کہ

وعدہ پورا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں اسی طرح قدرت کو کام میں لانے سے بھی تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے یہ خیال ان کی جان کو گھلا دیتا ہے۔ اور اس وقت جو آثار بھی خشیت کے ان پر ظاہر ہوں تو کچھ تعجب نہیں۔ حضرت عمرؓ جیسے کامل الایمان ہیں۔ سب جانتے ہیں کیا ان کو حدیث کی بشارت میں کچھ شک ہوسکتا ہے ہرگز نہیں مگر وہی بات ہے کہ جس وقت خشیت کا غلبہ ہوتا ہے اور قدرت پر نظر ہوتی ہے تو بشارت کا خیال بھی نہیں رہتا۔ (الاسلام الحقیقی ج ۱۲)

ضعیف ترین ایمان:

حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جب شفاعت کی اجازت ہوگی تو سب علی قدر مراتب شفاعت کریں گے۔ انبیاء علیہم السلام بھی کریں گے اور امتی بھی، جب سب کی شفاعت ختم ہوجاوے گی تو حق تعالیٰ فرمادیں گے کہ انبیاء بھی شفاعت کر چکے اور ملائکہ بھی کر چکے اب ارحم الراحمین باقی ہیں۔ یہ فرما کر دو ہتڑ بھر کر دوزخیوں کو جنت میں داخل کردیں گے۔ (اللہ میاں کی دو ہتڑ خدا جانے کتنی ہوگی اس سے یہاں بحث کرنا نہیں ہے کیونکہ یہ لفظ متشابہات میں سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو کچھ مراد ہو حق ہے) یہاں مقصود یہ ہے کہ حق تعالیٰ بہت سے ان دوزخیوں کو جہنم سے نکالیں گے جن کو نہ شفاعت امتیوں کی پہنچی نہ ملائکہ کی، نہ انبیاء علیہم السلام کی۔

اور اسی حدیث میں یہ لفظ بھی ہے **اخرجوا من النار من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من ایمان** (اتحاف السادۃ المتقین 139:1) یعنی انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کو یہ حکم ہوگا کہ دوزخ سے اس شخص کو بھی نکال لو جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو ان دونوں کے ملانے سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ شفاعت سے رہ گئے تھے ان میں ذرہ برابر بھی ایمان نہ ہوگا۔

تو اب اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ لوگ مومن ہوں گے یا کافر؟ اگر کافر ہوں گے تو ان کی مغفرت بعد میں بھی کیسی ہوگی کیونکہ کافر کی مغفرت ممتنع ہے اور اگر مومن ہیں تو کسی شفاعت کرنے والے نے مومنین نے یا ملائکہ نے یا کسی نبی نے کیوں شفاعت نہیں کی۔

جبکہ یہ حکم ہوا تھا کہ جن کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے ان کو بھی نکال لیا جاوے۔

اس اشکال کا جواب یہی ہے کہ یہ شق تو باطل ہے کہ وہ کفار ہوں کیونکہ کافر کی بخشش نہیں ہوسکتی بلکہ وہ مومن ہی ہونگے لیکن ان کا ایمان اتنا ضعیف اور اس قدر مخفی ہوگا کہ انبیاء علیہم السلام کے ادراک میں بھی نہیں آئے گا حالانکہ حق تعالیٰ نے ان کو علم کامل عطا فرمایا ہے۔

خصوصاً آخرت میں کہ وہ تو مقام ہی ہے انکشاف حقائق کا مگر اس پر بھی ان حضرات کو پتہ نہ چلا۔ اتنا ذرا سا ایمان تھا کہ سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو علم نہ ہوگا غرض یہ لوگ حقیقت میں ہونگے مومن ہی لیکن ان کا ایمان اس قدر دھندلا ہوگا کہ انتہا درجہ کی تیز چشم بصیرت کے بھی ادراک میں نہ آئے گا اس سے ثابت ہوا کہ بعض کا ایمان ایسا ضعیف بھی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی اس کا پتہ چلنا مشکل ہے پھر مولویوں کو تو کیسے پتہ چل جاوے گا اور عوام تو کسی شمار ہی میں نہیں اس لئے بات بات میں کسی پر کفر کا فتویٰ لگا دینا کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟ (الاسلام الحقیقی ج ۱۲)

لفظ رب العالمین کا نکتہ:

اور دیکھئے قرآن شریف کی بھی کیا بلاغت ہے۔ اللہ اکبر۔ یہاں رب العلمین کا لفظ کیا موقع سے بڑھایا ہے جس کے معنی ہیں تمام جہاں کا پالنے والا۔ اس میں یہ بتلا دیا کہ ہما۹ے احکام میں وسوسہ بھی نہ لاؤ ہم نے ربوبیت اور تربیت کے لئے احکام مقرر کئے ہیں تم کو نقصان پہنچانا مقصود نہیں ہے ہم تم کو پرورش کرنے والے ہیں اگر کسی حکم میں کچھ تکلیف بھی معلوم ہوتی ہو۔ تو اس کی ایسی مثال ہے۔

طفل مے لرزد زنیش احتجام   مادر مشفق ازاں غم شاد کام

ایک بچے کے پھوڑا نکلتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ ماں سے زیادہ کوئی اس کے واسطے بہی خواہ اور مہربان اور مشفق نہیں ہے اپنی تکلیف کو ماں گوارا کر لے مگر بچے کی تکلیف کو گوارا نہیں کر سکتی مگر اس پھوڑے کا آپریشن اپنی آنکھوں کے سامنے کراتی ہے بچہ چیخ رہا ہے مگر وہ رحم نہیں کرتی بلکہ دل میں خوش ہوتی جاتی ہے کہ اب میرے بچے کو آرام ہوگا کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بے رحمی ہے، نہیں عین رحم ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اگر آپریشن نہ ہوگا تو یہ پھوڑا دو چند سہ چند ہو کر ناسور بن جائے گا پھر علاج بھی نہ ہو سکے گا اور ساری عمر کو زندگی تلخ ہو جائے گی۔ اس ساری عمر کی تکلیف سے بچانے کے لئے وہ بچہ کا آپریشن کراتی ہے اسی واسطے خوش ہوتی ہے تو یہ تکلیف سے بچانا رحم ہے یا بے رحمی؟

اسی طرح حق سبحانہ، تربیت کرتے ہیں کہ گناہ سے بچنے کے لئے بندوں کو احکام کی تکلیف دیتے ہیں کیوں کہ گناہ کا انجام دوزخ ہے اگر اس وقت اس سے بچنے کی تکلیف نہ دی جاوے تو آخر میں دوزخ میں جانا ہوگا اور ممکن ہے کہ ابدالآباد کی زندگی تلخ ہو جائے اس

لئے وہ ہم کو احکام کا مکلف کر کے اس تلخی سے بچاتے ہیں یا دنیا کی کوئی مصیبت نازل کر دیتے ہیں تو اس کے ذریعہ سے معاصی کا کفارہ کرتے ہیں گویا مادہ فاسدہ کا آپریشن کرتے ہیں مگر مرہم بھی اس کے ساتھ ساتھ ہے۔

دل، فدائے اوشدہ جان نیز ہم　　درداز یاراست ودرمان نیز ہم

درد دوست کی طرف سے ہے اور علاج بھی اسی کی طرف سے ہے میرا دل اس پر قربان اور جان بھی قربان ہے۔

تکلیف بھی وہی دیتے ہیں اور اس کی جزا بھی وہی دیں گے ناگوار حالت آپریشن ہے اور گوارا حالت مرہم ہے اصل مرہم تو آخرت میں ملے گا اور دنیا میں بھی تھوڑا سا مرہم ملتا ہے وہ مرہم کیا ہے دل کی راحت اور چین، جو شخص احکام الٰہی کا اتباع کرتا ہے اور گناہ سے بچتا ہے اور اپنی حالت اختیاری وغیر اختیاری کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اس کے قلب میں وہ اطمینان وراحت پیدا ہوتی ہے کہ اس کے سامنے ناگوار حالت اور مصیبت کچھ بھی اثر نہیں کر سکتی ان کے واسطے مصیبت بھی صرف صورۃً مصیبت ہوتی ہے اور حقیقت میں راحت ہوتی ہے جنہوں نے اس حقیقت کو سمجھا ان سے پوچھئے بعض وقت عین کلفت میں ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے انہی کی حالت اس طرح بیان کی گئی ہے۔ (الاسلام الحقیقی ج ۱۲)

مسلمان کی ذمہ داریاں

سو ہر شخص اپنی حالت دیکھ لے کہ شب و روز میں کتنے منٹ اور کتنا وقت اس کام کے لئے اس نے خاص کر رکھا ہے۔ یوں تو ہم میں عابدین بھی ہیں، زاہدین بھی ہیں۔ علماء بھی ہیں، طلباء بھی ہیں، غرض طرح طرح سے دین کی خدمتیں کی جارہی ہیں اور ان کا اہتمام بھی ہے مگر یہ دیکھ لیں کہ جتنی دیر وظیفہ، تلاوت، ذکر و شغل اور نفلیں پڑھنے میں صرف کرتے ہیں اور کسب حلال میں (جو بقصدِ ثواب عبادت ہے) مشغول ہوتے ہیں۔ آیا اس وقت میں سے کوئی حصہ اس کام میں بھی صرف ہوتا ہے کہ دوسروں کو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ کریں اب فرمایئے ایسے کتنے ہیں جو اس کام کو کرتے ہیں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید مہینے کے مہینے خالی جاتے ہیں جن میں ایک شخص کو بھی متوجہ الی اللہ نہیں کیا جاتا۔ یعنی اس کی نوبت ہی نہیں آتی کہ کافر کو اسلام کی ترغیب دیں۔۔ ضعیف الاسلام کو تقویت اسلام

کی ترغیب دیں اور جو متردد ہیں۔ جن کے اسلام سے نکل جانے کا اندیشہ ہے ان کو اسلام پر ثابت قدم رہنے کی ترغیب دیں یہ بے توجہی تو اصول کے اعتبار سے ہے۔

اب فروع کے اعتبار سے بھی دیکھیں تو اس میں بھی وہ کوتاہی نظر آئے گی یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا باب ہی مفقود ملے گا۔ یہ امر بالمعروف نیک کام کی ترغیب، نماز کی ترغیب، جن پر نماز فرض ہے جن کے پاس بقدر نصاب مال ہے انہیں زکوٰۃ کی ترغیب، جن پر حج فرض ہے انہیں حج کی ترغیب دی ہو، یا جس کے اخلاق باطنی اچھے نہ ہوں۔ اسے تہذیب اخلاق کے طریقے بتائے ہوں۔ کہ یہ سب دعوت الی اللہ ہی کے شعبے ہیں اور امر بالمعروف کے اقسام ہیں۔ یا کسی کو نہی عن المنکر کیا ہو۔ کسی مبتلائے معصیت کو معصیت سے روکا ہو۔ خواہ وہ صغیرہ ہو خواہ کبیرہ۔ (دعوت الی اللہ ج ١٣)

دعوت کا ضابطہ

دعوت عامہ میں داعی کو بھی مقتداء ہونا چاہیے جس کیلئے عالم ہونا بھی لازم ہے۔

دوسرے اس لئے بھی مقتداء کو عالم ہونے کی ضرورت ہے کہ خطاب عام کرتا ہوا یعنی وعظ کہتا ہوا دیکھ کر لوگ بھی یہی سمجھیں گے کہ یہ دین کے مقتداء اور عالم ہیں اور یہ سمجھ کے ان سے شرعی اور فقہی مسائل پوچھیں گے اور یہاں مسائل کے نام صفر ہوگا اور اتنی ہمت نہ ہوگی کہ کہہ دیں کہ ہم کو معلوم نہیں اور ہر وقت ایسی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ ٹال دیا کریں۔ لامحالہ اس حدیث کا مضمون واقع ہوگا۔

فافتو ابغیر علم فضلو واضلوا۔ یعنی بغیر علم کے جو جی میں آئے گا فتویٰ دے دیں گے۔ خود بھی گمراہ ہوں گے اوروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ (دعوت الی اللہ ج ١٣)

ایک معترض کی اصلاح

میں ایک دفعہ سہارن پور گیا تو ایک شخص نے وہاں بہشتی زیور کا ایک باریک مسئلہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے پوچھا تھا۔ مولانا نے اپنے حسن اخلاق سے اس کو سمجھا دیا تھا۔ مگر وہی مرغے کی ایک ٹانگ ان کی سمجھ میں کہاں آنا تھا۔ کیونکہ سمجھنا مطلوب ہی نہ تھا۔ جب میں گیا تو وہ سمجھے کہ یہ تو مؤلف ہی آگیا، ان سے پوچھنا چاہیے، چنانچہ میرے

پاس بھی آئے، پہلے آن کے تو زور سے کہا السلام علیکم، اسلام ہی سے خشونت اور اکھڑ پن ٹپکتا تھا۔ پھر کہنے لگے کہ یہ عبارت ہے بہشتی زیور کی۔ ذرا اس کو دیکھ لیجئے۔ میں نے کہا کہ میں نے تو سب دیکھ ہی کے لکھا ہے۔ آپ کہیئے کیا کہنا ہے۔ کہا یہ سمجھ میں نہیں آیا، میں نے کہا مطلب نہیں سمجھے یا علت نہیں سمجھے۔ مطلب تو ظاہر ہے، اردو میں سہل کر کے لکھا گیا ہے۔ کہا جی علت نہیں سمجھا۔ کہ اس کی علت کیا ہے۔ میں نے کہا، آپ کو کچھ اور بھی مسائل یاد ہیں۔ کہا جی ہاں بہت سے۔ میں نے کہا کہ کیا ان سب کی علت کو آپ نے معلوم کر لیا ہے۔ یا بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی علت اور حکمت معلوم نہیں۔ اگر سب کی علت معلوم ہو چکی۔ تو مجھے اجازت دیجئے کہ دو چار کی میں بھی علت دریافت کر لوں۔ کہا ہاں! غیر معلوم العلت بھی بہت سے ہیں۔ میں نے کہا، پھر اسے بھی اسی فہرست میں داخل کر لیجئے۔ اس جواب سے وہ ناراض تو بہت ہوئے۔ مگر بولے کچھ نہیں۔ پس کتاب بغل میں دبا جلدی سے اٹھ گئے۔

مولانا نے فرمایا۔ کہ تم نے تو بڑی جلدی ساکت کر دیا۔ میں نے کہا، حضرت میں آپ کی طرح خلیق نہیں۔ کہ ایک کوڑھ مغز کے ساتھ چار گھنٹے مغز ماروں۔ اخیر میں بز اخفش کی طرح وہ کہے۔ کہ میں نہیں سمجھا اور پھر میں تقریر کروں۔ قصہ بز اخفش کا طالب علموں میں یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے بکرے سے سبق کا تکرار کیا کرتے۔ تقریر ختم کرنے کے بعد اس سے پوچھتے۔ کہ سمجھا اور اس کو یہ تعلیم کر رکھا تھا کہ وہ نفی کے طور پر سر ہلا دیتا ہے۔ یہ پھر تقریر شروع کرتے۔ ایسے ہی مکرر سہ کرر تقریر کرتے۔ تو مجھ سے اخفش نہیں بنا جاتا۔

اس کے بعد اور ایک جنٹلمین صاحب آئے۔ وہ بھی اسی علت میں مبتلا تھے۔ مہذب عنوان سے کہنے لگے۔ کہ حضرت جب لوگ علماء کی شان میں گستاخی کرتے ہیں تو ہم کو برا معلوم ہوتا ہے۔ بہت رنج ہوتا ہے چنانچہ اس مسئلہ میں جہلاء اعتراض کرتے ہیں، جو ناگوار ہوتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں۔ تو میں ایک چھوٹا سا جلسہ جمع کروں۔ آپ اس میں ان چند مسائل کی تقریر کر دیں۔ میں نے کہا، میں آپ کی محبت کا نہایت ممنون ہوں۔ مگر عقلی قاعدہ ہے کہ الاہم فالاہم، جو کام سب سے اہم ہو۔ پہلے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ یہ آپ کو مسلم ہے یا نہیں۔ کہا ضرور مسلم ہے۔ کیونکہ یہ مقدمہ تو عقل کے موافق تھا۔ اس کو بغیر تسلیم کئے تو چارہ ہی نہیں تھا۔ ان لوگوں کے عقلیات سارے مسلم ہیں، بس نقلیات ہی میں کلام

ہے۔ میں نے کہا جو لوگ علماء کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر ایک طبقہ وہ ہے جو ائمہ مجتہدین کی شان میں گستاخی کرتا ہے وہ ان سے بھی گستاخ تر ہے۔ ان سے بڑھ کر ایک وہ فرقہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ اور سب سے بدتر وہ گروہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو سب وشتم کرتا ہے۔ تو ترتیب سے کام کرنا چاہیے۔ آپ اول ان لوگوں کی اصلاح کا انتظام کر دیجئے۔ جو اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔ پھر ان کی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی کرتے ہیں پھر ان کی جو صحابہ رضی اللہ عنھم کو نہیں چھوڑتے۔ پھر ان کی جو آئمہ کو برا بھلا کہتے ہیں جب ان سب کا انتظام ہو جاوے گا۔ آخر میں یہ جماعت علماء کی شان میں گستاخی کرنے والی رہ گئی۔ اس کا انتظام میں کروں گا، اب وہ چپ، کیا جواب دیں، جب دیکھا کہ اس طرح کام نہ چلا تو گفتگو کا طرز بدلا اور کہا یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ اس وقت ان کی اصلاح کی ضرورت تو نہیں لیکن اگر کر دی جائے تو ضرر ہی کیا ہے۔ میں نے کہا کچھ ضرر نہیں، کہنے لگے، پھر ایسا کر دیجئے۔ میں نے کہا یہ مشورہ ہے یا حکم ہے۔ اگر حکم ہے تو آپ کو حکومت کا کوئی حق نہیں۔ میں آپ کا کوئی محکوم نہیں۔ نوکر نہیں، آپ کا شاگرد نہیں۔ مرید نہیں اور اگر مشورہ ہے تو مشورہ میں مخاطب کے ماننے کا انتظار نہیں ہوتا۔ آپ اپنے فرض منصبی سے فارغ ہو چکے۔ آگے ہمارا کام ہے۔ ہماری جو سمجھ میں آوے گا کریں گے۔ آپ کی کچہری کا وقت آ گیا ہے۔ تشریف لے جائیے۔ غرض یہ بھی چلے گئے، تمام دن یہی قصہ رہا۔ مگر میں نے کسی کو ایک منٹ میں ختم کیا۔ کسی کو دو منٹ میں اور پہلے ایک ہی آدمی نے کئی دن سے اکابر کو تنگ کر رکھا تھا۔ غرض یہ کہ ہر سائل کے ساتھ نہ تو مطلقاً خشکی برتے اور نہ ہر جگہ خلیق بنے۔ اصلاح اسی طرح ہوتی ہے۔ اسی واسطے میں کہتا ہوں کہ اول تو حقیقت ظاہر کر دو اور اگر نہ سمجھے تو آخر میں کہہ دو کہ بس جاؤ یہ خدا کا حکم ہے۔ خدا کے حکم کے مقابلہ میں ہم تمہاری واہیات خرافات کو نہیں مانتے ہیں۔ (آداب التبلیغ ج ۱۳)

اقسام تبلیغ

تبلیغ کی قسمیں کر دی جائیں کہ ایک تبلیغ اصول وعقائد کی ہے۔ کفار کو۔ دوسری قسم تبلیغ فرد ہے مسلمانوں کو۔ تیسری قسم ایک جماعت کو تبلیغ کے قابل بنانا۔ پھر تو درس تدریس کا تبلیغ

میں داخل ہونا بالکل ظاہر ہے اور جب تبلیغ کی مختلف قسمیں ہیں۔ تو اب یہ ضروری نہیں۔ کہ ہر شخص ساری قسمیں ادا کرے۔ بلکہ اس کے لئے تقسیم خدمات ضروری ہے پس ان سب کاموں کو خاص خاص جماعت کے سپرد کیا جائے۔ یعنی قابلیت اور مناسبت کو دیکھ کر تقسیم خدمات کی جائے۔ کیونکہ ہر ایک آدمی ہر ایک کام کے قابل نہیں ہوتا۔ (آداب التبلیغ ج ۱۳)

بزرگوں کا طرز نصیحت

مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی قدس سرہ کی حکایت ہے کہ آپ سے کسی نے ایک رئیس خان صاحب کی شکایت کی کہ یہ نماز نہیں پڑھتے۔ مولانا نے ان سے پوچھا کہ خان صاحب نماز کیوں نہیں پڑھتے۔ کہا، حضرت! آپ سے کیا پردہ۔ بات یہ ہے کہ ”میں داڑھی چڑھانے کا عادی ہوں۔ یہ شوق مجھ سے نہیں چھوٹتا اور نماز کے لئے پانچ وقت وضو کرنا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے بار بار داڑھی کا اتارنا چڑھانا مشکل ہے۔ اس لئے میں نماز نہیں پڑھ سکتا۔۔ مولانا نے فرمایا کہ بس آپ کو یہی عذر ہے۔ کہا ہاں۔ فرمایا ہم آپ کو اجازت دیتے ہیں کہ آپ بے وضو ہی نماز پڑھ لیا کریں۔ مگر نماز کو نہ چھوڑیں۔ خان صاحب نے کہا حضرت بے وضو کے نماز پڑھنے سے تو یوں سنا ہے کہ آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ فرمایا۔ تم کافر نہ ہو گے تم بے فکر رہو اور بے وضو ہی پڑھ لیا کرو۔ چنانچہ خان صاحب بے وضو ہی نماز پڑھنے کھڑے ہوئے۔ مگر اندر سے دل نہ مانا۔ آخر نماز چھوڑ کر وضو کیا اور وضو سے نماز پڑھی۔ پھر ایک دو روز تک تو ہر وضو کے بعد داڑھی چڑھا لیا کرتے۔ اس کے بعد یہ بھی چھوڑ دیا اور اچھے خاصے پکے نمازی ہو گئے۔ دیکھئے مولانا نے کیسے عجیب طرز سے نصیحت کی۔ کہ مخاطب کو ذرا بھی توحش نہ ہوا۔ (التواصی بالحق ج ۱۳)

عذر بلا اہتمام عمل

ہماری حالت یہ ہے کہ جیسا تبلیغ اعمال کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ویسا ہم کو اس کا اہتمام نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بہت کوتاہی ہو رہی ہے۔

جیسا کہ دعوت الی الایمان اور تبلیغ عقائد میں کوتاہی ہو رہی ہے اور جیسا ایک امر مانع ہو رہا ہے۔ تبلیغ عقائد اور دعوت الی الایمان سے اسی طرح ایک امر مانع ہو رہا ہے۔ تبلیغ

اعمال سے اور وہ امر یہ ہے کہ ہم کو عادت ہوگئی ہے ترک دعوت الی الاعمال کی اور اس کے مانع ہونے سے یہ مطلب نہ لیا جائے۔ کہ یہ عادت عذر ہے۔ کیونکہ جب میں اس کا لغو ہونا بیان کردوں گا۔ تو اس سے عذر نہ ہونا معلوم ہو جائے گا اور اس کے یہ معنی نہیں کہ ترک دعوت الی الاعمال کے لئے کوئی عذر فی نفسہ بھی نہیں۔ اگر اعذار شرعیہ موجود ہوں اور ان کا تحقق ہو جائے تو اس وقت ترک دعوت جائز ہے۔ مگر اس وقت میں ان اعذار شرعیہ کو بیان نہ کروں گا۔ نہ بیان کی ضرورت ہے کیونکہ کسی عمل کے متعلق بیان اعذار کی ضرورت جب ہو کہ ہم کو اس عمل کا اہتمام ہو اور جہاں مخاطب کو عمل ہی کا اہتمام نہ ہو۔ وہاں اعذار کو بیان نہ کیا جائے گا بلکہ اولاً اس کو اہتمام عمل پر متوجہ کیا جائے گا۔ جب وہ عمل کا اہتمام کرنے لگے اور عمل میں مشغول ہو جائے گا۔ پھر اس کو اعذار شرعیہ سے مطلع کیا جائے گا۔ (التواصی بالصبر ج ۱۳)

مسلمان کا مذاق

دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن کو تبلیغ کرنے میں ضرر کا اندیشہ ہے۔ جیسے دشمن اور مخالف۔ اور بعض وہ ہیں۔ جہاں ضرر کا کچھ اندیشہ نہیں۔ صرف ناگواری کا خطرہ ہے اور ان میں زیادہ تر ایسے ہی ہیں۔ چنانچہ دوست احباب۔ بھائی اور عزیز سے ضرر جسمانی یا مالی کا کوئی خطرہ نہیں۔ بس ان کی تبلیغ سے محض اس واسطے پہلوتہی کی جاتی ہے کہ ان کو ہماری روک ٹوک ناگوار ہوگی۔ سو اس کا علاج یہ ہے کہ نصیحت کا عنوان ایسا اختیار کرو۔ جس سے ناگواری نہ ہو۔ اور اس پر بھی کسی کو ناگواری ہو تو اس کی پرواہ نہ کرنی چاہیے۔ مسلمان کا تو یہ مذاق ہونا چاہیے:

ہزار خویش کہ بے گانہ از خدا باشد　　فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

(التواصی بالصبر ج ۱۳)

حسن اسلام کا تقاضہ

حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

من حسن اسلام المرء ترکه ما لا یعنیه (مجمع الزوائد للهیثمی ۸: ۱۸)

(یعنی لایعنی امور کا ترک کر دینا آدمی کے حسن اسلام سے ہے) اور لایعنی کے معنی ابھی مذکور ہوئے ہیں۔ کہ عبث ولغو کو لایعنی کہتے ہیں۔ یعنی جو چیز نہ نافع ہو۔ نہ مضر۔ وہ لایعنی ہے۔ اسی کے ترک کو حضور نے حسن اسلام فرمایا ہے اور یہ نہیں فرمایا:۔

من احسن اسلام المرء ترک ما یضرہٗ

کہ مضر کا ترک کردینا حسن اسلام سے ہے۔ حالانکہ مضر کا ترک کردینا یقیناً حسن اسلام ہے۔ مگر حضور نے بجائے مایضرہ کے مالایعنی فرما کر یہ بتلادیا۔ کہ جو عبث ہے۔ وہ واقع میں مضر ہی ہے۔ تو گویا ترک نافع کی دو صورتیں ہوئیں۔ ایک ارتکاب مضر اور ایک خلو عن الشغل المفید۔ اور یہ دوسری قسم اپنے مال کے اعتبار سے پہلی ہی قسم میں داخل ہوجاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا۔ کہ فقط مضر کا ترک کردینا کافی نہیں ہے۔ بلکہ نافع میں مشغول ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ مشغلہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو دوسرے مشغلہ سے روک سکتا ہے۔ ورنہ بغیر مشغلہ کے مضر سے رکا رہنا ناپائیدار ہوگا۔ کیونکہ چندروز تک تو نفس صبر کرتا ہے۔ اس کے بعد پھر کسی نہ کسی مشغلہ کی طرف متوجہ کردیتا ہے۔ اور وہ اکثر مضر ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا مقولہ ہے۔ کہ تم نفس کو مشغول کرلو۔ قبل اس کے کہ وہ تم کو مشغول کرلے۔" (ضرورت تبلیغ ج ۱۴)

ذکر قلبی

حدیث شریف میں ہے کہ:۔

کان صلی اللہ علیہ وسلم یذکر اللّٰہ فی کل احیانہ (الصحیح للبخاری ۱: ۸۳)

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے اور کل احیان میں اوقات بول و براز و قضائے حاجات بھی شامل ہیں اور ظاہر ہے۔ کہ بول و براز کے موقع پر زبان سے ذکر و تلاوت مکروہ ہے۔ بس کل احیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے احوال اور ایسے مواقع میں قلب سے ذکر کیا کرتے تھے۔ (ضرورت تبلیغ ج ۱۴)

حقیقت ذکر

حدیث شریف میں ہے۔ **الشیطان جاثم علٰی قلب ابن ادم فاذا ذکر اللّٰہ خنس و اذا غفل وسوس** (مشکوٰۃ المصابیح: ۲۲۸۱)

یعنی ابن آدم کے قلب پر شیطان چڑھا ہوا بیٹھا ہے۔ جب وہ ذکر اللہ کرتا ہے۔ اس وقت تو ہٹ جاتا ہے اور جب خالی رہتا ہے تو وسوسے ڈالتا ہے۔ اس سے معلوم ہوگیا۔ کہ اگر نفس کو مشغول نہ کروگے۔ تو یہ خود مشغلہ تجویز کرلے گا۔

اگر کوئی یہ شبہ کرے۔ کہ نماز کا تو کوئی رکن بھی ذکر سے خالی نہیں۔ قراءت، تسبیح، تکبیر، تشہد غرض سب ذکر ہی ذکر ہے۔ مگر باوجود اس کثرت کے ساتھ اس کے مشتمل علی الذکر ہونے کے سب سے زیادہ وسوسے نماز ہی میں پیدا ہوتے ہیں۔ تو ہم یہ کیسے مان لیں۔ کہ جب کسی کام میں مشغول ہوں تو وسوسہ نہیں آتا۔ اس مادہ جزئیہ سے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ قاعدہ صحیح نہیں۔ کہ جب نفس کو کسی کام میں مشغول نہ کرو گے۔ تب ہی وہ کسی کام میں لگ جائے گا۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کمبخت تو کام کے اندر بھی اپنا کام چلاتا رہتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ ذکر کہتے ہیں یاد کو۔ خواہ وہ تنہا قلب سے ہو، خواہ زبان بھی اس میں شریک ہو۔ مگر محض زبان سے نہ ہو۔ اگر محض زبان سے یاد ہے۔ تو وہ واقع میں ذکر نہیں۔ بلکہ وہ تو صورت ذکر ہے۔ اب شبہ جاتا رہا۔ کیونکہ دیکھ لیجئے کہ جہاں اور جس شخص کو وساوس آتے ہیں۔ وہاں واقع میں ذکر کا وجود نہیں۔ بلکہ محض ذکر کی صورت ہی صورت ہوتی ہے۔ قلب اس کی طرف مشغول نہیں ہوتا۔ چنانچہ جس نماز میں وساوس آتے ہیں۔ اس میں قلب نماز میں پورا مشغول نہیں ہوتا۔ ورنہ النفس لا توجہ الی شیئین فی ان واحد کے قاعدہ سے پوری مشغولی کے ساتھ وساوس آ نہیں سکتے۔

اب اس پر ایک اور شبہ رہا۔ وہ یہ کہ جب قلب متوجہ نہیں ہوتا۔ پھر ادا کیسے ہوتا ہے۔ کیونکہ فعل اختیاری تو بدوں ارادۂ قلب کے ہو ہی نہیں سکتا اور ارادہ کے لئے توجہ لازم ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ کلیہ صحیح ہے۔ مگر اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ جب بالکل توجہ نہ ہو تو فعل نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ شروع توجہ سے کیا ہو۔ مگر استمرار میں توجہ نہ رہی ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جیسے دو آدمی ساتھ ساتھ چلیں اور باتیں کرتے ہوئے راستہ طے کریں۔ تو باتیں کرتے وقت توجہ فقط باتوں کی طرف رہے گی۔ چلنے کی طرف نہ رہے گی۔ مگر مشی پھر بھی واقع ہوتی ہے۔ جیسے گھڑی کی کوک کہ ابتداء میں حرکت چابی کو دینی پڑتی ہے۔ پھر اس کی رفتار کے استمرار و بقا کے لئے کوکنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اسی طرح مشی ممتد کے ساتھ قصد متجدد کی ضرورت نہیں۔ وہی پہلا قصد کافی ہے اور وہی ساری مشی میں مؤثر ہے۔ یا جیسے ہارمونیم باجہ کہ جب ایک دفعہ کوئی اسے بجانے بیٹھ گیا۔ تو ہر قرعہ پر جدید قصد کی حاجت نہیں۔ بلکہ ابتداء پڑتا ہے۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے۔ اب وہ ارادہ تو کیا کرتا۔ اسے بعض دفعہ ایسی محویت ہوتی ہے۔ کہ ہاتھ چلنے کی بھی خبر نہیں ہوتی اور جیسے قاری ہے۔ کہ قراءت میں اگر ہر

ہر لفظ پر نیا قصد کرے۔ تو اس کا لہجہ بے تکلف اور بے ساختہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بارہا تجربہ ہوا ہوگا۔ کہ جب کسی نے بنا کر پڑھا۔ وہیں اس کا لہجہ بگڑ گیا۔ بلکہ بے ساختہ اور بے ارادہ پڑھنے سے نہایت اچھا پڑھا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی فعل اختیاری کی جب عادت اور مشق ہو جائے۔ تو پھر ابتداء کے لئے تو قصد کی ضرورت ہوتی ہے۔ استمرار کے لئے قصد متجدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چنانچہ تمام مثالوں سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ کہ فعل اختیاری کے صدور کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر ہر آن میں اس پر توجہ ہو۔ بس ابتداء کے لئے توجہ ضروری ہے۔ بس اب نماز اور وساوس کے جمع ہونے میں کوئی اشکال نہیں رہا۔ کیونکہ ابتدائی توجہ سے نماز شروع ہوگئی اور وہ ہو رہی ہے اور درمیان میں وساوس کی طرف توجہ مبذول ہو گئی۔ (ضرورت تبلیغ ج ۱۴)

ہر چیز میں تین درجے ہیں۔ ایک آسائش اور ایک آرائش ایک نمائش۔ تو آسائش تو ہر ایک کے لئے مستحب ہے اور آرائش یا زیبائش میں اگر معصیت کا مثلاً بلا ضرورت قرض وغیرہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے تو یہ بھی مباح ہے۔ گو اس کا ترک اولیٰ ہے اور نمائش جس میں ریا و کبر و عجب اور فخر ہوتا ہے۔ یہ حرام ہے۔ اب اس کا فیصلہ ہر شخص کے تدین پر ہے۔ کہ اس کی نیت کیا ہے۔ اگر دل میں غور کر کے یہ دیکھے کہ یہ کام میں نے نمائش کے لئے کیا ہے۔ تو تاویل کر کے اس کو آرائش میں داخل نہ کرے۔ مگر اس کے ساتھ دوسرے کے فعل کو بھی خواہ مخواہ معصیت میں داخل نہ کرے۔ کہ ہر ایک کے فعل کو نمائش پر محمول کرنے لگے۔ بلکہ حسن ظن رکھے۔ تو خلاصہ یہ ہوا۔ کہ مساکن مرضیہ اگر احب من اللہ ہوں۔ تب محل وعید ہیں، ورنہ نہیں۔ (ضرورت تبلیغ ج ۱۴)

تبلیغ میں اعتدال

تبلیغ کے کام کو اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ.

سبحان اللہ کام بھی بتلا دیا اور کام کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ کہ لوگوں کو خوبصورتی اور نرمی ولطافت سے اللہ کی سبیل کی طرف بلاؤ اور راہِ راست پر لاؤ۔ یہ ہے وہ کام جو بذریعہ وعظ کے یا مکاتب و مدارس کے ذریعہ سے ہونا چاہیے۔ یعنی مبلغین ان ناواقف مسلمانوں کو اسلام کے محاسن اور احکام جا کر سنائیں اور رفتہ رفتہ کچھ مکاتب و مدارس وہاں قائم کر دیئے جاویں۔ ان میں سے جو طریقہ زیادہ مفید معلوم ہو۔ اسے اختیار کرنا چاہیے۔ بس یہ تو ہمارا کام ہے۔ اسے

پورا کرنے کے بعد نتیجہ خدا کے سپرد کردو۔ ناکامی کے متعلق تو کہہ چکا اب کامیابی کے متعلق بھی کہتا ہوں۔ کہ اگر خوش قسمتی سے کامیاب ہو جاؤ۔ تو نازمت کرو۔ جیسے ہم سے یہ غلطی بھی ہوتی ہے اور اس وقت ہماری حالت اس شعر کا مصداق ہوتی ہے۔ ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی   تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یعنی ہماری جو حالت ہے۔ وہ اعتدال سے باہر ہے۔ نہ ناکامی میں حدود پر رہتے ہیں نہ کامیابی میں۔ پس سنیئے کہ قرآن مجید میں مطلق کامیابی کے متعلق دو ارشاد ہیں:۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذَالِکَ فَلْیَفْرَحُوْا.

اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا کے فضل پر خوش ہونا چاہیے اور ایک جگہ یہ ارشاد ہے:۔

لَاتَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ.

بہت مت خوش ہو۔ خدا پسند نہیں کرتا زیادہ خوش ہونے والوں کو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خوش نہ ہونا چاہیے۔ پس ان دونوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے۔ مگر دراصل ان میں تعارض نہیں۔ بلکہ یہ دونوں حالتیں جدا جدا ہیں۔ جن کے متعلق تنبیہ کی گئی ہے۔ ایک خوشی اضطراری ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً تمہاری ایک ہمیانی روپے یا اشرفیوں کی کھوگئی ہے۔ جس سے آپ بہت پریشان ہیں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت دق ہو چکے ہیں۔ کہیں پتہ نہیں چلتا۔ کہ دفعتۃً کسی نے ہاتھ میں لا کر دے دی۔ ایک خوشی تو اس وقت ہے۔ یہ اضطراری اور بے اختیاری خوشی ہوگی اور ایک یہ صورت ہے۔ کہ ہمیانی گم ہونے پر تم نے نوکروں کو خوب مارا پیٹا۔ اب خدا جانے۔ وہ ان کو ملی یا نہیں۔ مگر بے چاروں نے ڈر کے مارے لا کر دے دی۔ ایک خوشی اس پر ہے۔ یہ اختیاری خوشی ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ پہلی خوشی جو آپکو ہوگی۔ وہ اترانے کی نہ ہوگی۔ بلکہ شکر کی ہوگی۔ کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ کھوئی ہوئی چیز مل گئی اور دوسری خوشی اترانے کی اور ناز و تکبر کی ہوگی۔ کہ دیکھا ہم نے کیسی اچھی تدبیر کی۔ ورنہ یہ ہمیانی کیسے ملتی تو ان دونوں میں پہلی خوشی محمود ہے اور دوسری مذموم۔

اسی طرح تبلیغ کی کامیابی پر اضطراری خوشی کا تو مضائقہ نہیں۔ باقی اپنی تدابیر اور مساعی کو سوچ سوچ کر خوش ہونا۔ کہ ہم نے یوں کیا تو کیا اچھا اثر ہوا۔ یہ مذموم ہے۔ بہرحال ہم کو کوشش کرنی چاہیے اور نتیجہ کو خدا کے سپرد کرنا چاہیے اور ناکامی پر

مغموم نہ ہونا چاہیے اور کامیابی پر اترانا نہیں چاہیے۔ کام شروع کر دو۔ اس کے سب راستے خود کھل جائیں گے۔ بقول مولانا رومیؒ۔

گرچہ رخنہ نیست عالم راپدید   خیرہ یوسف دارمی باید ودید

(اگر چہ قیود نفسانیہ سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے پھر بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح بھرپور کوشش کرنا چاہیے)

یعنی جب زلیخا نے یوسف علیہ السلام کو قصر مسبع میں بند کیا تھا۔ تو اس وقت وہ زلیخا کے پاس سے بھاگے تھے۔ حالانکہ محل کے سات دروازے تھے اور ساتوں دروازوں میں زلیخا نے قفل ڈال دیئے تھے۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم تھا۔ مگر چونکہ نبی تھے۔ اس لئے آپ نے یہ سمجھا۔ کہ گو دروازے مقفل ہیں۔ مگر جتنا میرا کام ہے وہ تو میں کروں۔ کم از کم دروازہ تک تو بھاگوں۔ چنانچہ بھاگے، اب جس دروازہ کے پاس پہنچتے تھے۔ قفل خود بخود ٹوٹ کر گر پڑتا تھا۔ اسی طرح ساتوں دروازے کھل گئے اور یہ بچ گئے۔ مولانا اسی کو یاد دلاتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم راپدید   خیرہ یوسف دارمی باید ودید

(اگر چہ قیود نفسانیہ سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے پھر بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح بھرپور کوشش کرنا چاہیے)

تو بس تم بھی دوڑو اور یوں سمجھو۔ کہ نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اسی کے فضل سے سب کچھ ہوگا۔ پھر اگر کوشش کی اور تمہاری کوشش سے لوگ ارتداد سے بچ گئے۔ تو نازمت کرنا۔ بلکہ شکر کرنا۔ غرض یہ دونوں درجے مطلوب نہیں۔ یعنی ایک یہ کہ کوشش ہی نہ کرے۔ دوسرا یہ کہ کوشش پر کامیابی کو لزوماً مرتب سمجھے۔ جیسے سودا نے ان لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے۔ جو خود بھی کام نہیں کرتے اور کام کرنے والوں کو یہ الزام دیتے ہیں۔ کہ میاں تم نے کیسا کام کیا۔ جو نتیجہ مفید نہ نکلا۔

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہ کن   بازی اگرچہ پا نہ سکا، سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز   اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

(ضرورت تبلیغ ج ۱۳)

تبلیغ بقدر استطاعت

مگر اس کوشش کے لئے ایک شرط بھی ہے۔ یعنی استطاعت۔ اور یہ سب کچھ میں ان

ہی کے کاموں کے لئے بیان کر رہا ہوں۔ جو اسباب ظاہرہ کی رو سے اپنی قدرت میں ہوں۔ یہ سب کوشش اور کوشش پر اجر اور دوسرے احکام ایسے ہی کاموں کے لئے ہیں۔

اور ایک وہ کام ہیں۔ جو اسباب ظاہرہ کی رو سے اپنی قدرت واستطاعت سے باہر ہیں۔ ان کے لئے کوشش کرنا فضول ہے۔ نہ مامور بہ اور نہ ایسی کوشش پر کچھ اجر۔ مثلاً کوئی شخص سورج کو قبضہ میں کرنے کے لئے آسمان کی طرف ہر روز کودا کرے۔ اور یہ سمجھے۔ کہ اگر کبھی گر کے مروں گا۔ تو شہید مروں گا۔ تو یہ محض خبط ہے۔ کیونکہ یہ فعل اس کی قدرت واستطاعت سے باہر ہے۔ اس لئے اس پر بجائے اجر کے باز پرس ہوگی۔ حدیث شریف میں ہے۔ کہ:

لا ینبغی للمؤمن ان یذل نفسهٗ. (سنن الترمذی:۲۲۵۴، سنن ابن ماجۃ :۴۰۱۶)

یعنی مومن کو مناسب نہیں۔ کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے۔ صحابہ رضی اللہ عنھم نے پوچھا۔ یا رسول اللہ۔ مومن اپنے کو کس طرح ذلیل کرتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یتحمل من البلاء لما لا یطیقه

ایسی بلا اپنے ذمہ لے لے جس کے تحمل کی طاقت نہیں ہے۔ (ضرورت تبلیغ ج ۱۳)

اہل علم کا عوام سے معاملہ

علی گڑھ میں ایک پروفیسر نے جو عربی ادب کے بڑے ماہر تھے۔ مجھ سے ایک حدیث کا متن پڑھ کر جس میں آیا ہے۔ کہ زنا کی کثرت سے طاعون پھیلتا ہے۔ سوال کیا۔ کہ کیا یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے کہا حدیث کا مدلول سمجھ میں نہیں آیا یا جنایت وعقوبت میں وجہ ربط سمجھ میں نہیں آئی۔ کہا ربط سمجھ میں نہیں آیا میں نے کہا کہ ربط کے سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس پر کوئی دین کا کام اٹکا ہوا نہیں ہے۔ آپ بدوں علم ربط ہی کے حدیث پر ایمان رکھیئے۔ کہا اس میں ایک نفع ہے میں نے کہا وہ کیا۔ کہا زیادت اطمینان۔ میں نے کہا۔ خود اطمینان کے مطلوب ہونے کی کیا دلیل؟ کہا دلیل اس کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ. میں نے کہا یہ کیا ضرر ہے۔ کہ جو چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نافع تھی۔ وہ آپ کو بھی نافع ہو۔ بس اس پر وہ خاموش ہو گئے علماء کو عوام کے ساتھ یہی طرز اختیار کرنا چاہیے۔ کہ دلائل وحکم واسرار ان کے سامنے بیان نہ کریں۔ اس

سے ان کا دماغ خراب ہوتا ہے۔ پھر وہ کوئی حکم بدوں علت وحکمت معلوم کیے بغیر قبول نہ کریں گے اور بعض احکام کی عِلَل وحِکَم دقیق ہوتی ہیں۔ عوام بیان کے بعد بھی ان کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہاں عوام یا تو عمل ترک کریں گے یا علماء علت وحکمت کے سمجھانے میں اپنا دماغ اور وقت ضائع کریں گے۔ اس سے بہتر یہی ہے۔ کہ علماء کا اتباع کریں۔ خود اجتہاد نہ کریں۔ ان سے احکام دریافت کریں۔ علل وحکم دریافت نہ کریں۔

علماء کو ایک بات کی اور نصیحت کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ جس کے سر پر بڑے موجود ہوں۔ اس کو اپنی شہرت کی کوشش نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ جہاں تک ہو اپنے کو گم کرو۔ گمنامی میں رہو۔ کیونکہ بڑا بننا سخت خطرہ کی بات ہے اور شہرت سے دنیوی مصائب کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

خویش را رنجور ساز ورزار زار   تا ترا بیروں کنند از اشتہار
اشتہار خلق بند محکم است   بند ایں از بند آہن کے کم است
چشمہاؤ خشمہاؤ اشکہا   بر سرت ریزو چو آب از مشکہا

(اپنے آپ کو رنجیدہ اور آہ وزاری میں مصروف رکھ تا کہ تو شہرت واشتہار سے باہر نکلے، مخلوق کی شہرت اللہ اور اسکے بندہ کے درمیان مضبوط بند ہے یہ بند لوہے کے بند سے کیا کم ہے، غصے اور آنکھیں اور اشک تیرے سر پر اس طرح ٹپکتے ہیں جیسے مشکوں سے پانی ٹپکتا ہے) (اتباع علماء ج ۱۳)

اکابر دیوبند کی دقت نظر

ہمارے حضرت کی اتنی دقیق نظر تھی۔ کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ جیسے زبردست عالم ایک سوال کریں اور حضرت انہیں جواب مسکت دیں۔ قصہ یہ ہے کہ حضرت مولانا کی اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی ایک ریاست سے نوکری آئی۔ سو روپے تنخواہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی تھی اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی تین سو روپے تھی۔ مولانا محمد قاسم جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ میں فلاں مطبع میں دس روپے کا ملازم ہوں۔ ملاحظہ کیجئے۔ کہ مولانا اور دس روپے۔ قرآن کی تصحیح کا کام کرتے تھے۔ ہر چند مالک مطبع نے اضافہ کرنا چاہا۔ مگر یہی فرمایا کہ میں تصحیح کا کام کرسکتا ہوں۔ اس کے لئے یہی بہت ہیں۔ تو تحریر فرماتے ہیں۔ کہ میں دس روپے کا نوکر ہوں۔ مجھے اسی کے خرچ کرنے کی فکر رہتی ہے۔ سو پانچ روپے تو

اہل وعیال کو دیتا ہوں اور پانچ روپے طالب علموں کی ضروریات میں خرچ ہو جاتے ہیں ۔ تین سو ملیں گے ۔ تو مجھ کو تو وہی پانچ روپے کافی ہوں گے ۔ بقیہ کے لئے ہر وقت میں اسی خلجان میں رہا ۔ کہ کیوں کر خرچ ہوں گے ۔ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ تجویز فرماتے ہیں ۔ کہ میں تین سو روپے سے کم پر نہیں آ سکتا ۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے فرمایا، حضرت آپ نے یہ کیا کیا ۔ اگر وہاں سے منظوری ہو جاوے ۔ تو پھر کیا کیجئے گا ۔ آپ کے مقابلہ میں تو ایک لاکھ بھی تھوڑے ہیں ۔ تو اس کے آگے مولانا نے تحریر فرمایا ۔ کہ لیکن جب چاہوں گا ۔ گھر رہوں گا ۔ جب چاہوں گا نوکری پر ۔ جب خط وہاں پہنچا ۔ معلوم ہو گیا کہ یہ حضرات کہیں نہیں جائیں گے ۔ تو بس حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی یہ دس روپے کی نوکری برائے نام نوکری تھی ۔ نام تو تھا نوکری کا ۔ مگر حقیقت میں کیا یہ نوکری کی تھی ۔

اس حالت میں حضرت حاجی صاحبؒ سے رائے لیتے ہیں ۔ نوکری چھوڑنے کی ۔ حضرت فرماتے ہیں ۔ پوچھنا دلیل تردد کی ہے ۔ تو وہ دلیل خامی کی ہے ۔ خامی میں نوکری چھوڑنا مناسب نہیں ۔ جب قوت ہوگی تو رسے تڑوا کے بھاگو گے ۔ بلکہ پوچھیں گے بھی نہیں ۔ اللہ اکبر سارے ارسطو، افلاطون، بقراط وسقراط جمع ہو کر تو ایسا کلیہ نکال دیں تو ضعیف کے لئے یہی مسئلہ ہے کہ نوکری نہ چھوڑے ۔ (آداب اصلاح ج ۱۳)

تعلیم خلوت کا راز

صوفیاء کی خلوت کی تعلیم کا یہی راز ہے لوگ سمجھتے ہیں وہ شریعت نہیں ۔ اس لئے خلوت میں تعلیم دیتے ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت لوگوں کا یہ گمان تھا کہ ان کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی خاص باتیں تعلیم فرمائی ہیں جو اوروں کو نہیں بتائیں ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ:

هل خصكم رسول الله صلى الله عليه وسلم بشیء من دون الناس

یعنی کیا تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی باتیں بتائی ہیں جو اوروں کو نہیں بتائیں ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

والله ما خصنا رسول الله صلى الله عليه وسلم بشیء الا فهما اديته الرجل فى القرآن.

بخدا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کے ساتھ مجھے مخصوص کیا ہو ہاں مجھے ایسا فہم ضرور ملا ہے جس سے قرآن سمجھتا ہوں اور اس فہم سے کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسے معنی سمجھ میں آتے ہیں جن پر عوام کی دسترس نہیں ہے۔ (آداب اصلاح ج ۱۳)

تبلیغ کی برکت

قادر بخش خاں رئیس نماز نہیں پڑھتے تھے۔ مولانا مظفر حسین صاحب جب گڑھی تشریف لائے۔ انہیں معلوم ہوا۔ خان صاحب کے پاس گئے اور فرمایا۔ کہ مجھے آپ سے کچھ مختصر سا کہنا ہے۔ انہوں نے کہا۔ فرمائیے، فرمایا کہ آپ نماز نہیں پڑھتے۔ نماز پڑھا کیجئے۔ خان صاحب نے کہا۔ سچی بات ہے کہ مجھے ڈاڑھی چڑھانے کا شوق ہے۔ وضو کرنے سے سب بال برابر ہو جاتے ہیں اور بے وضو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔ فرمایا بے وضو ہی پڑھ لیا کیجئے۔ اجازت ہے۔ خان صاحب نے ایک وقت کی نماز تو بے وضو پڑھی۔ جب دوسرا وقت آیا۔ خیال پیدا ہوا کہ کیا بے وضو پڑھیں۔ محنت بھی کریں اور نفع کچھ بھی نہ ہو۔ بس ایک وقت بے وضو پڑھ کے دوسرے وقت سے باوضو نماز پڑھنے لگے۔ اس طرح سے وہ نمازی بن گئے اور ڈاڑھی بڑھانا بھی چھوٹ گیا۔ حضرت تو ایک چنگاری لگا گئے تھے۔ تو بزرگوں کی یہ بات ہے۔ ناقصین کیا سمجھیں گے۔ گو پیری مریدی کرنے لگیں۔

نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند   نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند
درنیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام

(جو شخص آئینہ بناتا ہو ضروری نہیں کہ وہ سکندری بھی جانتا ہو، جو شخص سر منڈاتا ہو ضروری نہیں کہ وہ قلندری بھی جانتا ہو، خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا پس کلام کو مختصر کر کے ختم کرنا چاہیے والسلام)

اور ایسے ہی مبصر کا کام ہے کہ بچوں کو ہر بات سے نہ روکے۔ (آداب اصلاح ج ۱۳)

ناصح غیر عامل

ایک بڑھیا اپنے لڑکے کو ایک بزرگ کی خدمت میں لائی اور عرض کیا۔ کہ حضرت یہ گڑ بہت کھاتا ہے۔ اسے نصیحت فرما دیجئے۔ ان بزرگ نے فرمایا۔ کل لانا۔ دوسرے دن بڑھیا اس لڑکے کو لائی۔ ان بزرگ نے نصیحت فرما دی۔ کہ میاں گڑ بہت

مت کھایا کرو۔ نقصان کرتا ہے۔ اس کے بعد اس لڑکے نے گڑ کھانا چھوڑ دیا۔ خدام نے پوچھا۔ کہ حضرت ایک دن کی تاخیر میں کیا مصلحت تھی۔ فرمایا کہ جب تک مجھے بھی گڑ کھانے کی عادت تھی۔ اب میں نے وہ عادت چھوڑ دی۔ اگر اس وقت کہتا تو اثر نہ ہوتا۔ اب میرے لہجہ میں قوت زبان میں برکت قلب میں طاقت پیدا ہوگئی۔ اب تجربہ کر لیجئے۔ کہ ناصح غیر عامل کا لہجہ نرم ہوتا ہے، نہ برکت ہوتی ہے، نہ قوت ہوتی ہے اس سے اثر بھی نہیں ہوتا، اگر کوئی غیر عامل بتکلف اپنے لہجہ میں قوت پیدا کرے تو اس کی وقاحت اور بے شرمی ہے۔ اسی ضعف کو کسی نے کہا ہے۔

احب مناجاة الحبیب باوجه ولکن لسان المذنبین کلیل

محبوبوں سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مگر خطاوار ہوں۔ اس لئے زبان یاری نہیں دیتی۔
(آداب اصلاح ج ۱۳)

انذار کی قسمیں

انذار کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ وحشت ہو۔ ایک یہ کہ الفت ہو۔ پہلی قسم تنفرا میں داخل ہے۔ دوسری قسم بشرا میں داخل ہے۔ مثلاً انداز سے یوں جی خوش ہوتا ہے۔ کہ سب مردہ کو قبر میں رکھ دیتے ہیں۔ تو جنت سے پہلے دوزخ دکھلائی جاتی ہے۔ کہ اگر اعمال اچھے نہ ہوتے اور اصلاح نہ ہوتی تو یہ ٹھکانا تھا تو اس جہنم دکھانے کو دخل خوش کرنے میں نہیں تو کیوں دکھلائی۔ حضرت جہنم دکھلا کر خوشی اور بڑھا دی۔ اب جنت کو دیکھ کر زیادہ خوشی ہوگی۔

الحمد الله الذی نجانی.

اسی طرح جو دنیا کے رنج وغم دیکھ چکے ہیں۔ وہ کہیں گے

الحمد اللّٰه الذی اذهب عنی الحزن

حدیث میں ہے۔ کہ جب تمام اہل ایمان جنت میں چلے جائیں گے اور جنت نہ بھرے گی تو حق تعالیٰ جنت کے لئے ایک نئی مخلوق اور پیدا کریں گے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے۔ کہ بھئی! ان سے تو ہم زیادہ مزہ میں ہیں۔ کہ انہوں نے کوئی چیز جنت کے مقابل دیکھی ہی نہیں۔ انہیں اس کی کیا قدر اور کیا خوشی۔ (آداب اصلاح ج ۱۳)

جمال وجلال خداوندی

مجھے چندروز سے یہ بات محسوس ہوئی ہے اور بچپن سے بھی مجھے اس کا احساس تھا۔ مگر اب چندروز سے زیادہ احساس ہے۔ کہ مجھے قرآن کے دو صفحوں پر تو نور سا محسوس ہوتا ہے اور اس کے بعد دو صفحے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے ان پر سایہ پڑا ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی چند آیات شروع کے دو صفحوں پر ہیں۔ مجھے یہ زیادہ روشن محسوس ہوتی ہیں اور اس کے بعد کے دو صفحے ایسے ہیں کہ گویا ان پر ظل پڑا ہوا ہے۔ اسی طرح سارے قرآن میں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

چند روز سے مجھے اس کی علت یہ ذہن میں آئی ۔ کہ جمال و جلال کی صورت منکشف ہوتی ہے۔ کیوں کہ قرآن میں ترغیب و ترہیب ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ تو جہاں ترغیب ہے وہاں تجلی جمالی ہے۔ جو زیادہ واضح ہے اور جہاں ترہیب ہے وہاں تجلی جلالی ہے جو کسی قدر ستر و حجاب لئے ہوئے ہے۔ خواہ کوئی اسے میرا وہم سمجھے۔ مگر میرے خیال میں یہی آیا ہے۔ واللہ اعلم ۔ (الاستقامت ج ۱۳)

جنت کا سوال

ایک صحابی زادے نے اس طرح دعا کی تھی۔

اللھم انی اسئلک القصر الابیض عن یمین الجنة

(اے اللہ میں سفید محل مانگتا ہوں ۔ جو جنت کی دائیں طرف ہو) ان کے والد صاحب نے جو صحابی تھے۔ فرمایا۔

یا بنی سل اللہ الجنة ولا تعتد فی الدعا ما نی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ان اللہ لا یحب المعتدین فی الدعاء.

(لم نجد الحدیث فی "موسوعة أطراف الحدیث النبوی الشریف ")

(صاحبزادے! اللہ سے جنت مانگو اور دعا میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ دعاء میں حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتے۔ تو دعا کے لئے بھی ایک حد ہے۔ شوق کے لئے ایک حد ہے۔

کیفیت نزع کی تفصیل

شدت نزع کا مدار طاعت و معصیت پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کے سبب دو ہیں۔ ایک قوت جسم، دوسرے کثرت تعلقات۔ کیونکہ موت کے وقت روح طبی جسم سے جدا ہوتی ہے۔ اگر جسم قوی ہے تو روح کا طبی انفصال اس سے دقت کے ساتھ ہوگا۔ کیوں کہ وہ رگ رگ میں پیوستہ ہوتی ہے اور چونکہ روح مجرد کو بھی روح طبی کے واسطہ سے جسم کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ تو اگر روح مجرم کو دنیا کی چیزوں کے ساتھ تعلق زیادہ ہوگا۔ تو اس تعلق کا منقطع ہونا اسے ناگوار ہوگا۔ اس لئے وہ جسم سے اپنا تعلق دیر میں قطع کرتی ہے۔ اس کے بعد سمجھیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم بھی قوی تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اقدس کو اپنی امت کے ساتھ تعلق بھی بہت تھا۔ وصال کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کی طرف سے فکر تھی۔ اس لئے شدت ہوئی۔ جب حق تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کی طرف سے بےفکر دیا۔ اس وقت روح نے جسم سے تعلق منقطع کیا۔ اب اگر یہ تعلق محمود ہے تو شدت نزع محمود ہے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ میں ہوا اور اگر تعلق مذموم ہے تو شدت مذموم ہے اور اگر کسی کی روح کو اشیاء دنیا سے کچھ بھی تعلق نہ ہو تو نزع میں سہولت ہوگی۔ چاہے میت کافر ہی ہو۔ جیسے کوئی جوگی تعلقات واجبہ وغیر واجبہ سب کو قطع کردے۔ تو اس کو نزع میں سہولت ہوگی۔ گو یہ سہولت محمود نہیں۔

اسی طرح اگر کسی کا جسم بہت کمزور ہو۔ اس کو بھی نزع میں آسانی ہوگی اور یہ بھی کمال نہیں۔ چنانچہ مدقوق کا جسم بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کو نزع سہل ہوتا ہے۔ کہ پاس والوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ کہ روح کب نکل گئی، چاہے مدقوق مومن ہو یا کافر۔ بہر حال شدت نزع کو بشارت ملائکہ سے کچھ منافات نہیں۔ ہر مومن مرتے ہوئے فرشتوں کی بشارتیں سن کر خدا سے ملنے کا مشاق ہو جاتا ہے۔ گو جسم سے جان نکلنے میں کلفت ہی کیوں نہ ہو۔

اس وقت اس کی وہ حالت ہوگی جیسے کسی شخص کو اس کا محبوب کھڑکی میں نکلنے کو کہے کہ اس ایک تنگ کھڑکی میں سے نکل کر ہمارے پاس آؤ۔ تو اس وقت وہ پینترے بدل کر اور دب جھک کر جانے کی کوشش کرے گا۔ گو اس حالت میں اس کے جسم پر خراش آجائے۔ مگر اندر سے اس کا دل وصال محبوب کا خیال کر کے خوش ہوگا۔ بلکہ اس تکلیف پر بھی وہ خوش ہوگا۔ کیونکہ محبوب اس کے

سامنے ہے۔ وہ جانتا ہے۔ کہ محبوب میری اس مشقت کو دیکھ رہا ہے۔ کہ میں کس مصیبت سے اس کے پاس جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس وقت وہ زبان حال سے یوں کہتا ہوا جائے گا۔

بجرم عشق توام میکشند و غوغائیست
تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشائیست

(تیرے عشق کے جرم میں قتل کرتے ہیں اور غوغائی اب تو بھی برسر بام آ کہ عجب تماشا ہے)

واقعی محبوب کے حکم کی تعمیل میں یا اس کی محبت میں نگاہوں کے سامنے جتنی بھی تکلیف ہو۔ سب آسان ہو جاتی ہے۔

اسی لئے حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مراقبہ تعلیم فرمایا۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا.

اپنے رب کے حکم کیلئے (تکالیف پر) صبر کیجئے۔ کیونکہ آپ ہمارے سامنے ہیں ہم آپ کی سب حالت دیکھ رہے ہیں۔ یہاں فانک باعیننا بڑھا کر صبر کو آسان کر دیا۔

ایک عاشق کو کسی شخص کے ساتھ محبت کے جرم میں لوگوں نے بہت مارا۔ ننانوے کوڑوں پر تو اس نے ایک بھی آہ نہ کی۔ سوویں کوڑے پر اس کے منہ سے آہ نکلی۔ کسی نے پوچھا کہ کہ تو نے ننانوے کوڑوں پر تو آہ نہ کی۔ اخیر میں ایک کوڑے پر آہ کی۔ کہ اس کی کیا وجہ تھی۔ کہا ننانوے کوڑوں تک تو محبوب میرے سامنے تھا۔ میرا حال دیکھ رہا تھا۔ اس لئے مجھے کلفت کا احساس نہ ہوا بلکہ اس میں مزہ آ رہا تھا۔ کہ محبوب دیکھ رہا ہے۔ کہ اس کی محبت میں میرا کیا حال ہے۔ اخیر کوڑے پر وہ چلا گیا۔ اس لئے کلفت کا احساس ہوا۔

صاحبو! یہ تو اس کا محبوب تھا۔ جس کی نگاہ سے عاشق غائب ہو گیا اور ہمارا محبوب ایسا ہے کہ کسی وقت کوئی چیز اس سے غائب نہیں ہے۔ ہمارے ہر حال کو دیکھ رہا ہے۔ پھر فانک باعیننا (آپ ہمارے سامنے ہیں) جس کے پیش نظر ہو۔ اس کو مصائب میں کیوں کلفت ہو۔ بہر حال شدت نزع کا شبہ رفع ہو گیا۔ غرض ایک تو یہ وقت ہے نزول ملائکہ کا۔ جب کہ مومن مرتا ہے اور روح نکلنے کے بعد کی کیفیت حدیث میں آتی ہے۔

حتی انه لینادله بعضهم بعضا.

یعنی فرشتے اس روح کو ایک دوسرے کو دیتے ہوئے لے چلتے ہیں۔ ہر ایک چاہتا ہے۔ کہ میں لے کر جاؤں۔ دوسرا چاہتا ہے۔ کہ میں لے کر جاؤں۔

دوسرا وقت اس کا قبر میں ہوتا ہے۔ کہ فرشتے آتے ہیں اور مردہ سے سوالات کرتے ہیں:۔ **من ربک ما دینک و من ھذالرجل.**

تیرا پروردگار کون ہے۔ تیرا دین کیا ہے اور یہ شخص کون ہیں۔ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) مومن تو جواب ٹھیک ہی دے گا پھر اس کو فرشتے بشارت دیں گے۔

نم کنومة العروس. (لم أجد الحديث فی "موسوعة أطراف الحديث النبوی الشريف") تیسرا وقت حشر کا ہے۔ کہ اس وقت فرشتے آئیں گے اور قبر سے مومن کا استقبال کریں گے اور اس کو بشارتیں سنائیں گے اور تعظیم وتکریم کے ساتھ میدان حشر میں لے جائیں گے۔ (الاستقامت ج ۱۳)

تفسیری نکتہ

ہمارے علماء نے خَلَقَ سَمٰوٰتِ وَاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامِ میں یہی حکمت بیان کی ہے کہ اس میں حق تعالیٰ نے ہم کو تنبیہ کی ہے کہ کام میں عجلت نہ کرنا چاہئے بلکہ سکون و اطمینان سے کرنا چاہئے دیکھو ہم نے باوجودیکہ ہم ایک کلمہ کن سے سب کچھ پیدا کر سکتے تھے پھر بھی زمین وآسمان کو چھ دن میں بنایا ہے پھر تم باوجود عجز کے عجلت کیوں کرتے ہو تو جیسا علماء نے حق تعالیٰ کے اس فعل کو تعلیم عملی پر محمول کیا ہے اسی طرح میرے نزدیک قرآن میں سجع کی رعایت نہ ہونا بھی عملی تعلیم ہے

حق تعالیٰ کے لئے ایک تو افعال ہیں اور ایک صفات ہیں اور ظاہر ہے کہ صفات کا قرب بہ نسبت افعال کے ذات سے زیادہ ہے کیونکہ صفات لا عین لا غیر ہیں اور افعال اتفاقاً غیر ذات ہیں اس لئے افعال کو بہ نسبت صفت کے ذات سے بعد ہے اور اسماء الٰہیہ میں بعض اسماء تو صفات پر دال ہیں اور بعض اسماء افعال پر دال ہیں پھر آج میں نے بہت غور کیا تو اسماء الٰہیہ میں کوئی نام ایسا نہیں پایا جو مرتبہ صفت میں غضب پر دال ہو بہت سے بہت آپ قہار و جبار کو پیش کریں گے تو جبار کے معنی تو غضب کے نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی جو صفت جبار ہے وہ جبر کسر کے معنی میں سے ہے جس کا حاصل ہے تلافی کرنا شکستگی کو جوڑنا تو اس کی دلالت تو خود رحمت ہی پر ہے اور قہار میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ اسم فعلی ہو جو فعل پر دال ہو اسم وصفی نہ ہو جیسے محیی و ممیت و خالق و رازق ہے تو اس صورت میں تو شبہ ہی نہیں ہو سکتا دوسرا احتمال یہ ہے کہ اسم صفت ہو مگر لغت عربی میں قہر کے معنی غصہ و غضب کے ثابت نہیں بلکہ

غلبہ کے معنی ہیں پس یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غضب حق تعالیٰ کی صفت ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ حق تعالیٰ سے صدور غضب نہیں ہوتا۔ ہوتا ہے لیکن درجہ فعل میں ہوتا ہے نہ کہ درجہ صفت میں اور رحمت کا ثبوت درجہ صفت میں ہوتا ہے جو کہ قدیم ہے اور اسی قدوم کے سبب صفت و موصوف کے تعلق میں ارادہ کو دخل نہیں کیونکہ لازم ذات وملزوم میں تحلل جعل نہیں ہوا کرتا گو رحمت کا تعلق عباد سے تو بالارادہ ہی ہوگا مگر ذات کی طرف اُس کا انتساب بلاارادہ ہے اور غضب کا انتساب بھی ذاتِ حق کی طرف بالارادہ ہے اور یہ ایک دوسری توجیہ ہے سبقت رحمتی علی غضبی کی کہ رحمت کو غضب پر سبقت بہ ایں معنی ہے کہ وہ صفت ہے اور یہ فعل ہے اور صفت سابق ہوتی ہے فعل پر یہی وجہ ہے کہ رحمت تو بلا سبب بھی ہو جاتی ہے کیونکہ مقتضی ذات کا ہے اور غضب بلاسبب نہیں ہوتا اور ایک توجیہ سبقت رحمتی علی غضبی کی وہ ہے جو میں نے استاد رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہے کہ جس شخص میں مقتضیات رحمت وغضب دونوں مجتمع ہوں اُس پر رحمت ہوتی ہے اور ایک صورت سبق کی یہ ہے کہ اعمال حسنہ میں تضاعف ہوتا ہے کہ ایک حسنہ کو دس حسنات کی برابر کر دیا جاتا ہے اور بعض کے لئے ایک حسنہ کو سات سو حسنہ تک اور بعض حسنات کو الی مالا تینا ہی بمعنی لاتقف عند حد بڑھایا جاتا ہے چنانچہ صوم کے بارے میں بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس کے ثواب کا تضاعف مالانہایت بمعنی لاتقف عند حد تک ہوتا ہے اور اعمال سیئہ میں تضاعف نہیں ہوتا بلکہ ہر گناہ ایک ہی گناہ شمار ہوتا ہے یہ توجیہ بھی لطیف ہے (مگر آج کی توجیہ الطف واشرف ہے ۱۲ ظ) اور اس سے معلوم ہوا کہ رجاء وخوف میں رجاء اصل ہے کیونکہ اس کا تعلق رحمت سے ہے جو صفت حق ہے اور خوف اصل نہیں اس کا تعلق غضب سے ہے جو صفت نہیں بلکہ فعل ہے اور ظاہر ہے کہ صفت بمقابلہ فعل کے اصل ہے اس لئے لازم ہے کہ ان دونوں کی فروع میں بھی جو شے فرع صفت کی ہے وہ اصل ہو اور جو غضب کی فرع ہے وہ اصل نہ ہو پس رجاء وخوف کی ایسی مثال ہے جیسے غذا ودوا کہ غذا اصل ہے اور دواء عارض پس رجاء غذا ہے اور خوف دوا ہے۔ (جمال الجلیل ج ۱۴)

ایک مسنون دعا کی تشریح

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **واسئلک من خشیتک ما تحول به بینی و بین معاصیک** (لم أجد الحديث في "موسوعة إطراف الحديث النبوي الشريف") کہ اے اللہ! میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں جس سے گناہوں میں آڑ ہو جائے یہ حد آپ

نے اس لئے بیان کی ہے کہ غلبہ خوف سے تعطل کا اندیشہ ہے ہم نے تجربہ کیا ہے کہ زیادہ خوف سے مایوسی ہو جاتی ہے کانپور میں ایک وکیل میرے ہم نام تھے انہوں نے احیاء العلوم کا باب الخوف دیکھا تھا ان کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ خاتمہ بالخیر ہونے سے مایوس ہو چلے اور اس کا نام سُن کر تھراتے اور کانپتے تھے ایک دن وہ میرے پاس کتاب لے کر آئے اور حالت یہ تھی کہ کتاب کو کھولتے ہوئے ان کا ہاتھ کانپتا تھا آخر میں نے تسلی کی جب کچھ ان کے ہوش وحواس درست ہوئے اور مجھ سے میری اس تقریر کے ضبط کرنے کی درخواست کی چنانچہ وہ ضبط اور شائع ہو چکی اس کا نام خاتمہ بالخیر ہے اسی طرح ایک انسپکٹر پولیس پر خوف غالب ہو گیا تھا اور وہ اس غلبہ سے اپنی مغفرت سے مایوس تھا آخر کہنے لگا کہ میں دوزخ میں ضرور جاؤں ہی گا پھر ظلم ورشوت میں بھی کیوں کمی کروں مگر نہ معلوم حق تعالیٰ کو اس کا کون سا فعل پسند آ گیا ہو گا کہ آخر میں توبہ نصیب ہوئی اور خاتمہ اچھا ہو گیا۔ (جمال الجلیل ج ۱۴)

افراط خوف کا اثر

بعض دفعہ غلبہ خوف سے یہ حالت ہو جاتی ہے کہ انسان سمجھ لیتا ہے کہ میری بخشش تو ہو نہیں سکتی یقیناً میں جہنم میں جاؤں گا پھر گناہوں میں کمی کیوں کروں۔ جیسے ایک دیہاتی نے کہا تھا پڑھن تو مرن نہ پڑھن تو مرن پھر دانتا کر کر کیوں کرن یعنی پڑھ کر بھی ایک دن مریں گے اور بے پڑھے بھی مریں گے پھر کس لئے پڑھنے میں محنت کریں غرض چونکہ خوف کا افراط مضر تھا اس لئے اس کو محدود کیا گیا اور رجاء کے لئے کوئی حد نہیں کیونکہ یہاں یہ اندیشہ تو ہے ہی نہیں کہ غلبہ رجا سے پیغمبر ہو جائے گا جیسے ایک دیہاتی نے میاں جی سے کہا تھا کہ میرے لونڈے کو ڈھیر نہ پڑھائیو کہیں لوٹ پوٹ پگمبر (پیغمبر) ہو جائے تو یہاں یہ اندیشہ نہیں اس لئے بزرگوں نے خوف کا نام سوط رکھا ہے اور ظاہر ہے کہ کوڑا اصل مقصود نہیں ہوتا بلکہ ضرورت کے وقت بقدر ضرورت استعمال کیا جاتا ہے اسی لئے خوف مانع عن المعاصی قبل الموت تک مطلوب ہے جب تک کہ عمل ہو سکے اور موت کے وقت انقطاع عمل ہے وہ خوف مطلوب نہیں بلکہ اُس وقت غلبہ رجا مطلوب ہے چنانچہ حدیث میں ہے لا یموتن احدکم الا وھو یحسن الظن باللہ تعالیٰ (او کمال قال) (سنن ابن ماجة: ۴۱۶۷، مسند احمد ۳: ۲۹۳، مشکواۃ المصابیح: ۲۶۰۵۔) شاید اس جگہ کسی کو شبہ ہو کہ

بعض دفعہ غلبہ رجا سے دلیری و بے باکی پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے لئے بھی ایک حد ہوئی کہ رجا اس حد تک مطلوب ہے۔ جس سے دلیری و بے باکی پیدا نہ ہو اس کا جواب یہ ہے کہ جس چیز سے دلیری و بے باکی پیدا ہوتی ہے وہ رجاء نہیں ہے کیونکہ میں اوپر **وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ** کے ذرا قبل کہہ چکا ہوں کہ رجا بدون عمل کے نہیں ہوتی بلکہ وہ تمنا و غرور ہے پس رجاء کے لئے حد ثابت نہ ہوئی۔ (جمال الجلیل ج ۱۴)

حکیمانہ جواب

ایک دفعہ ریل میں ایک ہندو نے مجھ سے کہا کہ صاحب مسلمانوں میں اور تو سب باتیں اچھی ہیں مگر جانوروں پر ظلم بہت کرتے ہیں میں نے کہا کیا ظلم کرتے ہیں کہنے لگا یہی کہ ان کا گوشت کھاتے ہیں میں نے کہا پھر یوں تو تم بھی ظلم کرتے ہو کہ روٹی کھاتے اور درختوں کو کاٹتے ہو کہنے لگا اجی ان میں جان کہاں ہے میں نے کہا اگر ان میں جان نہ ہوتی تو ان کے کھانے سے تمہارے اندر جان کیونکر بڑھتی اور قوت حیات کیونکر پیدا ہوتی ہے بے جان چیز کے کھانے سے جان نہیں بڑھ سکتی۔ بس وہ چپ ہو گیا۔ (اجر الصیام من غیر انصرام ج ۱۴)

وجود صانع حقیقی:

ہمارے ماموں منشی شوکت علی صاحب کا ایک لطیفہ ہے آپ نے ایک ہندو سے پوچھا کہ لالہ جی یہ تو بتلاؤ گائے ہندو یا مسلمان اگر ہندو ہے تو مسلمانوں کے گھر کا چارہ کیوں کھاتی ہے اور اگر مسلمان ہے تو جب تمہارا دیوتا ہی مسلمان ہے تو تم مسلمان کیوں نہیں ہوتے، ہندو بالکل لا جواب ہو گیا اور کہنے لگا منشی جی تم تو ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہو (اجر الصیام من غیر انصرام ج ۱۴)

شانِ عبدیت

نماز میں شان عبدیت اس سے کیا زیادہ ہو گی کہ اشرف الاعضاء یعنی وجہ کو اخس الاشیاء یعنی زمین پر رکھا جاتا ہے، چہرہ کا اشرف الاعضاء ہونا تو ظاہر ہے کہ اعضاء رئیسہ دماغ و سمع بصر سب اسی میں ہیں، اسی لئے حدیث میں منہ پر مارنے سے ممانعت آئی ہے اور زمین کا اخس و ارذل ہونا اس سے ظاہر ہے کہ سب اس پر ہگتے موتتے ہیں اور جو چاہے تصرف کرتے ہیں اس پر چہرہ کو رکھنا

غایت عبودیت ہے صاحبو! شکر کیجئے کہ ہم لوگوں کو اس کی عادت بچپن ہی سے ہے اس لئے منکر نہیں معلوم ہوتی اور جو بڑی عمر میں شروع کرتے ہیں چونکہ وہ اوروں کو بھی یہی افعال کرتے دیکھتے ہیں اس لئے ان کو گرانی نہیں ہوتی ورنہ واقعی حرکات صلوٰۃ میں جس درجہ ذلت و عبودیت ہے متکبرین اس پر دفعۃً قادر نہیں ہو سکتے متکبرین کو تو جھکنا بھی دُشوار ہے (اجر الصیام من غیر انصرام ج ۱۴)

ایک آیت کی تفسیر

حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا (اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں) اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں علم خشیت کے لئے شرط ہے علت نہیں ہے اس کی تفسیر میں لوگ غلطی کرتے ہیں کہ علم کو علت خشیت سمجھتے ہیں اس لئے اس پر یہ اشکال بھی وارد ہوتا ہے کہ آیت کا مقتضا تو یہ ہے کہ کوئی عالم خشیت سے خالی نہ ہو اور کسی مولوی سے گناہ کا صدور نہ ہو حالانکہ اس کے خلاف مشاہدہ ہوتا ہے، یہ اشکال پہلے مجھے بھی ہوتا تھا پھر خود بخود قلب پر یہ بات وارد ہوئی کہ اس کا حصر مفہوم تو یہ ہے کہ ''**لا یخشی اللّٰہ من عبادہ الا العلماء**'' کا خلاصہ یہ ہوا کہ ''**لا خشیۃ الا بالعلم**'' نہ کہ ''**لا علم الا بالخشیۃ**'' پس یہ حصر ایسا ہو گیا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے **لاصلوٰۃ الا بطھور** کہ نماز بدون وضو کے نہیں ہوتی جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کا جہاں وجود ہوگا وضو کے ساتھ ہوگا، بدون وضو کے نہ ہوگا، یہ تو مطلب نہیں کہ جب وضو کا وجود ہو تو اس کے ساتھ نماز کا وجود بھی لازم ہو اسی طرح یہاں پر علم شرط خشیت ہے کہ جہاں خشیت ہے وہاں علم ضرور ہے گو وہ مولوی بھی نہ ہو کیونکہ جاہل بھی اللہ سے ڈرتا ہے تو اسے کم از کم عذاب ہی کا علم ہے تو خشیت بدونِ علم کے اس کو بھی نہیں ہوتی باقی یہ ضروری نہیں کہ جہاں علم ہو وہاں خشیت لازم ہو کیونکہ علم اس کی علت نہیں۔ (المعرق والرحیق للمحرق والغریق ج ۱۴)

آپ نے جان لیا کہ طرق طلب جنت کا حاصل دو (۲) امر ہیں اب یا تو ایک دونوں میں سے اصل ہے دوسرا معین یا دونوں اصل ہیں، مجھے یوں معلوم ہوتا ہے اپنے مذاق سے کہ اصل نہی النفس ہے اور خوف اس کے لئے معین ہے میں یہ اپنے دل سے نہیں کہتا ہوں بلکہ اس حدیث سے کہ نسالک من خشیتک ماتحول بہ بیننا وبین معاصیک۔ (لم أجد الحدیث فی ''موسوعۃ أطراف الحدیث النبوی الشریف'') دعا مانگتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ

اے اللہ! ہم مانگتے ہیں خوف میں سے اس قدر کہ حائل ہو جاویں آپ اس سے، ہم میں اور معصیت میں، تعلیل سے یہ بات نکلتی ہے کہ خشیت معصیت سے بچنے کے لئے مطلوب ہے بالذات مقصود نہیں، ورنہ نسئالک خشیتک مطلقا فرماتے کسی چیز کی حد مقرر کرنے سے صاف یہی بات مفہوم ہوا کرتی ہے کہ اس سے زیادہ مطلوب نہیں خوف کی حد فرمادی کہ اس قدر چاہتے ہیں کہ معصیت سے مانع ہو معلوم ہوا کہ اگر خوف اس سے زیادہ ہو جائے تو محمود نہیں، خوف مع الرجاء یہی ہے اور اگر خوف ہی خوف ہو کہ رجاء نہ رہے اور نااُمیدی تک نوبت پہنچ جائے تو یہ کفر ہے اس سے معصیت چھوٹی نہیں بلکہ آدمی یہ سمجھ کر کہ طاعت سے کیا ہوگا زیادہ معصیت میں پڑ جاتا ہے، میں نے خود دیکھا ایک مغلوب کو تب معلوم ہوا کہ شریعت میں جو توسط ہے اُس میں یہ مصلحت ہے یہ ایک وکیل صاحب تھے نماز روزہ کے خوب پابند تھے، خوف غالب ہوا تو عجیب حالت ہو۔(طلب الجنۃ ج ۱۴)

طاعت کے فائدے

میں کہتا ہوں امتحان کرنے سے تو کیا اثر، بھولے سے بھی طاعت اگر ہوگئی تو اثر ضرور کرے گی، کپڑا بھولے سے رنگ میں گر جائے تو گو وہ بات نہ آئے گی کہ اگر کوئی قصداً رنگتا مگر دھبے تو ضرور پڑ ہی جائیں گے، تجربہ ہوا ہے لوگوں کو کہ دھوکے سے طاعت ہوگئی اور اثر ہو گیا، قصہ مشہور ہے کہ ایک چور بادشاہ کی لڑکی پر عاشق تھا، ایک روز کہیں چوری کے ارادہ سے بادشاہ کے یہاں پہنچ گیا وہاں بادشاہ اور بیگم میں اسی لڑکی کی شادی کی نسبت گفتگو تھی، بادشاہ کہہ رہے تھے کہ میں تو اس کی شادی کسی ایسے شخص سے کروں گا کہ نہایت عابد و زاہد متقی ہو، یہ چور صاحب چوری تو بھول گئے اور بہت غنیمت سمجھا کہ آج خوب کام بنا وہاں آ کر ایک مسجد میں جا بیٹھے اور دن رات عبادت کرنا شروع کی تہجد بھی اشراق بھی چاشت بھی غرض عبادت ہی سے کام تھا لوگوں میں شہرہ ہوا کہ ایک بڑے عابد صاحب......... تشریف لائے ہیں رفتہ رفتہ تمام شہر میں ان کی شہرت ہوگئی ادھر بادشاہ نے بھی آدمی تعینات کر رکھے تھے کہ دیکھو شہر میں سب سے زیادہ عابد و پرہیز گار کون ہے، ان مخبروں نے خبر دی کہ ایک عابد کہ ایک صاحب فلاں مسجد میں......... قیام رکھتے ہیں ان سے زیادہ متقی و پرہیز گار کوئی نظر نہیں آتا، بادشاہ نے خاص وزیر کو ان کے پاس پیغام لے کر بھیجا اور یہاں کام ہو چکا تھا، انہوں نے التفات بھی نہ کیا، خیر وزیر نے نہایت ادب

سے پیغام شاہی سُنایا انہوں نے کہا دراصل نیت تو میری فاسد تھی اسی غرض سے عبادت شروع کی تھی مگر حق سبحانہ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا اب مجھے آپ کی بیٹی کی ضرورت ہے نہ آپ کے جاہ وحشم کی بس تشریف لے جایئے اور میرا وقت ضائع نہ کیجئے۔ (طلب الجنة ج ۱۴)

صورت مثالی

صراط مستقیم کی شکل مثالی پل صراط کے ہے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی حقیقت لکھی ہے جس سے یہ استبعاد بھی دفع ہو جاتا ہے کہ جب وہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے تو پھر اس پر چلیں گے کیسے، سوانہوں نے اس کی حقیقت بتلا دی ہے لیکن یہ تحقیق ظنی ہے محض تائید کے لئے ذکر کر دی ہے، باقی نفس مسئلہ کہ اعمال کی مثالی صورتیں ہوتی ہیں تو یہ حدیث سے ثابت ہو چکا، وہ حقیقت پل صراط کی یہ لکھی ہے کہ شریعت میں ہر چیز کا اعتدال مقصود ہے اور اعمال فرع ہیں اخلاق کی تو اصل محل اعتدال کا اخلاق ہیں۔ (طلب الجنة ج ۱۴)

اخلاقی حدود:

ان کا بیان یہ ہے کہ اخلاق کے اصول تین ہیں یعنی اصل میں تین قوتیں ہیں جو جڑ ہیں تمام اخلاق کی یعنی جن قویٰ سے اخلاق پیدا ہوئے ہیں وہ تین ہیں قوت عقلیہ، قوت شہویہ، قوت غضبیہ، حاصل یہ کہ اپنے منافع کے حصول اور مضار کے رفع کے لئے خواہ وہ دنیویہ ہوں یا اخرویہ دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک وہ قوت کہ جس سے منفعت ومضرت کو سمجھے کہ یہ مضرت یا منفعت ہے وہ قوت مدرکہ قوت عقلیہ ہے اور ایک یہ کہ منفعت کو سمجھ کر اس کو حاصل کرے، یہ قوت شہویہ کا کام ہے اور ایک یہ کہ مضرت کو سمجھ کر اس کو دفع کرے۔ یہ قوت دافعہ قوت غضبیہ ہے۔ غرض یہ قویٰ ہیں ایک کا نام قوت عقلیہ ہے ایک کا نام قوت شہویہ ہے ایک کا قوت غضبیہ، پھر ان تینوں سے مختلف اعمال صادر ہوتے ہیں پھر اُن اعمال کے تین درجے ہیں افراط وتفریط اعتدال، چنانچہ قوت عقلیہ کا افراط یہ ہے کہ اتنی ہے کہ وحی کو بھی نہ مانے، جیسے یونانیوں نے کیا، تفریط یہ ہے کہ اتنی گھٹے کہ جہل وسفہ تک اُتر آئے، اسی طرح قوت شہویہ کا ایک درجہ افراط ہے کہ حلال حرام کی بھی تمیز نہ رہے، بیوی اجنبی سب برابر ہو جائیں اور ایک درجہ ہے تفریط یعنی ایسے پرہیز گار بنے کہ بیوی سے بھی پرہیز کرنے

لگے یا مال کے ایسے حریص ہوئے کہ اپنا پرایا سب ہضم کرنے لگے یا ایسے زاہد بنے کہ ضرورت کی چیزیں بھی چھوڑ دیں، اسی طرح غضبیہ کا افراط یہ ہے کہ بالکل بھیڑیا ہی بن جاویں اور تفریط یہ کہ ایسے نرم ہوئے کہ کوئی جوتے بھی مارے لے دین کو بھی برا بھلا کہہ لے تب بھی غصہ نہ آوے تو یہ افراط وتفریط تھا ایک ان تینوں قوتوں کا اعتدال یعنی جہاں شریعت نے اجازت دی ہو وہاں تو ان قوتوں کا استعمال کرے اور جہاں اجازت نہ دی ہو وہاں ان قوتوں سے کام نہ لے، یہ اعتدال ہے تو ہر قوت میں تین درجے ہوئے، افراط تفریط اعتدال۔ ان سب درجوں کے الگ الگ نام ہیں جو قوت عقلیہ کا افراد درجہ ہے اس کا نام ہے جزیرہ جو تفریط کا درجہ اس کو سفاہت لکھتے ہیں جو اعتدال کا درجہ ہے اس کا لقب حکمت ہے، اسی طرح قوت شہویہ کا افراط کا درجہ فجور ہے، تفریط کا درجہ خمود ہے، اعتدال درجہ عفت ہے اور قوت غضبیہ کا بڑھا ہوا درجہ تہور ہے گھٹا ہوا درجہ جبن ہے، اعتدال کا درجہ شجاعت ہے تو یہ نو چیزیں ہوئیں جو تمام اخلاق حسنہ وسیئہ کو حاوی ہیں اور مطلوب ان نو درجوں میں صرف تین درجے اعتدال کے ہیں یعنی حکمت، عفت، شجاعت باقی سب رذائل ہیں تو اصول اخلاق حسنہ کے یہ تین ہوئے اور ان تینوں کے مجموعہ کا نام ہے عدالت اسی لئے اس اُمت کا لقب ہے اُمت وسط یعنی اُمت عادلہ غرض انسان وہ ہے جس میں اعتدال ہو اب آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں بزرگ تو بہت ہیں انسان بہت کم ہیں چنانچہ شاعر کہتا ہے۔

زاہد شدی و شیخ شدی و دانشمند — ایں جملہ شدی ولیکن انسان نشدی

(زاہد ہوئے شیخ ہوئے دانشمند ہوئے، یہ سب کچھ ہوئے لیکن انسان نہ بنے) (طلب الجنۃ ج ۱۴)

اعتدال حقیقی

اعتدال حقیقی سب میں زیادہ مشکل ہے کیونکہ اعتدال حقیقی کہتے ہیں وسط حقیقی کو کہ اس میں ذرہ برابر نہ افراط ہو نہ تفریط ہو اور مشاہدہ سے اس کا دشوار ہونا ظاہر ہے اور پل صراط اسی اعتدال کی صورت مثالیہ ہے اور اس کی دشواری تلوار کی تیزی کی صورت میں ظاہر ہوئی اور اس کا اعتدال حقیقی بال سے زیادہ باریک ہونے کی صورت میں ظاہر ہوا کیونکہ جب اعتدال وسط حقیقی ہوگا اور وسط حقیقی غیر منقسم ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ منقسم ہو تو پھر خود اس میں طرفیں اور وسط نکلیں گے تو وہ وسط حقیقی نہ رہا بہر حال وسط حقیقی کا غیر منقسم ہونا لازم ہے اور بال منقسم ہے تو وہ بال سے

زیادہ باریک ہوگا، پس اس طریق شریعت کا وسط حقیقی ہونا اس شکل سے ظاہر ہوگا کہ وہ پل صراط بال سے زیادہ باریک ہوگا اس تشبیہ میں کوئی امر خلاف اصول عقلیہ لازم نہیں آیا اور اسی درجہ کے وسط ہونے سے اُس کا مشکل ہونا بھی لازم آیا کہ نہ اِدھر جاؤ نہ اُدھر جاؤ، بیچوں بیچ میں رہو بس یہ ہے حقیقت پل صراط کی وہ شریعت کی صورت مثالی ہے۔ جس کا بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہونا بدلائل ثابت کر دیا گیا تو شریعت پر چلنے والے اب بھی پل صراط پر چل رہے ہیں جب یہ ہے تو جو یہاں پل صراط پر یعنی شریعت پر چل چکا ہے وہ وہاں بھی با آسانی چل سکے گا، کیونکہ وہ یہی تو ہے اب بتلایئے پل صراط پر چلنا کیا دشوار ہوا جو یہاں شریعت پر چل رہا ہے، اسے وہاں چلنا بھی آسان ہو جائے گا، سو پل صراط پر چلنے کا طریقہ بہت ہی آسان ہے اور وہ سنت طریقہ ہے یہی سنت بیچ کا رستہ ہے (طلب الجنة ج ۱۴)

مصالح عقلیہ:

مصالح عقلیہ ایک کتاب ہے اس میں میں نے ایک مقدمہ لکھا ہے نہایت لطیف نہایت نفیس میں اس کی اس حیثیت سے تعریف نہیں کر رہا ہوں کہ وہ میری تقریر ہے اور اپنی تقریر محبوب ہوا ہی کرتی ہے مقرر سے کیا بحث ہے وہ تقریر دراصل ہے ہی اچھی اگر وہ تقریر دوسرے کی بھی ہوتی تب بھی میں اس کی ایسی ترغیب دیتا کیونکہ وہ بہت ہی ضروری ہے تو میں مصالح عقلیہ کے مقدمہ کو یاد دلاتا ہوں کہ وہ دیکھنے کے قابل ہے اگر کسی کو مصالح کے مطالعہ کا شوق ہو اس کے لئے تو نہایت ہی ضروری ہے اس کا پہلے سے دیکھ لینا ورنہ ضرور ضرر ہوگا اس واسطے کہ علوم اسرار غامض ہوا کرتے ہیں اور میں نے بھی اس وقت محض تقلیداً لبعض العلماء بیان کر دیئے ورنہ میرا اصلی مذاق یہ نہیں ہے یوں سمجھئے کہ مہمانوں کی خاطر سے چٹنی دستر خوان پر رکھ دی ہے (چنانچہ چند خاص مہمانوں ہی کی تحریک سے یہ وعظ بیان فرمایا گیا تھا جن میں سے بعض پیرزادے تھے اور بعض بوجہ دوسرے سلسلہ میں ہونے کے متعارف دَرویشانہ مذاق رکھتے تھے ۱۲) کسی کا بغیر چٹنی کے منہ ہی نہ چلے تو کیا کیا جائے، ہاں جس کے مذاق کے موافق نہ ہو وہ ساری تقریر کو بھلا دے لیکن جو شخص جزئیات کو بھی یاد رکھنا چاہئے، اُسے کلیات کا بھلا دینا جرم ہے، اگر وہ کلیات کو بھلا دے گا تو کلیات یعنی کلھیوں میں رکھا جاوے گا، یعنی جیل خانوں میں، کیا معنی کہ تنگی میں پڑے گی اُس کی روح۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

نکتہا چوں تیغ پولا دست تیز   چوں نداری تو سپر واپس گریز
پیش ایں الماس بے اسپر میا   کز بریدن تیغ رانبود حیا

(تصوف کے نکتے فولاد کی تلوار کی طرح تیز ہیں اگر تیرے پاس ڈھال (حفاظت کا سامان) نہ ہو تو واپس ہو جا اس الماس کے سامنے بغیر ڈھال کے مت جا کیونکہ تلوار کو کاٹتے وقت کسی کا لحاظ اور شرم نہیں ہوتی)

اور جنہوں نے بے دھڑک ان مضامین کو بیان کر دیا ہے اور کسی قسم کی احتیاط نہیں کی تو ان پر مولانا سخت ناراض ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند   از سخن ہا عالمے را سوختند

(وہ قوم ظالم ہے جس نے آنکھیں بند کرلیں اور ناروا باتوں سے ایک عالم کو جلا دیا)

سبحان اللہ کیسے محقق شخص ہیں، یہ فرماتے ہیں۔

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند   از سخن ہا عالمے را سوختند

(وہ قوم ظالم ہے جس نے آنکھیں بند کرلیں اور ناروا باتوں سے ایک عالم کو جلا دیا)

مگر باوجود اس کے خود بھی کہیں کہیں نکتے بیان کرنے لگتے ہیں مگر بضرورت اور مخاطب کے فہم کا ہر موقع پر لحاظ کر کے چنانچہ عالم مثال کی صور بیان کرتے کرتے جوش میں حق تعالیٰ کی بھی بہت سی مثالیں بیان کر گئے، پھر سب کچھ بیان کر کے آخر میں سب کی نفی فرما دی اور تنزیہ کو یہ کہہ کر ظاہر کر دیا۔

اے بروں از وہم وقال وقیل من   خاک برفرق من و تمثیل من

(اے وہ ذات عالی جو میرے وہم اور قیل وقال سے افزوں ہے مجھ پر اور میری مثال پر خاک)

قرب کی صورتیں

قرب کی مختلف صورتیں ہیں کبھی بصورت عروج ہوتا ہے اور کبھی بصورت نزول جنت میں قرب بصورت عروج ہوگا اور یہاں سجدہ میں بصورت نزول ہوتا ہے اس مضمون کو مولانا رومی نے کیا خوب بیان فرمایا چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

گفت پیغمبر کہ معراج مرا   نیست از معراج یونس اجتبا

(پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری معراج کو حضرت یونس علیہ السلام کی معراج پر ترجیح مت دو)

مولانا اس مقام پر حدیث لاتفضلونی علی یونس بن متی (الشفاء للقاضی عیاض ۱: ۲۶۵، اِتحاف السادۃ المتقین ۲: ۱۰۵۔) کی تفسیر فرما رہے ہیں چنانچہ سرخی میں بھی یہی حدیث لکھی ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھ کو یونس علیہ السلام پر فضیلت نہ دو اور معراج کے قصہ کو بطورِ مثال لائے ہیں، پس فرماتے ہیں کہ یونس علیہ السلام کا جو قصہ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ بدوں صریح اجازت خداوندی کے تبلیغ چھوڑ کر وہ اپنے شہر سے چلے گئے یہاں تک کہ کشتی میں سوار ہوئے اور کشتی چکر میں آ گئی پھر ان کو پانی میں ڈال دیا گیا اور مچھلی نے نگل لیا تو ان کی اس حالت کو نقص پر محمول نہ کرو کیونکہ یہ ان کے لئے ویسی ہی معراج تھی جیسے مجھے معراج ہوئی ہے پس تم میری معراج کو ان کی معراج پر ایسی فضیلت نہ دو جس سے ان کی معراج کو گھٹا دو اور اس کا نقص ظاہر ہو کیونکہ ان کی معراج بھی کامل تھی ناقص نہ تھی گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج اکمل تھی اب یہاں عام لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو آسمانوں پر عروج ہوا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حالت کو معراج کہنا درست ہے مگر حضرت یونس علیہ السلام کو تو عروج نہیں ہوا بلکہ نزول ہوا تھا اس کو معراج کہنا کیوں کر صحیح ہوگا مولانا نے اس کا جواب دیا ہے۔

قرب از پستی بیا لا رفتن ست   قرب حق از قید ہستی رستن ست

(قرب اس کا نام نہیں کہ نیچے سے اوپر چلے جاؤ بلکہ قرب یہ ہے کہ ہستی سے چھوٹ جاؤ)

فرماتے ہیں کہ قرب کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ نیچے سے اوپر کو بلایا جائے اور ایک صورت یہ بھی ہے کہ اوپر سے نیچے کو بلایا جائے کیونکہ قرب حق کسی خاص صورت کے ساتھ مقید نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کسی خاص جہت کے ساتھ مقید نہیں ہیں۔

نور اوازیمن ویسر وتحت و فوق   برسرو برگردنم مانند طوق

(اس کا نور دائیں اوپر نیچے ہر طرف ہے جیسے گلے کا ہار گردن کو گھیرے ہوتا ہے)

ان کی تجلی تو ہر جہت میں ہے اس لئے ہر سمت میں معراج ہو سکتی ہے، خود ایک حدیث میں آیا ہے

لودلیتم محبل الی الارض السفلی لھطباء علی اللہ (الدر المنثور ۶: ۱۷۰، و تفسیر ابن کثیر ۸: ۳۳، تفسیر الطبری: ۲۷.) (رواہ الترمذی فی کتاب التفسیر من جامعہ عن الحسن عن ابی ھریرۃ مرفوعاً وقال غریب و حسن لم یسمع من ابی ھریرۃ مقاصد ص 160)

یعنی اگر ایک رسی کو ارض سفلی تک لٹکایا جائے تو وہ حق تعالیٰ پر پہنچے گی مطلب یہ ہے کہ

وہاں بھی تجلی حق موجود ہے کوئی جگہ اور کوئی سمت ان کی تجلی سے خالی نہیں رہی، عرش کی تخصیص اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی میں تو اس پر تو سب کا اجماع ہے کہ حق تعالیٰ مکان سے منزہ ہیں عرش مستقر الٰہی بالتعارف ہرگز نہیں پھر اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے کیا معنی ہیں اس کے متعلق سلف نے تو سکوت کیا ہے (اور یہی اسلم ہے) اور خلف نے مناسب تاویلیں بیان کی ہیں اسی قبیل سے حضرت حاجی صاحب کی ایک تاویل ہے فرمایا کہ نصوص میں اللّٰہ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ نہیں فرمایا بلکہ جا بجا اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمت کی تجلی عرش پر زیادہ ہے پس یہ تخصیص ایک خاص صفت کی تجلی کے اعتبار سے ہے، ذات کے اعتبار سے نہیں اسی لئے احکام سب عرش سے آتے ہیں کیونکہ احکام میں رحمت کا خاص ظہور ہے، (السورۃ الرحمانیہ ج ۱۴)

سلاطین دنیا کے یہاں یہ جرم ہے مگر حق تعالیٰ کو یہ ادا پسند ہے بلکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض باتیں سلاطین دنیا کے یہاں ادب ہیں اور وہاں بے ادبی میں داخل ہیں، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **لا یقل احدکم اللھم اغفر لی ان شئت اللّٰھم ارحمنی ولیعزم المسلة فانہ لا یکرہ لہ** (المصنف لابن ابی شیبة ۱۰: ۱۹۹.) یعنی دعا میں یوں نہ کہو کہ اے اللہ! اگر آپ چاہیں تو مجھے بخش دیں (بلکہ یوں کہو کہ اے اللہ مجھے ضرور بخش دیجئے ۱۲) کیونکہ دنیا میں جو سلاطین کو یوں لکھا جاتا ہے کہ اگر حضور .... کی مرضی ہو تو ایسا کر دیجئے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا نہ لکھنے سے ان پر دباؤ ہوتا ہے اور وہ ہر درخواست کے پورا کرنے پر قادر بھی نہیں ہیں اس لئے ان قیود کی ضرورت ہے اور حق تعالیٰ پر کسی کا کچھ بھی دباؤ نہیں ہے اور وہ ہر درخواست کے پورا کرنے پر بھی قادر بھی ہیں تو وہاں ان شئت کی کیا ضرورت ہے پھر ایسے دربار میں اگر ثمرہ ادھار بھی ملے تو کیا حرج ہے جہاں ادھار کا ثمرہ اضعاف مضاعفہ دیا جاتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗ اَجْرٌ کَرِیْمٌ (جو شخص اللہ تعالیٰ کو قرض دے قرض حسنہ تو اللہ تعالیٰ اس کا کئی گنا اضافہ فرمادیں گے اور اس کے لئے اکرام واعزاز والا اجر ہوگا) یہاں قرض حسنہ کے وہ معنی نہیں جو عوام میں مشہور ہیں کہ بس خوشی سے ادھار دے دو اگر مقروض کے پاس ہوا تو ادا کر دے گا اور نہیں تو صبر کرو مگر اللہ تعالیٰ کا قرض حسنہ ایسا نہیں کہ جو دیا ہو وہی لے لو بلکہ اختیار ہے کہ جتنا چاہے سود لے لو، گو اس کو سود کہنا بے ادبی ہے مگر میں

نے مشاکلۃً اس کو سود کہہ دیا ہے، حق تعالیٰ ایک جگہ فرماتے ہیں **فَیُضَاعِف لَہٗ اَضْعَافاً کَثِیْرَۃً** (پس اس کا کئی گنا بہت زیادہ اضافہ کریں گے) کہ اس قرض کو حق تعالیٰ چند در چند کر کے ادا کریں گے حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک چھوارے کو حق تعالیٰ بڑھاتے ہیں کہ وہ جبل احد کے برابر ہو جاتا ہے۔ بتلایئے اس میں کتنے اضعاف ہوئے، صاحبو! پھر ایسے کریم کو اُدھار دینا کیا مشکل ہے کیا تم نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو نادار سمجھتے ہو غرض اگر آخرت ہی کا ثمرہ مراد ہو تب بھی اول تو اللہ تعالیٰ کے یہاں ایمان و اعمال صالحہ کا ثمرہ نقد ہی ہے ادھار نہیں کیونکہ آخرت کا مثل نقد ہونا اوپر مذکور ہوا ہے اور اگر ادھار بھی ہو تو میں نے بتلا دیا کہ ایسا ادھار طبعاً مرغوب ہوتا ہے جس کا نتیجہ **اَضْعَافاً مُضَاعَفَۃً** ہو، تیسرے **سَیَجْعَلُ لَہُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا** میں سین قرب کے واسطے اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ تمہارے بلانے کا کوئی وقت مقرر نہیں ممکن ہے کہ آج ہی نماز پڑھتے ہی اللہ تعالیٰ آپ کو بلا لیں اور سارا معاملہ طے کر دیں پھر مرتے ہی تم کو سب عوض مل جائے گا (کیونکہ مرنے کے بعد ہر مسلمان کو دکھلا دیا جاتا ہے کہ تمہارے واسطے جنت کے یہ درجے تیار ہیں گو دخول جنت قیامت کے بعد ہوگا مگر معاملہ تو مرتے ہی طے ہو جاتا ہے) چوتھے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سین المقرب کا مدلول دنیا ہی میں حاصل ہوتا ہے یعنی ایمان و اعمال صالحہ کا یہ ثمرہ آخرت میں تو ملے ہی گا دنیا میں بھی ملتا ہے یعنی جس کو حق تعالیٰ نے یہاں بیان فرمایا ہے، **سَیَجْعَلُ لَہُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا** (اللہ تعالیٰ ان میں محبت پیدا فرما دیتا ہے) یہ وہ جیسا کہ آخرت میں حاصل ہوگا دنیا میں بھی حاصل ہوتا ہے کیونکہ ود کی چار قسمیں ہیں ایک یہ کہ حق تعالیٰ اس کے محبّ ہوں اور بندہ محبوب ہو، دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ محبوب ہوں اور بندہ محبّ ہو تیسرے یہ کہ خلق کو اس شخص کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے، چوتھے یہ کہ خلق سے اس کو محبت ہو جاتی ہے ان اقسام اربعہ میں بجز قسم اول کے سب اقسام کا ظہور دنیا ہی میں ہوتا ہے گو حصول سب کا یہاں بھی ہو جاتا ہے ان میں شاید آپ کو ایک قسم کھٹکی ہوگی کہ اس شخص کو خلق سے بھی محبت ہو جاتی ہے اس پر شبہ ہوگا کہ یہ تو غیر اللہ کے ساتھ تعلق ہے جو مذموم ہے پھر اس کو ثمرہ اعمال صالحہ کیونکر بنایا گیا مگر کہتا ہوں کہ محبت خلق مطلقاً مذموم نہیں بلکہ اس کی دو قسمیں ہیں ایک مذموم ہے ایک محمود ہے جس کی ایک دلیل تو یہیں موجود ہے وہ یہ کہ مخلوق کا آپ سے محبت کرنا یہ تو آپ کے نزدیک بھی مطلوب ہے اس میں کھٹک نہیں ہوئی آخر کیوں؟ یہ بھی تو خلق کا تعلق ہے کیونکہ آپ بھی تو مخلوق ہی ہیں،

یہ کیا آپ کو تو سب چاہیں اور آپ کسی کو نہ چاہیں اگر مخلوق کا آپ سے محبت کرنا مطلوب ومحمود ہے تو آپ کا مخلوق سے محبت کرنا بھی کسی درجہ میں محمود ہونا چاہئے، بات یہ ہے کہ مخلوق کا آپ سے محبت کرنا کیونکر محمود ہوا؟ اس لئے کہ وہ تم سے للہ محبت کرتے ہیں (اگر یہ نہ ہو بلکہ کسی دنیوی غرض کے لئے محبت کریں تو یہ محمود نہیں ۱۲) اسی طرح ایمان واعمال صالحہ کے بعد جو آپ کو مخلوق سے محبت ہوگی وہ حقیقت میں خدا سے محبت ہوگی اس وقت مخلوق سے جو کچھ تعلق یا محبت ہوگی محض اس وجہ سے ہوگی کہ حق تعالیٰ کے بندے ہیں اللہ کے ساتھ ان کو نسبت ہے اور قاعدہ ہے کہ جب انسان کسی پر عاشق ہوتا ہے تو اس کے متعلقین سے بھی اس کو محبت ہوتی ہے (قال مجنوں بنی عامر

امر علی الدیار دیار لیلی   اقبل ذا الجدار وذاالجدارا
وما حب الدیار شغفن قلبی   ولکن حب من سکن الدیارا (۱۲)

(مجنوں) لیلیٰ کے گھروں کے پاس سے گزرا، دیواروں کو دیوار والوں کو چومتا ہوا اور گھروں سے محبت کرنا میرے دل کا شیوہ نہیں لیکن میں اس سے محبت رکھتا ہوں جو ان گھروں میں رہتے ہیں)

اور کسی سے تعلق اور واسطہ سے کسی کو چاہنا حقیقت میں واسطہ کو چاہنا ہے پس خدا تعالیٰ کی وجہ سے مخلوق کے ساتھ محبت کرنا بھی محمود ہے۔ (المودۃ الرحمانیہ ج ۱۳)

اب بے چارے منصور کے انا الحق کا مطلب بھی ظاہر ہوگیا کہ وہ انا الحق خود نہ کہہ رہے تھے بلکہ اس وقت ان کی وہ حالت تھی جیسے شجرۂ موسیٰ سے آواز آئی تھی اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (بے شک میں اللہ سارے جہانوں کا پروردگار ہوں) گو آواز شجرہ ہی سے نکل رہی تھی چنانچہ خود نص میں تصریح ہے نُوْدِیَ مِنْ شَاطِیءِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤی (وادی ایمن میں بقعہ مبارکہ اور درخت سے آواز دی اے موسیٰ علیہ السلام) تو کیا شجرہ خود کہہ رہا تھا اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ ہرگز نہیں ورنہ شجرہ کا رب ہونا لازم آئے گا اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ آواز شجرہ میں سے نہیں نکلی تھی بعینہٖ صورت حق تھی کیونکہ حق تعالیٰ صوت سے پاک ہیں اور یقیناً موسیٰ علیہ السلام کو صوت ہی مسموع ہوئی تھی جو سمت خاص اور مکان خاص کے ساتھ مقید تھی تو اس کو حق تعالیٰ نے وادی ایمن اور بقعہ مبارکہ اور من الشجرۃ کے ساتھ مقید کیا ہے ورنہ کلام حق بعینہ ہوتا تو ان قیود سے مقید نہ ہوتا پس ماننا پڑے گا کہ وہ آواز تو شجر ہی کی تھی اور اسی میں سے نکلی تھی مگر حق تعالیٰ کی طرف سے

متکلم تھا خود متکلم نہ تھا جیسے قرآن مجید میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوا ہے فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ کہ جب ہم قرآن پڑھا کریں تو آپ قرأت کا اتباع کیا کیجئے یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی صوت کو سنتے تھے اور اللہ تعالیٰ صوت سے منزہ ہیں پھر اذا قراناہ کا کیا مطلب ہے یہی کہا جاتا ہے کہ یہاں قرأت جبریل کو قرأت حق کہا گیا ہے کیونکہ وہ بحکم حق قرأت کرتے تھے ایسے ہی یہاں بھی قول شجر کو قول حق کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے جو کچھ کہا تھا بحکم حق کہا تھا پس یوں ہی منصور کے انا الحق کو اللہ تعالیٰ کا قول کہنا چاہئے کیونکہ غلبہ حال میں کلام حق ان کی زبان سے نکلتا تھا وہ بھی متکلم بحکم حق تھے، خود متکلم نہ تھے چنانچہ ایک بزرگ کے واقعہ سے اس کی تائید ہوتی ہے وہ یہ کہ ایک بزرگ نے حق تعالیٰ سے سوال کیا کہ منصور نے بھی اپنے کو خدا کہا تھا اور فرعون نے بھی وہ تو مقبول ہو گئے اور یہ مردود ہو گیا اس کی کیا وجہ جواب ارشاد ہوا کہ منصور نے اپنے کو مٹا کر انا الحق کہا تھا اور فرعون نے ہم کو مٹا کر اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں تمہارا بلند و بالا رب ہوں) کہا تھا۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ منصور نے جو کچھ کہا تھا خود نہ کہا تھا کیونکہ وہ خودی کو مٹا چکے تھے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گفت فرعونے انا الحق گشت پست   گفت منصورے انا الحق گشت مست
لعنت اللہ آں انا را در جفا   رحمت اللہ ایں انا را در وفا

(فرعون نے انا الحق کہا رسوا اور ذلیل ہوا، حضرت منصور نے انا الحق کہا مقبول ہو گئے، راہ جفا میں انا کہنا اللہ کی لعنت کے موجب بننے کا سبب ہے اور راہ وفا میں انا کہنا اللہ کی رحمت کا سبب ہے) (المودۃ الرحمانیہ ج ۱۴)

کشف اور جانور

جو شخص اپنے نفس کے ساتھ اس حیثیت سے محبت کرتا ہے کہ وہ اللہ کی امانت ہے اس کی چیز ہے تو اس کے سب کام اللہ کے لئے ہوتے ہیں اپنے لئے کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس لئے اپنے نفس کے ساتھ اس کا محبت کرنا عین محبت حق ہے، (المودۃ الرحمانیہ ج ۱۴)

اجابت کا مروجہ مفہوم

آج کل جس چیز کو اجابت سمجھا جاتا ہے اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے ایک بزرگ نے

عاقبت بخیر و سلامتی ایمان کی تفسیر کی تھی۔ پانی پت میں مولوی غوث علی صاحب ایک درویش تھے۔ بڑے ظریف تھے ان کے سامنے کسی نے کسی کو یہ دعا دی کہ عاقبت بخیر ہو ایمان کی سلامتی۔ مولوی صاحب نے کہا جانتے بھی ہو عاقبت بخیر و سلامت ایمان کا کیا مطلب ہے اس نے کہا جی یہی کہ انجام بخیر ہو اور ایمان سلامت رہے۔ فرمایا یہ تو ظاہری مطلب ہے اُس نے کہا حضرت پھر دوسرا مطلب آپ بیان کر دیجئے۔ فرمایا ایمان کی سلامتی یہ ہے کہ دونوں وقت کھانے کو روٹی ملتی رہے اور عاقبت بخیر یہ ہے کہ دونوں وقت اجابت آسانی سے ہو جائے۔ مطلب یہ تھا کہ تم جیسوں کے لئے تو یہی خیر اور سلامتی ہے ایسے ہی عام لوگ اجابت دعا کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ جو ہم نے مانگا ہے وہ مل جائے۔

کما و رد فی الحدیث ان وفد بنی تمیم قدموا علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال لھم یا بنی تمیم اقبلوا البشری فقالوا ابشرتنا فاعطنا ثم جاءہٗ وفد الاشعر بین فیما احسب قال یَا معشر الاشعر یین اقبلوا البشری اذردہٗ بنو تمیم فقالوا البشر نا یَا رَسول اللّٰہ ۱۲)(الصحیح للبخاری4:135، سنن الترمذی3161)

حدیث میں وارد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں بنی تمیم کا وفد حاضر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اے بنی تمیم بشارت کو قبول کرو انہوں نے عرض کیا کہ آپ بشارت دینے کی بجائے ہم کو کچھ عطا کیجئے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اشعریین حاضر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اشعر تم بشارت کو قبول کرو اس لیے کہ بنی تمیم نے اسکو رد کر دیا انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم نے بشارت کو قبول کیا۔

اہل اللہ کا دعا سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ جو مانگا ہے وہ مل جائے اسی واسطے ظہور اثر دعا میں تاخیر ہونے سے وہ پریشان نہیں ہوتے کیونکہ ان کا مقصود تو خود دعا ہی ہے بلکہ بعض دفعہ وہ اس کی تمنا کیا کرتے ہیں کہ ابھی دعا کا اثر ظاہر نہ ہو ورنہ پھر کس بہانہ سے مانگا کریں گے اور کس بہانہ سے باتیں کریں گے۔

جیسے ایک مریض طبیب پر عاشق ہو گیا تھا تو وہ اپنے لئے طول مرض کی دعا کرتا تھا تاکہ اس بہانہ ہی سے محبوب کی زیارت ہوتی رہے۔ (ارضاء الحق ج ۱۵)

حقیقی اجابت

حقیقی اجابت یہی ہے حق تعالیٰ ان کو اس دعائے مرضی کا مظہر بنا دے جس کو مولانا فرماتے ہیں۔ جیسا اوپر مذکور ہوا۔

چوں خدا از خود سوال و گد کند   پس دعائے خویشتن چوں رد کند

حق تعالیٰ شانہٗ جب سوال کرنے کی خود فرمائش کرتے ہیں تو اپنی طلب و دعا کی فرمائش کو کب رد کریں گے۔

ما چو چنگیم و تو زخمہ می زنی   زاری از ما نے تو زاری میکنی

اے اللہ ہماری مثال چنگ کی سی ہے اور آپ گویا مضراب مار رہے ہیں تو اس بناء پر ہم گریہ وزاری کریں وہ بھی حقیقۃً ہماری طرف سے نہیں ہے۔

اسی لئے ایک بزرگ نے لکھا ہے کہ اوروں کی مظہریت تکوینی ہے (کہ ان کے وجود سے صرف تکوین حق کا ظہور ہوتا ہے) اور اہل اللہ کی مظہریت تشریعی بھی ہے کہ اُن کے وجود سے احکام شرعیہ کا ظہور ہوتا ہے یعنی ان سے انہی اعمال کا ظہور ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ کو پسند ہوتے ہیں غرض ارادہ کا فنا نہ کرنا اور اپنے لئے کچھ تجویز کرنا یہی غلطی ہے۔ ارضاء خلق اسی کا شعبہ ہے۔ (ارضاء الحق ج ۱۵)

احناف کا عمل بالحدیث

مدعیان عمل بالحدیث کا یہ اعتراض کہ تمہارے سامنے ایک حدیث پیش کی جاتی ہے۔ اور تم اُس کو نہیں مانتے محض اس وجہ سے کہ تمہارے امام کا قول اس کے خلاف ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم کو تقلید حدیث مقصود بالذات نہیں بلکہ تقلید قول امام مقصود ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس مسئلہ میں اختلاف ہوتا ہے اس میں احادیث مختلف ہوتی ہیں۔ جس حدیث کو تم ہمارے سامنے پیش کرتے ہو ہمارا عمل اگر اس پر نہیں تو اس مسئلہ میں دوسری حدیث پر ہمارا عمل ہے اور تم اس حدیث کو نہیں مانتے جس کو ہم مانتے ہیں پھر ہمارے ہی اوپر کیا الزام ہے تم پر بھی تو الزام ہے۔

رہا تمہارا یہ کہنا کہ ہماری حدیث راجح ہے تمہاری مرجوح ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ طریق ترجیح کا مدار ذوق پر ہے تمہارے ذوق میں ایک حدیث راجح ہے اور امام ابوحنیفہ کے ذوق میں دوسری راجح ہے اور ہمارے نزدیک امام کا ذوق تمہارے ذوق سے اسلم وارجح ہے پھر تمہارا اپنے آپ کو عامل بالحدیث کہنا اور مقلدین کو عامل بالحدیث نہ کہنا محض ہٹ دھرمی ہے۔

اسی کو میں دوسرے عنوان سے کہتا ہوں کہ عمل بالحدیث کے معنی آیا۔

عمل بکل الاحادیث ہے یا عمل بعض الاحادیث۔؟

اگر کہو عمل بکل الاحادیث مراد ہے سو یہ تو تم بھی نہیں کرتے اور یہ ممکن بھی نہیں کیونکہ آثار مختلفہ واحادیث متعارضہ میں سب احادیث پر عمل نہیں ہوسکتا یقیناً بعض پر عمل ہوگا۔ اور بعض کا ترک ہوگا اور اگر عمل ببعض الاحادیث مراد ہے تو اس معنی کے ہم بھی عامل بالحدیث ہیں پھر تم اپنے ہی کو عامل بالحدیث کدھر سے کہتے ہو۔ (ارضاء الحق ج ۱۵)

ضرورت تقلید

مسائل منصوصہ تو بہت کم ہیں زیادہ مسائل اجتہادیہ ہیں اور ان میں مدعیان عمل بالحدیث بھی حنفیہ کی کتابوں سے فتوے دیتے اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ (یا اور کسی امام کے قول کو لیتے ہیں) تو زیادہ مسائل میں آپ بھی مقلد ہوئے تو یہ کیا بات کہ تقلید کرنا تو حرام نہیں صرف تقلید کا نام لینا ہی ناجائز اور شرک ہے اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ وہ تمام مسائل میں احادیث منصوصہ پر ہی عمل کرتا اور فتوے دیتا ہے تو وہ ہم کو اجازت دیں کہ معاملات و عقود و فسوخ و شفعہ و رہن وغیرہ کے چند سوالات ہم ان سے کریں اور ان کا جواب وہ ہم کو احادیث منصوصہ صریحہ صحیحہ سے دیں قیامت آجائے گی اور احادیث سے وہ کبھی جواب نہ دے سکیں گے۔ اب یا تو وہ کسی امام کے قول سے جواب دیں گے یہ تو تقلید ہوئی یا یہ کہیں گے کہ شریعت میں ان مسائل کا کوئی حکم نہیں یہ **الیوم اکملت لکم دینکم** (آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا) کے خلاف ہوگا۔ (ارضاء الحق ج ۱۵)

جواز قیاس

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دین کو کامل کر دیا گیا تو چاہئے کوئی صورت ایسی نہ ہو جس کا حکم شریعت میں نہ ہو اور ظاہر ہے کہ احکام منصوصہ بہت کم ہیں تو اب تکمیل دین کی صورت بجز اس کے کیا قیاس و استنباط کی اجازت ہو کہ انہی مسائل منصوصہ پر غیر منصوصہ کو قیاس کر کے ان کا حکم معلوم کریں یہاں سے ان مدعیان عمل بالاحادیث کی غلطی بھی ظاہر ہوگئی جو قیاس و استنباط کو مطلقاً رد کرتے ہیں۔ اور بعض احادیث میں جو

قیاس کی مذمت ہے وہ وہ قیاس ہے جو اصول شریعت کے خلاف ہو یعنی جس کی اصل نص میں موجود نہ ہو بلکہ اس کا مبنی محض اپنی رائے ہو اور جس قیاس کی اصل نص میں موجود ہو اس کی مذمت ہرگز نہیں ورنہ دین کا نقص لازم آئے گا۔ (ارضاء الحق ج ۱۵)

تقلید میں غلو

میرا مقصود دراصل مقلدین کو ان کی اس غلطی پر متنبہ کرنا ہے کہ اُن میں سے بعض کو تقلید میں ایسا غلو ہوتا ہے کہ آیات و احادیث کو بے دھڑک یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ ہم ان کو نہیں جانتے ہم تو اپنے امام کے قول کو جانتے ہیں یہ طرز نہایت خطرناک اور شنیع ہے اور قرآن میں اس پر سخت وعید وارد ہے گویا یہ لوگ اس آیت کا مصداق ہیں۔

وَ اذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنَاتٍ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ یَكَادُوْنَ یَسْطُوْنَ بِا لَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ عَلَیْهِمْ اٰیٰتِنَا ط

ترجمہ: اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں آپ کافروں کے چہروں میں تغیر محسوس کریںگے قریب ہے کہ وہ لوگ ان لوگوں پر حملہ کر بیٹھیں جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں۔ (ارضاء الحق ج ۱۵)

عہد صحابہ میں جمع قرآن کا مسئلہ

جمع قرآن کے لئے جب حضرت عمرؓ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مشورہ دیا تو حضرت صدیق اکبر نے فرمایا کہ میں ایسا کام کیونکر کر سکتا ہوں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ اس کے جواب میں حضرت عمر نے کوئی دلیل بیان نہیں کی صرف بار بار یوں کہتے رہے کہ واللہ انہ لخیر بخدا یہ کام اچھا ہے۔ چنانچہ اس کے تکرار ہی سے حضرت صدیق اکبر کو شرح صدر ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلایا اور ان کو جمع قرآن کا حکم دیا انہوں نے بھی وہی شبہ کیا جو حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت عمرؓ کے سامنے کیا تھا مگر حضرت صدیقؓ نے بھی زید بن ثابتؓ کے سامنے کوئی دلیل بیان نہیں کی وہ بھی بار بار یہ کہتے رہے کہ یہ کام اچھا ہے۔ کہ یہ کام اچھا ہے۔ اس کے تکرار ہی سے حضرت زید بن ثابت کو شرح صدر ہو گیا۔ اور انہوں نے جمع قرآن کا کام شروع کر دیا۔ اسی

طرح قتال مرتدین کے بارے میں جب حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے جازم ہوگئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

امرت ان اقاتل الناس حتى يقولوا لَا اِلٰهَ اِلَّا الله فَمَنْ قالها فقد عصم مني ما به و دمه او كما قال (السنن الكبرى للبيهقي100:6، مجمع الزوائد 172:4، كنز العمال: 397بدون لفظ: اَلا)

مجھ کو لوگوں سے قتال کا امر کیا گیا ہے جب تک وہ لا الٰہ الا اللہ نہ کہیں۔ جب اس کا اقرار کر لیں تو ان کے انفس واموال محفوظ ہو جائیں گے۔ اور ان مرتدین میں ایک جماعت وہ ہے جو توحید ورسالت کی مصدق ہے اور ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتی ہے اور ہمارا ذبیحہ کھاتی ہے صرف فرضیت زکوٰۃ میں تاویل کرتی ہے تو اس سے آپ کیونکر قتال کریں گے۔ اس کے جواب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یہ نہیں کیا کہ حضرت عمرؓ کی دلیل کا جواب بیان کریں۔ بلکہ یہ فرمایا۔

واللّٰه لو منعوني عناقا او عقالا كانو ا يؤ دونها الى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لا قا تلنهم عليه. (الدرالمنثور255:2، الترغيب والترهيب557:2)

بخدا اگر یہ لوگ ایک بکری کا بچہ یا ایک رسی بھی روکیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ادا کرتے تھے تو میں اس پر بھی ان سے جہاد کروں گا۔ بس اسی سے حضرت عمرؓ پر حق واضح ہوگیا چنانچہ فرماتے ہیں۔

فوا اللّٰه ما رأيت الا ان اللّٰه قد شرح صدر ابي بكر للقتال فعرفت انه الحق (الدرالمنثور255:2 ، الترغيب والترهيب557:2)

اختلافی صورت میں طریقہ کار

میرے ایک دوست نے خوب کہا ہے کہ جب علماء کسی فعل کے جواز وعدم جواز میں اختلاف کرتے ہیں اور کوئی اُسے واجب وضروری نہ کہے تو اسے ترک کر دینا چاہیے۔ واقعی ایمان کی سلامتی اسی میں ہے کیونکہ جس بات کے جواز وعدم جواز میں اختلاف ہو اس کو کرتے ہوئے دل میں کھٹک ضرور ہوگی اور جس بات میں کھٹک ہو وہ حدیث کی رو سے گناہ کا فرد ہے (ارضاء الحق ج ۱۵)

اب جن لوگوں کی دعا قبول ہو جاتی ہے وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور جن لوگوں کی دعا قبول نہیں ہوتی وہ سخت نالاں رہتے ہیں۔ حالانکہ نہ قبولیت دعا مقبول ہونے کی علامت ہے نہ عدم قبولیت مردود ہونے کی علامت ہے۔ (طریق القلب ج ۱۵)

حق تعالیٰ کے ساتھ محبت طبعی

حق تعالیٰ کے مدرک بالحواس اور مدرک بالکنہ نہ ہونے اور ان کی نظیر اور مثل نہ ہونے پر اس حکم کا متفرع کرنا تو صحیح ہے کہ ان کا ادراک تام نہیں ہو سکتا۔ مگر بعض نے غلطی کی ہے کہ اس پر یہ حکم بھی متفرع کیا ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ محبت طبعی بھی نہیں ہو سکتی اور دلیل میں یہ کہا ہے کہ محبت طبعی یا تو دیکھنے سے ہوتی ہے یا آواز سننے سے۔ چنانچہ اندھوں کو آواز سُن کر عشق ہو جاتا ہے وہ صورت کہاں دیکھتے ہیں اس لئے محض مشاہدہ صورت تو مدار عشق نہیں ہے بلکہ آواز بھی اس کا منشاء ہو سکتی ہے۔ رئیس العاشقین مولانا جامیؒ فرماتے ہیں۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بسا کیں دولت از گفتار خیزد

عشق تنہا دیدار سے ہی نہیں پیدا ہوتا بہت دفعہ یہ دولت گفتگو سے بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

اور حق تعالیٰ کا نہ مشاہدہ ہو سکتا ہے اور نہ عادۃً حق تعالیٰ سے کلام ہو سکتا ہے اور اگر خرقِ عادات کے طور پر کسی کو ہو بھی۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوا ہے مگر وہ صورت سے منزہ ہے تو پھر وہ بھی جب کہ اس کو بلا واسطہ کلامِ الٰہی مانا جائے بواسطۂ مثال کے نہ مانا جائے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو کلام ہوا وہ بواسطۂ مثال کے تھا۔ کیونکہ وہ کلام مسموع تھا۔ اور کلام مسموع میں ترکیب بھی ہوگی الفاظ بھی ہوں گے۔ آواز بھی ہوگی۔ اور یہ امور مثال میں ہو سکتے ہیں نہ کہ اصل کلام الٰہی میں کیونکہ صوفیہ کا اجماع ہے۔ اور یہی متکلمین کا بھی مذہب ہے۔ کہ

قول اور الحن نے آواز نے   اس کی بات کو آواز اور لحن نہیں

حق تعالیٰ کا کلام لحن اور آواز سے مبرا ہے اور دنیا میں بدوں لحن و آواز کے ہم کلام کو نہ سُن سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں تو اس اعتبار سے کلام بھی مثل رؤیت کے ہے کہ دنیا میں حق تعالیٰ سے کلام بھی بلا واسطہ مثال کے نہیں ہو سکتا۔ اور شاید یہی مراد ہے حجاب سے اس آیت میں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ

ترجمہ: کسی بشر کی یہ مجال نہیں کہ حق تعالیٰ اُس سے (دنیا میں) کلام کریں مگر وحی سے یا حجاب کے پیچھے سے ۱۲)

ہاں! مثال کے واسطے سے رؤیت بھی ہوسکتی ہے اور کلام بھی ہوسکتا ہے۔

یہ شبہ نہ ہو کہ پہلے تو حق تعالیٰ کی نظیر کی تم نے نفی کی ہے اور یہاں مثال کو جائز کہا ہے۔ جواب یہ ہے کہ وہاں نظیر سے مراد مثل ہے جو متحد فی النوع ہوتی ہے اور اس سے حق تعالیٰ منزہ ہے اور مثال مشارک فی الوصف ہوا کرتی ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ کے لئے مثل یعنی مشارک فی النوع تو کوئی نہیں ہاں مثال مشارک فی الوصف جائز ہے۔

پس بعض متکشفین کہتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ کی نہ رؤیت ہوسکتی ہے نہ ان کا کلام بالا واسطہ مثال کے مسموع ہوسکتا ہے تو حق تعالیٰ کے ساتھ محبت طبعی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ محبت طبعی کا سبب رؤیت صورت یا سماع صورت ہی ہوا کرتا ہے یہ دلیل اپنی جزامت و پختگی میں بظاہر قوی معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں محض لاشئے ہے۔

امام غزالیؒ نے اس کا خوب رد کیا ہے اور فرمایا ہے کہ محبت طبعیہ کا سبب ان اسباب میں منحصر نہیں ہے اور اس کی خوب مثال دی ہے کہ ہر مومن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت طبعیہ ایسی ہے کہ بیوی بچوں اور ماں باپ وغیرہ سب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا کرنے کو تیار ہے حالانکہ نہ اس وقت کے مسلمانوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت دیکھی ہے۔ نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنی ہے اسی طرح بزرگوں کے سلسلہ سے ہم کو محبت ہے۔ جن کو ہم نے دیکھا بھی نہیں۔ (مثلاً حضرت فاطمہ زہرا اور امام حسین رضی اللہ عنہما اور سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت مسلمانوں کو طبعی محبت ہے)۔

نیز مقلدوں کو ائمہ مجتہدین سے طبعی محبت ہے۔ چنانچہ مقلدوں اور غیر مقلدوں سے جو جھگڑا ہوتا ہے وہ اس کی دلیل ظاہر ہے کہ ذرا سی گستاخی پر مقلدوں کو جوش آجاتا ہے۔ اور آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور یہ اثر محبت طبعی کا ہے محبت عقلی کا نہیں کیونکہ محبت عقلی استدلال سے ہوتی ہے اور استدلال سے جوش نہیں ہوا کرتا بہرحال محبت طبعی بدوں ان دو کے بھی ہوسکتی ہے تو معلوم ہوا کہ اس کا ایک اور سبب بھی ہے جس کا نام ہے مناسبت اور مناسبت ہی مدار محبت طبعیہ ہے۔ سو حق تعالیٰ سے زیادہ بندہ کو کسی سے بھی مناسبت نہیں۔ پس محبت طبعی بھی خدا تعالیٰ سے زیادہ کسی کے ساتھ نہیں ہوسکتی۔ (الوصل والفصل ج ۱۵)

محبت غیر حق

بلکہ محققین نے تو دعویٰ کیا ہے کہ غیر خدا سے محبت ہو ہی نہیں سکتی اور جس کو غیر سے بظاہر محبت ہے وہ بھی حقیقت میں خدا تعالیٰ ہی سے محبت ہے۔ باقی اس پر جو مؤاخذہ ہے وہ بوجہ نیت کے ہے کیونکہ اس کو تو یہ خبر نہیں کہ میں اللہ تعالیٰ سے محبت کر رہا ہوں۔ یہ تو نیت غیر ہی کی کر رہا ہے اور اس پر اجماع ہے کہ مواخذہ جب ہوتا ہے نیت ہی پر ہوتا ہے اور جہاں بظاہر عمل پر مواٗخذہ ہے وہ بھی حقیقت میں نیت ہی پر ہے۔ (الوصل والفصل ج ۱۵)

مجاہدہ سے متعلق ایک شبہ کا ازالہ

مجاہدہ سے لوازمِ بشریت اور امور طبعیہ زائل نہیں ہوا کرتے۔ اس میں بعض لوگوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مجاہدہ سے لوازمِ بشریت و تقاضائے طبعی مسلوب ہو جاتے ہیں، پھر بعد اعتدال و تمکین کے جب ان آثار کا عود ہوتا ہے تو پریشان ہوتا ہے کہ ہائے میری ساری محنت برباد اور میرا سارا مجاہدہ ضائع گیا۔ حالانکہ یہ اعتقاد غلط ہے۔ مجاہدہ سے امور طبعیہ مسلوب نہیں ہوتے بلکہ جوش مجاہدہ سے صرف مغلوب ہو جاتے ہیں پھر بعد اعتدال کے جب ہنڈیا پک جاتی ہے تو وہ جوش نہیں رہتا بلکہ سکون ہو جاتا ہے۔ (فناء النفوس ج ۱۵)

گھی مرغوب شے نہیں

جب میں ڈھاکہ گیا تو وہاں کھانے میں گھی بہت ہوتا تھا۔ میں نے منع کیا کہ (اتنا گھی مت ڈالا کرو، میں اتنا گھی نہیں کھا سکتا) تو نواب صاحب کے ایک عزیز کہنے لگے کہ ہم تو آپ کی وجہ سے گھی بہت کم ڈالتے ہیں ورنہ ہمارے یہاں تو سیر بھر گوشت میں سیر بھر گھی ڈالا جاتا ہے۔ میں نے کہا ہمارے یہاں تو اتنا گھی جانوروں کو دیا کرتے ہیں۔ جب بیل منزل چل کر آتے ہیں تو آدھ سیر یا سیر بھر گھی نال میں بھر کر اُن کو پلایا جاتا ہے۔ آدمی تو اتنا گھی کبھی نہیں کھاتے اور قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ گھی انسانوں کے لئے کوئی زیادہ مرغوب شے نہیں۔ کہنے لگے صاحب! قرآن سے کیونکر معلوم ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ حق تعالیٰ نے جنت کے اندر نہریں بتلائی ہیں ایک پانی کی، ایک دودھ کی ایک شراب کی، ایک شہد کی اگر

گھی مرغوب شئے ہوتا تو جنت میں ایک نہر گھی کی بھی ضرور ہوتی ہے۔ مگر گھی کی نہر کوئی بھی نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی مرغوب شئے نہیں۔ (فناء النفوس ج ۱۵)

تصرف بلا واسطہ

تفویض کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہر تصرف پر راضی رہنا چاہئے تو پھر گناہ پر راضی رہنا چاہئے کیونکہ وہ بھی تصرف حق ہی ہے اس شبہ کو رفع کرتے ہیں کہ خبردار گناہ مت کرنا **ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها** کہ زمین میں فساد نہ کرنا بعد اس کے کہ اس کی درستی کر دی گئی ہے۔ مطلب یہ کہ گناہ موجب فساد ہے اور ہم نے فساد کو نبوت اور تشریع احکام کے ذریعہ سے ممنوع قرار دیا ہے پس اب تم اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔ اور گو گناہ بھی خدا کا پیدا کیا ہوا ہے کیونکہ خالق خیر و شر وہی ہے مگر یہ تصرف بلا واسطہ حق تعالیٰ کا تصرف نہیں بلکہ اس کے اندر تم واسطہ ہو کیونکہ بندہ کاسب افعال ہے اور واسطہ مذموم ہے اور گناہ میں بندہ کے واسطہ ہونے پر لاتفسدوا میں خطاب کے صیغہ سے بھی دلالت ہو رہی ہے خلاصہ تعلیم کا یہ ہوا کہ تفویض کے معنی یہ ہیں کہ جو تصرف حق تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ ہو اُس پر راضی رہو، اور جو تصرف ایسا ہو جس میں تمہارے فعل قبیح کا واسطہ ہو اُس پر راضی ہونا بایں معنی کہ گناہوں پر جرأت کرنے لگو اور اُن سے بچنے کا اہتمام نہ کرو۔ تفویض نہیں۔

اب یہ شبہ بھی رفع ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ گناہ پر راضی ہونا تفویض نہیں۔ اب گناہ سے منع کرنے کے بعد طاعات کا امر فرماتے ہیں وادعوہ خوفا وطمعا کہ اللہ کی عبادت کرو۔ خوف و رجاء کے ساتھ یعنی عبادت کر کے نہ تو ناز ہو نہ مایوس ہو۔ ناز تو جب ہوتا ہے کہ اپنی عبادت کو کامل سمجھے اور مایوسی جب ہوتی ہے کہ اپنی عبادت کو بالکل ہی بے کار سمجھے۔ حاصل تعلیم کا یہ ہوا کہ نہ تو عبادت کو ایسا کامل سمجھو کہ ناز کرنے لگو نہ ایسا ناقص سمجھو کہ بیکار سمجھنے لگو اس میں بتلا دیا گیا کہ تفویض کا مقتضی یہ ہے کہ عبادت میں لگو اور گناہوں سے بچو کیونکہ تفویض کا منشاء ادائے حق الوہیت ہے اور اظہار عبدیت اب تم خود سمجھ لو کہ اس کا مقتضا یہ ہو سکتا ہے کہ خدا کی نافرمانی کرو یا یہ ہو سکتا ہے کہ اُس کی عبادت میں مشغول ہو یقیناً ہر عاقل یہی کہے گا کہ عبدیت کا مقتضا اطاعت ہے نا کہ معصیت آگے اطاعت کی مزید ترغیب ہے۔ ان رحمۃ اللہ قریب من المحسنین کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بلاشبہ نیک کاروں سے قریب ہے۔ پس تم کو احسان کی کوشش کرنا چاہئے تا کہ رحمت تم سے قریب ہو۔ (التعرف بالتصرف ج ۱۵)

شرط احسان

بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ احسان یعنی اخلاص یہ ہے کہ عبادت وخوف ورجا کے ساتھ نہ ہو بلکہ محض رضا کے لئے ہو اس کے بعد یہ لوگ ڈینگے ہانکتے ہیں کہ ہم کو جنت کی کیا پرواہ ہے دوزخ کی کیا پرواہ ہے یہ سخت بے ادبی ہے اور ان کا یہ دعویٰ خود اس آیت سے رد ہو گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں خوف وطمع کے ساتھ عبادت کا حکم فرمایا ہے اور اس پر احسان کو متفرع کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ احسان یہی ہے کہ عبادت خوف وطمع کے ساتھ ہو۔ خوف وطمع احسان کے منافی نہیں۔ بس اخلاص کے لئے شرط یہ ہے کہ عمل میں دنیا کی کوئی غرض نہ ہو۔ یہ شرط نہیں کہ خوف وطمع اخروی بھی نہ ہو جب اصل دعویٰ ہی غلط ہے تو اس پر جو باتیں متفرع ہیں کہ جنت سے لاپروائی اور دوزخ سے عدم مبالات ظاہر کی جاتی ہے ان کا گستاخی ہونا ظاہر ہے مگر یہ سب باتیں میں غالین کے بارہ میں کہہ رہا ہوں۔ غالین یعنی حالیین کے بارہ میں نہیں کہہ رہا جو مغلوب الحال ہیں وہ حضرات مستثنیٰ ہیں اگر جنت سے لاپروائی یا دوزخ سے عدم مبالات ان کے کلام میں نظر سے گزرے تو اُن پر اعتراض نہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ حضرات باطن میں سب سے بڑھ کر با ادب ہیں گو ظاہر میں بے ادب معلوم ہوں۔ مولانا فرماتے ہیں اہل سکر کے بارہ میں جن کی زبان سے خلاف ادب باتیں نکل جاتی ہیں کہ۔

بے ادب ترنیست زوکس در جہاں　　　با ادب ترنیست زوکس درنہاں

اور اہل صحو کے بارہ میں ارشاد فرماتے ہیں جو باوجود صحو کے ایسی بے تمیزی کی باتیں بناتے ہیں۔

از خدا جوئیم توفیق ادب　　　بے ادب محروم ماند از فضل رب
بے ادب تنہا نہ خود را درشت بد　　　بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد
ہر کہ گستاخی کند اندر طریق　　　باشد او درجہ حیرت غریق
از ادب پرنور گشت ست ایں فلک　　　وزادب معصوم و پاک آمد ملک
بدز گستاخی کسوف آفتاب　　　شد عزاز یلے زجر آت ردباب

ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ظالم آں قومے کہ چشمان دوختند　　　از سخن با عالمے را سوختند

بھلا جو شخص ایک ادنیٰ مخلوق سے بھی صبر نہ کر سکے۔ بیوی بچوں سے بھی صبر نہ کر سکے اس کا کیا منہ ہے جو جنت سے لاپروائی ظاہر کرے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ایک صبرت نیست از فرزند و زن　　صبر چوں داری زرب ذوالمنن ے
ایکہ صبرت نیست از دنیائے دوں　　صبر چوں داری زنعم الماجدون ۸

بحمد اللہ اب سب شبہات مرتفع ہو گئے جس کے بعد مضمون الا لہ الخلق والامر یعنی مضمون تفویض مکمل ہو گیا۔ (التعرف بالتصرف ج ۱۵)

سلف کی خوبی

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی حکایت ہے کہ ایک لڑکا تیزی کے ساتھ چلا جا رہا تھا امام صاحبؒ نے فرمایا کہ صاحبزادہ سنبھل کر چلو گر پڑو گے۔ وہ لڑکا بولا کہ آپ سنبھل کر چلیں۔ اس لئے کہ آپ کے سنبھلنے سے عالم سنبھل جائے گا اور آپ کے بگڑنے سے عالم بگڑ جائے گا۔ اور میرے گرنے تو صرف مجھ ہی پر اثر ہو گا۔ امام صاحبؒ بچہ سے یہ بات سُن کر بہت متاثر ہوئے اُن حضرات میں یہ خوبی تھی کہ

لا تنظر الی من قال وانظر الی ما قالَ پر پورا عمل تھا۔ یعنی وہ حضرات قائل کو نہیں دیکھتے تھے۔ بات کو دیکھتے تھے۔ کہ کس درجہ کی ہے۔

یہاں یہ کیفیت ہے کہ چھوٹوں کی بات پر تو کیا ہی عمل کرتے۔ چھوٹوں کی باتوں کو تو کان لگا کر سنتے بھی نہیں۔ بلکہ بڑوں کی باتوں کو بھی نہیں سنتے اور بڑوں کے ارشاد پر بھی عمل نہیں کرتے۔ ایک مولوی صاحب مفتی تھے۔ فرماتے تھے کہ میرے پاس جب کوئی فتویٰ بغرض تصحیح آتا ہے تو میرا جی دستخط کرنے کو نہیں چاہتا۔ بلکہ حتی الوسع اسی کی سعی رہتی ہے کہ مخالفت کروں۔ ہمارا یہ مذاق ہو گیا ہے اللہ اکبر کہ حق کی موافقت سے بھی عار ہے۔

اب تو مرید بھی پیروں پر ردو قدح کرنے لگے۔ حالانکہ یہ فرقہ سب سے زیادہ فانی اور مؤدب تھا۔ مگر اب تو وہ بھی یوں چاہتے ہیں کہ ہماری ہی بات غالب رہے۔ چنانچہ شیخ اگر کسی بات پر تنبیہ کرے اولاً تو اپنی خطا کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اور اگر تسلیم بھی کر لیتے ہیں تو صاف اقرار غلطی کا نہیں کرتے۔ بلکہ منشا اشتباہ کو ایسے انداز سے بیان کرتے ہیں جس سے

غلطی میں بُعد نہ رہے اور سکی نہ ہو۔ افسوس آج کل یہ کیسا مادہ پیدا ہو گیا ہے کہ اپنی بات بنانے اور اپنے پہلو کو اونچا رکھنے کا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات میں لکھا ہے۔

وکانَ وَقّا فا عند کتاب اللہ یعنی کسی ایسی تحقیق کے بعد جس میں آپ کے قول کا نص سے تعارض بھی نہ ہوتا تھا۔ اگر کوئی شخص کتاب اللہ کی آیت پڑھ دیتا تو آپ ادب سے فوراً سکوت فرما لیتے تھے۔ (اعانۃ النافع ج ۱۵)

قرب علمی

حق تعالیٰ جو بندہ کے قریب ہیں۔ اس قرب سے قرب علم یا رضا مراد ہے۔ قرب حسی مراد نہیں۔ اس لئے کہ قرب حسی جانبین سے ہوتا ہے کیونکہ ایک شے جب کسی شئے سے حسًا قریب ہوگی تو لا محالہ وہ شئے بھی اس سے قریب ہوگی اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرب جانبین سے نہیں ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ (ہم اس کی طرف شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں) یہاں **اَنۡتُمۡ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ** نہیں فرمایا **نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ** (تم اس کی طرف زیادہ نزدیک ہو) فرمایا یعنی ہم بہت قریب ہیں تو معلوم ہوا کہ قرب خدا کی طرف سے ہے۔ ہماری طرف سے نہیں پس یہاں اس قرب سے قرب علمی مراد ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ وَنَعۡلَمُ مَا تُوَسۡوِسُ بِهٖ نَفۡسُهٗ وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِط (اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں)

اس آیت میں **نَعۡلَمُ** پر قرب کو مرتب فرمایا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس قرب سے مراد قرب علمی ہے یعنی جیسا خدا کو علم ہے بندہ کا بندہ کو اُس کا ذرہ بھر بھی نہیں۔ باقی حقیقت کے اعتبار سے حق تعالیٰ کو بندہ سے بہت بعد ہے وہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ بندہ کو اُس سے کیا نسبت یہ تو اس کا تصور صحیح بھی نہیں کر سکتا۔

کل ما خطر ببالک فَھُوَ ھَالکٌ واللّٰہُ اعزوا علٰی من ذالک

(ہر وہ چیز جو تمہارے دل میں گزرتی ہے وہ فانی ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے برتر و اعلیٰ ہے)

اے برادر بے نہایت در گہے است   ہر چہ بروے میرسی بروے مایست

(اے بھائی بے نہایت درگاہ ہے جس درجہ پر پہنچو اس پر مت ٹھہرو اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو) (اعانۃ النافع ج ۱۵)

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ جہنم میں مکث طویل کا ادنیٰ درجہ سات ہزار برس ہیں۔ حضرت جہنم کے اندر تو سات دن بھی کوئی عذاب کا تحمل نہیں کرسکتا۔ مگر میں مسلمانوں کو بشارت دیتا ہوں کہ ان کو عذابِ جہنم کا احساس کفار سے بہت کم ہوگا۔ جس کی حقیقت مسلم کی ایک حدیث میں ان لفظوں سے بیان کی گئی ہے۔ اَمَاتَهُ اللّٰهُ فِيْهَا اَمَاتَةً کہ حق تعالیٰ ان کو جہنم میں ایک قسم کی موت دیدیں گے۔ حدیث میں تو اتنا ہی ہے۔ شیخ ابن عربیؒ نے اس کی تفسیر یوں کی ہے کہ مومنین کو جہنم میں ایک مدت کے لئے ہلکی سی نیند آجائے گی۔ حدیث النوم اخوالموت سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ نیز اس سے بھی کہ اَمَاتَهُ اللّٰهُ فِيْهَا اَمَاتَةً کا سیاق کلام بتلا رہا ہے کہ حقیقی موت تو مراد نہیں۔ ورنہ اماتَةً بڑھانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ صرف اَمَاتَهُمْ کافی تھا یہ طرز کلام بتلا رہا ہے کہ خاص قسم کی مراد ہے جو موت کے مشابہ ہے حقیقی موت مراد نہیں وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

شیخ عربیؒ نے اس کے بعد یہ بھی فرمایا ہے کہ اس نیند کی حالت میں وہ یوں خواب دیکھے گا کہ میں جنت میں ہوں اور خود ان کے پاس ہوں۔ یہ بات کہنے کی تو نہ تھی کہیں مسلمان بے فکر نہ ہو جائیں۔ کہ بس جہنم میں جاکر مزے سے سوئیں گے! جی ہاں کبھی جاگو گے تو ہو ہی نہیں سکتا اگر تھوڑی دیر کو بھی جاگ گئے تو نانی یاد آجائے گی۔ (افناء المحبوب ج ۱۵)

مسئلہ انفاق سے متعلق وضاحت

حدیث میں ہے کہ جب نیا کپڑا پہنے تو پرانے کپڑے کو خیرات کردے اور نیا جوتا پہنے تو پرانے کو اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ ردی مال صدقہ کیا جائے گا تو میں اس حدیث کا مطلب یہ سمجھا ہوں کہ پرانے کپڑے اور جوتا کو اللہ کے نام پر ثواب کی نیت سے نہ دیا جائے۔ بلکہ اعانت غریب کی نیت سے صدقہ کیا جائے تم اعانت غریب کے سوا کچھ قصد نہ کرو۔ چاہے اللہ تعالیٰ تم کو ثواب بھی دیدیں خوب سمجھ لو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مراد اس سے وہ پرانا ہو جو ردی کے درجہ تک نہ پہنچا ہو۔ بہر حال تحصیل بر کے لئے احب الاشیاء کا انفاق ضروری نہیں۔ (افناء المحبوب ج ۱۵)

اہل اسلام سے شکوہ

میں بریلی ایک مرتبہ گیا تو صاحب جنٹ نے ملاقات کی رغبت ظاہر کی۔ میں اُن سے ملا۔ اول سوال اُنہوں نے یہ کیا کہ میں نے سُنا ہے کہ آپ نے کوئی تفسیر لکھی ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں لکھی ہے پوچھا کہ آپ کو اس میں کتنا روپیہ ملا۔ میں نے کہا کہ ایک بھی نہیں کہا کہ پھر آپ نے اتنا محنت کیوں کیا۔ میں نے کہا کہ ثواب آخرت کی نیت سے کہنے لگا کیا ابھی مسلمانوں میں ایسے خیال کے لوگ موجود ہیں۔ میں نے کہا کہ بہت کثرت سے۔

اس حکایت کے نقل کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ اس متاعِ دنیا کے مقصود سمجھنے کی جڑ بتلا دوں۔ کہ یہ خیال مسلمانوں میں غیر مسلم قوموں سے آیا ہے۔ اور یہ لوگ اہل یورپ کی شاگردی کرتے ہیں۔ لیکن شاگردی بھی ناتمام ہے کیونکہ وہ لوگ تو مادہ پرست ہیں۔ صانع عالم کے قائل نہیں تو جو شخص نہ مبداء کا قائل ہو نہ معاد کا وہ تو اس خیال میں معذور ہے۔ اگرچہ اس میں وہ بھی معذور نہیں کہ مبداء و معاد کا باوجود قیام دلائل کے انکار کیا۔ مگر بعد انکار کے اس انکار کی فرع کا قائل ہونا۔ یعنی دنیا کو مقصود بالذات سمجھنا زیادہ عجیب نہیں۔ مگر مسلمان پر کیا آفت نازل ہوئی کہ باوجود قیامت کے قائل ہونے کے پھر بھی اگر کسی کام میں دنیا کا فائدہ یا دُنیا میں فائدہ نہ ہو تو اس کو بے کار سمجھے اس لئے شاگردی بھی ناتمام شاگردی ہے۔ (قطع التمنی ج ۱۵)

مرض سے گناہ معاف

حدیث شریف میں ہے کہ طاعون مومن کے لئے رحمت ہے کیونکہ اُس سے تطہیر ہوگی۔ حدیث شریف میں ہے کہ ہر بیماری سے گناہ پاک ہوتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک آیا ہے کہ اگر کوئی چیز رکھ کر بھول جائے تو اتنی پریشانی سے بھی گناہ معاف ہوتے ہیں۔ غرض ہر چیز جو ہمارے اختیار سے خارج ہو وہ ہمارے لئے رحمت ہے۔ (قطع التمنی ج ۱۵)

رزق میں برکت کے معنی

رزق میں برکت کے یہ معنی نہیں کہ کم چیز مقدار میں بڑھ جاتی ہے کہ بازار سے تو ایک من گیہوں لائے اور گھر پر آکر دو من اترے ممکن تو ایسا بھی ہے ایک صاحب خیر نے مجھ سے بیان

کیا کہ وہ مسجد بنواتے تھے اور ایک تھیلی میں روپے رکھے تھے۔ اور کام شروع کیا، جب ضرورت ہوتی اس میں سے ہی ہاتھ ڈال کر نکال لاتے یہاں تک کہ سب کام بن گیا۔ حساب جو لگایا تو جتنا روپیہ تھا اس سے کم نہیں ہوا تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے مگر ہمیشہ ضرور نہیں۔ بلکہ اس کے معنی اور ہیں اور وہی اکثر واقع ہیں اور وہ یہ کہ یہ مقدار قلیل جب تمہارے ہی صرف میں آئے بیماری میں خرچ نہ ہو اور ایسے ہی فضول خرچیوں میں، مقدمات میں، لا طائل تکلفات میں ضائع نہ جائے۔ جو کچھ آئے تمہاری ذات پر صرف ہو، چاہے تھوڑا ہو، اس سے بہتر ہے کہ زیادہ آئے اور تم پر خرچ نہ ہو، اور آخر میں میں کہتا ہوں کہ نہ ہو برکت مگر خود اللہ میاں کی رضا ہی دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، اللہ میاں ملیں پھر کیا حقیقت ہے کسی چیز کی، مال و دولت کے مقابلہ میں کیا اللہ میاں کی کچھ وقعت نہیں سمجھتے ہو۔ حضرات! اللہ میاں کی رضا وہ چیز ہے کہ جس کی نسبت ایک بزرگ کہتے ہیں۔

؎ بمان اے آنکہ جز تو پاک نیست

دنیا کے حکام کی صرف خوشنودی کے واسطے کتنے کتنے سفر اور کیا کیا خرچ کرنا پڑتا ہے اور پھر ان کی خوشنودی دیرپا نہیں۔ ذرا سی بات پر بگڑ گئے اور اللہ میاں فرماتے ہیں کہ ہم شکور ہیں۔ خیال کیجئے اس لفظ کو۔ (تطہیر رمضان ج ۱۶)

نکاح کی ترغیب

حدیث شریف میں ہے: یامعشر الشباب من استطاع منکم الباءة فلیتزوج فانها اغض للبصر واحصن للفرج.

(الصحیح للبخاری ۷:۳، الصحیح لمسلم کتاب النکاح ۱، ۲، سنن النسائی ۴:۱۶۹)

(اے جوانوں کی جماعت تم میں سے جو مہر دے سکے اس کو نکاح کر لینا چاہئے کیونکہ یہ پست نظری اور شرمگاہ کی حفاظت کا باعث ہے)

اور ترغیب نکاح سے محض کسر شہوت ہی مقصود نہیں بلکہ لذت بھی مراد ہے ورنہ کسر شہوت کی تو اور بھی صورتیں ہیں چنانچہ رہبانیت ہے۔ اختصاء ہے کافور کھا لینا ہے۔ بعض صحابہؓ نے اپنے اجتہاد سے یا راہبوں کو دیکھ کر اختصاء کی اجازت چاہی تھی۔ تو حضورؐ نے نہایت سختی سے منع فرمایا۔ پھر شریعت میں عزل سے منع کیا گیا ہے کیونکہ اس میں شبع کامل

ولذت اکمل نہیں ہوتی۔ اگر نکاح سے محض کسر شہوت ہی مقصود ہوتی تو عزل پر انکار نہ کیا جاتا اور گو بعض نصوص سے ترغیب سے مقصود توالد ہے لیکن وہ خود موقوف ہے لذت پر تو مشروط کی ترغیب شرط کی ترغیب ہے۔ (تقلیل السنام بصورۃ القیام ج ١٦)

اسوہ حسنہ

احادیث میں اس طرح ہے کہ حضرات ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے بعض صحابہ نے حضورؐ کے معمولات پوچھے۔ انہوں نے ظاہر فرمایا جس کا حاصل یہ تھا کہ آپ رات کو کچھ دیر سوتے ہیں کچھ دیر جاگتے ہیں۔ کچھ دیر عبادت کرتے ہیں کچھ وقت بیبیوں کی باتوں میں صرف کر دیتے ہیں کبھی روزہ رکھتے ہیں کبھی افطار کرتے ہیں۔ راوی کہتے۔ ہیں۔

فکانهم تقالوها وقالوا این نحن من النبی صلی الله علیه وسلم وقد غفر الله ماتقدم من ذنبه وماتاخر فقال احدهم اما انافاصلی اللیل ابداً وقال آخر انا اصوم النهار ابداً ولا افطر وقال الاخرانا اعتزل النساء فلا اتزوج ابداً

یعنی ان حضرات نے حضورؐ کے دستور العمل کو سہل دیکھ کر قلیل سمجھا اور کہنے لگے کہ حضور کو تو زیادہ عمل کی ضرورت نہیں اور تقلیل عمل مضر نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے آپ کے سب اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے ہیں۔ (بالفرض اگر ہوں ورنہ آپ میں گناہ کا وجود ہی نہ تھا ١٢) لیکن ہم کو بوجہ اپنے نقصان مرتبہ کے زیادہ عمل کی ضرورت ہے۔ اس لئے ایک نے قسم کھائی کہ میں تو آج سے تمام رات نہ سوؤں گا یہ عمل شاق تو اس نے اختیار کیا۔ دوسرے بولے کہ میں ساری عمر روزے ہی رکھا کروں گا۔ تیسرے بولے میں کبھی نکاح ہی نہ کروں گا۔ صحابہؓ کی بھی عجیب حالت تھی کہ حضورؐ کے عمل قلیل دیکھ کر یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ لاؤ ہم بھی کم ہی کیا کریں کیوں مصیبت میں پڑے واقعی ہم تو اپنے مرشد کی عبادت کم دیکھ کر یہی کہیں کہ ہم کو بھی زیادہ کی کیا ضرورت ہے۔ مگر صحابہؓ نے اس کے برعکس یہ کہا کہ گو حضورؐ کم کریں مگر ہم کو زیادہ ہی کرنا چاہیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور ان حضرات کے خیالات کی غلطی ظاہر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ تم نے ایسا ایسا کہا یاد رکھو میں تم سے زیادہ حق تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ لیکن باوجود اس کے

اصوم وافطر واصلی وارقد و اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی متفق علیه: (الصحیح للبخاری والصحیح لمسلم)

یعنی میں کبھی روزہ رکھتا ہوں، کبھی افطار کرتا ہوں اور کچھ جاگتا ہوں، کچھ سوتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ (یہی میری سنت ہے) اور جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ تو دیکھئے ان صحابہ کے خیال کا یہی حاصل تھا کہ حضورؐ کو لذات کے استعمال سے ضرر نہیں ہوتا مگر ہم کو ضرور ہوگا۔ اس لئے ہمیں لذات سے بچنا چاہیے۔ مگر حضورؐ نے اس خیال کو خلاف سنت بتلایا۔ پس ثابت ہوا کہ کثرت وقاع سے ضرر کا اعتقاد رکھنا دین میں بدعت ایجاد کرنا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کثرت وقاع میں ہر شخص کو اپنی قوت کا اندازہ کر لینا ضروری ہے۔ اسراف تو ہر شئے میں مذموم ہے پھر حضورؐ کے بعد صحابہؓ کے طرز عمل کو دیکھا جائے تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ رمضان میں افطار کر کے عشاء کے وقت تک گیارہ عورتوں سے فارغ ہوا کرتے تھے۔ ان میں باندیاں بھی تھیں۔ شاید کوئی یہ کہے کہ مغرب سے عشاء تک وقت ہی کیا ہوتا ہے، جس میں گیارہ سے فراغت کر لیتے تھے اور جلدی جلدی فارغ ہوتے تھے تو یہ ان کے ضعف کی دلیل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کے زمانہ میں عشاء کی نماز دیر میں ہوتی تھی اس لئے ان کو کافی وقت ملتا تھا اور ہم اس لئے جلدی پڑھتے ہیں کہ شاید زیادہ دیر کرنے سے کوئی نماز ہی کو نہ آوے۔ اور ہم کسی کو کیوں کہیں ہمیں سب سے پہلے اپنا ہی احتمال ہے کہ شاید ہم ہی نہ آویں۔ غرض صحابہ کا کثرت وقاع میں یہ طرز عمل تھا اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ یہ وہ بزرگ ہیں جو اتباع سنت و زہد و عبادت میں صحابہ کے اندر ممتاز تھے۔ ان کے طرز سے بھی معلوم ہوا کہ کثرت وقاع زہد و عبادت کیخلاف نہیں اور نہ باطن کو مضر ہے۔ (تقلیل المنام بصورۃ القیام ج۱۶)

بنی اسرائیل کے کفن چور کا واقعہ

حدیث میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک کفن چور تھا اس نے مرنے کے وقت اپنے سب بیٹوں کو جمع کر کے کہا کہ میں تمہارا کیسا باپ تھا یعنی تمہارے ساتھ کیسا برتاؤ کیا ہے انہوں نے کہا بہت اچھا برتاؤ کیا اس نے کہا اس کے عوض میرا ایک چھوٹا سا کام کر دو گے انہوں نے کہا جان و دل سے کر دیں گے کہا کہ جب میں مر جاؤں تو میری لاش کو جلا دینا اور اس کی راکھ کو محفوظ رکھنا اور جب خوب زور شور کی آندھی چلے تو اس راکھ کو منتشر کر دینا شاید

میں اس طرح سے خدا کے ہاتھ نہ لگوں اور عذاب سے بچ جاؤں اور خدا تعالیٰ مجھ پر قادر ہو گئے تو مجھ پر ایسا سخت عذاب کریں گے کہ کبھی کسی پر نہ کیا ہوگا۔ چنانچہ جب وہ مر گیا تو اس کے بیٹوں نے اس کی وصیت پر عمل کیا حق تعالیٰ نے اس کے تمام اجزاء جمع کر کے نفخ روح کیا جب زندہ ہو گیا تو پوچھا کیوں صاحب یہ کیا حرکت تھی ایسا کیوں کیا اس نے عرض کیا اے پروردگار تیرے خوف سے ایسا کیا حدیث میں آتا ہے۔ فغفر لہ یعنی اتنی بات پر اس کی مغفرت کر دی گئی۔ اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب اسے خدا کی قدرت میں شک تھا تو مومن کیسے ہوا۔ جب مومن نہ ہو تو مغفرت کیسے ہو گئی اور اس کا جواب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ شاید پہلی امم میں غیر مومن کی بھی مغفرت ہوا کرتی ہو سو اس کا احتمال اس لئے نہیں کہ یہ امر نصوص سے معلوم ہے کہ اس امت پر رحمت زیادہ ہے حتیٰ کہ کفار پر بھی بہ نسبت پہلے کفار کے رحمت زیادہ ہے کہ گناہ کرتے ہیں اور بنی اسرائیل کی طرح مسخ نہیں ہوتے۔ عاد کی طرح تیز ہواؤں سے ہلاک نہیں کئے جاتے کسی کو الٹ دیا گیا۔ کسی کو فرشتے کی چیخ سے ہلاک کر دیا۔ کہیں اس امت میں بھی ہے اور اس امت کے کفار کے واسطے نص قطعی ہے کہ مغفرت نہیں ہوگی سو پہلی امم کے کفار کی مغفرت ہوگی تو اس امت کے کفار کی بھی ہوگی۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ان پر رحمت زیادہ ہے اور لازم باطل ہے لہذا ملزوم بھی باطل پس یہ جواب نہیں چل سکتا پس اعتراض باقی رہا کہ وہ قدرت میں تردد کی وجہ سے کافر تھا تو مغفرت کیسے ہو گئی۔ غرض یہ اشکال ہے بعضوں نے اس سے بچنے کے لئے ان قدر اللہ (اگر قادر ہو گئے اللہ تعالیٰ ۱۲) کے معنی ہیں تاویل کی کہ قدر کے معنی ضیق (تنگی کی ۱۲) کے بھی آتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان تکلفات کے بغیر اس کا جواب نہایت سہل ہے وہ یہ کہ اس کی سمجھ اتنی ہی تھی اور وہ اپنی سمجھ کے موافق مکلف تھا۔ وہ یوں سمجھتا تھا کہ بس قدرت اتنی ہی ہوتی ہے۔ اتنی عقل نہ تھی کہ یہ سمجھتا کہ وہ قدرت اس سے بہت آگے ہے۔ اسی طرح اس باب میں اعرابیوں کی عجیب وغریب حکایتیں مشہور ہیں۔ ایک اعرابی کی حکایت ہے کہ ایک واعظ نے اپنے وعظ میں بیان کیا کہ حق تعالیٰ کے نہ ہاتھ ہے نہ پاؤں نہ آنکھ ہے نہ ناک نہ اور اعضاء۔ غرض وہ جوارح سے بالکل پاک ہے۔ ایک اعرابی سن کر کہنے لگا کہ بطیخ شامی کی طرح گول مول اور اپاہج تیرا ہی خدا ہوگا ہمارے خدا کے سب کچھ

ہے۔ غرض ہر شخص اپنی فہم کے موافق سمجھتا ہے اور اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا کہ باوجود ان بدیہی غلطیوں کے پھر بھی ان سب کا نام دفتر عارفین میں لکھا ہوا ہے اور دوسرے تو کنہ ذات کی کیا سمجھتے جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی لا احصی ثناء علیک (مسند احمد ۶: ۵۸، اتحاف السادۃ المتقین ۲: ۷۱) (میں تیری تعریف ہی نہیں کر سکتا ہوں ۱۲) فرماتے ہیں پھر کسی اور کی کیا مجال جو کنہ اور حقیقت دریافت کر سکے۔ (روح القیام ج ۱۶)

روز محشر اعمال کی کیفیت

قرآن مجید میں ہے وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا (جو جو اعمال انہوں نے کئے ہیں ان میں موجود پالیں گے ۱۲) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کی بھی تفسیر فرمائی تھی۔ مشہور تفسیر تو اس کی مکتوب فی الصحیفہ (نامہ اعمال میں لکھا ہوا ۱۲) سے کی ہے مگر مولانا فرماتے تھے کہ خود اعمال حاضر ہوں گے جب ظاہر الفاظ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا سے معلوم ہوتا ہے یعنی قیامت کے روز سارے اعمال کو حاضر پائیں گے اس پر اشکال یہ ہے کہ جو اعمال ختم ہو چکے وہ کیسے عود کریں گے۔ محقق دوانی نے اسے اس طرح رفع کیا ہے کہ انہوں نے اپنے رسالہ زوراء میں یہ ثابت کیا ہے کہ حقائق اعمال کے جوہر ہیں۔ یہ رسالہ حضرت نے میرے پاس بھیجا تھا شاید بھیجنے سے یہ مقصود ہو کہ ان کی تحقیق حضرت کو پسند آئی ہو واللہ اعلم میں اس کو یقینا کہہ نہیں سکتا کیونکہ کچھ فرمایا نہیں۔ میں نے اس رسالہ کو دیکھا میری سمجھ میں یہ بات تو نہیں آتی کہ حقائق اعمال جوہر ہیں۔ ہاں اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ معنی مصدری قیامت میں نہ ہوں گے بلکہ حسب تحریر مولانا محمد یعقوب صاحب ان اعمال کے اثر قیامت کے روز شکلیں بن کر اہل محشر کو نظر آئیں گی۔ مثلاً جو چوری کر چکا ہے وہاں نظر آئے گا کہ چوری کر رہا ہے۔ زنا کر چکا وہاں نظر آئے گا۔ کہ زنا کر رہا ہے۔ غرض جو آثار اعمال کے اس کے بدن میں جمع ہیں سب وہاں اعمال بن کر نظر آئیں گے۔

اس کی مثال یہاں بھی خدا نے پیدا کر دی ہے یعنی جس طرح بائیسکوپ کے اندر گذشتہ واقعات کی صورتیں نظر آتی ہیں اسی طرح قیامت کے دن یہ بھی بائیسکوپ بن جائے گا اور اس کے ہاتھ پیر گراموفون کی طرح جو کچھ اس نے کیا ہے بولیں گے۔ ایک زانی کی حکایت ہے کہ زنا کر کے غسل کر رہا تھا۔ غسل کا پانی نالی سے بہہ رہا تھا۔ ایک بزرگ کا ادھر سے گزر ہوا اس پانی کو دیکھ کر کہا اس میں زنا بہہ رہا ہے۔ پوچھا حضرت آپ کو کیونکر معلوم ہوا فرمایا کوئی

زانی غسل کر رہا ہے۔ مجھے پانی کے ہر ہر قطرہ میں زنا کی تصویر نظر آتی ہے۔ تو حضرت تمام اعمال کے آثار اس میں پیدا ہو جاتے ہیں تو جو صورت صلوٰتیہ پہلی ہیں وہ سب اس شخص کے اندر موجود ہیں تو یہ صلوۃ جس میں نفخ ہوا روح کا اسی سے سب میں روح پھیل جائے گی۔ دیکھو جس وقت ایک آئینہ پر روشنی کا عکس پڑتا ہے تو وہ اپنے پاس کے آئینوں کو بھی روشن کر دیتا ہے بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو جو صورت ایک آئینہ کے اندر آتی ہے سب میں پہنچ جاتی ہے اسی طرح اگر پہلی نمازوں میں قابلیت ہے تو بھی ایک روح ان میں بھی پہنچ جائے گی۔ کما قیل

؎ آفتابے در ہزاراں آبگینہ تافتہ

(ایک سورج ہزاروں شیشوں میں چمکتا ہے ١٢) (روح القیام ج ١٦)

فکر آخرت کی برکات

دنیا ظل ہے آخرت کا حدیث شریف میں ہے۔

من جعل همومه هما واحدً اهم الأخرة كفاه الله همومه' كلها (سنن ابن ماجة: ٢٥٧، المستدرک للحاکم ٢: ٤٤٣، مشکوٰة المصابیح: ٢٦٣)

یعنی جس نے اپنے تمام افکار کو ایک ہی فکر بنا لیا یعنی فکر آخرت اللہ تعالیٰ اس کے تمام افکار کو کفایت فرماتا ہے۔ **ومن تشعبت به هموم الدنيا** اور جس پر ہموم دنیا نے ہجوم کر دیا **لم يبال الله فى اى اودية هلك** خدا کو کچھ پرواہ نہیں کہ وہ اس کے کس جنگل میں ہلاک ہوگا۔ بہرحال حدیث سے بھی ثابت ہو گیا کہ ترک دنیا کے بعد دنیا خود حاصل ہو جاتی ہے اور قرآن سے بھی ثابت ہے فرماتے ہیں وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا جو اللہ سے ڈرتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ ایک راستہ نکال دیتے ہیں مگر اس کے یہ معنی نہ سمجھنا کہ نوکری کی ضرورت نہیں رہے گی زراعت وتجارت کی حاجت نہیں رہے گی۔

جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کہ دو دو مہینے چولہا نہیں گرم ہوا۔ ہنڈیا نہیں چڑھی۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ فرعون کو ظاہری تکلیف نہ ہونے سے فضیلت ہو گئی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ بیمار ہوتے ہیں تو انہیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہائے بیماری بڑھ جائے گی تو کیا ہوگی۔ ہائے مقدمہ اگر ہائی کورٹ سے بھی ہار گئے تو پھر کیا ہوگا۔ ہائے کل کھانے کو نہیں تو دن کیونکر کٹے گا۔ یہ حالت ان کی نہیں ہوتی انہیں ہر حال میں سکون واطمینان رہتا ہے۔ (روح القیام ج ١٦)

فضیلت تلاوۃ

تلاوت سب عباتوں سے افضل ہے بہت سی حدیثیں اس باب میں وارد ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ اس کے ایک ایک حرف پر دس دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ فقط الحمد کہہ لو پچاس نیکیاں مل گئیں۔ تو دیکھئے قرآن میں کس قدر حرف ہیں۔ اگر پورے قرآن کی تلاوت کریں گے تو کس قدر نیکیاں ملیں گی۔ اور فرماتے ہیں کہ خدا کسی کی طرف اس قدر متوجہ نہیں ہوتا جتنا قرآن پڑھنے والے نبی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نبی میں یہ قید لگانا دال ہے علت توجہ کی طرف کہ وہ قرآن کا پڑھنا ہو اگرچہ تالی امتی ہو۔ اسی واسطے میں جس ذاکر کو دیکھتا ہوں کہ تلاوت سے رغبت ہے تو اوراذ کار چھڑا دیتا ہوں یا کم کرا دیتا ہوں اور تلاوت کی تعلیم کرتا ہوں۔

یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ جب قرآن کی تلاوت اس قدر افضل ہے تو پھر اس کو چھوڑ کر ذکر و شغل کی تعلیم کیوں دی جاتی ہے۔ کیونکہ بات یہ ہے کہ جو تلاوت قرآن کے شرائط ہیں بعض اوقات ان میں کمی ہوتی ہے تو ذکر و شغل میں اسی لئے لگاتے ہیں تاکہ تلاوت کے قابل ہو جائے۔ (نور الصدور ج ۱۶)

وصل محبوب

حدیث میں آیا ہے کہ **شهرا عيد لا ينقصان** (الصحیح لمسلم کتاب الصیام: ۳۱، سنن ابی داؤد: ۲۳۲۳، سنن الترمذی: ۶۹۲) (عید کے دونوں مہینے کم نہیں ہوتے ۱۲) اس کی تفسیر بھی خود حدیث میں آئی ہے کہ وہ رمضان و ذی الحجہ ہیں۔ ذی الحجہ کا شہر عید فرمانا تو ظاہر ہے کہ اس میں عید کا دن ہے۔ لیکن رمضان کو اس وجہ سے عید فرمایا کہ یہ فرحت کا مہینہ ہے کہ ہر روز افطار کے وقت اس میں فرحت ہوتی ہے اور یا یہ وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جس معنی کو تم اسے عید کا مقابل سمجھتے ہو یعنی امساک عن الغذاء (غذا سے باز رکھنا ۱۲) سو اس معنی کے اعتبار سے بھی یہ عید ہی کا مہینہ ہے یعنی اس میں روحانی غذائیں ملتی ہیں۔ بلکہ جو حقیقی غذائیں اس ماہ میں ملتی ہیں وہ عید میں میسر بھی نہیں آتیں۔

وذكرك للمشتاق خير شراب وكل شراب دونه كسراب (روح الجوار ج ۱۶)

ایک حکمت اس میں میرے قلب پر منجانب اللہ وارد ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ایک کمال یہ ہے کہ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ یعنی جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتے

ہیں تو کن کہہ دیتے ہیں وہ ہو جاتی ہے اور انسان مظہر ہے کمالات حق کا۔ پس انسان کے اندر بھی اس کا کوئی نمونہ ہونا چاہیے۔ کہ اس کے ارادہ کرنے سے کوئی چیز پیدا ہو جاوے۔ بدون دخل اکتساب واتعاب کے چنانچہ اس کا ظہور اس نکاح ومباشرت سے ہوا کہ صرف ارادہ متوجہ ہوا کہ ہمارے بیٹا ہو بس ہو گیا تو اگر یہ نہ ہوتا تو حق تعالیٰ کی اس صنعت کا انسان میں ظہور نہ ہوتا۔ میرے ایک دوست عارف تھے وہ نکاح نہیں کرتے تھے میں نے انہیں یہ حکمت سمجھائی چنانچہ انہوں نے نکاح کیا ان کے یہاں بیٹا بھی ہوا مگر ہم کہ ہماری ہی بتائی ہوئی یہ تدبیر تھی یوں ہی رہ گئے اور کچھ بھی نہ ہوا۔ (یہ ظرافت تھی ۱۲)

افلاطون نے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا تھا کہ اگر آسمان کمان ہو اور حوادث تیر ہوں اور خدا تعالیٰ تیرانداز ہوں تو اس سے بھاگ کر کہاں جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیرانداز کے پاس جا کھڑا ہو۔ کیونکہ تیر دور والے کے لگتا ہے پاس والے کے نہیں لگتا۔ افلاطون نے کہا کہ یہ جواب بجز نبی کے کوئی نہیں دے سکتا واقعی آپ نبی ہیں مگر بایں ہمہ یہ حکما اتباع نہیں کرتے تھے یہ کہتے تھے کہ نبی کی ضرورت ان لوگوں کو ہے جنہوں نے اپنے نفوس کی اصلاح نہیں کی۔ **ونحن قوم قدھذبنا انفسنا فلاحاجة لنا الی من یھذبنا** اور ہم اپنے نفسوں کو مہذب بنا چکے ہیں۔ ہمیں کسی مہذب بنانے والے کی ضرورت نہیں۔ مگر بخدا ان کا یہ خیال غلط تھا۔ بھلا عقلی تہذیب بھی کہیں نبی سے مستغنیٰ کر سکتی ہے ان لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کی تہذیب کو دیکھا ہی نہیں۔ ورنہ اقرار کر لیتے کہ اس کے سامنے ہماری تہذیب سراسر بدتہذیبی ہے۔

قلت کلام کی ضرورت فی نفسہ اس قلت اختلاط سے زیادہ ہے مگر قلت کلام عادۃً موقوف ہے قلت اختلاط پر کیونکہ لوگوں سے میل جول کر کے زبان کو سنبھالنا دشوار ہے اس لئے قلت کلام کی سہل صورت یہی ہے کہ مخلوق سے الگ رہے۔ گوشہ نشینی اختیار کرے کیونکہ مجمع کا قرب بھی اختلاط کی مثل ہے مجمع کے قرب سے بھی سکوت نہیں ہو سکتا۔ اس لئے صوفیہ نے عزلت کو اختیار کیا ہے اور اس کی بہت تاکید کی ہے (تقلیل الاختلاط مع الانام ج۱۶)

مقام ولدیت

حضرت خضر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں یہ سمجھتا تھا کہ میں سب اولیاء اللہ کو پہچانتا ہوں لیکن ایک مرتبہ ایک مجمع تھا وہاں حدیثوں کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ اور وہاں ایک شخص علیحدہ

نماز پڑھتا تھا میں نے اس سے کہا کہ بھائی تم اس مجمع میں کیوں شریک نہیں ہوتے وہ شخص صاحب حال تھے انہوں نے جو جواب دیا گو وہ بظاہر قواعد شرعیہ پر منطبق نہیں ہوتا مگر واقع میں خلاف نہیں جواب یہ دیا کہ بتلاؤ یہ لوگ کس سے روایت حدیث کی بیان کرتے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ سفیان اور اوزاعی وغیرہما سے کہا کہ جو خود اللہ تعالیٰ سے حدیث بیان کرے اس کو کیا ضرورت ہے کہ سفیان اور اوزاعی سے بیان کرے۔ خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کی دلیل کیا ہے کہ تم ایسے ہو کہا کہ دلیل اس کی یہ ہے کہ تم کو پہچانتا ہوں اور تم مجھ کو نہیں پہچانتے تم خضر ہو اور تم تو بتلاؤ میں کون ہوں۔ خضر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس روز مجھ کو معلوم ہوا کہ بعض اھل ولایت کو میں بھی نہیں پہچانتا۔ سچ ہے۔ **اولیائی تحت قبائی لا یعرفھم سوائی** (اولیاء اللہ میری چادر تلے ہیں ان کو میرے سوا کوئی نہیں پہچانتا) ایسے حضرات سے ارشاد اور تلقین بھی بہت کم ہوتا ہے مگر ان کو اس کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی کہ ہم سے کسی کو نفع نہیں۔ حضرت احمد جامؒ اسی مضمون کو بیان فرماتے ہیں۔

احمد تو عاشقی بمشیخت تراچہ کار   دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

ترجمہ: اے احمد تو عاشق ہے تجھے پیری مریدی سے کیا کام ہے دیوانہ رہ۔ سلسلہ ہوا ہوا' نہ ہوا نہ ہوا۔ (التہذیب ج۱۲)

عرب کی جاہلانہ رسم

حدیث میں ہے **الوائدة والموؤدة کلتا ھما فی النار** کہ زندہ درگور کرنے والی اور زندہ درگور کی گئی دونوں آگ میں ہیں۔ ہندوستان میں بھی لڑکیوں کے مارنے کی عادت تھی مگر سلطنت نے اس کا انتظام کر دیا۔ عرب میں یہاں سے زیادہ آفت تھی کہ لڑکی کو زندہ درگور کر دیتے تھے کہ وہ خود ہی گھٹ کر مر جاتی تھی یہاں تو مار کر دفن کر دیتے تھے مگر عرب کا طریقہ یہاں سے اشد تھا شاید اس صورت سے مارنے میں عرب کا یہ خیال ہو کہ مارنے کے فعل کو اپنے ذمہ کیوں رکھیں یا معلوم نہیں کہ عرب کے نزدیک اس کا کوئی اور اختراعی سبب تھا غرض کہ یہ رواج تھا اور یہ حدیث اس کے متعلق ہے۔ **الوائدة والموؤدة کلتا ھما فی النار** (سنن ابی داوٗد: ۴۷۱۷، مسند احمد ۳:۴۷۸، کنز العمال: ۲۸۱، الدر المنثور ۳:۲۸۴) اس میں ظاہراً یہ شبہ ہوتا ہے کہ بچی نے کیا خطا کی ہے جس کی وجہ سے

وہ دوزخ میں ڈالی گئی۔ علماء نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں سب سے اچھا جواب یہ ہے کہ بچی دوزخ میں تو ہوگی مگر معذب نہ ہوگی جیسے جہنم میں فرشتے بھی ہوں گے مگر معذب نہ ہوں گے چنانچہ خزنہ جہنم دوزخ ہی میں ہوں گے مگر وہاں بھی ویسے ہی مقرب ہیں جیسے جنت کے فرشتے جنت میں کیونکہ اصل انعام تو بندہ پر یہ ہے کہ اس کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہو خواہ دوزخ میں ہو یا جنت میں اگر دوزخ میں معیت ہے تو پھر تکلیف کا کیا ذکر ہے وہی جنت ہے اور اگر جنت میں معیت نہ ہوتی وہ دوزخ سے بدتر ہوتی۔

با تو دوزخ جنت است اے جانفزا　　بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

(اے میری جان تیرا ساتھ ہو تو دوزخ بھی جنت ہے اے دل ربا تیرے بغیر جنت بھی دوزخ ہے)

خزنہ جہنم کے ساتھ خدا تعالیٰ کی معیت ہوگی اس لئے وہ فرشتے آرام ہی میں ہونگے۔

(مثلث رمضان ج۱۶)

حقیقت تعذیب

جیل خانہ میں ایک تو مجرم ہوتے ہیں اور ایک وہ جو وہاں ملازم ہیں۔ مجرمین کو تکلیف ہوتی ہے کہ ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہوتا ہے اور ملازمین جیسے اور جگہ خوش ہیں اسی طرح وہاں بھی وجہ یہی ہے کہ مجرمین کے ساتھ حکومت کی معیت نہیں ہوتی بلکہ عتاب متعلق ہوتا ہے اور ملازمین کے ساتھ معیت ہوتی ہے۔

البتہ ایک شبہ یہاں یہ واقع ہوتا ہے کہ پھر موؤدہ کو جہنم میں رکھنے سے فائدہ کیا جبکہ وہ معذب نہیں کیا اس کے لئے جہنم ہی میں ٹھکانا تھا جواب یہ ہے کہ اول تو ہمیں مصلحت دریافت کرنے کی مجال نہیں خیر میں مصلحت بھی بتاتا ہوں وہ یہ کہ بچی جس کو زندہ درگور کیا تھا وہ ماں کے پیش نظر رہے اس سے ماں کے لئے زیادتی عذاب کی مقصود ہے کہ اس کو دیکھ دیکھ کر اپنا فعل یاد کر کے خوب کڑھے اور رنج ہو کہ ہائے میں کیسی سنگدل تھی کہ میں نے اپنی بیٹی کے ساتھ یہ حرکت کی جس کی وجہ سے آج عذاب بھگت رہی ہوں نیز ممکن ہے کہ اس پر حقیقت بھی منکشف نہ ہو اور وہ یہی سمجھتی رہے کہ میری بچی پر بھی عذاب ہو رہا ہے۔ حالانکہ وہ معذب نہیں اور حقیقت منکشف نہ ہونے سے اس کا حسرت اور رنج اور زیادہ ہو جاوے جو کہ باعث زیادتی عذاب کا ہے اور یہ ضرور نہیں کہ وہاں سب ہی کو ایسا انکشاف عام ہو جاوے کہ کوئی چیز مخفی ہی نہ رہے ہاں دنیا سے زیادہ وہاں انکشاف ہوگا۔

وجہ یہ ہے کہ ممکنات کے علوم متناہی ہیں اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ بعض علوم مخفی بھی ہوں بس ماں یہ سمجھے گی کہ مجھ پر عذاب ہے اور میری وجہ سے بچی پر بھی عذاب ہے اس سے عذاب میں زیادتی ہوگی اور اولاد سے تعلق فطری ہے وہاں بھی یہ تعلق بالکلیہ منقطع نہ ہوگا کیونکہ فطریات عادۃً بدلا نہیں کرتے تو جب ماں یہ سمجھے گی کہ میری وجہ سے یہ بھی عذاب میں ہے اس سے اس کی کلفت بڑھے گی اگر اس محمل پر حدیث کو محمول کرلیا جاوے تو کیا قباحت ہے۔ (شلث رمضان ج١٦)

تعذیب شمس وقمر

حدیث میں ہے **الشمس والقمر مکوران فی النار یوم القیمة** (مجمع الزوائد ١٠: ٣٩٠، مشکوۃ المصابیح: ٥٦٩٢، مشکل الآثار ١: ٦٧) کہ آفتاب اور چاند بے نور کر کے جہنم میں ڈالے جاویں گے یہاں بھی وہی شبہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کیا خطا کی ہے کہ جس کی وجہ سے جہنم میں ہوں گے جواب یہ ہے کہ خطا کی تحقیق کی ضرورت اس وقت ہے جبکہ وہ معذب بھی ہوں سو وہ معذب نہ ہوں گے اور ان کو دوزخ میں ڈالنے سے مشرکین کو دکھانا ہوگا کہ یہ خود کو تو دوزخ سے بچا ہی نہ سکے تم کو تو کیا بچا سکتے۔ اس کو اقرب اس لئے کہا گیا کہ ذی روح کا معذب ہونا اتنا مستبعد نہیں جتنا غیر ذی روح کا معذب ہونا (اس موقعہ پر ذی روح وہ لڑکی ہے جس کو زندہ درگور کیا تھا اور غیر ذی روح شمس وقمر ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ لڑکی معذب تو نہ ہوگی مگر اس کا معذب ہونا اتنا بعید نہ تھا جتنا کہ شمس وقمر کا معذب ہونا بعید ہے کیونکہ لڑکی ذی حیات ہے اور ذی حیات کو عادۃً تکلیف ہونا بعید نہیں اور شمس و قمر غیر ذی حیات ہیں اور غیر ذی روح کو عادۃً تہذیب نہیں ہوتی چنانچہ لکڑیوں کو آگ میں جلاتے ہیں مگر بوجہ غیر ذی روح ہونے کے ان کو تکلیف ہونا مستبعد ہے بخلاف اس کے کہ کسی جاندار کو آگ میں ڈال دیں کہ اس کو تکلیف ہونا کچھ بھی بعید نہیں اگرچہ حق تعالیٰ کو اس پر بھی قدرت ہے کہ غیر ذی روح کو بھی معذب فرماویں۔ پس شمس وقمر ہوں گے تو وہ دوزخ میں مگر معذب نہ ہوں گے کیونکہ ذی روح نہیں اور اسی لئے مکلف نہیں بلکہ بعض ذی روح بھی مکلف نہیں جیسے حیوانات وبہائم بلکہ بعض ذوی العقول بھی بواسطہ انبیاء کے مکلف نہیں یعنی ان کی طرف انبیاء کی بعثت نہیں ہوئی گو بعض اہل لطائف اس کے بھی قائل ہوئے ہیں

کہ ملائکہ بھی اس طرح مکلف ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت ان کی طرف بھی ہے۔ بلکہ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ بعثت جمادات کی طرف بھی ہے اور وہ بھی مکلف ہیں اور بعثت الی کافۃ الخلق سے استدلال کیا ہے مگر میرے نزدیک یہ ایک لطیفہ ہے اور اگر اس کو مان بھی لیا جاوے تو کہا جاوے گا کہ یہ مکلف تو ہیں مگر ان چیزوں سے عصیان کا ظہور نہیں ہوا اس لئے معذب نہ ہوں گے چنانچہ کلام اللہ سے ان کا مطیع ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ (اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیا تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ کے سامنے عاجزی کرتے ہیں جو کہ آسمانوں میں زمین اور سورج اور چاند اور چوپایوں اور بہت سے آدمی اور وہ سجدہ کرتے ہیں) اگر ان سے عصیان ہوتا بوجہ اس کے کہ اس قول میں ان کی طرف بھی بعثت ہے اور یہ مکلف ہیں اس لئے ضرور تھا کہ یہ معذب بھی ہوں مگر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عصیان نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے سمٰوات وارض وشمس وقمر ودواب (آسمان، زمین سورج، چاند اور چوپائے) سب کے متعلق بلا استثناء کے یسجد لہ فرمایا ہے اور ناس کے لئے کثیر کی قید بڑھائی ہے اس سے معلوم ہوا کہ ناس میں تو بعض مطیع اور بعض عاصی ہیں مگر اور مخلوقات میں سب مطیع ہیں اور آیت میں ناس سے مراد انس وجن دونوں ہیں کیونکہ ناس کا ترجمہ ہے لوگ جن کو بھی کہتے ہیں مگر ایک طالب علم تھے وہ جانوروں کو بھی لوگ کہا کرتے تھے ایک دفعہ کہنے لگے کہ بندر لوگ بڑے شریر ہیں مگر محاورہ میں لوگ صرف انس وجن کو کہتے ہیں۔ غرض انس وجن میں تو دو قسمیں ہیں بعض فرمانبردار بعض نافرمان اور جو ان کے سوا ہیں وہ سب فرمانبردار ہیں۔ لہذا شمس وقمر کا غیر معذب ہونا واضح ہو گیا اس کے خلاف کا احتمال ہی نہیں گو طالب علمی کے زمانہ میں ایک شخص مجھ سے جھگڑ رہے تھے کہ یہ بھی معذب ہوں گے اور سبب یہ بتلاتے تھے جو چیزیں سبب معصیت ہوئی ہیں وہ بھی معذب ہونے چاہیں۔

جواب اس کا یہ ہے کہ سبب معصیت ہونا جو بالاختیار ہو وہ معذب ہونے کو مستلزم ہے نہ وہ جو کہ سبب بلا اختیار ہو چنانچہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ تسبب بلا اختیار معصیت نہیں ہے فقہاء اور صوفیہ ہی شریعت کو خوب سمجھنے والے ہیں ان ہی دونوں گروہ نے شریعت کے اسرار کو خوب

سمجھا ہے گو بعض فقہاء اور صوفیہ میں لڑائی بھی رہی ہے مگر جو حضرات جامع شریعت وطریقت ہوئے ہیں وہ کبھی نہیں لڑے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ محقق وہ ہے جس میں تین وصف ہوں، فقیہ ہو محدث ہو صوفی ہو محققین میں لڑائی نہیں ہوئی ہاں غیر محققین میں ہوئی ہے۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند (جب حقیقت معلوم نہ ہوتی تو افسانے بنانے شروع کر دیئے)

غرض فقہاء نے یہ مسئلہ سمجھا ہے کہ مطلق سبب بننا معصیت نہیں اس لئے جو چیزیں بلا اختیار سبب معصیت ہوئی ہیں وہ معذب نہ ہوں گی۔ (ثلث رمضان ج۱۲)

صورۃ تعذیب

البتہ اس میں کلام ہے کہ شمس وقمر آیا اپنی جگہ رہ کر جہنم میں ہوں گے یا ان کو اپنی جگہ سے ہٹا کر جہنم میں ڈالا جائے گا۔ جمہور کی رائے ہے کہ دونوں کو ہٹا کر جہنم میں ڈالا جائے گا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم بھی بہت بڑی ہے اس لئے کہ یہ اجرام یعنی شمس وقمر کوئی چھوٹی سی چیز نہیں ہیں شمس زمین سے ہزاروں حصہ بڑا ہے ایسے ہی قمر کو سمجھنا چاہیے بایں ہمہ مثل گولے کے جہنم میں پھینک دیئے جاویں گے مگر شیخ اکبرؒ کا کشف ہے کہ شمس وقمر اپنی جگہ رہیں گے۔ اور جہنم میں بھی ہوں گے اور وہ اس طرح کہ جہنم کو ان کی مستقر تک بلکہ اس سے بھی آگے بسط دیا جاویگا یعنی جہنم کی آگ میں بسط ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسی ہانڈی ڈھکی ہوئی پک رہی ہو اور پھر اس کو کھول دیا جاوے تو اس کی گرمی پھیل جاتی ہے اسی طرح جب جہنم کو کھول دیا جاوے گا تو اس کی حرارت پھیل جائے گی جس سے سمندر و ہوا سب آگ بن جاویں گے حتیٰ کہ آسمان تک حرارت پہنچے گی جو آفتاب وقمر کو بھی محیط ہو جاوے گی اور آفتاب وقمر دونوں اس میں داخل ہوں گے یہ صورت ہوگی شمس وقمر کے اپنی جگہ رہنے کی اور جہنم میں بھی ہونے کی اور پھر جہنم کی آگ متجاوز ہو کر ساتویں آسمان کے مقعر تک پہنچے گی اور وہاں بہت ہی لطیف ہو جائے گی کہ اس کی لطافت میں لذت ہوگی اور جنت کے میوے اسی لطیف گرمی سے پکیں گے اور جنت ساتویں آسمان کے محدب پر ہوگی اس کشف کی قرآن وحدیث نہ تائید ہی کرتا ہے اور نہ تکذیب ہی کرتا ہے۔ کشفیات میں ہم شیخ اکبرؒ کے تابع نہیں ہیں لیکن اگر کوئی اس کا قائل بھی ہو مگر جزماً نہیں تو کچھ حرج بھی نہیں کیونکہ جیسے تائید نہیں ویسے تکذیب بھی نہیں یہ فائدہ کے طور پر بیان کر دیا۔ بہر حال یہ اشکال وارد نہیں ہوتا کہ لڑکی جہنم میں ہو اور معذب نہ ہو۔ تو

اس بناء پر ممکن تھا کہ اہل جنت دوزخ میں بھیج دیئے جاتے اور معذب نہ ہوتے مگر حق تعالیٰ کی رحمت کو دیکھئے یہ احادیث میں آتا ہے کہ جب جنت میں اہل جنت داخل ہو چکیں گے پھر اس میں جگہ باقی رہ جائے گی تو حق سبحانہ تعالیٰ ایک مخلوق کو پیدا کریں گے کہ وہ اس میں رہا کرے گی اسی طرح جب جہنم باوجود اہل جہنم کے داخل ہونے کے ھَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ کہتی رہے گی پھر اس کے لئے حق تعالیٰ یہ نہ کریں گے کہ کسی مخلوق کو پیدا کر کے اس میں داخل کریں اور اس کا پیٹ بھر دیں گو وہ باوجود جہنم میں ہونے کے معذب بھی نہ ہوتے۔ بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ بلاوجہ عذاب کی صورت کو بھی گوارا نہیں فرماتے کہ کسی کو پیدا کر کے اس میں صورۃً بھی داخل فرمائیں۔ یہ عین رحمت ہے حدیث میں آتا ہے کہ دوزخ کے پکارتے رہنے پر حق تعالیٰ اپنا قدم اس پر رکھ دیں گے تو وہ کہے گی بس بس۔ اس حدیث کے معنیٰ اول تو واللہ اعلم کہلائیں اور اگر کوئی بات بھی سمجھ میں آوے مگر وہ بات مجلس عام میں کہنے کے قابل نہیں۔ اسلم طریق یہی ہے کہ زبان کو بند رکھا جاوے۔ (ثلث رمضان ج۱۶)

اہل جنت کی غذا و نعمتیں

حدیث میں ہے کہ اہل جنت کو ایک خاص غذا عطا ہوگی اور غذا اس زمین کی روٹی ہو گی اس میں اشکال یہ ہے کہ کیا ڈھیلے اور پتھر کھائیں گے کیونکہ زمین میں تو یہی چیزیں ہیں۔ دوسرے اس میں حکمت کیا ہے کہ اس زمین کی روٹی ملے کیا کوئی دوسری چیز جنت کی نہ تھی۔

ہمارے اساتذہ نے اس کو حل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے اور بات بھی نہایت لطیف ہے۔ گو درجہ ظن میں ہے اشکال کا جواب تو یہ ہے کہ حدیث میں یہ کہاں ہے کہ ڈھیلے اور پتھر کھائیں گے وہاں تو روٹی کا ذکر ہے کہ حق تعالیٰ زمین کی روٹی دیں گے اور سب اس میں سے کھائیں گے یہاں بھی تو ہم زمین کے اجزاء کھاتے ہیں۔ دیکھئے ایک من گیہوں بوتے ہیں اور بیس من پیدا ہوتے ہیں جو ایک من سے زائد ہیں وہ زمین ہی کے تو اجزاء ہیں۔ عناصر کے امتزاج سے ایک خاص ترکیب سے مٹی کی شکل گیہوں کی بن گئی۔ پس تم یہاں بھی تو زمین ہی کے اجزا کھا رہے ہو پھر جیسے یہاں چھننے کے بعد کھاتے ہو اسی طرح اللہ میاں وہاں بھی لطیف اجزاء کو چھان کر کھلائیں گے۔ زمین سے جتنے پھل وغیرہ پیدا ہوتے ہیں سب زمین ہی کے تو اجزاء ہیں اجزاء لطیف ان شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں تو ایک سوال تو

اس سے حل ہو گیا۔ باقی رہا حکمت کا سوال تو میں اپنے اساتذہ ہی سے اس کو نقل کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ بہت سے اللہ کے بندے وہ ہیں جنہوں نے دنیا کی چیزوں کو چکھا تک نہیں۔ خواہ اضطراراً کہ میسر نہیں ہوئی یا اختیاراً بمصلحت مجاہدہ و معالجہ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو پان کا مزہ نہیں جانتے تو بعضوں نے میوے نہ کھائے ہوں گے بعض نے گوشت نہ کھایا ہوگا تو اگر ان کو صرف جنت ہی کی نعمتیں دیتے تو ان کو دنیا اور جنت کی نعمتوں میں تفاوت نہ معلوم ہوتا اور بدون تفاوت کی پوری لذت اور قدر نہ ہوتی اس لئے ان کو اس شکل میں دنیا کی نعمتیں بھی عطا فرمائیں گے اور وہ نعمت دیں گے کہ جس میں ہزار ہا قسم کے مزے ہوں گے کیونکہ جتنے مزے دنیا میں ہیں زمین ہی سے نکلے ہوئے ہیں تاکہ موازنہ کر کے لذت زائد ہو پھر اصل میں تو صرف ان زاہدوں کو حکمت مذکورہ کے سبب کھلانا منظور ہوگا مگر کرم کی عادت پر زاہدوں کے ساتھ ہم شکم پروروں کو بھی کھلا دیں گے۔ پس جیسا اس موازنہ سے نعم جنت کا مزہ بڑھے گا اسی طرح ایسے ہی موازنہ سے جنت کا مزہ ایسے ہی لوگوں کو ہوگا جو دنیا میں مشقتیں اور مصائب اٹھا کر راحت کے موقعہ پر پہنچیں گے بخلاف ان کے جنہوں نے دنیا دیکھی ہی نہیں پیدا ہوتے ہی جنت میں داخل کر دیئے گئے۔ بہر حال اتنا معلوم ہوا کہ جنت اور دوزخ دونوں کے پر کرنے کے طریق میں رحمت کا ظہور ہوگا اسی ظہور کی فرع یہ بھی ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے مقرر فرمائے۔ (مثلث رمضان ج۱۶)

جہنم کی ہولناکی

بعض اہل کشف نے جہنم کی شکل کے بارہ میں کہا ہے کہ اس کی شکل اژدھے کی سی ہے اس کے پیٹ میں سانپ بچھو کھجورے وغیرہ ہیں سارا جہنم اژدھے کی صورت ہے اس سے ایک حدیث کے معنی بلا تاویل کے سمجھ میں آجاویں گے کہ حدیث میں آتا ہے کہ جہنم میدان قیامت میں لائی جاوے گی جس کو ستر ہزار باگیں ہوں گی اور ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے پکڑے ہوں گے مگر پھر بھی قابو سے نکلی جاتی ہوگی اور کڑکتی ہوگی اور هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ پکارتی ہوگی اس کے معنی صوفیہ کے قول پر اس طرح سمجھ میں آتے ہیں کہ چونکہ وہ ذی حیات ہے اس لئے اس قسم کے آثار اس سے پائے جاویں گے بات یہ ہے کہ قرآن و حدیث کو جس سہولت سے اہل باطن سمجھتے ہیں اور لوگ نہیں سمجھتے اور جاندار

ہونے کی صورت میں اس کا اثر فرحت میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے اہل باطن کے مسلک پر سیرابی کی فرحت صائمین کو بہت زیادہ حاصل ہوگی کیونکہ جب سنیں گے کہ باب الریان ذی حیات ہوگا تو یہ سمجھیں گے کہ دروازہ میں داخل ہونے والے تو خوش ہی ہوں گے مگر وہ دروازہ بھی بوجہ ذی حیات ہونے کے خوش ہوگا اور پھاٹک کے جاندار ہونے پر خلاف عادت ہونے کے خیال سے تعجب نہ کیا جاوے کیونکہ خلاف عادت بھی نہیں جیسے دنیا میں بچے کے لئے اماں جان پھاٹک بن جاتی ہیں کہ لڑکا اس کے طریق خاص سے نکلتا ہے ایسی ہی وہ دروازہ ہوگا اور یہ تعجب ایسا ہی ہے جیسے ایک ملحد نے اعتراض کیا تھا کہ جنت میں دودھ کی نہروں کے واسطے اتنی گائیں کہاں سے آئیں گی جواب یہ ہے کہ دنیا میں دودھ تھن میں سے نکلتا ہے اور خدا ہی پیدا کرتا ہے اگر وہاں وہ نہر ہی خاصیت میں ایک بڑا تھن ہو اور اس میں دودھ پیدا کر دیا جاوے تو کیا تعجب کی بات ہے اسی طرح جیسے یہاں جاندار پھاٹک پیدا کئے ہیں وہاں بھی پیدا کر دیں تو کیا محل تعجب ہے۔ (مثلث رمضان ج ۱۶)

نیکی کی برکات

طاعات کا یہ بھی اثر ہے کہ ان کی برکت سے گناہ کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے بلکہ بعض دفعہ گناہ مقدر (بتقدیر معلق) بھی ٹل جاتا ہے چنانچہ حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید تھا بہت نماز تہجد گزار پابند ذکر و شغل اس کو ایک رات میں ستر بار احتلام ہوا وہ بڑا پریشان ہوا کہ یہ کیا مصیبت ہے ساری رات غسل ہی میں گزر گئی نہ تہجد رہا نہ ذکر و شغل صبح کو شیخ سے حالت عرض کی فرمایا کہ تم اس حالت سے مغموم مت ہو مجھے معلوم ہوا تھا کہ تیری تقدیر میں ستر دفعہ زنا کرنا لکھا ہوا ہے میں نے دعا کی تھی کہ اے اللہ اس بلا سے نجات دیجئے اللہ تعالیٰ نے میری دعا سے بیداری کے زنا کو خواب کے زنا کی طرف منتقل فرما دیا ہے۔ جس میں گناہ ہی نہیں ہوا اب تم بے فکر رہو بڑی بلا ٹل گئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ ہم ذکر وغیرہ کر رہے ہیں اور آسانی سے کر لیتے ہیں یہ آسانی خدا تعالیٰ کی عطا ہے ورنہ بہت سی مخلوق ایسی بھی ہے۔ جس کو ذکر کی توفیق نہیں اور ان کے لئے یہ کام سب سے زیادہ دشوار ہے اس پر میں نے استطرادًا یہ بھی بتلا دیا تھا کہ بعض دفعہ ذکر سے زبان بند ہونے کا سبب غایت قرب بھی ہوتا ہے۔ بہر حال آپ کو جو کلمہ شریف پڑھنا آسان ہے یہ خدا کی بہت بڑی نعمت ہے ورنہ کبھی یہ بھی بند ہو جاتا ہے۔ (اکمال العدۃ ج ۱۶)

اقسام انسان

انسان چار قسم کے ہیں ایک وہ جن کو دین کی عقل بھی ہے اور دنیا کی بھی جیسے انبیاء اور ورثۃ الانبیاء یعنی وہ علماء مسند ارشاد پر متمکن ہیں دوسرے وہ جن کو دین کی عقل ہے اور دنیا کی نہیں۔ جیسے بھولے بھالے صلحاء واولیاء امت۔ تیسرے وہ جن کو دین کی عقل نہیں ہے اور دنیا کی عقل ہے جیسے عاقل کفار، چوتھے وہ جن کو نہ دنیا کی عقل نہ دین کی عقل جیسے بیوقوف کفار۔

غرض انبیاء اور علماء محققین کامل العقل ہوتے ہیں گو تجربہ میں اس لئے کمی ہو کہ وہ دنیاوی امور میں منہمک نہیں ہیں۔ (اکمال الصوم والعید ج ۱۶)

تبلیغ کا حکیمانہ طرز

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ میں ایک شخص حاضر ہوا آپ نے دیکھا کہ اس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچا ہے۔ جب وعظ ختم ہوا اور لوگ چلنے لگے تو آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ ذرا آپ ٹھہر جائیں مجھ کو آپ سے ایک کام ہے۔ جب سب چلے گئے تو آپ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں نے تم کو اس لئے روکا ہے کہ بھائی ذرا میرے پاجامہ کو دیکھو مجھ کو شبہ یہ ہو جاتا ہے کہ میرا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹک جاتا ہے آیا یہ میرا خیال ہی خیال ہے یا واقعی ٹخنوں سے نیچا ہے کیونکہ جس کا ٹخنوں سے نیچے پاجامہ ہوگا وہ دوزخ میں جائے گا وغیرہ وغیرہ تو بھائی دوزخ کا سخت عذاب ہے۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے ذرا اچھی طرح میرے پاجامہ کو دیکھ لو۔ یہ سنتے ہی وہ شخص شرما گیا اور پیروں میں گر پڑا اور کہا کہ حضرت آپ کا پاجامہ تو نہیں لٹکتا ہے البتہ مجھ نالائق کو لٹکتا ہے میں توبہ کرتا ہوں آئندہ ایسا نہ ہوگا۔ (سنت ابراہیم ج ۱۷)

رحمت خداوندی

جو لوگ گائے ذبح نہ کرنے میں دعویٰ رحم کا کرتے ہیں وہ بدفہم بھی پورے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قربانی کا بھی حکم دیا ہے اور جانوروں پر رحم کرنے کا بھی حکم فرمایا ہے اگر قربانی خلاف رحم ہوتی تو اللہ تعالیٰ جو سب سے زیادہ رحیم ہیں وہ کیوں اس کا حکم فرماتے مگر جب اللہ تعالیٰ نے قربانی کا حکم فرمایا ہے اب اس کو بے رحمی کہنا گویا معاذ اللہ خدا کو بے رحم کہنا ہے۔ (سنت ابراہیم ج ۱۷)

قربانی سنت ابراہیم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ نے عرض کیا **ما ھذہ الاضاحی یا رسول اللہ** یعنی یہ قربانیاں کیا چیز ہیں؟ آپ نے فرمایا **سنة ابیکم ابراھیم** (تمہارے ابا جان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے) سو احقر نے اس میں یہ بیان کیا تھا کہ صحابہ نے قربانی کی حقیقت پوچھی تھی آپ نے حقیقت بیان فرمائی جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ سنت ہے ابراہیم علیہ السلام کی اور ظاہر ہے کہ سنت سے مراد ہر سنت تو ہے نہیں کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کا ہر فعل تو قربانی نہیں ہے بلکہ مراد سنت خاصہ ہے پس جواب یہ ہوا کہ **التضحیة سنة خاصة لابراھیم** (قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت خاصہ ہے) بس ایک مقدمہ تو یہ ہوا جو حدیث سے ثابت ہے اب دیکھنا چاہئے کہ وہ سنت خاصہ کون سا فعل ہے سو قرآن میں جو اس کے متعلق قصہ مذکور ہے اس میں ان کے دو فعل منقول ہیں ایک ذبح ولد دوسرا ذبح کبش فدیہ اور ہر چند کہ سرسری نظر میں جو آپ کا اخیر فعل ہے یعنی ذبح کبش وہ مصداق معلوم ہوتا ہے سنت ابراہیم کا لیکن اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو اس بناء پر کہ اصل مامور یہ ذبح ولد تھا یہی احق ہے سنت کے مصداق ہونے کا پس دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ **سنة ابراھیم ذبح الولد** جو قرآن سے ثابت ہے اور اس کے عدم وقوع کو مانع ارادہ نہیں سمجھا جاوے کیونکہ ذبح بمعنی ذبح کردن جو کہ فعل اختیاری ہے وہ تو واقع ہوا البتہ اس کا اثر مطاوع یعنی مذبوح شدن واقع نہیں ہوا تو ذبح پر عدم وقوع کا حکم ہی غلط ہے نیز انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہے اور وحی میں غلطی کا احتمال نہیں اور خواب میں انی اذبحک (میں تجھے ذبح کر رہا ہوں) نص ہے تو ضرور ذبح کو واقع کہا جاوے گا۔ پس جب یہ اس کا مصداق ہوا تو اب عبارت جواب کی یہ ہوئی کہ التضحیة ذبح الولد (قربانی لڑکے کو ذبح کرنا ہے) اور ظاہر ہے کہ یہ حمل ظاہراً صحیح نہیں اور تصحیح ضروری ہے کیونکہ دونوں مقدمے صحیح ہوں تو نتیجہ ضرور صحیح ہوگا یعنی التضحیة ذبح الولد اور اس کا نتیجہ بالمعنی الاصطلاحی نہ سمجھا جاوے کیونکہ وہ لازم ہوتا ہے۔ صغریٰ اور کبریٰ کو اور یہاں سنة ابراہیم ذبح الولد جو مقدمہ ثانیہ ہے کلیہ نہیں مگر مدعا کا اثبات اس کے کبریٰ ہونے کے طور پر کیا بھی نہیں گیا بلکہ تقریر کی توجیہ یہ ہے کہ سنت سے مراد جب ذبح الولد ہے تو جملہ التضحیة سنة ابراہیم میں بجائے لفظ سنت ابراہیم کے لفظ ذبح الولد رکھ دو تو عبارت یہ بن جاوے گی کہ التضحیة ذبح

الولد (قربانی کی صورت لڑکے کو ذبح کرنا ہے) اور یہی مدعا تھا غرض جب دونوں مقدمے صحیح ہیں تو مدعا بھی صحیح ہونا لازم ہے پس اس کو سمجھنا چاہیے۔ یہاں موضوع و محمول میں دو دو احتمال ہونے سے کل چار احتمال اس حمل میں ہو سکتے ہیں ایک صورۃ التضحیۃ صورۃ ذبح الولد (قربانی کی صورت لڑکے کو ذبح کرنا ہے) دوسرا روح التضحیۃ روح ذبح الولد (قربانی کی صورت روح ہے ذبح الولد کی) تیسرا صورۃ التضحیۃ روح ذبح الولد چوتھا روح التضحیۃ ذبح الولد (روح قربانی کی ذبح ولد کی صورت ہے) اور بجز ثانی کے سب کا بطلان ظاہر ہے پس ثانی متعین ہو گیا یعنی ان دونوں فعل کی روح اور لب اور مغز ایک ہے مطلب یہ ہے کہ تضحیہ کی جو حقیقت اور مغز ہے وہ وہ ہے جو ذبح ولد کی حقیقت اور مغز ہے۔

اب یہ بات رہ گئی کہ وہ مغز ذبح الولد کا کیا ہے کہ اسی کو روح تضحیہ کہا جاوے گا سو وہ مغز ذبح الولد کا بالکل امر وجدانی ہے یعنی وہی امر ہے کہ تصور کیا جاوے کہ اگر بحکم حق میں ولد کو ذبح کر ڈالوں تو مجھ پر کیا حالت گزرے سو ظاہر ہے کہ سخت ناگواری طبعی گزرے اور ایسی حالت میں اس فعل کو کر ڈالنا یہ اس ناگواری طبعی کو برداشت کر لینا ہو پس وہ امر جو گزرے وہ یہ ہوا کہ طبعی ناگواری شدید کو خدا کے حکم سے برداشت کرنا اور اسی کو صوفیہ کی اصطلاح میں فناء نفس کہتے ہیں پس روح ذبح الولد کی فناء نفس ٹھہرا پس یہی فناء نفس روح تضحیہ کی ہوئی پس معنی جملہ التضحیۃ ذبح الولد کے یہ ہوئے کہ روح التضحیہ روح ذبح الولد پس حقیقت تضحیہ کی فناء نفس ہوا۔

اور میں نے اس پر یہ حکم متفرع کیا تھا کہ جب روح اور حقیقت تضحیہ کی یہ ہے تو خود اس تضحیہ میں اور اس کے متعلق جمیع احکام و اعمال میں نفس کا ذرا اتباع نہ کیا جاوے بالکل احکام شرعیہ کا اتباع کیا جاوے واجبات میں لزوماً اور مستحبات میں بطریق محبت پس یہ حاصل تھا اس تقریر کا اس تقریر سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ تقریر سنۃ ابراہیم سے تو قربانی کی حقیقت فناء النفس معلوم ہوتی ہے اور آج کی تقریر عود العید سے قربانی کی حقیقت تعظیم بالقلب معلوم ہوتی ہے جس کا ترجمان تکبیر باللسان ہے پس ان میں تدافع ہوتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ سنۃ ابراہیم میں حقیقت بمعنی ماہیت ہے چنانچہ حدیث میں حمل اس کی دلیل ہے اور عود العید میں حقیقت بمعنی غایت ہے چنانچہ قرآن میں لام کے لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ (تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کا نام لیں) اس کی دلیل ہے اور صوفیہ کی اصطلاح میں لفظ حقیقت کا اطلاق دونوں معنی میں شائع ہے۔ اس اصطلاح پر دونوں تقریروں میں لفظ حقیقت وارد ہو گیا بس کچھ تدافع

نہ رہا اور باوجود اس کے میں نے تقریر عود العید میں لفظ حقیقت کو بھی بچایا ہے۔ اب ختم کرتا ہوں اور اس غایت پر بھی میں وہی احکام متفرع کرتا ہوں جو سنت ابراہیم میں حقیقت تضحیہ یعنی فناء النفس پر متفرع کئے تھے۔ یعنی جب حکمت اس طاعت کی تکبیر بالقلب واللسان ہے اور اس تکبیر کے لئے لازم ہے نفس کی تصغیر پس کبیر کے مقابلہ میں صغیر کا اتباع نہ کیا جاوے کبیر ہی کے احکام کو متبوع اصل قرار دیا جاوے خلاصہ یہ ہے کہ ان احکام میں مثل جمیع احکام کے نفس کا ذرا اتباع نہ کیا جاوے پس ترجیح احکام النصوص علی احکام النفوس لازم عام ہے (عود العید ج ۷)

سنت ابراہیمی کا مصداق

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اس حدیث سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ جانوروں کی جان ہماری جان کا عوض ہے اس سے تو صرف یہ معلوم ہوا کہ قربانی کرنا حضرت ابراہیمؑ کی سنت ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے دنبہ ذبح کیا تھا؟

تو بات یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اصل فعل تو ذبح ولد تھا اور ذبح کبش ان کا فعل نہ تھا بلکہ یہ تو بدوں ان کے ارادہ کے غیب سے فدیہ اسماعیل بنایا گیا پس سنۃ ابیکم ابراہیم (تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے) (الدر المنثور) سے وہی فعل مراد لینا چاہیے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصل فعل تھا اور وہ ذبح ولد تھا اور ذبح کبش کا وقوع بطور فدیہ کے ہوا ہے چنانچہ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض دے دیا) میں لفظ فَدَیْنَا اس پر صراحۃً دال ہے۔

تو حاصل حدیث کا یہ ہوا کہ اضحیہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے اور وہ سنت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ولد کو ذبح کیا تھا پھر حق تعالیٰ نے کبش کو فدیہ ولد بنا دیا پس معلوم ہوا کہ قربانی کے جانور کو ذبح کرنا قائم مقام ذبح ولد کے ہے کیونکہ واقعہ ابراہیم علیہ السلام میں ایسا ہی ہوا تھا۔

اور اگر اس دلالت کے غیر صریح ہونے سے کوئی اس پر اشکال کرے تو ہم کو مضر نہیں کیونکہ اول تو یہ مضمون عقائد کی قبیل سے نہیں جس کے لئے حدیث صحیح الدلالۃ کی ضرورت ہو بلکہ منجملہ ترغیبات وفضائل کے ہے جس کے لئے فی الجملہ دلالت حدیث کافی ہے دوسرے اگر یہ حدیث اس دعوے پر صریح الدلالۃ نہیں تو ہم دوسری حدیث کو جو اپنے عموم سے دلالت میں صریح ہے اس سے ملا کر اپنا مدعیٰ پورا کرلیں گے حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

انا عند ظن عبدی بی (مسند احمد) کہ میں اپنے بندہ کے گمان کے ساتھ ہوں سو ہم کو تو اس وجہ دلالت کی بناء پر جو سنۃ ابیکم ابراھیم (اللہ المنعون) کے متعلق اوپر مذکور ہوئی حق تعالیٰ کے ساتھ یہ گمان پختہ ہے کہ ان شاء اللہ قربانی کا جانور قائم مقام ذبح ولد کے ہے اور ہم کو اس میں وہی ثواب ملے گا جو ذبح ولد میں ملتا اب تو کچھ اشکال نہیں رہا اور جس کو اب بھی اشکال ہو وہ اپنا ثواب کم کرلے وہ قربانی کو ذبح ولد کا عوض نہ سمجھے اسے اختیار ہے۔ (السوال فی الشوال ج ۱۷)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد ازواج کی مصالح وحکم

مخالفین کا اعتراض ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاذ اللہ حظ نفس کے لئے تعدد ازواج کیا۔ نو بیبیوں سے نکاح کیا اور افسوس یہ ہے کہ بعض مسلمان بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ گو اعتراضاً نہیں بلکہ اپنے حظوظ نفس کی گنجائش کے لئے چنانچہ بعض لوگ چند نکاح کر کے کہتے ہیں کہ ہم نے اگر کیا تو کیا حرج ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو چند نکاح کئے ہیں۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حظ نفس کے لئے چند نکاح ہرگز نہیں کئے حضورؐ کے لئے تعدد ازواج مصالح دینیہ کے سبب مشروع ہوا۔ مثلاً آپ کی شان تھی شارع کی کہ آپ تمام امت کے لئے احکام الٰہی بیان فرماتے تھے بعض احکام ایسے بھی ہیں جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور عورتیں خود حضور سے بلا واسطہ دریافت کر نہ سکتی تھیں اور مردوں کے ذریعہ سے کہاں تک جزئیات کی تحقیق ہو سکتی اس لئے آپ کے احکام کی اشاعت میں تعدد ازواج کی مصلحت تھی کہ دوسری عورتیں ازواج کے واسطے سے سوال بآسانی کرلیا کریں اور جوبات ان کی سمجھ میں نہ آوے اس کو ان ازواج مطہرات کے ذریعہ سے بخوبی سمجھ لیا کریں۔

اب آپ ہی انصاف کریں کہ ہزارہا مسلمان عورتوں کو احکام سمجھانے کے لئے اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نو سے زیادہ بھی نکاح کرتے تب بھی کم تھا۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعدد ازواج میں اعتدال کی تعلیم فرمائی ہے اور خود بھی عدل کے کسی دقیقہ کو نہیں چھوڑا گو بعض اقوال پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر واجب بھی نہ تھا۔ علاوہ اس کے نکاح میں دو جانبین ہیں ایک افراط اور ایک تفریط' افراط یہ کہ باوجود قوت کے نکاح ہی نہ کرے۔ ایک تفریط کہ ضرورت سے زیادہ کرے۔ حضورؐ نے دونوں سے منع فرمایا اور اعتدال کی تعلیم دی کہ جتنی ضرورت ہو اس سے آگے نہ بڑھے اور چار سے زیادہ کی کسی کو بھی ضرورت

نہیں اور شاذ کا اعتبار نہیں اس لئے اس سے زیادہ سب کے لئے حرام ہے۔ اب غور کیجئے کہ ایک شخص کو ایک نکاح کی ضرورت تھی اس نے ایک نکاح کر لیا یہ تو اعتدال ہے اور اگر ایک شخص کو دو یا تین کی ضرورت ہو اور اس نے ایک پر اکتفا کر لیا تو یہ مجاہدہ ہے۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب سنئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت جو ملاحدہ کا اعتراض ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ان کو حضور کی قوت کا اندازہ نہیں۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معمولی آدمیوں جیسا سمجھتے ہیں حالانکہ عادۃ اللہ یہ جاری ہے کہ انبیاء علیہم السلام باطنی کمالات کے علاوہ ظاہری اور بشری کمالات میں بھی دوسروں سے زیادہ ہوتے ہیں چنانچہ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے سو اور ہزار بیبیاں ہونا۔ اہل کتاب میں مشہور ہے اسی طرح ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی قوت بشریہ میں دوسروں سے بڑھے ہوئے تھے۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تیس مردوں کی اور ایک روایت میں چالیس مردوں کی قوت تھی۔ پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیس یا چالیس نکاح بھی کرتے تب بھی اعتدال سے کسی طرح باہر نہ ہوتے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قدر قوت حاصل تھی پھر جب اتنی قوت پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نو بیبیوں پر اکتفا کیا تو یہ مجاہدہ ہوا یا کہ حظ نفس؟ بہرحال یہ صورت اعتدال سے آگے کسی طرح نہ تھی بلکہ اعتدال سے گزر کر مجاہدہ میں داخل تھی۔

پھر ضروری بات ہے کہ نو بیبیاں ہونے سے حقوق بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمہ بڑھ گئے خواہ لزوماً یا التزاماً کیونکہ اس میں علماء کا اختلاف بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عورتوں کی باری مقرر کرنا اور برابری وغیرہ کرنا واجب تھا۔ آپ تبرعاً کرتے تھے بہرحال اس میں چاہے اختلاف ہو مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برابری اور عدل کا پورا لحاظ فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ بیماری میں بھی ایک کی باری میں دوسری کے گھر نہ رہتے تھے۔ البتہ مرض وفات میں جب ازواج مطہرات نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت عائشہؓ کے دن کا بہت انتظار رہتا ہے تو سب نے رضامندی کے ساتھ عرض کیا کہ بس اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہؓ ہی کے گھر میں تشریف رکھیں اور اس حالت میں ہر اک کے گھر جانے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کلفت پہنچتی ہے۔ اب خیال کیا جائے کہ جس شخص کو حقوق کے ادا کرنے کا اس درجہ خیال ہو اس کے لئے نو بیبیوں کی اجازت محض ظاہر میں ایک

رخصت ہے۔ ورنہ حقیقت میں بڑی مشقت ہے۔ حتیٰ کہ بیبیوں میں عدل کرنا بڑی سلطنت کے عدل سے بھی مشکل تر ہے۔ کیونکہ یہاں محض ضابطہ کا تعلق نہیں کہ صرف ڈانٹ ڈپٹ سے کام لے لے دونوں سے محبت کا تعلق ہے ہر اک کی تکلیف سے دل دکھتا ہے۔

پھر شریعت کی پابندی کا مقتضا یہ ہے کہ ظاہری برتاؤ میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی جائے ایسی حالت میں عدل کرنا بڑے مرد کا کام ہے اور حضورؐ عدل کی اس قدر رعایت فرماتے تھے کہ آپ سے بڑھ کر کوئی نہیں کر سکتا اس کے بعد بھی آپ یہ فرمایا کرتے **اللھم ھذہ قسمتی فیما املک فلا تلمنی فیما تملک ولا املک** (سنن النسائی ۶۴/۷) الٰہی یہ میری تقسیم ہے ان امور میں جو تیرے قبضہ میں ہیں۔ پس مجھ کو اس چیز میں ملامت نہ فرمائیے جو میرے اختیار سے باہر ہے یعنی قلبی محبت اور رجحان مثلاً میلان زیادہ آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف زیادہ تھا۔ تو یہ بات اختیار سے باہر تھی۔ مگر ظاہری برتاؤ میں آپؐ سب کے ساتھ عدل پورا فرماتے تھے۔ پس اس مشقت پر نظر کر کے وہ رخصت بھی رخصت نہ رہی بلکہ وہ بھی عزیمت تھی اب کس کا منہ ہے کہ اپنے آپ کو احکام سے مستثنیٰ سمجھے۔ (الحج المبرور ج ۱۷)

جنت محل رضا

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اصل مقصود رضائے حق ہے ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ رضائے حق پر نظر کرتے ہوئے جنت کی درخواست ضروری ہے کیونکہ اول تو وہ محل رضا ہے جنت ہی میں حق تعالیٰ کی رضا کا ظہور ہوگا۔ جب رضا مطلوب ہے تو محل رضا بھی مطلوب ہونا چاہیے۔ ای **شیئ اذا ثبت ثبت بلوازمہ** ہر شے اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوا کرتی ہے مطلوب کے مقدمات اور وسائل بھی من وجہ مطلوب ہوئے ہیں لہٰذا رضا کے مطلوب ہونے سے بھی جنت کا مطلوب ہونا لازم آتا ہے پھر اس سے بے پروائی کے کیا معنیٰ؟ (الحج المبرور ج ۱۷)

میں کہا کرتا ہوں کہ یہ دو فرقے دین کے محافظ ہیں۔ فقہاء اور صوفیہؒ اور فقہاء کا وجود تو مسلمانوں کے حق میں بہت بڑی نعمت تھی۔

علماء نے لکھا ہے کہ کسی کو خبر نہیں کہ میرے ساتھ خدا کو کیا منظور ہے۔ مگر فقہاء کو معلوم ہے کہ خدا کو ان کے ساتھ بھلائی منظور ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے **من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین** جس کے ساتھ خدا کو بھلائی کرنے کا ارادہ ہوتا ہے اس کو دین کی سمجھ

یعنی فقہ عطا کرتے ہیں امام محمدؒ کو کسی نے وفات کے بعد خواب میں دیکھا پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا فرمایا مجھ کو حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے محمد مانگو کیا مانگتے ہو میں نے عرض کیا کہ میری مغفرت کردی جائے جواب ملا کہ اگر ہم تم کو بخشنا نہ چاہتے تو فقہ عطا نہ کرتے۔ ہم نے تم کو فقہ اسی لئے عطا کیا تھا کہ تم کو بخشنا منظور تھا۔

مگر اس سے مامون العاقبت ہونا لازم نہیں آتا۔ یعنی یہ نہ سمجھا جاوے کہ فقہاء پر سوء خاتمہ کا اندیشہ بالکل نہیں اس لئے مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں کیونکہ حق تعالیٰ اگر فقیہ کو عذاب کرنا چاہیں گے تو فقہ کو اس سے سلب کرلیں گے کوئی یہ نہ کہے کہ فقہ کیونکر سلب ہوجاوے گا۔ بات یہ ہے کہ فقہ کتابوں کے پڑھ لینے کا نام نہیں۔ فقہ ایک نور ہے جو فقیہ کے دل میں ہوتا ہے جس کی برکت سے اس کو دین کی سمجھ حاصل ہوتی ہے اور اس نور کو حق تعالیٰ جب چاہیں سلب کرلیں وہ کسی کے اختیار میں نہیں ہے اب تم لاکھ کتابیں پڑھتے پڑھاتے رہو۔ مگر چونکہ دین کی سمجھ نہیں رہی تم فقیہ نہیں ہوسکتے اور وہ نور فقہ طاعات اور تقویٰ سے بڑھتا ہے اور معاصی سے سلب ہوجاتا ہے جو فقیہ مطیع اور متقی نہ ہو وہ کتابوں کا فقیہ ہے حقیقی فقیہ نہیں اور نہ اس کے واسطے وہ بشارت ہے جو حدیث میں مذکور ہے اس لئے خاتمہ سے اطمینان کسی حال میں فقیہ کو بھی نہیں ہوسکتا۔ (الحج المبرور ج ۱۷)

محبت شیخ اور اس کی وجہ

شریعت میں سب سے زیادہ حق باپ کا ہے اس کے بعد استاد کا اس کے بعد پیر کا مگر یہ طبعی بات ہے کہ محبت پیر کے ساتھ زیادہ ہوتی ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ پیر کا تعلق خالص دینی تعلق ہے دنیا کا اس میں لگاؤ نہیں اور جس تعلق میں دنیا کا لگاؤ نہ ہوگا وہ ضرور مستحکم ہوگا۔ پیر چونکہ خالص دین کی تربیت کرتا ہے اس لئے اس سے زیادہ کوئی علاقہ موثر نہیں (الحج المبرور ج ۱۷)

شیخ (ابن عربی کی تحقیق یہ ہے کہ ایک تو زمان آخرت ہے اور ایک مکان آخرت ہے۔ زمان آخرت تو مرنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اور مکان آخرت اسی وقت موجود ہے چنانچہ جنت و دوزخ کے بارے میں جملہ اہل سنت کا قول ہے کہ وہ اس وقت موجود ہیں تو کیا وہ دنیا میں ہیں۔ اگر دنیا میں ہیں تب تو اس شخص کا قول صحیح ہوجائے گا جو کہتا ہے کہ ہم نے تو تمام دنیا کا جغرافیہ پڑھا جنت دوزخ کا اس میں کہیں پتہ ہی نہیں۔

اس کا جواب اہل حق کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ تم نے دنیا کا جغرافیہ پڑھا اور ایک جغرافیہ آخرت کا ہے تم نے وہ نہیں پڑھا وہ تمہارے کورس میں داخل نہیں ہے اس لئے تم کو جنت و دوزخ کا پتہ نہیں چلا اگر آخرت کا جغرافیہ پڑھتے تب ان کو پتہ چلتا، پس اہل حق جنت و دوزخ کو دنیا میں موجود نہیں مانتے بلکہ ان کو مکان آخرت میں موجود مانتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مکان آخرت اس وقت بھی موجود ہے اور جس طرح آخرت میں رویت ممکن ہے اسی طرح مکان آخرت میں بھی ممکن ہے گو دیکھنے والا ابھی زمان آخرت میں داخل نہ ہوا ہو۔ پس قاعدہ مذکور منتقض نہیں ہوا جس رویت کو آپ کے لئے ثابت کیا جاتا ہے وہ دنیا میں نہ تھی بلکہ مکان آخرت میں تھی۔ (تحصیل المرام ج ۱۷)

علوم انبیاء علیہم السلام

انبیاء اور محققین کو اصل میں نفع رسانی مقصود رہی ہے اور نافع مضمون کی شان ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ اس سے عوام سے لے کر خواص تک نفع حاصل کریں اور ایسے مضامین عجیب وغریب نہیں ہوتے۔ بلکہ سننے سے معمولی معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر ان پر عمل کیا جائے تو اس وقت ان کا نفع معلوم ہوتا ہے اور جس قدر ان میں غور کیا جاتا ہے اسی قدر زیادہ باریکیاں اس میں نکلتی ہیں اور حقائق دقائق اور مضامین غامضہ سے چونکہ کوئی نفع نہیں اس لئے انبیاء اور ان کے جانشین ایسے مضامین بیان نہیں فرماتے نہ اس وجہ سے کہ ان کو معلوم نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ فہم عوام سے باہر ہیں اور نیز کوئی نفع بھی نہیں۔

اس کو ایک مثال کے ضمن میں سمجھنا چاہیے کہ حکیم محمود خاں کی دو مقام میں دو شانیں ہیں ایک تو جس وقت وہ طالب علموں کو پڑھا دیں اور ایک جس وقت نسخہ لکھیں تو اگر کوئی شخص مطب میں ان کو دیکھ کر کہے کہ میں نے تو سنا تھا کہ حکیم محمود خان صاحب طب کے بڑے عالم ہیں یہ تو کچھ بھی نہیں۔ سونف، کاسنی تو کوئی بتا دے تو وہ شخص احمق ہے اس کو یہ عقل نہیں کہ جو لوگ ان کے پاس اس وقت جمع ہیں یہ مریض ہیں ان کے لئے یہی مناسب ہے۔ اگر اس کو طب کی تحقیقات سننے کا شوق ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس وقت کا انتظار کرے جب کہ وہ طالب علموں کی نفیسی اور قانون کا سبق پڑھاتے ہیں۔ (اسرار ج ۱۷)

تجلی کلامی

الحاصل اگر کلام الٰہی کو یہ لباس حدوث کا نہ پہنایا جاتا تو یہ حالت ہوتی۔ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ یعنی اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو اے مخاطب تو اس کو اللہ کے خوف سے دب جانے والا اور پھٹ جانے والا دیکھتا۔ کوہ طور پر ایک ہی تجلی تو ہوئی تھی جس نے اس کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اول رویت کی درخواست کی تھی جس کے جواب میں ارشاد ہوا۔ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ یعنی تم مجھ کو نہیں دیکھ سکتے اس پہاڑ کی طرف دیکھو اگر یہ اپنی جگہ پر جما رہا تو تم مجھ کو دیکھ لو گے۔ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا یعنی رب موسیٰ نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور بیہوش ہو کر گر گئے۔ پس یہی حال تجلی کلامی کا بھی ہوتا کہ کسی کو اس کی تاب نہ ہوتی۔ حدیث شریف میں ہے **لو کشف سبحات وجهه' لاحترق ما انتهى اليه بصره (لم اجد الحديث في موسوعة)** (اگر وہ اپنے چہرے کے حجابات اٹھا دیتے جہاں تک اس کی نظر پہنچے سب جل جاتے) پس غایت رحمت ہے کہ اپنے کلام کو ایسی صورت سے اس عالم میں اتارا کہ ہمارے قلوب اس کے متحمل ہو گئے تو لازم تو یہ تھا کہ اس کا احسان مانیں نہ کہ الٹا اعتراض کریں۔ غرض انبیاء اور اولیاء اللہ کا کلام تنزل کے بعد بھی نہایت رفیع الشان ہوتا ہے وہ کلام سہل ممتنع ہوتا ہے۔ اس کے اندر ایسی رعایت اور پہلو ہوتے ہیں کہ نہایت مفید اور نہایت مفید ہونے کے ساتھ نہایت عالی کہ ارسطو اور افلاطون اور مشائین اور اشراقین بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ پس اس پر اعتراض کرنا نری حماقت ہے اور عقل پرستی نہیں بلکہ وہم پرستی ہے خلاصہ یہ ہے کہ ان عقلاء کی عقل نے راہ ماری ہے اور فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ (جو کچھ ان کے پاس ہے اس پر خوش ہیں) کے پورے مصداق ہیں۔ (اسرار ج ۱۷)

حکم تدفین کے مصالح

اسلام کی خوبی یہاں سے ظاہر ہوتی ہے کہ دفن کا حکم دیا اور جلانے کی ممانعت کر دی کہ دفن میں اکرام اور احراق (جلانے) میں ترک احترام ہے اور اس کے علاوہ دفن میں ارجاع الی الاصل (اصل کی طرف لوٹنا) بھی ہے۔ اور احراق میں اصل سے عدول ہے۔ بعض

مدعیین فلسفہ جلانے کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اور دفن کی خرابیاں کہ اس سے مٹی خراب ہو جاتی ہے اور اس سے جو بخارات اٹھتے ہیں وہ گندے زہریلے اور متعفن ہوتے ہیں اس طرح کے نکتوں سے ثابت کرتے ہیں کہ جلانا اچھا ہے مگر ہم تو اس کے خلاف مشاہدہ کر رہے ہیں کہ کسی مدفون کی قبر پر ہمیں بدبو نہیں آتی مگر مرگھٹ پر تو اس قدر متعفن اور گندی ہوا ہو جاتی ہے کہ ناک نہیں دی جاتی ایسے مہمل نکتے تو ہر چیز میں بیان ہو سکتے ہیں مگر سلامت فطرت حق و باطل کا فیصلہ خود کر لیتی ہے بلکہ عقل تو دفن کو پسند کرتی ہے کہ اس میں بدن کو اس کی اصل میں پہنچا دیا باقی خاک کا اصل ہونا سو اس کی دلیل یہ ہے کہ ہر عنصر کا اپنے خمیر کی طرف طبعی میلان ہے اگر کوئی انسان کوٹھے پر سے اچھلے اگر وہ اوپر چلا جاتا تو ہوا یا نار غالب ہوتی اور اب تو خاک غالب ہے یا آب اور آب کا غالب نہ ہونا بھی ظاہر ہے ورنہ آب میں پہنچ کر عمق کی طرف نہ جاتا۔ پس خاک کا غلبہ متعین ہو گیا اور یہ قاعدہ عقلی ہے کہ:

کل شئی یرجع الی اصلہ (یعنی ہر چیز اپنی اصل کی طرف عود کرتی ہے) تو خاک میں دفن کرنا بالکل عقل کے موافق اور اس کے ماسوا سب فطرت سلیمہ اور عقل کے بالکل خلاف ہے۔ (روح العج والثج ج ۱۷)

الحمد للہ حق تعالیٰ نے اس وقت مجھے جواب میں یہ بات سمجھا دی کہ انہیں کیا خبر کہ مسلمانوں میں رحم نہیں۔ اب آپ سب مسلمان ٹٹول لیجئے کہ ذبح کے وقت قلب کی کیا کیفیت ہوتی ہے کڑھتا ہے یا نہیں۔ بعض موجود بزرگوں کا قصہ سنا ہے کہ ذبح کے وقت آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے آخر یہ کیا بات ہے ترحم اور کسے کہتے ہیں۔ (روح العج والثج ج ۱۷)

گناہ کی چنگاری

گناہ کی مثال تو آگ کی سی ہے۔ ایک چنگاری بھی مکان جلانے کے لیے کافی ہے اور بڑا انگارہ بھی۔ پس صغیرہ چنگاری ہے اور بڑا گناہ انگارہ۔ پس عمل کرنے کے لیے یہ پوچھنا کہ یہ صغیرہ ہے یا کبیرہ شبہ میں ڈالتا ہے کہ اگر کبیرہ ہوگا تو بچیں گے اور اگر صغیرہ ہوا تو خیر، ہم ایسے شخص سے اجازت لیتے ہیں کہ لاؤ تمہارے چھپر میں چھوٹی سی چنگاری رکھ دیں۔ اگر یہ ناگوار ہے تو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کیسے گوارا ہے (استخفاف المعاصی ج ۱۸)

موت کی یاد

حدیث شریف میں ہے ''اکثروا ذکر ھاذم اللذات'' (لذتوں کو توڑنے والی یعنی موت کو اکثر یاد رکھو) مراقبہ کے لیے یہ اشعار نہایت مناسب ہیں۔

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے　　　خوب ملک روس ہے اور سرزمین طوس ہے
گر میسر ہو تو کیا عشرت سے کیجئے زندگی　　　اس طرف آواز طبل ادھر صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہے مئے گلگوں کا دور　　　شب ہوئی تو ماہ رویوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی ایک تماشا میں تجھے　　　چل دکھاؤں تو تو قید آز کا محبوس ہے
لے گئی یکبارگی گور غریباں کی طرف　　　جس جگہ جان تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے　　　یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ وحشمت دنیا سے آج　　　کچھ بھی انکے ساتھ غیر از حسرت وافسوس ہے

اس مراقبہ کے بعد دنیا کی بھی محبت کم ہوگئی اور توبہ بھی ہوگئی اور مرض گناہ کا بفضلہ تعالیٰ دور ہو جائے گا۔ سبحان اللہ شریعت نے کیا علاج تجویز فرمایا ہے۔ اگر امر تکوین سے مبتلائے مرض ہوا تھا تو امر تشریعی سے صحت یاب ہوا۔

درد از یار است و درماں نیز ہم　　　دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم

(درد محبوب کی طرف سے ہے اور علاج بھی اسی کی جانب سے ہے۔ اس پر دل بھی قربان ہو اور جان بھی قربان ہو) (استخفاف المعاصی ج ۱۸)

گناہ بے لذت

بعض چیزیں تو ایسی ہیں کہ ان کو شوکت سے بھی کوئی تعلق نہیں مثلاً تصویر رکھنا' کتا پالنا' داڑھی منڈانا' مجھے ایک اپنی اور ایک دوسرے صاحب کی حکایت یاد آئی' اپنی تو یہ کہ میں ایک مرتبہ ریل میں سفر کر رہا تھا کہ ایک جنٹلمین جو کتا لیے ہوئے تھے' مجھ سے فرمانے لگے کہ کتے میں ایسے ایسے اوصاف ہیں پھر اس کا پالنا کیوں منع کیا گیا' میں نے کہا کہ صاحب اس کا ایک تو عام جواب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور یہ جواب ہزاروں شبہات کا ہے۔ دوسرا جواب خاص جواب ہے جو اس باب کے ساتھ مخصوص ہے وہ یہ کہ اس

میں باوجود ان صفات کے ایک ایسا عیب ہے کہ جس نے سب اوصاف کو گرد کر دیا اور وہ یہ ہے کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں اس لیے اس کا پالنا منع ہے۔ بس چپ ہی تو ہو گئے اور خوش ہو کر تسلیم کیا اور دوسرے کی حکایت یہ ہے کہ ایک صاحب کتا بغل میں دبائے بیٹھے تھے، کسی نے کہا کہ اس میں کیا مصلحت ہے، کہنے لگے تاکہ فرشتہ موت کا نہ آئے۔ انہوں نے کہا یہ تو کوئی بات نہیں، آخر دنیا میں کتے بھی تو مرتے ہیں جو فرشتہ ان کی جان نکالتا ہے وہی تمہاری بھی نکالے گا اور پہلی حکایت میں جو میں نے دوسرا جواب دیا تھا جس سے وہ بہت خوش ہوئے تھے، واقع میں وہ کوئی بڑی بات نہیں، بات اصلی تو وہی تھی کہ ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ غرض بعضے گناہ میں تو بالکل ہی ضرورت و مصلحت کا کوئی درجہ نہیں گو جن کو ضروری سمجھا جاتا ہے بایں معنی کہ ان کے نہ کرنے میں کچھ تکلیف ہوتی ہے اور ان کے لیے نفس کچھ حیلہ نکال لیتا ہے، عقل صحیح کے سامنے وہ بھی لغو ہیں لیکن اس وضع کے بدلنے میں تو کسی درجے کا بھی نفع نہیں اور اس کے چھوڑنے میں کونسی تکلیف ہے تو یہ گناہ بالکل گناہ بے لذت ہوا اور اگر بالفرض کوئی لذت و ضرورت ہو تو بھی تو خدا کے حکم کے سامنے اپنی مصلحت کیا چیز ہے یہ تو ظاہری گناہ تھے۔ (ترک المعاصی ج ۱۸)

باطنی گناہ

باطنی گناہ یہ ہیں کہ مثلاً اہل دنیا تو دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں اور دیندار اس پیرایہ میں تو نہیں لیکن وہ اپنے کو بزرگ سمجھ کر دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں خوب کہا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ کہاں کی بزرگی یہ کہا ہے:

غافل مرد کہ مرکب مردان مرد راہ   در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش   ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(ترک المعاصی ج ۱۸)

مباح کے ساتھ جو معاملہ کیا جاتا ہے اس میں دو غلطیاں ہوتی ہیں ایک افراطی دوسری تفریطی، افراطی غلطی تو یہ ہے کہ مباح کے ہر درجہ کو مباح سمجھ کر تمام درجات طے کر جاتے ہیں، کسی درجہ پر جا کر رکتے نہیں حالانکہ بعض درجے مباح کے ایسے ہیں کہ وہاں پہنچ کر آدمی محرم سے بچ نہیں سکتا۔ جیسے کھیت کے چاروں طرف کی ڈول بھی مباح

الحمٰی ہے لیکن اس پر مویشی کو نہ چلانا چاہیے اس لیے کہ اس کے قریب کھیت ہے اس میں چرنے لگنے کا قوی احتمال ہے اور کسی کے کھیت میں مویشی کا چرانا حرام ہے ایسے مباحات کا ایک درجہ وہ ہے کہ محرم سے ملا ہوا ہے تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ وہاں جا کر پھر محرم سے بچنے کی سعی کرنے میں آدمی ناکام رہتا ہے اس لیے اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔ بس مباح میں اس قدر توسع کرنا کہ کسی درجہ میں نہ رکے یہ مناسب نہیں ہے۔

استنباط رحمت

اور دلیل اس کی یہ ہے کہ آدم وحوا علیہما السلام کو حکم ہوا تھا کہ **"لَاتَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ"** یعنی اس درخت کے قریب مت جاؤ حالانکہ منہی عنہ اکل شجرہ ہے لیکن منع کیا گیا اس کے پاس جانے سے۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ نہایت رحیم وکریم ہیں۔

انہوں نے دیکھا کہ جب پاس جاویں گے تو پھر رکنا دشوار ہے

ایک شخص کو کان پور میں، میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ شدت خوف کی وجہ سے مایوس ہوکر قریب تھا کہ نماز روزہ ہی چھوڑ دے اور لیجئے دیکھئے شوق ذوق بہت محبوب ومطلوب چیز ہے مگر اس کی نسبت بھی ارشاد ہے: **"واسئلک شوقا الی القائک فی غیر ضراء مضرة ولا فتنة مضلة"** (یعنی اے اللہ مجھے ایسا شوق عطا ہو جس میں مصیبت آزار دینے والی اور بلا گمراہ کرنے والی نہ ہو) یعنی شدت شوق کے بعض اوقات میں دو اثر ہوتے ہیں یا تو اہل شوق ہی پگھل جاتے ہیں نہ کھانے کے رہتے ہیں نہ سونے کے ہر وقت اسی طرف مشغول رہتے ہیں اور بیمار ہوکر بعض اوقات جان تک نوبت آجاتی ہے۔ **من غیر ضراء مضرة** (بلا آزار دینے والی سے) میں اس سے احتراز ہے اور یا یہ اثر ہے کہ گستاخ وبے ادب ہوکر گمراہی اور کفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے اس کے متعلق ارشاد فرمایا **ولا فتنة مضلة** (بلا آزار دینے والی سے) دنیا میں بھی اس دوسرے اثر کا نمونہ موجود ہے اگر کسی نوکر چاکر کو زیادہ منہ لگاؤ تو اگر وہ بھلا مانس ہے تو اس پر تو زیادہ عنایت کرنا اس کو مسخر کر لینا ہے اگر وہ پہلے ایک گھنٹہ خدمت کرتا ہوگا تو اب چار گھنٹہ کرے گا اور اس کے اندر خباثت ہے تو اور زیادہ منہ چڑھے گا۔ حتیٰ کہ نوبت اس کی پہنچے گی کہ آقا اس کو نکال کر باہر کرے گا۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

خشیت میں حد لگائی، شوق میں حد لگائی، اسی طرح معصیت کے استقلال کی بھی حد ہوگی۔ قاعدہ کلیہ ہے کہ جب کوئی شے حد سے بڑھے گی ضرور خرابی ہوگی۔ اسی طرح گناہ کی نسبت یہ خیال کر لینا کہ یہ اتنا بڑا ہے کہ اب میری کوئی طاعت بھی قبول نہ ہوگی یہ افراط کا درجہ ہے۔

مسلمان کیلئے گناہ بے لذت ہی ہے

میں بہ قسم کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان کے لیے تو گناہ ہمیشہ بے لذت ہی ہوتا ہے بلکہ بے لذت سے بڑھ کر بدلذت اور یہ بات بہت ہی ظاہر ہے مگر اس سے نظر قاصر اس وجہ سے ہو رہی ہے کہ لوگوں نے لذت جسم ہی کو لذت سمجھ لیا ہے اور یہ نہیں دیکھا کہ لذت درحقیقت کس کو حاصل ہوتی ہے جسم کو یا روح کو جسم اور روح میں نسبت عینک اور آنکھ کی سی ہے دکھائی تو بیشک عینک ہی سے دیتا ہے مگر دیکھنے والی عینک نہیں ہے بلکہ آنکھ ہے بلکہ ترقی کر کے کہہ سکتے ہیں کہ آنکھ بھی دیکھنے والی نہیں ہے آنکھ آلہ ہے ادراکار اور مدرک نفس ناطقہ ہے درحقیقت صحیح یہی ہے کہ دیکھنے والا نفس ناطقہ ہے اور آنکھ اور عینک دونوں آلات ہیں تو عینک کی طرف اگر دیکھنے کی نسبت کی جاوے گی بلکہ آنکھ کی طرف بھی اگر لی جائے گی تو مجازاً ہی صحیح ہو سکتی ہے حقیقتاً صحیح نہیں۔ اسی طرح ادراک لذت یا ادراک الم کی نسبت جسم کی طرف ہمیشہ مجازاً ہوگی جو کہ ناقابل اعتبار ہے اور درحقیقت الم اور لذت جو کچھ ہے وہ روح کو ہے مگر ایک زمانہ ہے جو اس غلطی میں مبتلا ہے کہ محض راحت جسم کا نام راحت رکھ لیا ہے گو روح کیسی ہی مردہ ہو رہی ہو حالانکہ اگر جسم کو لذت ہوئی اور روح کو نہ ہوئی تو وہ کیا خاک لذت ہے وہ لذت تو ایسی ہوگی جیسے زیادہ مرچ دار سالن کہ زبان کو تو مزہ آتا ہے مگر دل کو تکلیف پہنچتی ہے کہ گرمی بڑھ جاتی ہے اور خفقان ہوگا اور طبیبوں کی ناز برداری کرنی پڑے گی اور وہ لذت ایسی ہے کہ جیسے غصب کی چیز کھا رہا ہے اور غاصب پر غضب ساتھ ساتھ نازل ہو رہا ہے۔ مثلاً حلوائی کی دکان سے ہاتھ مار کر مٹھائی کھالی اور ادھر سے لاٹھیاں پڑنے لگیں کہ زبان کو تو مٹھائی کا مزہ آیا مگر سر پھوٹا اور ذرے سے مزہ کے لیے مدتوں مرہم پٹی ہوتی رہی، لذت تو یہاں بھی آئی مگر کیا یہ لذت کس شمار میں ہے؟ اور کیا کوئی عقلمند اس لذت کے لیے غصب کی اجازت دے دے گا؟ اور بے حسی کی اور بات ہے۔ (الکاف ج ۱۸)

حفاظت نظر مقدم ہے

جس آیت میں غض بصر اور حفاظت فرج دونوں کا حکم ہے اس میں حق تعالیٰ نے امر غض بصر کو مقدم کیا ہے۔ ارشاد ہے: "قُل لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ" یعنی کہہ دیجئے مومنین سے کہ اپنی نگاہیں نیچی کریں یعنی نظر سے بچیں اس حکم کو مقدم کیا۔ دوسرے حکم پر یعنی وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ پر یعنی اصل فعل سے بچنے پر اس کی وجہ یہی ہے کہ غض بصر ذریعہ ہے حفاظت شرمگاہ کا اور ذریعہ آسان ہوتا ہے اسی واسطے اس کو اختیار کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اصل فعل یعنی زنا سے بچنا اتنا آسان نہیں جتنا نظر کو بچالینا آسان ہے۔ ثابت ہوا کہ غض بصر کوئی زیادہ مشکل کام نہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت مقدسہ نے آسانی کے واسطے تدبیر بتلائی ہے اور اسی واسطے پردہ کا حکم رکھا ہے، لوگ کہتے تو ہیں کہ پردہ کی کیا ضرورت ہے۔ اصل گناہ یعنی زنا کیا نہ جاوے پردہ ہو یا نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ ذرائع کو اختیار کرنے کے بعد بھی اگر مقصود میں کامیابی ہو جاوے تو بہت ہے۔ چہ جائیکہ ذرائع کو اختیار ہی نہ کیا جاوے اور کامیابی کی امید رکھی جاوے۔ میں کہتا ہوں کہ پردہ کے بعد بھی زبان سے بچ جاؤ تو بڑی بات ہے کیونکہ شیطان کے شر سے کہیں بے پردگی ہو جاتی ہے اور پردہ کو توڑ کر امید رکھنا کہ زنا سے حفاظت رہے گی، محض حماقت ہے ان لوگوں نے شرعی انتظام کو بالکل لغو سمجھا ہے۔ (الکاف ج ۱۸)

بے پردگی کے مفاسد

ایک جگہ اعتراض کیا گیا ہے کہ پردہ میں بھی سب کچھ ہو جاتا ہے جن طبیعتوں میں خرابی ہوتی ہے وہ کسی صورت میں باز نہیں رہ سکتیں، کیا پردہ داروں میں زنا نہیں ہوتا۔ میں نے کہا جب کبھی کچھ ہوا تو بے پردگی ہی سے ہوا اور اکثر تو یہ ہے کہ جن لوگوں میں ایسے واقعات ہوئے ہیں ان کو پردہ دار کہنا ہی برائے نام ہے ورنہ ان کے یہاں نہ چچازاد بھائی سے پردہ ہے نہ ماموں زاد بھائی سے، نہ خالہ زاد سے، نہ بہنوئی سے، نہ دیور سے، نہ جیٹھ سے۔ جب ہی تو مفاسد مرتب ہوئے ہیں۔ اس حالت میں ان کو پردہ دار کہنا ایسا ہے جیسے کوئی معزز آدمی جوا کھیل کر یا شراب پی کر جیل خانہ میں پہنچ جائے تو کوئی کہے لو صاحب جیل خانہ میں معززین بھی جانے لگے۔ یہ غلط ہے بلکہ وہ معززین جیل خانہ میں جب ہی پہنچے جب کہ

عزت کو چھوڑ دیا۔ اس وقت ان کو معزز کہنا تو ان کا صرف خاندانی انتساب سے ہے ورنہ عزت تو رخصت ہو چکی کیونکہ عزت تو عزت کے افعال کا نام ہے جب جوا کھیلا یا شراب پی تو افعال بگڑ چکے، پھر عزت کہاں؟ ایسے ہی پردہ داروں میں جو زنا ہو جاتا ہے ان کو پردہ دار کہنا باعتبار ما کان کے ہوگا یا باعتبار رسم کے ہوگا ورنہ پردہ ٹوٹنے کے بعد ہی تو اس فعل کی نوبت آئی۔ غرض غلطی ہے ان لوگوں کی جو پردہ کے خلاف ہیں اور یہ خیال خام ہے کہ زنا سے حفاظت ہو سکتی ہے بلا سد ذرائع کے۔ جب شریعت اس کو ایسا مشکل سمجھتی ہے کہ اس کے لیے ذرائع اور تدابیر کی ضرورت سمجھتی ہے تو وہ واقع میں مشکل ہی ہے، شریعت کی نظر ہم سے کہیں غامض ہے؟ اس کے سامنے ہماری تحقیق کیا چیز ہے؟ اور پھر وہ کچھ تحقیق بھی تو ہو، صرف تقلید اور خود رائی کا نام تو تحقیق نہیں ہو سکتا۔ (الکاف ج ۱۸)

واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو وہ رتبہ بخشا ہے کہ بڑے سے بڑے ولی بھی حتیٰ کہ امام مہدی علیہ السلام بھی ایک ادنیٰ صحابی کے برابر نہیں ہو سکتے اور یہ حق تعالیٰ شانہ کا بہت ہی بڑا فضل و احسان اُمت محمدیہ کے حال پر ہے کہ ہمارے خلف پر صحابہ کی فضیلت کو پوری طرح منکشف کر دیا کہ سب نے اس پر اجماع و اتفاق کر لیا کہ **الصحابة كلهم عدول و افضل الخلق بعد الانبياء اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم.**

یعنی صحابہ سب کے سب معتبر اور ثقہ ہیں۔ ان میں کوئی شخص غیر معتبر نہیں اور تمام مخلوق میں بعد انبیاء علیہم السلام کے سب سے زیادہ افضل صحابہ ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس مسئلہ کا انکشاف ہمارے حق میں بہت ہی بڑی رحمت ہے اور وہ رحمت یہ ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی حق تعالیٰ شانہ کو اس دین کی حفاظت ہی منظور ہے۔ اگر حضرات صحابہ کے متعلق ہمارا یہ اعتقاد نہ ہوتا بلکہ خدانخواستہ ان کے غیر معتبر ہونے کا یا ان کی نسبت خیانت کرنے کا کچھ بھی شبہ ہوتا تو شریعت کا سارا انظام درہم برہم ہو جاتا۔ قرآن و احادیث کی بابت طرح طرح کے خیالات و شبہات پیدا ہوتے اور کسی طرح دل کو اطمینان نصیب نہ ہوتا اور صحابہ کی نسبت حضرات سلف صالحین کا یہ اجماع محض حسن اعتقاد ہی کی بناء پر نہیں بلکہ خود ان کے احوال و اعمال سے ان کی دیانت اور راست بازی و پرہیزگاری ایسی کھلی ہوئی نظر آتی ہے کہ موافق تو موافق مخالف تک اس کا اقرار کیے ہوئے ہیں جس پر تاریخ گواہ ہے جس کے بعد اس قول میں کچھ بھی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ **الصحابة كلهم عدول**۔ حضرات صحابہ کی اس فضیلت کے انکشاف سے صرف یہی

نہیں کہ دین کی حفاظت ہوگئی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی فضیلت کے اقرار کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت بڑھ گئی جس قدر صحابہ کے ساتھ اعتقاد بڑھتا ہے اسی قدر حضور کے ساتھ محبت بڑھتی ہے اور جس قدر صحابہ سے کسی کو بے اعتقادی ہوتی ہے اسی قدر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت میں کمی ہو جاتی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ جس مدرسہ کے سارے طلبہ بد استعداد ہوں وہاں مدرسین کی بد استعدادی کا بھی شبہ کیا جاتا ہے سو اگر ہمارے اعتقاد صحابہ کے ساتھ اچھے نہ ہوں گے تو معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت بھی اچھا خیال نہ ہو سکے گا بلکہ یہ وسوسہ پیدا ہوگا کہ بس جی جیسی روح ویسے ہی فرشتے اور یہ حالت ہماری بہت ہی خراب و ناگفتہ بہ ہوتی۔ چنانچہ اس زمانہ میں بھی کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جن کو صحابہ کے ساتھ بے اعتقادی و بدگمانی ہے سو ان کی دینی حالت دیکھ لی جائے کہ کس قدر کمزور ہو رہی ہے۔ (الجلا ملا ہتلا ج ۱۸)

فضیلت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سائل کو کیسا دنداں شکن جواب دیا کہ تو معاویہؓ کی بابت سوال کرتا ہے عمر بن عبدالعزیز و اویس قرنی کو حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک کی خاک سے بھی تو نسبت نہیں۔ آج کل بھی بعض لوگوں کو اس قسم کے سوالات کا خبط سوار ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ ایک عالم سے کسی نے سوال کیا تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ ان دونوں میں سے کون حق پر تھے انہوں نے خوب جواب دیا کہ میں بہ قسم کہتا ہوں کہ قیامت کے روز یہ مقدمہ تمہارے اجلاس میں نہیں بھیجا جائے گا اور اگر بھیجا گیا تو میں تم کو مشورہ دیتا ہوں کہ مقدمہ خارج کر دینا اور کہہ دینا کہ مقدمہ میرے حدود اختیار سے باہر ہے' پھر میں واقعات سے بھی بے بہرہ ہوں اور میں نے علماء سے اس کی تحقیق بھی کرنی چاہی تھی مگر انہوں نے مجھ کو جواب نہیں دیا' تمہاری گردن تو اس جواب سے چھوٹ جائے گی۔ پھر اگر ہم سے سوال ہوا کہ تم نے اسے کیوں نہیں بتلایا تو ہم خود نمٹ لیں گے۔ واقعی اچھا جواب دیا بھلا اپنے حوصلہ سے زیادہ بڑھنا حماقت ہے یا نہیں؟ پہلے ہم اپنے گھر کا تو فیصلہ کر لیں' پیچھے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ کے جھگڑے میں پڑیں' دنیا میں اس کی نظیر دیکھ لیجئے کہ اگر کوئی مقدمہ وائسرائے کی عدالت کے متعلق ہو جس کی بابت یقین ہے کہ تحصیلدار صاحب کی کچہری میں کبھی نہ آئے گا اور تحصیل دار اس کے فیصلہ و قوانین معلوم کرنے کے درپے ہو اور نہ معلوم ہونے سے پریشان

ہو تو یہ حماقت ہے یا نہیں، ہر شخص یہی کہے گا کہ آپ کو اپنی تحصیل کے قواعد معلوم کرنے چاہئیں ان میں اگر کوتاہی ہوگئی تو آپ سے باز پرس ہوگی، آپ سے یہ سوال کوئی نہ کرے گا کہ تم نے وائسرائے کے اجلاس کے قوانین کیوں نہیں یاد کیے۔ (الجلاء للاجلاء ج ۱۸)

میں نے لوگوں سے کہا توبہ و استغفار کرو! اور ہر روز پانچ سو مرتبہ کم از کم "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" (نہیں نیکی کرنے کی ہمت اور نہ گناہوں سے بچنے کی طاقت سوائے اللہ تعالیٰ کے جو بلند و بالا اور عظمت والا ہے (کی توفیق سے) کا وظیفہ مقرر کرلو! ان شاء اللہ ایک ہفتہ میں سب مصیبت دور ہو جائے گی۔ یہ میں نے کوئی کشف سے نہیں کہا تھا بلکہ حدیث میں آیا ہے: "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ كَنْزٌ مِنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ بخته وَهُوَدَوَاءٌ لِسَبْعِيْنَ دَاءٍ اَيْسَرُهَا الْهَمُّ" کہ "لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ" یہ جنت کا ایک خزانہ ہے اور ستر بلاؤں کی دوا ہے جس میں سے ادنیٰ فکر و غم ہے (رواہ فی الحصن جامع ۱۲) اس بھروسہ پر میں نے کہہ دیا تھا اور عدد کی تعیین اتفاق سے میرے منہ سے نکل گئی، ان لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور عمل شروع کیا، واقعی ایک ہفتہ گزرنے نہ پایا تھا کہ وہ حکم منسوخ ہوگیا اور امن چین ہوگئی پھر ان لوگوں کو اس عمل سے ایسا اعتقاد ہوا کہ کان پور کی جامع مسجد میں اب تک نماز عصر کے بعد اس کا ورد چلا جا رہا ہے۔ غرض مصائب سے نجات چاہتے ہو تو ایک ذات سے تعلق پیدا کرو! وہ کون ہے:

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار   بگذارند و خم طرہ یارے گیرند

(میں بڑی مصلحت یہ دیکھتا ہوں کہ دوست سب کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہو جائیں)

یعنی حق تعالیٰ شانہ سے تعلق پیدا کرو! اس کے سوا سب سے نظر قطع کرو! کیونکہ راحت و کلفت سب اسی کے ہاتھ میں ہے اس کو راضی کرو! انشاء اللہ وہ تمام مصائب کا انتظام فرما دیں گے:

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّاتَذَكَّرُوْنَ ۝

"یا وہ ذات جو بے قرار آدمی کی سنتا ہے جب وہ اس کو پکارتا ہے اور اسکی مصیبت کو دور کرتا ہے اور تم کو زمین صاحب تصرف بناتا ہے کیا اللہ کے ساتھ اور کوئی معبود ہے مگر تم لوگ بہت ہی کم یاد رکھتے ہو۔"

ہاں! وہ کون ہے؟ جو کہ مضطر کی دعا قبول کرتا ہے اور مصیبت کو دور کرتا ہے اور تم کو زمین میں یکے بعد دیگرے قائم مقام بناتا ہے (وہ صرف خدائے عز و جل ہے) کیا (اب بھی) خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ (ہرگز نہیں) مگر پھر جو بعض لوگ خدا کی طرف نہیں جھکتے اس کا یہ سبب نہیں کہ وہ اس مضمون کو جانتے نہیں بلکہ وہ لوگ (محض کورانہ تقلید سے) خدا کے ساتھ دوسروں کو برابر کرتے ہیں۔ (الجلاء للابتلاء ج ۱۸)

استقامت اعمال

اور حق تعالیٰ کی صفات پر مجھے ایک بات یاد آئی جو بہت ہی کام کی بات ہے۔ ایک علم عظیم ہے جو حق تعالیٰ نے آج عطا فرمایا ہے، اس کی قدر وہ جانے جس پر گزرتی ہے۔ مجھ سے اگر پوچھئے! تو لاکھوں کی بات ہے وہ یہ کہ بعض سالکوں کو یہ بات پیش آتی ہے کہ ان میں تاثر کم ہوتا ہے نہ خوف نہ غلبہ نہ زیادہ غلبہ محبت پس ان کی طبیعت خالی خالی معلوم ہوتی ہے اور بعضوں پر احوال و مواجید کا بہت غلبہ ہوتا ہے، ذرا ذرا سی بات پر رقت اور خوف طاری ہو جاتا ہے گریہ غالب ہو جاتا ہے کبھی شوق و محبت میں سکر کی سی کیفیت رہتی ہے تو جن سالکوں پر ان احوال کا غلبہ نہیں ہوتا وہ پریشان رہتے ہیں کہ ہم کو ذکر سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ لیجئے! آج میں اس کی حقیقت بتلاتا ہوں اور وہ علم ایک نیک بی بی کے خط کے آنے سے حاصل ہوا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہاں موت کثرت سے ہو رہی ہے جس سے بہ تمام کاموں کو طبیعت چاہتی ہے مگر مجھے خوف نہیں معلوم ہوتا نہ کچھ رقت طاری ہوتی ہے یہ حالت کیسی ہے ان کو تو میں نے ہی لکھ دیا کہ حالات مقصود نہیں ہیں بلکہ اعمال مقصود ہیں اگر اعمال میں کوتاہی نہ ہو تو ان حالات کے ہونے یا نہ ہونے کی کچھ بھی پروا نہ کرنی چاہیے مگر اس کی حقیقت جو اسی وقت میرے دل پر منکشف ہوئی وہ ان کو نہیں لکھی کیونکہ وہ بات ان کی فہم سے زیادہ تھی اور اس حقیقت کے سمجھنے سے پہلے دو مقدمے سمجھ لیجئے ایک یہ کہ تمام سلوک کا مقصود حضرت حق میں فنا ہے یعنی اپنی صفات کو صفات حق میں فنا کر دینا اور متخلق باخلاق اللہ ہونا یہ مقصود ہے۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ حضرت حق میں جو صفات ہیں ان سے مراد غایات ہیں مبادی نہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہماری صفات کے دو درجے ہیں ایک مبدا ایک منتہی مبدا انفعال ہوتا ہے۔ مثلاً ہمارے اندر رحمت و شفقت کا مادہ ہے تو اس کا ایک مبدا ہے ایک منتہی ہے مبدا یہ کہ کسی کی حالت اور مصیبت کو دیکھ کر دل دکھتا ہے

دل پر اثر ہوتا ہے یہ انفعال ہے اور منتہی یہ ہے کہ دل دکھنے کے بعد ہم نے اس شخص کے ساتھ ہمدردی کی اس کی اعانت کی یہ فعل ہے اور یہی مقصود بھی ہے۔ صفت رحمت سے اسی طرح حیا اور علم و رغبت وغیرہ تو حق تعالیٰ چونکہ انفعال اور تاثر سے پاک ہیں اس لیے ان کو جو رحمٰن الرحیم عفو غفور وغیرہ کہا جاتا ہے تو ان کی صفات میں صرف غایات مرد ہیں مبادی مراد نہیں، ایک مقدمہ یہ ہوا۔ اب سمجھئے! کہ خوف اور محبت وغیرہ جو صفات ہیں ان کے اندر بھی دو درجے ہیں ایک مبدا دوسرا منتہی۔ مبدا وہی تاثر اور انفعال ہے کہ خدا کی عظمت وجلال کے خیال سے دل پر اثر ہوا رقت طاری ہوئی اور منتہی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی سے رک گئے یہ فعل ہے محبت کا مبدا یہ ہے کہ دل میں عشق کی دھن پیدا ہو اور محبوب کے خیال میں محو ہو جائے یہ انفعال ہے اور منتہی یہ ہے کہ محبوب کی رضا جوئی اور خوشنودی کی طلب میں لگ جائے تو جس شخص کے اوپر خوف اور محبت کی کیفیت غالب نہ ہو مگر استقامت حاصل ہو کہ معاصی سے پوری طرح بچنے والا اور طاعات کا بجالانے والا ہو اس میں صفات کے مبادی نہیں پائے گئے بلکہ صرف غایات پائے گئے تو یہ شخص اصل متخلق باخلاق اللہ ہے اور جس پر ان کی کیفیات کا غلبہ ہو اس میں اول مبادی پائے گئے پھر غایات پائے گئے تو یہ شخص اس درجہ کا متخلق باخلاق اللہ نہیں ہے اس حقیقت کے انکشاف کے بعد سالکین کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ جن احوال وکیفیات کے فقدان سے وہ پریشان ہوتے ہیں ان کا فقدان کوئی نقص نہیں بلکہ کمال یہی ہے کہ بدون غلبہ احوال کے استقامت حاصل ہو جو کہ مقصود ہے اس لیے اب ان چیزوں کی خواہش اور تمنا میں نہ پڑنا چاہیے اس میں حق تعالیٰ کی حکمت ہے کہ کسی کو غلبہ احوال عطا فرمایا اور کسی کو بدون اس کے ہی استقامت عطا فرمادی، کسی پر خوف کا غلبہ ہے وہ رو رہا ہے کسی پر رجاء کا غلبہ ہے وہ ہنس رہا ہے، کسی پر طلب اور شوق غالب ہے وہ بے چین ہے اور کسی پر کوئی حال غالب نہیں وہ سادگی کے ساتھ اعمال مقصودہ میں لگا ہوا ہے یہ سب خدا ہی کے بنائے ہوئے ہیں ایک کو دوسرے کے حال کی طلب نہ کرنا چاہیے:

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است   بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان است

(پھول کے کان میں کیا فرمادیا کہ خنداں ہے بلبل سے کیا فرمادیا کہ نالاں ہے)

اگر حق تعالیٰ نے صاحب اضطراب بنایا ہے تو سکون کے طالب نہ بنو! اور صاحب سکون بنایا ہے تو اضطراب کے طالب نہ بنو! اب جو لوگ کام کرتے ہیں ان سے پوچھو کہ یہ علم کس قدر عظیم ہے اس سے ان کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی اور پریشانی اور غم کا پہاڑ دل سے

ہٹ گیا ہوگا کیونکہ سالکین کو ذرا ذرا سی بات سے رنج وغم ہونے لگا ہے اگر کچھ بھی شبہ اس کا ہوجائے کہ ان کی محبت میں یا طلب میں کمی ہے تو بس ان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔

بردل سالک ہزاراں غم بود   گرز باغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل میں ہزاروں غم ہوتے ہیں اگر باطنی حالت میں ذرا برابر کمی پاتا ہے)

یہ علوم اور حقائق وہ چیزیں ہیں کہ سالکین ان کے سامنے ہفت اقلیم کی بھی حقیقت نہیں سمجھتے۔ اب میں غور کرتا ہوں اگر میرے پاس ہزار گاؤں ہوتے تب بھی جو مسرت اس وقت مجھ کو اس علم کے حاصل ہونے سے ہوئی میں سچ کہتا ہوں کہ ہزار گاؤں کے اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں۔ خلاصہ یہ کہ اگر کسی پر خوف وشوق کا غلبہ نہ ہو مگر استقامت اعمال نصیب ہوگئی ہے اس کو بے فکر رہنا چاہیے مگر سامان کرنے کے بعد۔ (الجلاء للابتلاء ج ۱۸)

ایک عوامی غلطی

لوگ افضل کی تعیین اپنی رائے سے کرتے ہیں یا اگر بعض لوگ کسی دلیل شرعی سے تعین کرتے ہیں تو وہ لوگ اس دلیل شرعی میں غور نہیں کرتے کہ یہ دلیل اس دعوے کے لیے کافی ہوگی یا نہیں اور انطباق ہوا یا نہیں ہوا چنانچہ عوام الناس جب تفاضل کی تحقیق کرتے ہیں اول تو اکثر اپنی رائے سے کرتے ہیں اور اس تفاضل کا معیار بھی ایک مقرر کرلیا ہے کیونکہ ہر تفاضل کے لیے کوئی نہ کوئی معیار تو ضرور ہونا چاہیے' ایک چاندی کو دوسری چاندی پر یا ایک کپڑے کو دوسرے کپڑے پر اگر ترجیح دیں تو اس ترجیح کا کوئی معیار ضرور ہوگا۔

پس اسی بناء پر عوام نے بھی اس تفاضل کے لیے ایک معیار مقرر کرلیا ہے کہ جس عمل کو وہ صورۃً عبادت سے زیادہ تلبس دیکھتے ہیں اس کو افضل سمجھتے ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اعمال دو قسم کے ہیں ایک وہ ہیں کہ جس طرح وہ واقع میں عبادت ہیں۔ اسی طرح صورت بھی وہ عبادت ہیں یا عبادت سے ان کو تلبس ہے۔ مثلاً نماز پڑھنا کہ یہ حقیقتاً اور صورۃً دونوں طرح عبادت ہے یا مسجد تیار کرانا کہ اس کو صورت عبادت سے تلبس ہے دوسرے وہ اعمال ہیں کہ واقع میں وہ عبادت ہیں لیکن ان کی ظاہری صورت عبادت نہیں معلوم ہوتی نہ ان کو کسی عبادت سے ایسا ظاہری تلبس ہے کہ ہر شخص کی نظر میں آجائے جیسے کسی طالب علم کی مدد کرنا' کھانے یا کپڑے سے (کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھے کسی طالب علم کا کھانا مقرر کرانا ہے ہرگز نہیں) کیونکہ

طالب علم کا کھانا مقرر کرنا جو عبادت ہے تو اس لیے کہ یہ خدمت دین ہے اور اس کا خدمت دین ہونا اس وقت سمجھ میں آ سکتا ہے کہ جب طالب علم فارغ ہو کر خدمت دین میں مصروف ہو تو یہ دونوں قسم کے اعمال عبادت ہیں لیکن دونوں میں تفاوت یہ ہے کہ مسجد کی تعمیر صورۃً بھی عبادت ہے کہ اس کے ساتھ عبادت کو تلبس ظاہر ہے یعنی اس میں لوگ نماز پڑھتے ہیں اور تلبس بھی بلاواسطہ ہے اور اسی وجہ سے یہ تلبس بہت ظاہر ہے اور عبادت بھی ایسی کہ وہ بصورتہا عبادت ہے یعنی اس کا عبادت ہونا نظری نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ نماز پڑھنا عبادت ہے۔ لہٰذا اس کو یوں سمجھا جاتا ہے کہ بناء مسجد یا اس میں تیل بتی دینا بھی بہت بڑی عبادت ہے۔

بر خلاف تقرر طعام طالب علم کے کہ یہ جس سے متلبس ہے اول تو وہ ایسی ظاہر عبادت نہیں کہ عوام بھی فوراً سمجھ لیں، دوسرے اطعام کو اس عبادت سے تلبس بھی بوسائط ہے کیونکہ امداد طلبہ میں علم دین کی مدد ہے اور وہ اتنی ظاہر عبادت نہیں کیونکہ اگر ایک شخص میزان الصرف یا درس کی کوئی کتاب بالخصوص فلسفہ یا ہیئت پڑھتا ہے تو کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ یہ عبادت کر رہا ہے اس لیے کہ اس کا عبادت ہونا مال اور انجام کے اعتبار سے ہے یعنی اگر دس برس تک یہ شخص مثلاً اسی میں لگا رہے اور فراغت حاصل کرے تو وہ اس قابل ہوگا کہ دین کی خدمت کر سکے اور خدمت دین افضل العبادات ہے۔ (تفاضل الاعمال ج ۱۸)

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا واقعہ

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین باتوں کا حکم فرمایا اور یہ تینوں باتیں میری مرضی کے خلاف ہیں مگر ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے میں نے اپنی مرضی کو چھوڑ دیا۔

ایک تو یہ کہ میرا رجحان حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تفضیل کی طرف تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو افضل الصحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سمجھو۔

دوسرے میرا میلان ترک تقلید کی جانب تھا، ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوا کہ مذاہب اربعہ سے باہر نہ ہو۔

تیسرے میں ترک اسباب کو پسند کرتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روک کر تشبث بالاسباب کا حکم فرمایا۔

ان تینوں حکموں میں بہت سے راز ہیں لیکن یہ وقت ان کی تفصیل کا نہیں لہٰذا اس کو یہیں چھوڑا جاتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ عالم برزخ میں بھی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یہی معلوم ہوا کہ شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے افضل سمجھو! غرض حدیث سے' کشف سے محققین کی رائے سے ہر طرح شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور اگر کسی کو اس مسئلے کی زیادہ تحقیق منظور ہو تو (ازالۃ الخفاء) کا مطالعہ کرے وہ ان شاء اللہ تعالیٰ خاص اسی متن کی پوری طرح شرح ہوگی۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ ان دونوں کے ہاتھ سے اسلام کی خدمت بہت زیادہ ہوئی۔ پس علم کی افضلیت کی تو یہ حالت لیکن باوجود افضل العبادات ہونے کے اس کی صورت عبادت کی نہیں ہے۔ (فضائل اعمال ج ۱۸)

دوستوں سے ملاقات بھی عبادت ہے

حضرت مولانا فتح محمد صاحبؒ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی حکایت بیان فرماتے تھے کہ میں حضرت رحمۃ اللہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا' بہت دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ آخر جب بہت دیر ہوگئی تو میں اٹھا اور عرض کیا کہ حضرت آج میں نے آپ کی عبادت میں بہت حرج کیا' حضرت فرمانے لگے کہ مولانا یہ کیا فرمایا' کیا نماز روزہ ہی عبادت ہے اور دوستوں کا جی خوش کرنا عبادت نہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ بیٹھتے تھے اور حد جواز تک جس قسم کی باتیں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ شریک رہتے مگر عوام الناس کیا سمجھیں۔

درنیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام

(تجربہ کار آدمی کی حالت کو غیر تجربہ کار آدمی نہیں سمجھ سکتا' لہٰذا بات کو طول نہ دے) (بڑوں کی شان میں اعتراض کرنے سے اپنی زبان کو تھامے رکھو اسی میں بھلائی و خیریت ہے) (فضائل اعمال ج ۱۸)

عارف اور غیر عارف کا فرق

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں علم اور معرفت درجہ کمال پر تھا اس کی تائید میں مرشدنا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ کا ایک ارشاد نقل کرتا ہوں۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ عارف کی دو رکعتیں غیر عارف کی ہزار رکعتوں سے بھی زیادہ درجہ رکھتی ہیں۔ وجہ فرق

کی یہ ہی ہے کہ عارف کو جو علم و معرفت حاصل ہے غیر عارف کو حاصل نہیں اور کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ نے مبالغۃً ایسا فرما دیا ہوگا ہرگز نہیں۔ صاحبو! یہ بالکل واقع کے مطابق اور اس سے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ کا عمیق علم معلوم ہوتا ہے اور یہ ہی وہ علوم ہیں جن کی وجہ سے مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے متبحر یوں فرماتے تھے کہ مجھے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جو کچھ اعتقاد ہوا ہے وہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علم کی بدولت ہوا ہے تو اس میں اگر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ذرا مبالغہ نہیں فرمایا۔ خود حدیث شریف میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ اگر ایک صحابی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ایک مد یا نصف مد صدقہ دیں اور غیر صحابی جبل احد کے برابر صدقہ دیں تو غیر صحابی کا یہ صدقہ صحابی کے نصف مد کے برابر نہیں ہوسکتا۔ اب ذرا مدینہ منورہ جا کر دیکھئے! کہ نصف مد غلہ کس قیمت کا ہوتا ہے اور اس قیمت کا کس قدر چاندی یا سونا آتا ہے اور وہ سونا جبل احد سے کیا نسبت رکھتا ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ بلا توسط قیمت کے اگر خود نصف مد غلہ کا طول و عرض بھی لیجئے اور اس مقدار کو جبل احد کے مقابلہ میں دیکھئے کہ کیا نسبت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کو جبل احد سے کوئی نسبت بھی نہیں تو اس کا مقتضا یہ تھا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ اس کو کروڑوں حصے سے زیادہ فرماتے۔ (حب العاجلہ ج ۱۸)

چنانچہ ارشاد ہے: "اَکْثِرُوْا ذِکْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتَ" (لذتوں کو ختم کر دینے والی یعنی موت کا ذکر زیادہ کیا کرو) اس حدیث کے الفاظ خود غور کرنے کے قابل ہیں کہ اول موت کی صفت کو بیان کیا اس کے بعد موت کے نام کی تصریح فرمائی جس سے اس امر اکثروا کی حکمت دریافت ہوگئی۔ یعنی موت زیادہ یاد کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے لذات کی جڑ اکھڑ جاتی ہے اور سہل ترکیب اس کے یاد کرنے کی یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے مراقبہ موت کیا کرے اور سوچا کرے کہ ایک دن میں مروں گا، دوزخ اور جنت میرے سامنے پیش کی جائے گی، اگر میں گنہگار مروں گا تو جنت کو مجھ سے چھپا لیا جائے گا اور تا قیامت مجھ کو عذاب قبر ہو جائے گا، پھر قیامت آئے گی اور سب کے نامہائے اعمال ان کو دکھلائے جائیں گے، اس کے بعد حساب ہوگا، اگر خدانخواستہ میری ناشائستہ حرکات بڑھ گئیں تو فرشتے کشاں کشاں مجھے جہنم کی طرف لے جائیں گے وغیرہ وغیرہ اس مراقبے سے ان شاء اللہ تعالیٰ انہماک فی الدنیا کا مرض بالکل زائل ہو جائے گا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص

دن میں بیس دفعہ موت کو یاد کرے گا اس کو شہادت حاصل ہوگی مگر موت کے یاد کرنے کے یہ معنی نہیں کہ لفظ موت کو بیس دفعہ دہرالیا جائے اس لیے کہ موت کو یاد کرنے سے شہادت کا درجہ حاصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایسا شخص اپنے آپ کو بالکل سونپ دے گا اور تسلیم کردے گا اور اس کے حظوظ نفسانی بالکل چھوٹ جائیں گے اور یہ ان لوگوں میں ہوگا کہ:

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جان دیگراست

(جو لوگ تسلیم و رضا یعنی عشق کی تلوار کے مارے ہوتے ہیں غیب کی جانب سے ہر گھڑی ان کو نئی زندگی حاصل ہوتی ہے)

بس موت کو یاد کرنا وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ یہ تقسیم تو اہل دنیا کے حالات کے اعتبار سے تھی۔

دین کا مقدم کرنا دین کے علم پر موقوف ہے مگر اس جملہ سے کوئی یہ مطلب نہ سمجھ جائے کہ میں سب کو مولوی بنانا چاہتا ہوں بلکہ جن علماء کی نسبت آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ سب کو مولوی بنانا چاہتے ہیں وہ خود ہی سب کو مولوی بنانے سے منع کرتے ہیں کیونکہ اس سے دو نقصان ہوں گے ایک تو یہ کہ تمام لوگ مولوی بن جائیں گے تو کھیتی اور تجارت سب برباد ہو جائے گی اور مجموعہ قوم پر معاش کی حفاظت کرنا فرض ہے اگر سب چھوڑ دیں اور اس سبب سے سب مر جائیں تو سب گنہگار ہوں گے تو واجب ہے کہ ایک جماعت کھیتی کے لیے رہے ایک تجارت کے لیے اور ایک خدمت دین کے لیے جس کو لوگوں نے اڑا دیا ہے۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ اگر سب مولوی بنے تو چونکہ اکثر طبائع میں حرص اور لالچ غالب ہے اور معاش سے بھی اکثر لوگ مستغنی نہیں ہوتے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مولوی کہلائیں گے اور حرص دنیا میں دین کو تباہ کریں گے اور دین کو ذریعہ تحصیل دنیا کا بنائیں گے ان کا تو یہ ضرر ہوگا اور دوسرے لوگ ان کو اس حالت ذلیل میں دیکھ کر دین کو بھی ذلیل سمجھنے لگیں گے دوسروں کا یہ ضرر ہوگا۔ سلف صالحین کا اس وجہ سے یہ معمول تھا کہ جو شخص امراء سے زیادہ ملتا تھا اس کو اپنے حلقہ درس میں شریک ہونے سے روک دیتے تھے۔ غرض یہ تو مطلب نہیں ہے کہ سب کے سب اصطلاحی عالم بنیں لیکن یہ ضروری ہے کہ کچھ لوگ اصطلاحی عالم ہوں اور کچھ لوگ متوسط درجہ تک پڑھ لیں اور ان کو جو ضرورت پیش آتی جائے علماء کاملین سے اس کے متعلق استفتاء کرلیں۔ صاحبو! اس وقت دو پیسے میں کلکتہ تک سے ہر بات دریافت ہو سکتی ہے۔ دیکھئے!

اگر ایک ہفتہ میں چار مسئلے معلوم ہوں تو ایک ماہ میں کس قدر ہو جائیں۔ پھر ایک سال میں ان کی کتنی تعداد ہو جائے اور چند سال میں کیسا معتد بہ ذخیرہ اپنے پاس ہو جائے تو ان کے لیے جو پڑھے لکھے ہیں اور جو حرف شناس نہیں ہیں ان کے لیے یہ کیا جائے کہ کسی ایک شخص کو مقرر کیا جائے جو ان کو ہر ہفتہ مسائل سنایا کرے اور یہ نہ ہو سکے تو ہر مہینے میں ایک بار تو ضرور ہی کچھ مسائل سنا دیا کرے اور یہ لوگ اپنی عورتوں کو سنا دیا کریں مگر اس کے لیے ایک مرکز کی ضرورت ہوگی کہ وہ اس کو اپنے ذمہ لے اور وہ کوئی عالم ہونا چاہیے اس کا کام یہ ہو کہ محض مسائل کا وعظ کہا کرے اس لیے میں نے اس وقت "وَاَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ" (اور جو کچھ ہم نے تمہیں رزق عطا کیا اس میں سے خرچ کرو) کو پڑھا کہ لوگ اس کی طرف توجہ اور ہمت کر کے ایک مولوی کو مناسب معاوضہ پر اس کام کے لیے رکھ لیں۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی حاصل ہوئی کہ یہاں یہ انتظام ہوا ہے۔ اس کی آسان تدبیر یہ ہے کہ روزانہ جب کھانا پکانے بیٹھو تو آٹے کی ایک چٹکی نکال کر علیحدہ کسی برتن میں ڈال دیا کرو اسی طرح جب روپے کے پیسے لو تو اس میں سے ایک پیسہ نکال کر اس کے مد کے لیے رکھ دیا کرو اور اس میں بستی کے ہر شخص کو شریک کرو اور جب مدرسے کی صورت ہو جائے تو اس میں تین چیزوں کی ضرورت ہوگی ان کو جاری کرو ایک تو یہ کہ قرآن شریف کی تعلیم ہو جو لڑکے ناظرہ پڑھیں ان کے ساتھ تو یہ طرز رکھو کہ جب بیس پارے قرآن شریف کے پڑھ لیں تو ان کو مسائل کا کوئی اردو رسالہ شروع کرا دیا جائے اور جو لڑکے حفظ پڑھیں ان کے ساتھ یہ طرز رکھو! کہ جب تک قرآن شریف ختم نہ ہو جائے کسی دوسرے شغل میں نہ لگاؤ' دوسرا کام یہ کہ ایک شخص کو ملازم رکھو کہ وہ عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھا دیا کرے' تیسرا کام یہ کہ ایک واعظ مدرسے میں رکھا جائے کہ وہ ہر ہفتہ وعظ کہا کرے اور قرب و جوار کے دیہات میں بھی وقتاً فوقتاً مسائل کی تعلیم کر دیا کرے تو اس کی کوشش کرنا بھی ''اَنفِقُوا'' میں داخل ہے۔ (ازالۃ الغفلت ج ۱۸)

واقعہ منصور

ایک بزرگ نے حق تعالیٰ سے سوال کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ منصور نے بھی انا الحق کہا تھا اور فرعون نے بھی انا الحق کہا تھا (کیونکہ **انا ربکم الاعلیٰ** کا بھی وہی حاصل ہے جو انا الحق کا ہے ۱۲) تو بات ایک ہی تھی مگر منصور تو مقبول ہو گیا اور فرعون مردود ہو گیا۔ وہاں

سے جواب عطا ہوا کہ تم سمجھتے نہیں دونوں میں بڑا فرق تھا، منصور نے اپنے کو مٹا کر انا الحق کہا تھا اور فرعون نے ہم کو مٹا کر انا الحق کہا تھا یعنی منصور نے ایسی حالت میں انا الحق کہا تھا کہ اپنی ہستی ان کی نظر سے غائب تھی اور ہستی خداوندی کے سوا کسی پر ان کی نظر نہ تھی تو وہ اپنی نفی کر کے انا الحق کہتے تھے اور فرعون نے ایسی حالت میں انا ربکم الاعلیٰ کہا تھا کہ اس وقت خدا کی ہستی اس کی نظر سے غائب تھی محض اپنی ہی ہستی پیش نظر تھی تو وہ ہستی خداوندی کی نفی کر کے اپنی ہستی کو ثابت کر رہا تھا، دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ منصور کے انا الحق کے یہ معنے تھے کہ میں اور تمام عالم کچھ نہیں صرف خدا ہی کا وجود ہے اور فرعون کے انا الحق کا یہ مطلب تھا کہ خدا کوئی چیز نہیں۔ بس میں ہی ہوں جو کچھ ہوں۔ واقعی یہ جواب ایسا عجیب ہے کہ حق تعالیٰ ہی دے سکتے ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

گفت فرعونے انا الحق گشت پست گفت منصورے انا الحق گشت مست

(فرعون تو اس بات سے مردود اور پست ہو گیا اور منصور مجذوب اور مست شمار ہوئے)

(مراقبۃ الارض ج ۱۸)

تہذیب کی حقیقت

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون نے موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ پایا ہے اور وہ آپ سے ملا بھی ہے اور کچھ سوالات بھی کیے ہیں۔ من جملہ ان کے ایک سوال یہ مشہور ہے کہ بتلائیے کہ اگر اللہ تعالیٰ تیر انداز ہوں اور فلک کمان ہو اور حوادث تیر ہوں تو ان سے بچ کر کہا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیر انداز کے پاس جا کھڑا ہو کیونکہ تیر اسی کے لگتا ہے جو تیر انداز سے دور ہو اور جو اس کے پہلو میں کھڑا ہو اس کے نہیں لگ سکتا۔ اس جواب پر افلاطون حیران ہو گیا اور کہنے لگا کہ یہ جواب نبی کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ آپ بیشک نبی ہیں مگر عوام کے واسطے۔ ہمارے واسطے نہیں کیونکہ ہم نے تو اخلاق و علوم سے اپنے کو مہذب بنالیا ہے اب ہم کو اس سے زیادہ تہذیب کی ضرورت نہیں ہاں ان لوگوں نے انبیاء کی تہذیب کو دیکھا نہیں ورنہ معلوم ہو جاتا کہ جس کو ہم تہذیب سمجھے ہوئے ہیں وہ محض تعذیب ہے اور اصل تہذیب انبیاء علیہم السلام ہی کے پاس ہے نیز انہوں نے انبیاء علیہم السلام کے علوم کو حاصل ہی نہیں کیا ہے ورنہ معلوم ہو جاتا کہ جن علوم پر ہم ناز اں ہیں ان پر ناز کرنے کی حقیقت یہ ہے:

چو آں کرمیکہ در سنگے نہاں است زمین و آسمان وے ہماں است

(مراقبۃ الارض ج ۱۸)

جسم و روح

اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ ہمارے اندر دو چیزیں ہیں ایک جسم ایک روح ان میں سے ایک سفلی ہے ایک علوی اور ہر ایک کا مبداء و معاد الگ الگ ہے جسم تو سفلی ہے اور اس کا مبداء و معاد تو زمین ہی ہے۔ چنانچہ یہ آیت بھی جو کہ میں نے تلاوت کی ہے اس کی دلیل ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ" اور روح علوی ہے اس کا مبداء و معاد آسمان ہے وہ آسمان ہی سے آئی ہے، مرنے کے بعد آسمان ہی پر چلی جاتی ہے کیونکہ روح سے مراد روح انسانی ہے جس سے ادراک معقولات ہوتا ہے۔ روح طبی مراد نہیں جو کہ دم سے متولد ہے روح انسانی کو سفلی کوئی نہیں کہتا، سب نے علوی مانا ہے یہ الگ اختلاف ہے کہ وہ مجرد ہے یا مادی اگر مجرد ہے جیسا کہ حکماء نے بھی کہا ہے کیونکہ جس چیز کو وہ نفس ناطقہ کہتے ہیں وہ روح انسانی ہے اور نفس ناطقہ کو ان لوگوں نے بھی مادی نہیں مانا بلکہ مجرد کہا ہے اور یہی صوفیاء کی بھی تحقیق ہے کہ روح مجرد ہے تب تو علوی بایں معنی ہے کہ فوق الاحیاز ہے اور یہی محل ہوگا۔ صوفیاء کے نزدیک روح کے فی السماء ہونے کا جیسا کہ یہی محمل ہے علماء ظاہر کے نزدیک بھی احادیث کون اللہ فی السماء کا اور اگر مادی ہے جیسا کہ متکلمین کا قول ہے کہ انہوں نے اسے جسم مانا ہے مگر جسم علوی لطیف۔ تب وہ علوی بایں معنی کہ اس کا جزء عالی ہے پس ثابت ہوا کہ روح کے علوی ہونے پر سب کا اتفاق ہے اور ہم کو سب سے کیا لینا کوئی بھی نہ مانے تو کیا جب کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ روح کا مبداء و معاد آسمان ہے معاد ہونا تو صراحۃً اور مبداء ہونا قیاساً چنانچہ حدیث میں روح کی حالت وارد ہے: "حَتّٰى تَخْرُجَ ثُمَّ اِلَى السَّمَاءِ فَيُفْتَحُ لَهَا الى قوله حتّٰى تنهىٰ اِلَى السَّمَآءِ الَّتِىْ فِيْهَا الحديث" (مشکوٰۃ عن ابن ماجہ) یعنی جب آدمی مرتا ہے تو فرشتے اسی کی روح کو آسمان پر لے جاتے ہیں اس سے یہ تو ظاہر ہے کہ روح کا معاد آسمان ہے اور مبداء ہونا اس طرح معلوم ہوا کہ موت کے بعد جسم کے لیے دفن کا حکم دیا گیا ہے جس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کو اصل کی طرف لوٹا دینا مقصود ہے جب جسم کا مبداء زمین تھی اور اس کو جسم کا معاد بنایا گیا اور روح کے لیے آسمان پر لے جانا بتلایا جس سے معلوم ہوا کہ آسمان سے مراد روح ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا کہ معاد اسی کو بنایا ہے جو مبداء تھا تو معلوم ہوا کہ آسمان ہی روح کا مبداء بھی

ہے بس جسم کا مبداء و معاد تو زمین ہوئی اور روح کا مبداء و معاد آسمان ہوا اور موت کے بعد روح کا آسمان کی طرف جانا جس طرح حدیث مذکور سے ثابت ہے اسی طرح قرآن سے بھی مفہوم ہوتا ہے۔ چنانچہ کفار کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ" یعنی ارواح کفار کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روحیں ان کی بھی آسمان پر جانا چاہتی ہیں مگر ان کو دھکے دے دیے جائیں گے۔ پس یہ دعویٰ بھی ثابت ہو گیا کہ آسمان روح کا مبداء و معاد ہے اور آسمان و زمین دونوں اس وقت سامنے موجود ہیں تو ان کو اس نظر سے دیکھتے رہنا معاد مستقبل کے استحضار کو سہل کر دیتا ہے اور اب مناسبت مقام سے استطراداً ایک تو اس پر شیخ اکبر نے یہ تفریع کی ہے کہ عالم آخرت اس وقت موجود ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ عالم آخرت کے دو جز ہیں ایک زمان آخرت جس میں جزا سزا شروع ہو جائے اور اعمال کا صلہ مل جاوے تو وہ بعد میں آئے گا۔ (مراقبۃ الارض ج ۱۸)

حیاء کا اقتضاء

حدیث شریف میں آیا ہے کہ کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا ستر کھولنا کیسا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انکار فرمایا اس شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِنْ كَانَ خَالِيًا یعنی اگر خلوت میں ہے فرمایا: فَاللّٰهُ اَحَقُّ مِنْ اَنْ يُّسْتَحْيٰ مِنْهُ یعنی اللہ تعالیٰ احق ہیں اس بات کے ساتھ کہ ان سے حیاء کی جائے اگرچہ اللہ تعالیٰ سے پردہ اور ستر نہیں ہو سکتا مگر یہ تو ہو سکتا ہے کہ پردہ کی صورت بنائی جاوے اور یہاں سے اس حدیث کی بھی شرح ہو گئی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر پر جایا کرتی تھیں جب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں دفن ہوئے تو میں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حیا کی وجہ سے نہیں گئی۔ اس حدیث سے لوگوں نے اپنی ذہانت سے بہت کچھ مستنبط کیا ہے سماع موتی بھی اس سے ثابت کیا ہے یہ سب نری ذہانت ہے اس سے کچھ نہیں نکلتا اس لیے کہ حیا کے دو اثر ہیں ایک پردہ حقیقۃ اور دوسرے پردہ صورۃ جیسا یہاں شبہ ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے حیا ہو تو اس کا اثر کیا ہوگا پردہ تو ہو نہیں سکتا تو جواب یہ ہے کہ گو پردہ حقیقی نہ ہو لیکن حیا کا اقتضاء یہ بھی ہے کہ پردہ کی صورت ہو پس یہاں بھی حیاء من عمر کے اندر

دوسرا احتمال ہے کہ مراد یہ ہو کہ گو پردہ حقیقی کا تحقق تو حی ہی کے اندر ہو سکتا ہے لیکن پردہ صورۃ میت سے بھی ممکن ہے پس اس احتمال کے ہوتے ہوئے استدلال کرنا سماع کے مسئلہ پر مشکل ہے۔

اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تنہائی میں بھی بلا ضرورت برہنہ ہونا نہ چاہیے اور بیوی کا ستر دیکھنا تو اس سے بھی زیادہ شرمناک ہے بعض حکماء نے کہا ہے کہ اس حرکت سے اولاد اندھی پیدا ہوتی ہے لیکن اگر اندھی نہ ہو تو بے حیا تو ضرور ہوتی ہے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس وقت خاص میں جس قسم کی اس سے حرکت ہوتی ہے اولاد کے اندر وہی خصلت پیدا ہوتی ہے اسی واسطے حکماء نے لکھا ہے کہ انزال کے وقت اگر زوجین کو کسی اچھے آدمی کا تصور آ جائے تو بچہ نیک ہوگا اسی واسطے پہلے لوگ اپنے خلوت کے کمرے میں علماء اور حکماء کی تصویریں رکھا کرتے تھے۔ شاید یہ سن کر کسی کی رال ٹپکی ہو کہ یہ تو تصویریں رکھنے کی ایک مصلحت بھی نکل آئی پھر کیوں ناجائز کہا جاتا ہے اس سے کیوں فائدہ نہیں اٹھایا جاتا لیکن ع

فی طلعته الشمس مایغنیک عن زحل

(ہمارے پاس سورج کی روشنی ایسی ہے جس کے ہوتے ہوئے سیارہ زحل کے روشنی کی ضرورت نہیں) حضرت! ہمارے پاس ایسی تصویر ہے کہ وہ ان تصویروں سے مغنی ہے۔ وہ کیا ہے:

دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار — جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

یعنی ہم کو چاہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا تصور کریں اور یہ دعا پڑھیں: "اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّیْطَانَ مَارَزَقْتَنَا" (اے اللہ ہم کو شیطان سے بچا اور دور رکھ شیطان کو اس سے جو ہم کو عطا فرما) اللہ جل جلالہ سے زیادہ کون ہے کہ جس کا خیال کیا جاوے۔ اگر کوئی کہے کہ شیطان کا خیال تو اس وقت نہ ہونا چاہیے اور اس دعا کے پڑھنے میں شیطان کا خیال ضرور آوے گا۔ بات یہ ہے کہ ایک تو کسی شے کا خیال اس کو مقصود و مرغوب بنا کر لاتا ہے اور ایک مہروب عنہ بنا کر دونوں میں بڑا فرق ہے اس دعا کا حاصل تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کیا گیا ہے کہ اے اللہ ہم کو اور ہماری اولاد کو شیطان سے بچایئے تو اس کا تصور بحیثیت تنفر کے ہوا پس اثر اسی کے مناسب ہوگا۔ چنانچہ اس دعاء کا اثر یہ آیا ہے: "فانه لن یضره الشیطن" اس کو ضرر نہ پہنچائے گا۔ اولاد پاک اور مقدس ہوگی اور یوں اگر اپنے ہاتھوں بگڑیں وہ دوسری بات ہے پس ہم کو اس تصویر کے ہوتے ہوئے کسی اور تصویر کی

حاجت نہیں۔ بہر حال بیوی کو برہنہ دیکھنے سے اخلاق پر اولاد کے اثر پڑتا ہے اور اس میں آدم وحوا کے رتبہ کی طرف بھی اشارہ ہو گیا۔ (التہذیب ج ۱۸)

ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے

ایک شخص نے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ میں ایمان تو لے آتا لیکن قریش کی بڑھیاں کہیں گی کہ دوزخ سے ڈر گیا۔ بہادری میں فرق آجائے گا۔ چنانچہ اسی حال میں مر گیا۔ آپ کو بہت رنج ہوا۔ اس پر آیت نازل ہوئی کہ اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۔ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے۔ لیکن اللہ جس کو چاہے ہدایت کرتا ہے۔ تو ایسی چڑ بری ہے ورنہ حق پر ملامت ہونے سے چڑ بڑھ جائے تو خیر ہے۔ بہر حال اللہ کے بندوں نے ملامت سر پر لی اور حق کو اتباع ہوٰی پر ترجیح دی۔ غرض اتباع ہوٰی کا سخت مذموم ہونا ثابت ہو گیا۔ (ذم ہویٰ ج ۱۹)

ترک تنخواہ کی خواہش

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ایک مولوی صاحب میرے پاس آئے ان کے نفس نے یہ تجویز کیا تھا کہ نوکری چھوڑ کر اللہ کے واسطے پڑھائیں اس لئے کہ تنخواہ لینے سے خلوص نہیں رہتا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے کہ شیطان نے دیکھا کہ دین کے کام میں لگے ہوئے ہیں ان سے یہ کام کسی تدبیر سے چھڑوانا چاہیے تو اگر یہ کہتا کہ پڑھانا چھوڑ دو تو اس کی ہرگز نہ چلتی اس لئے اس کی وہ صورت تجویز کی جو دینداری کے رنگ میں ہے کہ اس میں خلوص نہیں ہے۔ نوکری چھوڑ کر پڑھاؤ تو سمجھ لو کہ اب تو پابندی تنخواہ سے بھی کام ہو رہا ہے اور اگر نوکری چھوڑ دو گے تو پابندی تو ہو گی نہیں رفتہ رفتہ پڑھانا ہی چھوٹ جائے گا۔ اور شیطان کامیاب ہو گا۔ اور یہ جو تم کو وسوسہ ہے کہ ہم نے معاوضہ لے لیا ہے خلوص نہیں رہا۔ تو میں تم سے پوچھتا ہوں کہ تم کو اب مثلاً ۲۵ ملتے ہیں سو بتلاؤ کہ اگر تم کو ۳۰ یاللغہ ۴۰ پر بلادیں تو تم اس صورت موجودہ کو چھوڑ کر وہاں چلے جاؤ گے یا نہیں کہنے لگے کہ میں تو ہرگز نہ جاؤں گا۔ میں نے کہا کہ بس معلوم ہو گیا کہ تم روپیہ کے لئے نہیں پڑھاتے بلکہ اللہ کے واسطے پڑھاتے ہو اور روپیہ گزران کیلئے لیتے ہو دنیا تم کو مقصود نہیں۔ پس خلوص نہ ہونے کا وسوسہ غلط

ثابت ہوا اس لئے نوکری ہرگز مت چھوڑو بلکہ میری رائے تو یہ ہے اگر عالم امیر ہو اور تنخواہ ملنے لگے تب بھی اس کو چاہیے کہ تنخواہ لے کر پڑھائے اگر ایسا ہی امارت کو جوش اٹھے وہ تنخواہ پھر مدرسہ میں دیدے مگر لے لے ضرور! تاکہ پابندی سے کام ہوتا رہے۔ ہمارے فقہاء جزاہم اللہ خیرا نے لکھا ہے کہ اگر قاضی امیر کبیر ہو تو اس کو بھی تنخواہ لینا چاہیے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی قاضی تنخواہ نہ لے اور دس برس تک وہ قاضی رہا۔ اور اس کے بعد کوئی غریب قاضی ہو کر آیا تو اب تنخواہ کا اجراء مشکل ہوگا۔ سبحان اللہ! فقہاء کا کیا فہم ہے یہ حضرات حقائق شناس تھے اس شان کا علم وفہم یہ اخلاص وتقویٰ کی برکت تھی مولانا فرماتے ہیں

بنی اندر خود علم انبیاء　　بے کتاب و بے معین واوستا

(انبیاءؑ جیسے علوم بلا کتاب واستاد اور معاون کے اپنے قلوب پر قابض پاؤ گے)

علم چوں بر دل زنی یارے بود　　علم چوں برتن زنی یارے بود

(علم جب قلب پر اثر کرے کہ خشیت اور خلوص پیدا ہو جائے تو وصول الی اللہ میں معین ہوگا اور اگر تن پر اثر ہو یعنی زبان پر تقریر رہی ہو یا اس کو تن پروری کا ذریعہ بنایا تو تیرا بوجھ اور وبال ہے)۔ (ذم ہویٰ ج ۱۹)

غلبہ خشیت

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی منافات کو اس عنوان سے بیان فرماتے ہیں **لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مومن ولا یسرق السارق حین یسرق وھو مومن** یعنی زنا کرنے والا زنا نہیں کرتا اس حالت میں کہ وہ مومن ہو اور چوری کرنیوالا چوری نہیں کرتا اس حالت میں کہ وہ مومن ہو۔

ظاہراً اس حدیث پر ایک اشکال ہے وہ یہ کہ کیا ان افعال سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے حالانکہ ہمارا مذہب یہ ہے کہ جب تک مسلمان گناہ کو گناہ سمجھے گا کافر نہ ہوگا۔ اور حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زنا کرنے سے چوری کرنے سے کافر ہو جاتا ہے۔ یہ اشکال ہے۔

جواب یہ ہے کہ حدیث میں ایمان کا خاص مرتبہ مراد ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی مرتبہ ایمان اور زنا میں منافات کو بیان فرما رہے ہیں اور وہ ایمان خاص یہ ہے کہ جن باتوں کا اعتقاد ہے وہ درجہ حال میں ہر دم پیش نظر رہنے لگیں یہی ہے ایمان کا کمال۔

پس مطلب حدیث کا یہ ہے کہ کمال ایمان کے ساتھ زنا جمع نہیں ہوتا یعنی کامل مومن ہو کر زنا نہیں کر سکتا۔ حضرات اہل اللہ اسی کی تدابیر کرتے ہیں کہ گناہ کا مانع راسخ ہو جائے جب وہ مانع راسخ ہو جاتا ہے تو اس حالت میں گناہ نہیں ہوتا۔ جس کی تعبیر دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ جس پر خدا تعالیٰ کی خشیت غالب ہو اور ان کے وعدے وعید بھی پیش نظر ہوں۔ شرم بھی دامن گیر ہو اور خوف بھی غالب ہو تو پھر اس سے گناہ نہیں ہوگا۔ بلکہ جس شخص میں ان چیزوں کا غلبہ ہوا ہے اس نے اگر قصد بھی کیا ہے گناہ کا تو ان چیزوں نے اس کو بچا لیا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق اہل اللہ کے بہت سے قصے ہیں کہ کسی نے معصیت کا ارتکاب بھی کرنا چاہا اور ان چیزوں کا غلبہ ہوا تو چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

غرض اہل اللہ زیادہ تر اس کی کوشش کرتے ہیں کہ قلب کی ایسی اصلاح ہو جائے۔ حدیث میں بھی اس اصلاح کا بڑا اہتمام آیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے **ان فی الجسد مضغةً اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله** یعنی بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ایسا ہے کہ اگر وہ درست ہو تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ فاسد ہو تو تمام بدن فاسد ہوتا ہے **الا وھی القلب** سن لو وہ دل ہے۔

واقعی قلب کی درستی سے تمام جوارح درست ہو جاتے ہیں اور اس کے بگڑنے سے سب بگڑ جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اتنے بڑے اہتمام کی چیز اور اس سے اس قدر غفلت! ہوی جس کا نام ہے اس کا محل قلب ہی تو ہے قلب سے جب تک ہوی نہ نکالی جائے گی اس وقت تک کامل اصلاح قلب کی نہ ہوگی۔ (الھوی والھدی ج ۱۹)

عفو و درگزر

حضرت امام حسینؓ کی حکایت ہے کہ آپ کے یہاں چند مہمان تھے کھانے کا وقت آیا۔ غلام کھانا لایا۔ اتفاق سے شوربے کا پیالہ لیے ہوئے تھا کہ فرش پر پاؤں پھسلا۔ پیالے میں سے گرم گرم شوربا آپ کے چہرہ مبارک پر گر پڑا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کیسا منظر تھا۔ اس وقت کے اہل جاہ اپنے دل میں ٹٹولیں کہ ایسے موقع پر وہ کیا کرتے آپ نے کچھ نہیں کیا۔ مگر بمصلحت تعلیم نظر تادیب سے اس کی طرف دیکھا اس کی زبان پر فوراً یہ جاری ہو گیا **والکاظمین الغیظ.** اللہ کے خاص بندے غصہ کو پینے والے ہیں آپ نے

فرمایا کظمت غیظی کہ میں نے اپنا غصہ پی لیا۔ پھر غلام نے کہا والعافین عن الناس اور وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں آپ نے فرمایا عفوت عنک کہ میں نے تجھے معاف کیا پھر اس نے کہا واللہ یحب المحسنین اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا قد اعتقتک لوجہ اللہ کہ میں نے تجھ کو اللہ کے واسطے آزاد کیا۔ حضرت یہ نمونے ہیں اقتداء کیلئے اب یہ سوچو کہ ہم میں ان حضرات سے زیادہ کون سی فضیلت ہے جو غصہ میں آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ (الھوی والھدیٰ ج ۱۹)

دولت کی بے وفائی

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں

رضینا قسمته الجبار فینا — لنا علم وللا عداء مال
فان المال یفنی عن قریب — وان العلم باقٍ لایزال

یعنی مال تو فنا ہو جائے گا۔ اور علم ہمیشہ باقی رہے گا۔ (نسیان النفس ج ۱۹)

حقیقت علم

علم سے مراد یہ نہیں کہ قال در اصل قول بود جانتا ہو بلکہ علم ایک نور ہے جس کی نسبت خداتعالیٰ فرماتے ہیں وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِىْ بِهٖ فِى النَّاسِ

اور اس نور کے ہوتے ہوئے قلب کی یہ حالت ہوتی ہے کہ

موحد چہ برپای ریزی زرش — چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید وہراسش نباشد زکس — ہمیں ست بنیاد توحید وبس

اگر چاروں طرف سے اس کو تلواروں میں گھیر لیا جائے تب بھی اس کے دل پر ہراس نہیں ہوتا۔

(نسیان النفس ج ۱۹)

کمال معرفت

علم کامل سے معرفت کامل ہوتی ہے وہ جانتا ہے کہ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔ اس لئے گھبراتا نہیں اور سمجھتا ہے کہ یہ میرے لئے علاج اور کفارہ سیئات ہو رہا ہے نیز اس میں یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم خدا کے ہیں اپنے نہیں ان کو اختیار ہے کہ جس حالت کو ہمارے لئے مناسب سمجھیں۔ (نسیان النفس ج ۱۹)

رحمت حق بہانہ می جوید

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ شب کے وقت گھر میں چراغ گل ہوگیا تو حضورؐ نے فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت عائشہؓ فرمانے لگیں کہ حضورؐ! یہ بھی کوئی مصیبت ہے یعنی حضرت عائشہؓ کو یہ معلوم تھا کہ انا للہ مصیبت کے وقت پڑھا جاتا ہے لیکن ان کو اس واقعہ کے مصیبت ہونے میں تامل تھا۔ کیونکہ ظاہراً یہ واقعہ ایک معمولی بات تھی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جو بات مومن کو ناگوار ہو وہ مصیبت ہے اور چراغ کے گل ہونے سے جبکہ قصد نہ ہو ناگواری ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ بھی مصیبت ہوئی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوا ہوگا کہ خدا نے اپنے بندوں کو ثواب عطا فرمانے کے کیسے معمولی معمولی طریقے رکھے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ۔ رحمت حق بہانہ می جوید

اور اس سے بڑھ کر لیجئے حدیث شریف میں ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی کوئی چیز جیب میں رکھ کر بھول جائے اور ادھر ادھر اس کو تلاش کرے تو اس تلاش کرنے میں جو پریشانی اس کو ہوگی خدا تعالیٰ اس پر بھی ثواب عطا فرمائیں گے اور کفارہ سیئات فرمائیں گے۔
بالکل ایسی حالت ہے کہ جیسے ہمارا چہیتا بچہ ہو کہ اس کے چلنے پھرنے اٹھنے بیٹھنے حتیٰ کہ گرنے پڑنے پر بھی ہم کو پیار آتا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ بھی ہم کو ہر ہر فعل پر ثواب عطا فرماتے ہیں مالم یکن معصیۃ وعناداً تو انا للہ جو سکھلایا گیا ہے اس لئے کہ اس کے ذریعے سے تخفیف حزن ہو کیونکہ جب اس کو پڑھے گا تو اس مضمون کی یاد تازہ ہوگی کہ ہم خدا کی مِلک ہیں وہ ہمارے مالک ہیں اور مالک کو اختیار ہے کہ ہم میں جو چاہیں تصرف کریں اور اس کا مخفف حزن ہونا ظاہر ہے۔ دوسرے اس خیال کے تازہ ہونے سے خدا تعالیٰ سے محبت بڑھتی ہے اور محبت کا خاصہ ہے کہ اس کی بدولت سخت سے سخت مصیبت بھی ہلکی ہوجاتی ہے۔ از محبت تلخہا شیریں شود

(نسیان النفس ج ۱۹)

نا اتفاقی کا بڑا سبب

آج کل بڑے زور سے اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہم لوگوں میں اتفاق رہے اس کے لئے تقریریں ہوتی ہیں۔ اخباروں میں تحریری مضامین بھیجے جاتے ہیں جلسے کئے جاتے ہیں لیکن جو نا اتفاقی کی جڑ ہے یعنی زبان۔ اس کے کاٹنے کی آج تک کسی کو فکر نہیں۔

صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ نا اتفاقی کا بڑا سبب ہم لوگوں کی زبان ہے جس کو لگام ہی نہیں جو چاہا کہہ دیا جس کو چاہا کہہ دیا۔ یہ ظالم اس قدر چلتی ہے کہ جس کی حد نہیں اور پھر غضب یہ کہ بے حیا کبھی تھکتی بھی نہیں دوسرے اعضاء مثلاً سر، آنکھ، کان، ہاتھ، پیر جب ان سے ضرورت سے زیادہ کام لیا جاتا ہے تو تھک جاتے ہیں لیکن زبان کسی وقت بھی تھکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اس لئے حدیث میں آیا ہے کہ جب صبح ہوتی ہے تو تمام اعضاء زبان سے خوشامد کر کے کہتے ہیں کہ تو ٹھیک رہنا اگر تو درست رہی تو ہم بھی درست رہیں گے اور اگر تو بگڑی تو ہم سب بھی بگڑ جائیں گے۔ (نسیان النفس ج ١٩٢)

اسی طرح اگر مصیبت میں کسی کو گرفتار دیکھتے ہیں اس کو اسی شخص تک محدود سمجھتے ہیں حالانکہ سمجھنا چاہیے۔ کہ اس پر مصیبت کیوں مسلط ہوئی۔ ظاہر ہے کہ گناہوں کی وجہ سے تو ہم کو بھی گناہوں سے بچنا چاہیے اسی لئے حدیث میں ہے کہ جب کسی کو مبتلائے مصیبت دیکھو تو کہو **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ عَافَانِىْ مِمَّا ابْتَلَاكَ وَفَضَّلَنِىْ عَلٰى كَثِيرا مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيْلًا.** اس میں بھی تذکیر ہے احتمال ابتلاء کی اور اسی میں تنبیہ اجمالی ہے۔ اسباب ابتلاء کی کہ معصیت ہے اسی پر یہ شکر سکھلایا کہ احتمال تھا کہ اسی معصیت کے سبب شاید ہم بھی مبتلا نہ ہو جائیں لیکن یہ دعا آہستہ پڑھے کہ مصیبت زدہ کی دل شکنی نہ ہو جیسا کہ دوسری جگہ فرماتے ہیں **لا تظهر الشماتة لاخيك** بعض دوسرے کے مصائب کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کو ڈرنا چاہیے کیونکہ مقتضی تو ہم میں بھی موجود ہیں۔

مصیبت زدہ پر طعن

بعض لوگ وہ ہیں کہ دوسرے کی مصیبت پر افسوس تو کرتے ہیں لیکن طعن کے طور پر اس کی بابت اسی حدیث میں ہے فیرحمہ اللہ ویبتلیک یعنی ہنسو مت شاید بجائے اس کے تم مبتلا ہو جاؤ اسی کو کہتے ہیں۔

نہ خواہندہ بردر دیگراں   بشکرانہ خواہندہ ازدرمراں

یعنی اگر اور کچھ نہیں تو سائل کو اسی شکر میں دیدو کہ تم مانگنے نہیں گئے تو یہ شکر اسی احتمال پر تو ہے کہ شاید ہم ہی اپنی معاصی کے سبب اس حالت کو پہنچ جائے۔

نماز اور انتظار نماز

امام صاحب نے اس کا راز سمجھا ہے اور اس کو اس طرح بیان فرمایا ہے **لان یکون**

اکلی کلہ صلوۃً احب الی من ان یکون صلوتی کلھا اکلا یعنی میرا کھانا نماز بن جاوے یہ اس سے بہتر ہے کہ نماز کھانا بن جاوے۔ یعنی نماز کے انتظار میں کھانا کھانا نماز ہی کے حکم میں ہے کیونکہ حدیث میں ہے **لایزال احدکم فی الصلوٰۃ ماانتظر الصلوٰۃ** . یعنی نماز کا انتظار بھی ثواب کے اعتبار سے نماز کے برابر ہے۔ تو اب جو شخص اس حالت میں کھانا کھا رہا ہے کہ دل نماز کی طرف لگا ہوا ہے اس کو کھانے میں بھی نماز کا ثواب مل رہا ہے۔ اور یہی راز ہے اعتکاف کی فضیلت کا۔ کیونکہ روح اعتکاف انتظار صلوٰۃ ہی ہے۔ معتکف کو ہر وقت نماز کا ثواب ملتا ہے۔ کیونکہ وہ نماز جماعت ہی کی پابندی کیلئے معتکف ہوا ہے۔ اسی لئے اعتکاف کے لئے مسجد جماعت شرط ہے۔ جس مسجد میں جماعت نہ ہوتی ہو وہاں اعتکاف جائز نہیں پس نماز کے اندر دل اٹکا ہوا ہو۔ اور کھانا کھا رہا ہو تو اس کو نماز کا ثواب اس وقت بھی ملے گا۔ اور اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور دل کھانے میں اٹکا ہو اہو تو اس کی نماز کھانا ہو جائے گی۔ وہ گویا نماز میں کھانا کھا رہا ہے۔ پس شریعت نے کھانے کو نماز سے مقدم نہیں کیا بلکہ وہ آپ کے کھانے کو نماز بنانا چاہتی ہے نماز کو کھانا بنانا نہیں چاہتی۔

حاجی صاحب علماء کو ہجرت سے منع کرتے تھے تاکہ ہندوستان میں علمی فیض بند نہ ہو جائے وہ بے چارے ہندوستان ہی کی قید میں رہتے ہیں اور ہجرت نہیں کرتے اس کے متعلق حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ دل بمکہ جسم بہندوستان بہ ازانکہ جسم بمکہ ودل ہندوستان۔ یعنی دل مکہ میں اٹکا رہے اور جسم ہندوستان میں ہو یہ اس سے بہتر ہے کہ جسم تو مکہ میں ہو اور دل ہندوستان میں۔ کیونکہ جو شخص مکہ کے اشتیاق میں رہے وہ گویا ہر وقت مکہ ہی میں ہے گو بظاہر ہندوستان میں ہو اور جو شخص بظاہر مکہ میں ہو اور دل ہندوستان میں اٹکا ہوا ہو وہ مکہ میں نہیں۔ بلکہ ہندوستان ہی میں ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے جو ظاہر میں بہت اچھے تھے اور مکہ میں ہجرت کر کے رہتے تھے مگر ان میں یہ مرض تھا کہ ہندوستان کو بہت یاد کرتے تھے۔ چنانچہ مرض الموت میں ان پر بے ہوشی طاری ہوئی تو بار بار زبان سے یہ نکلتا تھا کہ ہندوستان لے چلو۔ خدام کو بڑی پریشانی ہوئی کہ مکہ سے ہندوستان کیونکر لے چلیں لوگ تو مکہ میں مرنے کی تمنا کرتے ہیں ہم اپنے ہاتھوں ان کو یہاں سے کیونکر نکال دیں پھر ان کی حالت سفر کے قابل نہ تھی مگر ان کا بار بار یہی اصرار تھا

اور جان نہ نکلتی تھی۔ بعضے خدام ذہین تھے انہوں نے یہ کیا کہ ان کے پلنگ کو ایک کمرہ سے دوسرے کمرہ میں لے گئے اور کہا حضرت ہندوستان آ گیا۔ پس یہ سنتے ہی آنکھیں کھل گئیں اور فوراً انتقال ہو گیا۔ گویا وہ اپنے نزدیک ہندوستان میں مرے پھر اس حالت میں ہجرت کرنے سے کیا نفع ہوا۔ امام صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے حدیث ابدء وابالعشاء قبل العشاء کا یہی راز سمجھا ہے کہ جو شخص کھانا نماز سے پہلے کھائیگا اس کا دل نماز میں اٹکا رہے گا اس حالت میں وہ کھانا بھی نماز میں داخل ہوگا اور جو شخص نماز کھانے سے پہلے پڑھے گا اس کا دل کھانے میں اٹکا رہے گا تو اس کی ساری نماز کھانا بن جائے گی۔ پس اس تعلیل سے یہ مستفاد ہوا کہ یہ اس شخص کیلئے ہے جس کو شدت سے بھوک لگی ہو کہ وہ اگر نماز پہلے پڑھیگا تو اس کا اشتیاق کھانے ہی کی طرف رہے گا ہر شخص کیلئے نہیں مگر ہر حال میں اس سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ شریعت نے بھی یکسوئی کا اہتمام کیا ہے اگر کامل یکسوئی نہ ہو تو بقدر ضرورت تو ہونا چاہیے۔ اسی لیے مجھے اس بیان کیلئے فی الجملہ یکسوئی کا انتظار تھا۔ (اصلاح ذات البین ج ۱۹)

انگریزی تعلیم کی ممانعت کا الزام

ایک عہدہ دار صاحب نے جو کہ ایک تقریب میں ہمارے یہاں مہمان تھے میرے بچپن میں علماء پر اعتراض شروع کیا کہ انہوں نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا۔ انگریزی پڑھنے سے منع کرتے ہیں اور حکومت کے عہدہ لینے سے روکتے ہیں۔ حالانکہ عہدوں ہی سے مسلمانوں کی عزت ہے اور وہ بغیر انگریزی کے حاصل نہیں ہو سکتے۔ اول اول تو میں نے صبر کیا خاموش رہا۔ کیونکہ وہ معترض صاحب مہمان تھے۔ مگر جب وہ اس سلسلہ کو دراز ہی کرتے رہے تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا صاحب مجھے آپ کی باتوں پر صبر کرتے ہوئے بہت دیر ہو گئی ہے۔ مگر آپ بات کو بڑھاتے ہی چلے جاتے ہیں اس لئے اب مجبوراً میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ مجھے اس وقت اس سے تو بحث نہیں کہ مسلمانوں کی ترقی انگریزی پڑھنے پر موقوف ہے یا نہیں۔ فرض کر لیجئے کہ اسی پر موقوف ہے اور بدوں اس کے مسلمانوں کو ترقی نہیں ہو سکتی مگر اس پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے انگریزی نہ پڑھنے کا الزام آیا علماء پر لگانا صحیح ہے یا غلط۔ سو میں پوچھتا ہوں کہ کیا علماء صرف انگریزی ہی سے منع کرتے ہیں یا علم دین حاصل کرنے کا حکم بھی

دیتے ہیں۔ اب بتلایئے کسی اور بات سے بھی منع کرتے ہیں۔ یقیناً وہ بہت سی باتوں سے منع کرتے ہیں مثلاً جھوٹ بولنے غیبت کرنے اور کسی کا حق دبانے۔ مسلمان انگریزی علماء کے منع کرنے سے نہیں پڑھتے تو ان کے کہنے سے علم دین کیوں نہیں پڑھتے۔ اگر یہ مولویوں کا اثر ہوتا تو دوسری باتوں میں بھی تو ہوتا۔ صرف اسی ایک بات میں کیوں اثر ہوا۔

اصل بات یہ ہے کہ مسلمان انگریزی پڑھنے میں دوسری قوموں سے اپنی سستی کی وجہ سے پیچھے ہیں کہ ان سے محنت نہیں ہوتی یا افلاس کی وجہ سے کہ ان کے پاس انگریزی تعلیم کے مصارف کیلئے رقم نہیں۔ علماء کے منع کرنے سے کوئی نہیں رکتا (الا ماشآء اللہ وھونا در والنادر کالمعدوم ۱۲) مگر آجکل تو الزام ملنے میں علماء کی وہی حالت ہے۔ جیسے ایک بھٹیاری کی حکایت ہے گو حکایت تو فحش ہے۔ مگر مولانا نے اس سے بھی زیادہ فحش حکایتیں مثنوی میں لکھی ہیں۔ اور ان سے علوم نکالے ہیں اس لئے بیان کرتا ہوں۔

قصہ یہ ہے کہ ایک سپاہی سرائے میں ٹھہرا اور بھٹیاری کو کھانا پکانے کے لئے جنس دی۔ بھٹیاراں اکثر جنس چرایا کرتی ہیں اس لئے سپاہی اس کے پاس مسلط ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ آنکھ بچا کر کچھ چراؤں مگر سپاہی نے موقع ہی نہ دیا۔ اب اس نے یہ تدبیر کی کہ جب سپاہی کھانا کھانے بیٹھا تو ساتھ میں اپنے لڑکے کو بھی بٹھا دیا کہ تو بھی کھالے۔ شریف آدمی کو دسترخوان پر سے کسی کا اٹھانا گوارا نہیں ہوتا۔ اس لئے سپاہی خاموش ہو گیا۔ اتفاق سے بھٹیاری کی ریح زور سے صادر ہوئی اس نے خفت اتارنے کو اپنے بچے کے ایک دھپ لگایا کہ دور موے کھانا کھاتے ہوئے یہ کیا کرتا ہے۔ سپاہی کو انتقام کا موقع ملا اس نے قصداً ریح صادر کی۔ اور زور سے ایک چپت لڑکے کے رسید کیا اور کہا یاد رکھ کریگا کوئی مگر پٹے گا تو ہی۔ اس سے بھٹیاری کو بھی بتلا دیا کہ تیری حرکت کو میں سمجھ گیا ہوں بس یہی حال آج کل کے مسلمانوں نے علماء کا کر رکھا ہے کہ کریگا کوئی مگر الزام انہی پر ہوگا۔ انگریزی نہ پڑھنے کا الزام بھی مولویوں پر اور مسلمانوں کے تنزل و افلاس کا الزام بھی علماء پر اور جاہلوں کے مرتد ہونے کا الزام انہی پر، مسلمانوں کی نا اتفاقی کا الزام بھی انہی پر۔

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ مولویوں نے مسلمانوں میں تفریق کر دی ہے ایک بات کو بعض مولوی جائز کہتے ہیں بعض ناجائز۔ ایک جگہ وعظ کہنے کا اتفاق ہوا جس میں گیارہویں کی رسم

سے منع کیا۔ وعظ کے بعد ایک داروغہ صاحب جو گیارہویں کے معتقد تھے کہنے لگے کہ صاحب علماء کے اختلاف نے ہم کو پریشان کردیا آپ تو گیارہویں کو منع کرتے ہیں اور فلاں مولوی صاحب جائز کہتے ہیں۔ ہماری بڑی مشکل ہے کس کی بات کو مانیں۔ میں نے کہا داروغہ صاحب۔ میں اس بات کے جواب سے پہلے آپ سے ایک سوال کرتا ہوں کہ جس طرح آپ ہم سے یہ کہہ رہے ہیں کہ فلاں مولوی صاحب گیارہویں کو جائز کہتے ہیں۔ ایمان سے بتلایئے کبھی آپ نے ان سے بھی کہا کہ فلاں مولوی صاحب اس کو ناجائز بتلاتے ہیں اب ہم کیا کریں؟ بس اب تو کھوئے گئے اس کا ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا۔ میں نے کہا داروغہ صاحب اتنا تو دروغ نہ بولو۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کو تحقیق مقصود نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آپ کے دل کو لگتی ہے اور جس کی بات خواہش نفس کے خلاف ہوتی ہے اس پر اعتراض ہے اگر تحقیق مطلوب ہوتی تو جو اعتراض آپ یہاں کررہے ہیں کبھی وہاں بھی تو کیا ہوتا۔ بے چارے تھے منصف اپنی غلطی کا اقرار کرلیا۔ (اصلاح ذات البین ج ۱۹)

خطبۃ الوداع کا اختلاف

الوداع کے خطبہ میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب مولویوں کے اختلاف نے تنگ کردیا۔ اس کا بھی یہی جواب ہے کہ یہ اعتراض دونوں جگہ کیوں نہیں کیا جاتا یہ تو الزامی جواب ہے اور تحقیقی جواب یہ ہے کہ پہلے لوگ تو رمضان کے عاشق تھے ان کو واقعی رمضان کے جانے کا رنج ہوتا تھا۔ اس لئے ان کو الوداع کے خطبہ کا حق تھا مگر اب تو لوگ دوسرے معنی میں رمضان کو الوداع کرتے ہیں یعنی رخصت دور دور۔ حالت یہ ہے کہ زبان سے تو الوداع کا خطبہ ہو رہا ہے۔ ظاہر میں رو رہے ہیں اور اب تو کوئی روتا بھی نہیں۔ بلکہ منہ تک بھی نہیں بناتے بلکہ دل میں خوش ہیں کہ اچھا ہوا رمضان ختم ہوگیا۔ اب خوب کھائیں پئیں گے۔

صاحب! الوداع کا خطبہ پڑھ سن کر کچھ تو غم زدوں کی سی حالت بنائی ہوتی مگر یہاں تو یہ مستیاں ہیں کہ شیر کے لئے آٹھ آنہ سیر اور بارہ آنہ سیر دودھ خریدتے ہیں۔ ارے غمزدوں کی یہی صورت ہوتی ہے جس کے سر پر غم کا پہاڑ ٹوٹا ہو کیا اس کو شیر کے اہتمام کی بھی سوجھتی

ہے ہم تو جب جانیں کہ کسی کا باپ وداع ہو جائے اور اس کے مرجانے پر شیر پکا کر کھائے۔ توبہ! یہاں تو اگر کوئی اس کا نام بھی لے دے تو اس کو کچا کھا جائیں کہ کمبخت! ہمارا تو باپ مرے اور تو ہمیں شیر کی ترغیب دلاتا ہے۔ اگر رمضان کے جانے کا رنج ہوتا تو یہاں بھی یہی حالت ہوتی۔ بہرحال ممانعت کے وجوہ موجود مگر مانع پر اس کا پھر بھی الزام۔ کہ مولویوں کے اختلاف نے عوام میں اختلاف پیدا کر دیا اس لئے اس کی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی کسی سے نزاع نہ کرے سب اتفاق واتحاد سے رہیں۔ (اصلاح ذات البین ج۱۹)

بددعا بغلبہ بشریت

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اَغْضِبُ كَمَا يَغْضِبُوْنَ فَاَيَّمَا رَجُلٍ اٰذِيْتُهٗ اَوْشَتَمْتُهٗ اَوْ كعنتُهٗ فَاجْعَلْهَا لَهٗ صَلٰوةً وَزَكٰوةً وَقُرْبَةً تُقَرِّبُهٗ بِهَا اِلَيْک

(اے اللہ! میں بشر ہوں مجھے بھی غصہ آجاتا ہے۔ جیسا اوروں کو غصہ آتا ہے تو جس شخص کو (جوش غضب میں) میں کچھ ایذاء دوں یا برا بھلا کہوں یا بددعا کروں تو ان سب کو اس کے حق میں رحمت خاص اور سبب تذکیہ اور موجب قربت بنادیجئے جس سے آپ اس کو اپنا مقرب بنالیں)۔

سبحان اللہ! کیا رحمت ہے فرماتے ہیں کہ اے اللہ میری بددعا بھی دعا ہی ہو کر لگے تو آپ کی عجیب شان ہے کہ غضب میں بھی آپ رحمت ہی فرماتے ہیں اس پر شاید کوئی خوش ہو کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا بھی دعا ہو کر لگتی ہے تو اب جتنی وعیدیں حضورؐ نے بیان فرمائی ہیں سب سے بے فکری ہے کیونکہ آپ کی وعید میں بھی عید ہوتی ہے ذرا کوئی اردو خوان جو قرآن وحدیث ومسائل فقہ کا ترجمہ دیکھ کر علماء سے اپنے کو مستغنی سمجھتے ہیں اس اشکال کا جواب تو دیدیں انشاء اللہ منہ ہی تکتے رہیں گے اور کچھ جواب نہ آئے گا۔ بات یہ ہے کہ محض ترجمہ دیکھنے سے مضمون کی حقیقت منکشف نہیں ہوتی اور جب تک حقیقت منکشف نہ ہو۔ اس وقت تک اشکالات کا جواب بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ چنانچہ آپ نے اردو کتابیں تو دینیات کی بہت پڑھی ہوں گی مگر ذرا اس کا جواب دیجئے۔ صاحبو! حقیقت کا انکشاف محققین کے پاس رہ کر ہوتا ہے لیجئے میں اس شبہ کا جواب دیتا ہوں۔ جواب یہ ہے کہ یہ حدیث انہی بددعاؤں کے متعلق ہے جو غلبہ بشریت سے بحالت غضب نکل جائیں۔ چنانچہ خود شروع میں اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ کا لفظ خود اس پر دال ہے کہ یہ ان بددعاؤں کے متعلق ہے جن کا منشاء بشریت ہے۔ (الانسداد للفساد ج۱۹)

تعلیم نسواں

تعلیم کا اصل مدار اہتمام پر ہے تو آپ بھی اہتمام کیجئے اور پردہ میں رکھ کر ہی اپنی عورتوں کو پڑھایئے۔ یقیناً تعلیم یافتہ ہو جائیں گی۔ آخر ایک زمانہ میں مسلمانوں کی عورتیں بھی تو بہت تعلیم یافتہ ہو چکی ہیں۔ حالانکہ اس وقت بھی پردہ موجود تھا۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اسلامی عروج کے زمانہ میں کتنی عورتیں محدث اور مفسر اور ادیب عالم ہوئی ہیں۔ ۱۲ جامع)

مگر عورتوں کو پردہ میں رکھ کر بھی صرف دینیات کی تعلیم دینا چاہیے جغرافیہ اور تاریخ نہ پڑھانا چاہیے ورنہ ان کو بھاگنے کے راستے معلوم ہو جائیں گے پھر وہ گھر سے ایسی جائیں گی کہ پتہ بھی نہ دیں گی۔

غرض! پردہ کی وجہ سے عورتوں کی نااتفاقی شدید تو نہیں ہوتی مگر مدید ہوتی ہے کہ ان میں باہم کشیدگی ہوتی ہے تو زمانہ دراز تک اس کا سلسلہ چلتا ہے نیز ان میں ایک ایسی بری عادت ہے کہ جب کسی بات پر لڑائی ہوگی تو پہلے مردے اکھیڑے جاتے ہیں۔ مردوں میں یہ مرض کم ہے مگر عورتیں جن باتوں کی صفائی بھی کر چکتیں ہیں دوبارہ لڑائی کے موقعہ پر پہلی باتوں کو پھر دہراتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت کا معاملہ اگر فی نفسہٖ خفیف بھی ہو تو پہلی باتوں کی یاددہانی سے سنگین بن جاتا ہے۔ خصوصاً جبکہ یاددہانی بھی دل خراش الفاظ سے جس میں عورتوں کو خاص ملکہ ہے۔ یہ طعن کے موقعہ پر اپنے احسان کو بھی ایسے عنوان سے جتلاتی ہیں جس سے دوسرے کا کلیجہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ہمارے قصبہ میں ایک خاندان میں نکاح کی تقریب تھی اور صاحب تقریب کی بھاوج بہت مفلس تھی۔ مگر اس نے قرض اور ادھار کر کے اس موقعہ کے لئے جوڑے تیار کئے اور صرف دلہن ہی کا جوڑا نہیں بلکہ سب گھر والوں کیلئے جوڑے تیار کئے گو وہ بڑھیا تو نہ تھے مگر نام کرنے کو کافی تھے۔ چنانچہ اس نے امید سے زیادہ کام کر کے دکھلا دیا پھر کسی موقعہ پر بھاوج اور نند میں تکرار ہوا۔ تو بھاوج کیا کہتی ہے کہ ”ارے میں تو وہ ہوں کہ میں نے نہ ہوتی میں بھی تمہارے وقت میں سارے خاندان پر کفن ڈالا تھا“ دیکھئے! اس نے جوڑے دینے کو کس لفظ سے ادا کیا کہ ساری ڈکشنری بھی ایسا لفظ نہ نکال سکتی مگر ان کی لڑائی باتوں ہی باتوں میں ہوتی ہے اس سے آگے یہ کچھ نہیں کرسکتیں۔ (الانسداد للفساد ج ۱۹)

اتفاق کی جڑ

میں سچ کہتا ہوں کہ آجکل جو تقریروں میں کہا جاتا ہے کہ اتفاق کرو، اتفاق کرو۔ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ سب میرے ساتھ اتفاق کریں ہر شخص اپنی رائے پر اتفاق کی دعوت دیتا ہے اور اس صورت میں قیامت تک اتفاق قائم نہیں ہوسکتا۔ بلکہ قیام اتفاق کی صورت یہ ہے کہ ہر شخص اس کیلئے آمادہ ہو کہ اگر کوئی میرا اتباع نہ کریگا تو میں اس کا اتباع کرلوں گا (بشرطیکہ خلاف شرع کام نہ کرے) حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ آجکل لوگ اتفاق پر تو بہت زور دیتے ہیں مگر اس کی جڑ کو نہیں دیکھتے۔ اتفاق کی جڑ تواضع یہ ہے ایک حجرہ نشیں صوفی کی تحقیق ہے جس کے سامنے تمام تحقیقات فلسفیہ گرد ہیں۔ (الانسداد للفساد ج ۱۹)

قرآن حکیم سے سائنسی مسائل کا استنباط

آجکل بہت سے قرآن مجید دشمن دوست نما پیدا ہوئے ہیں۔ جو قرآن مجید میں سے سائنس کے مسائل درجہ دلالت میں ثابت کرتے ہیں یہ سخت دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ تو فخر کے طور پر کہتے ہیں کہ جو مسئلہ اہل یورپ اور سائنس دانوں نے آج سمجھا ہے وہ قرآن مجید میں تیرہ سو برس پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکل چکا ہے۔ لیکن فی الواقع

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست　　　حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

خدا کو اور خدا کے کلام کو اس خیر خواہی کی ضرورت نہیں۔ یاد رکھو! اس مسلک میں کئی طرح کی دشمنی ہے اور مولوی لوگ ان مسائل کی تحقیق اور قرآن مجید کے ساتھ زبردستی چسپاں ہوسکنے کی تقریر سے بے خبر نہیں ہیں۔ چنانچہ میں حالانکہ ایک ادنیٰ طالب علم ہوں مگر خود میرے پاس اس کا بڑا دفتر ذہن میں موجود ہے لیکن ان ہی خرابیوں کے سبب قرآن مجید سے ان کو کبھی متعلق نہیں کیا جاتا بقول بزرگے

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز　　　ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

ہمارے زمانہ کے یہ محققین تو یوں سمجھتے ہیں کہ ان ملانوں کو خبر نہیں ہے۔ صاحبو! ان مدعیوں کو تو ایک ہی خبر ہے کہ یہ مسائل قرآن مجید سے اس طرح نکلتے ہیں اور ملانوں کو اس کی بھی خبر ہے اور اس میں جو مضرت ہے اس کی بھی خبر ہے۔ چنانچہ اہل نظر و تحقیق کے نزدیک ایک خرابی جو اس کیلئے لازم غیر منفک ہے یہ ہے کہ جس فن کی وہ کتاب وہ مسئلے اس فن کے نہیں۔

طب کی کتاب اگر کوئی لکھے اور اس میں ایک فصل تو لکھے امراض راس کی اور آگے اس کے فعل فعلا فعلوا کی بحث لکھے پھر دوسری فصل لکھے۔ امراض بطن کی اور تیسری فصل میں یفعل یفعلان کی بحث لکھ دے تو یہ کتاب کیا ہوگی۔ آدھی میزان الطب اور آدھی میزان الصرف اس کو کہا جائیگا۔ پھر اس کو اگر اہل علم کے روبرو پیش کیا جائے تو اس کتاب کو کون پسند کریگا۔ تو کیا قرآن مجید کو آپ ایسا بنانا چاہتے ہیں۔ کیا یہ قرآن مجید کے لئے نقص نہ ہوگا۔ دوسرے جو مسائل قرآن مجید سے یہ لوگ استنباط کرتے ہیں اور جن کے اوپر بڑا فخر و ناز ہے وہ کوئی وقیع مسائل بھی نہیں سب ممد و معاون شکم و دہن کے ہیں تو جن کے نزدیک شکم و دہن اور ان کی خدمت بڑی چیز ہے ان کے نزدیک یہ مسائل بیشک مہتمم بالشان اور مایہ فخر و ناز ہونگے۔ ہم تو ان کو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ اور اگر وہ ایسے مسائل ہوں جن میں شکم و دہاں کی بھی امداد نہیں تو پھر تو بالکل ہی لغو ہونگے۔ کیونکہ نہ آخرت کیلئے مفید نہ دنیا کے لئے نافع۔ (الاتفاق ج۱۹)

محبوبیت کا باطنی سبب

ایمان و عمل صالح کی وجہ سے محبت کیوں ہوتی ہے۔ اصل وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں خاصیت ہی یہ رکھ دی ہے۔ جیسے بعض دوائیں بالخاصہ موثر ہوتی ہیں۔ ایسے ہی یہ بھی ہے لیکن یہ زمانہ ہے تحقیقات کا۔ اس لئے اس پر اکتفا نہ کیا جائیگا۔ اس لئے میں اس کی دو وجہ بیان کرتا ہوں۔ ایک تو راز ظاہری اور ایک باطنی۔ باطنی کو اول بیان کرتا ہوں حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب بندہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ تمام ملائکہ میں پکار دو کہ فلاں بندہ سے ہم کو محبت ہے تم بھی اس کو دوست رکھو پھر حکم ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی پکار دو۔ اگر کوئی کہے کہ ہم کو کسی کی نسبت بھی اعلان نہیں۔

سنیئے بات یہ ہے کہ فرشتوں کا اعلان قلوب میں ہوتا ہے اور وہ یہی کہ اس کی محبت قلوب میں پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ زمین پر یہ اعلان کیا جاتا ہے۔ فیوضع له القبول فی الارض پس وہ سب کی نظروں میں مقبول ہوتا ہے اس کے بعد حضور نے استشہاد میں یہ آیت پڑھی اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا. حضور کا یہ آیت پڑھنا صریح دال ہے اس پر کہ ودًّا یہاں پر مصدر مبنی للمفعول ہے۔ اور میرا اس مضمون کو اس آیت سے استنباط کرنا صحیح ہے۔ دوسرا راز باطنی یہ ہے کہ محل محبت کا قلب ہے اور قلوب حق

تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں جب وہ قلوب میں کسی کی محبت پیدا کرنا چاہیں گے بالاضطرار اس کے سامنے جھک جانا ہی پڑیگا۔ اس کے سامنے پھر کسی کا حوصلہ نہیں ہے کہ ٹیڑھا چلے۔ ایک مقام پر ایک بزرگ سے کوئی شخص الجھا۔ دونوں طرف خشک خشک جواب ہوئے ان بزرگ کے پاس سے وہ شخص پچاس قدم بھی نہ گیا ہوگا کہ دل میں ایک چوٹ سی لگی اور قدم آگے نہ بڑھا۔ اور واپس آ کر ہاتھ جوڑے کہ خدا کے واسطے میرا قصور معاف کردو۔ اور یہ کہا کہ خدا جانے مجھ کو کیا ہوگا کہ میں قدم آگے بڑھاتا تھا۔ اور وہ پیچھے کو ہٹتا تھا۔ وہ بات کیا تھی یہ نہیں کہ ان بزرگ نے کچھ تصرف کیا ہو۔ بلکہ اس پر ایک سرکاری پیادہ مسلط ہوگیا۔ اور کشاں کشاں اس کو پکڑ لیا۔ غرض! ان بزرگ نے جب قصور معاف کیا اس وقت وہ گیا اس سے معلوم ہوا کہ قلب میں کوئی بات خدا تعالیٰ پیدا کر دیتے ہیں۔ غرض راز باطنی تو اس کا یہ ہے۔ (الاتفاق ج ۱۹)

محبت کے اسباب ظاہرہ

اور راز ظاہری یہ ہے کہ محبت کے کل تین سبب ہوا کرتے ہیں۔ نوال، کمال، جمال۔ یعنی عطا و احسان سبب محبت کا ہوتا ہے۔ چنانچہ محسن سے اسی بناء پر محبت ہوتی ہے اور عطا ہی میں یہ بھی داخل ہے کہ کسی کی خطا معاف کردی جائے یا کسی کا کام کر دیا جائے کسی کی بیہودگی پر درگزر کی جائے۔ کبھی کمال کی وجہ سے محبت ہوتی ہے خواہ علمی ہو یا عملی یا اخلاقی۔ مثلاً اہل علم سے محبت اسی واسطے ہوتی ہے کہ ان میں کمال علم ہے اگرچہ اس کے علم سے اپنے کو بھی نفع نہ ہو اور جیسے حاتم کی سخاوت سن کر اس کی طرف ایک میلان ہوتا ہے۔ اور جیسے رستم سے اسی واسطے محبت ہے کہ اس میں شجاعت کا کمال ہے۔ مجھ کو یاد ہے کہ بچپن میں اردو شاہنامہ دیکھا کرتا تھا جب کسی لڑائی کا قصہ آتا تو جی سے تمنا ہوتی تھی کہ خدا کرے یہ لکھا ہو کہ رستم جیت گیا۔ حالانکہ اگر وہ جیت گیا یا ہار جائے تو ہم کو کیا نفع ہے مگر اس کے کمال کی وجہ سے کان اس بات کو نہیں سن سکتے تھے کہ ہار گیا۔

تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اسکے اندر شجاعت کا کمال تھا۔ اس زمانہ میں جو بہت سے واقعات لڑائی کے ہوئے تو مسلمانوں کے غلبہ کو سن کر مسلمانوں کا دل تو خوش ہوتا ہی تھا۔ مگر بہت سے ہنود کو بھی دیکھا کہ وہ ان کے غلبہ کو سن کر خوش ہوتے تھے۔ اس کا سبب بھی وہ ہی محبت ہے۔ ترکوں سے بسبب ان کے کمال شجاعت کے اور اس کے علاوہ ایک سبب

ترکوں سے محبت کا ان کی مظلومیت بھی تھی کہ یہ بھی کمال میں داخل ہے۔ اس لئے کمال یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرے اور جب اس پر ظلم ہو تو مستقل رہے۔ تیسرا سبب محبت کا جمال ہوتا ہے۔ جیسے کوئی حسین وجمیل ہے اس سے بالطبع محبت ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ گورے چٹے کو جمیل نہیں کہتے یہ تو پوست پرستوں کا مذہب ہے کہ ان کے یہاں محبت جمال صورت ہی سے ہے۔ عقلاء کے نزدیک اصلی جمال یہ ہے کہ اخلاق میں تناسب واعتدال ہو اور اسی سے کشش ہوتی ہے قلوب کو اگر اس کے ساتھ صورت بھی کچھ اچھی ہو تو بہت ہی کچھ کشش ہوتی ہے یہ ہیں طبعی اسباب محبت کے۔ (الاتفاق ج ۱۹)

صاحبو! ہر شے کا ایک مصرف ہے رحم اور ہمدردی کا بھی موقع ہے اگر اس موقع پر کی جائیگی تو مدح کے قابل ہوگی۔ ورنہ ہمدردی نہ ہوگی۔ دیکھو! پیار محبت بہت اچھی شے ہے۔ مگر کس کے ساتھ اپنے بچوں کے ساتھ بیوی کے ساتھ۔ اگر کوئی بیہودہ معمول کرلے کہ جب گھر آیا کرے اماں جان کو پیار کیا کرے تو اس کو سب مسخرہ اور بیوقوف اور بے ادب کہیں گے۔

اسی طرح مثلاً باپ کو برخوردار، نور چشم لکھنے لگے تو معیوب ہوگا۔ غرض ہر شے کے اندر اعتدال ہونا چاہیے ورنہ پھر وہ اپنی حد سے نکل کر اپنی ضد میں جا پہنچتی ہے۔ **بقول اھل تحقیق الشئ اذاخرج عن حدود الحق یضد** مثلاً ترحم ہی ہے۔ اس میں اگر اعتدال نہ ہوا مثلاً چوہوں کو نہیں مارا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے آدمیوں کو مارا کیونکہ وہ آدمیوں کو تکلیف دیں گے۔ کیا اچھا رحم ہوا کہ چوہوں پر تو رحم کیا اور اپنی بنی نوع کا نقصان کیا۔ اسلام نے اخلاق کی تعدیل کی ہے۔ یہ تو نوال میں گفتگو تھی۔ اب کمال کو لیجئے۔ بڑا کمال علم ہے شریعت میں اسکے حاصل کرنے کی بہت ہی تاکید ہے۔ سخاوت اور شجاعت بھی کمال ہیں۔ شریعت نے ان دونوں کا بھی ایسا اہتمام کیا ہے کہ کوئی اس کی نظیر نہیں دکھلا سکتا۔ اب رہ گیا جمال! تو اس کا مدار ہے اخلاق پر اس لیے کہ اخلاق جمیلہ میں جو کشش ہے۔ حسن صورت میں اس قدر نہیں ہے اگر کسی میں اخلاق جمیل ہوں اگرچہ ترکیب اعضاء کے قاعدے سے عرفاً وہ حسین نہ ہو۔ مگر اس کے اندر ایک دلربائی چہرہ پر حلاوت اور نور ایسا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے حسینوں میں وہ بات نہیں ہوتی۔

بازاری عورتیں اپنے کو بہت بناتی ہیں مگر چونکہ اخلاق ذمیمہ ان کے اندر ہوتے ہیں اس لئے

چہرہ پر پھٹکار برستی ہے۔ بھولا پن نہیں ہوتا۔ بخلاف عفیف عورتوں کے کہ کیسی ہی میلی کچیلی کالی کولی ہوں۔ مگر انکے اوپر ایک نور اور کشش ہوتی ہے۔ سو اعمال صالحہ میں یہ خاصیت بھی ہے کہ جمال بڑھ جاتا ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ.

مولانا فرماتے ہیں۔

نور حق ظاہر بود اندر ولی   نیک بیں باشی اگر اہل ولی

کسی نے خوب ترجمہ کیا ہے۔

مرد حقانی کی پیشانی کا نور   کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

اور اگر کسی کا ذہن اتنا عمیق نہ ہو اور غایت بلاہت سے وہ حسن متعارف ہی میں جمال کو منحصر سمجھتا ہو تب بھی ظاہر ہے کہ محبوبیت کاملہ کے لئے اس کا مدار ہونا مشروط ہوگا اس حسین الصورت کے حسین السیرت ہونے پر۔ جس سے پھر اصلی مداریت ایمان وعمل صالح ہی کے لئے ثابت رہی ورنہ اگر اس کی سیرت اچھی نہ ہوئی تو بعض کو اس سے محبت ہی نہ ہوگی۔ اور اگر کسی کو ہوگی۔ کامل نہ ہوگی۔ یعنی ضعیف ہوگی۔ یا جلدی زائل ہوجائیگی۔ یعنی جب یہ حسن جاتا رہے گا تو محبوبیت بھی جاتی رہیگی۔ اور حسن سیرت پر جو محبوبیت ہوگی وہ مدت العمر باقی رہے گی۔

علاوہ اس کے اگر اس سے بھی قطع نظر کی جائے تب بھی محبوبیت کے لئے مجموعہ اسباب کا جمع ہونا ضروری نہیں اگر مومن و عامل صالحات میں جمال بھی نہ ہو تب بھی دوسرے اسباب تو قوت کے ساتھ موجود ہیں۔ وہ بھی محبوبیت کیلئے کافی ہیں اور اگر کسی کافر میں محبوبیت پائی جائے تو اگر وہ اخلاق اسلامی میں سے کسی خلق کے پائے جانے سے ہے تب تو اس کا سبب وہی عمل صالح ٹھہرا باقی یہ بات کہ پھر مومن کی کیا تخصیص ہوئی۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ وہ خلق بھی غیر مومن میں اس کمال کے ساتھ ہرگز نہ پایا جائیگا۔ جیسا مومن میں کیونکہ مومن میں اس کا مقتضی مضبوط ہوگا یعنی ابتغاء مرضات حق۔ جس میں تغیر وتبدل نہیں ہوتا۔ بخلاف کافر کے کہ اس کا جو منشاء ہوگا وہ متبدل ہوگا۔ اور اس کے تبدل سے وہ خلق متبدل ہوسکتا ہے پس کمال محبوبیت مومن ہی میں رہی۔ اور اگر اخلاق کے علاوہ اور کوئی امر ہے جیسے حسن صورت وغیرہ تو وہ عام محبوبیت کا سبب نہ ہوگا۔ چنانچہ مسلم ومشہور ہے۔ معشوق من است آنکہ بہ نزدیک تو زشت ست

بخلاف اسباب تعلیم فرمودہ شریعت کے کہ انمیں یہ اثر عام ہے۔ البتہ جس کے مدرکات ہی ٹھیک نہ رہے ہوں یا اس کی کوئی غرض فوت ہوتی ہو اس کا اعتبار ہی نہیں۔ یہ مضمون آئندہ مقصوداً بھی آتا ہے۔ (الاتفاق ج ۱۹)

فضیلت وعظ

حدیث میں آتا ہے کہ جب کہیں اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو فرشتوں کی ایک جماعت وہاں مجتمع ہو جاتی ہے پھر وہ ذاکرین کے اوپر سکینہ نازل کرتے ہیں پھر جب وہ حق تعالیٰ کے پاس چلے جاتے ہیں تو وہاں سوال ہوتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا وہ عرض کرتے ہیں کہ یا اللہ ہم نے ان کو آپ کا ذکر کرتے ہوئے چھوڑا حق تعالیٰ سوال فرماتے ہیں کہ کیا انہوں نے ہم کو دیکھا ہے۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ نہیں یا اللہ انہوں نے آپ کو دیکھا نہیں اگر دیکھ لیتے تو اس سے بھی زیادہ کوشش کرتے پھر سوال ہوتا ہے کہ وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ وہ آپ سے جنت اور آپ کی رضا کو طلب کرتے ہیں اور آپ کی ناراضگی اور جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ گواہ رہو ہم نے ان سب کو بخش دیا۔ اس پر بعض فرشتے کہتے ہیں کہ یا اللہ فلاں شخص تو ذکر کے قصد سے نہ آیا تھا ویسے ہی آکر ان کے پاس بیٹھ گیا تھا ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے اس کو بھی بخش دیا یہ جماعت ایسی نہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا محروم ہو۔ یہ تو حدیث کا مختصر مضمون ہے اور ظاہر ہے کہ وعظ کی مجلس بھی مجلس ذکر ہے اس میں خدا تعالیٰ کے احکام کا ذکر ہوتا ہے اور یہ بھی ذکر اللہ ہی ہے ذکر اللہ فقط تسبیح و تہلیل وغیرہ میں منحصر نہیں صاحب حصن حصین نے اس مسئلہ پر متنبہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں **بل کل مطیع الله فهو ذاکر**، کہ ہر شخص جو خدا کی اطاعت میں مشغول ہو وہ ذاکر ہی ہے۔ (الکمال فی الدین للنساء ج ۲۰)

باکمال عورتیں

ایک حدیث میں بھی ہے **كَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ كَثِير وَلَم يَكمُل مِنَ النِّسَاءِ اِلَّا مَريَمَ بِنتَ عِمرَانَ وَآسِيَةَ اِمرَاَةَ فِرعَونَ وَفَضلُ عَائِشَةَ عَلىٰ النِّسَاءِ كَفَضلِ الثَّرِيدِ عَلىٰ سَائِرِ الطَّعَامِ.**

جس کا حاصل یہ ہے کہ مردوں میں تو بہت لوگ کامل ہوئے لیکن عورتوں میں بجز مریم علیہا السلام اور آسیہ فرعون کی بیوی کے اور کوئی کامل نہ ہوئی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ہے تمام عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید کی فضیلت ہے تمام کھانوں پر۔ اس سے علماء نے حضرت عائشہؓ کا کمال بھی سمجھا ہے کہ وہ کامل ہیں۔

بہرحال اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورتیں کامل ہو بھی سکتی اور اس کا وقوع بھی ہوا ہے گو ان میں کامل افراد بہ نسبت مردوں کے کم ہیں مگر ایک حدیث سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عورتیں کامل ہو ہی نہیں سکتیں۔ وہ حدیث یہ ہے کہ آپ نے ایک بار عورتوں کو خطاب کر کے فرمایا:

مَارَأیتُ من ناقِصَات عَقلٍ وَدِینٍ اَذھَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الحَازِمِ مِن اِحدٰکُنَّ.

ترجمہ: ”میں نے عورتوں سے بڑھ کر کوئی ناقص العقل اور ناقص الدین ایسا نہیں دیکھا جو ہوشیار مرد کی عقل کو جلدی زائل کر دیتا ہوں۔“

اس پر عورتوں نے سوال کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری عقل اور دین میں کیا نقصان ہے؟ آپ نے فرمایا کیا عورتوں کی گواہی مردوں کی آدھی گواہی کے برابر نہیں ہے۔ انہوں نے کہا بے شک۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو ان کی عقل کا نقصان ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر شمار کی گئی ہے اور کیا جب تم کو حیض آتا ہے تو تم نماز روزہ چھوڑ کر نہیں بیٹھ جاتیں۔ انہوں نے کہا بے شک! فرمایا کہ یہ تمہارے دین کا نقصان ہے۔

اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے ناقص ہونے کا جو سبب بیان فرمایا ہے وہ ایسا سبب ہے جس سے کوئی عورت بھی خالی نہیں۔ لہٰذا لازم آتا ہے کہ عورتوں میں کوئی بھی کامل نہ ہو سکے۔ حالانکہ قرآن اور دیگر احادیث سے ان میں بھی کاملات کا وجود معلوم ہوتا ہے۔ یہ اشکال عرصہ سے میرے ذہن میں تھا مگر اس کا کوئی شافی جواب اب تک ذہن میں نہ آیا تھا۔ اسی لئے اس اشکال کو اب تک میں نے کہیں بیان نہ کیا کہ خواہ مخواہ دوسروں کو بھی کیوں پریشانی میں ڈالوں الحمدللہ اس وقت جواب ذہن میں آ گیا اس لئے میں نے اشکال کو بھی بیان کر دیا اور جواب بھی عرض کرتا ہوں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کمال کی دو قسمیں ہیں ایک کمالِ اختیاری ایک کمال غیر اختیاری۔ اسی طرح نقصان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری ایک غیر اختیاری اور انسان مکلف ہے تحصیل کمال اختیاری کا جو

کہ امر مکتسب ہے اور مکلّف ہے ازالہ نقصان اختیاری کا جو اس کی قدرت میں داخل ہے اور کمال غیر اختیاری کی تحصیل اور نقصان غیر اختیاری سے اجتناب کا انسان مکلّف نہیں۔

لَا یُکَلِّفُ اللہُ نَفساً اِلاَّ وُسعَھَا. (اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) لیکن یہ ضرور ہے کہ کمال غیر اختیاری کے حاصل نہ ہونے سے عورتوں کو گناہ نہ ہوگا لیکن گناہ نہ ہونے سے اس کا موجب نقصان نہ ہونا لازم نہیں۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے نہ ہونے سے گناہ نہیں ہوتا۔ لیکن نقصان ضرور ہے (مثلاً ایک آدمی میں طبعاً بزدلی اور خوف بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے وہ جہاد نہیں کر سکتا اس صورت میں اس کو گناہ تو نہیں ہوگا لیکن یہ نقصان ضرور ہے اور مجاہدین کے برابر وہ شخص نہیں ہو سکتا۔ ۱۲)

پس قرآن میں جو عورتوں کو کامل کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کمال مکتسب کا درجہ اس کو حاصل ہو سکتا ہے اور حدیث میں جو ان کو ناقصات الدین کہا گیا ہے اس میں نقصان غیر اختیاری کو بیان کیا گیا ہے اور کمال مکتسب ونقصان غیر اختیاری کے جمع ہونے میں کوئی اشکال نہیں۔ اب یہ سوال رہا کہ دوسری حدیث میں جو فرمایا گیا ہے کہ مردوں میں تو بہت کامل ہوئے اور عورتوں میں بجز مریم علیہا السلام وحضرت آسیہ کے اور کوئی کامل نہیں ہوا۔ اس سے در یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کمال کا وہی درجہ تھا جو مردوں میں تھا (کیونکہ جس کمال کو مردوں کے لئے ثابت کر کے عورتوں سے اسکی نفی کی گئی ہے۔ حدیث میں صیغہ استثناء کے ساتھ اسی کمال کو ان دونوں کیلئے ثابت کیا گیا ہے۔ اگر یہ مطلب نہ ہو تو ان کے استثناء کرنے کے کچھ معنی نہ ہوں گے ۱۲) اور جب یہ مطلب ہوا کہ ان دونوں کو کامل مردوں کے برابر کمال حاصل تھا تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان میں نقصان عقل ونقصان دین کا وہ سبب غیر اختیاری موجود نہ تھا جو دوسری عورتوں میں موجود ہے اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ممکن ہے ان میں وہ نقصان غیر اختیاری موجود نہ ہو اور خدا تعالےٰ کی قدرت سے یہ کچھ بعید نہیں۔ دوسرے ممکن ہے کہ ان میں بھی نقصان غیر اختیاری جس سے اس نقصان غیر اختیاری کی تلافی ہو گئی ہو۔ (الکمال فی الدین للنساء ج ۲۰)

کھانے میں اعتدال

حدیث میں ہے۔ ثُلُث لِطَعَامِہ وَثُلُث لِشَرَابِہ وَثُلُث لِنَفسِہ.

ایک تہائی کھانے کے لئے اور ایک پانی کے لئے اور ایک تہائی سانس کے لئے اور ایک ثلث کی قید غالباً اتفاقی ہے مطلب یہ ہے کہ کچھ گنجائش رکھ کر کھانا چاہئے یہی تعلیم مولنا کی لکھنے پڑھنے کے متعلق تھی کہ تھوڑا سا شوق باقی رکھ کر محنت کیا کرو۔ پھر مولانا نے فرمایا کہ تم نے چکئی بھی پھرائی ہے ہم نے کہا حضرت نہیں فرمایا تم نے دنیا میں خاک دیکھا۔ دیکھو چکئی پھرانے کا قاعدہ یہ ہے کہ اس پر سے سارا ڈورا نہ اُتارا جائے اگر ڈورا سارا اُتر جائے گا تو پھر از سرِ نو چڑھانا پڑے گا اور اگر تھوڑا سا ڈورا اس پر لپٹا رہے تو نہایت آسانی سے اسی پر لوٹ آتی ہے۔ یہی قاعدہ شارع نے مقرر کیا ہے۔

اِنَّ اللهَ لاَ یَملِ حتیّٰ تَملُّوا. یعنی عمل شوق باقی رکھ کرو اتنا عمل نہ کرو کہ سارا شوق ایک دم سے ہی پورا کرلو بلکہ نفس پر آسانی کرو زیادتی نہ کرو عبادت تحمل کے موافق کرو تحمل سے زیادہ نہ کرو۔ (رفع الالتباس عن نفع الالباس ج ٢٠)

طریقہ تعلیم نسواں

عورتوں کو وہ کتابیں پڑھایئے جن میں ان کے ضروریات دینی لکھے گئے ہیں اور ان کو سبقاً سبقاً پڑھایئے ان کے ہاتھ میں کتاب دے کر بے فکر نہ ہو جایئے عورتیں اکثر کج فہم اور کم فہم ہوتی ہیں یا تو کتاب کے مطلب کو سمجھیں گی نہیں یا کچھ کا کچھ سمجھ لیں گی اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر کے گھر کا کوئی مرد بیبیوں کو اکٹھا کر کے وہ کتابیں پڑھایا کرے یا اگر وہ پڑھ نہ سکتی ہوں تو ان کو سنایا کرے مگر نظر تعلیم کی غایت اور غرض پر رہے۔ صرف ورق گردانی نہ ہو جو مسئلے ان کو پڑھائے جائیں یا سنائے جائیں ان پر عمل کی نگرانی بھی کی جائے۔

یہ بھی قاعدہ ہے کہ مسئلہ پڑھنے سے یاد نہیں رہتا بلکہ اس کے کاربند ہو جانے سے خوب ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ اور اگر کوئی بی بی پڑھی ہوئی میسر ہوں تو وہی کتاب لے کر دوسری بیبیوں کو پڑھائیں یا سکھائیں۔

بہر حال کوئی صورت ہو مگر اس سے غفلت نہ ہونی چاہئے آپ صرف اپنی ذات خاص سے پابند شرع ہو کر بری نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے:

قُوا اَنفُسَکُم وَاَھلِیکُم نَاراً وَقُودُھَا النَّاسُ وَالحِجَارَۃُ

یعنی بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے۔ اور حدیث ہے

اَلا فَکُلُّکُم رَاعٍ وَ کُلُّکُم مَسئُولٌ عَن رَعِیَّتِہٖ.

یعنی ہر بڑا چھوٹے کا نگراں ہے۔ اور اس سے باز پرس ہوگی تو جس طرح ممکن ہے عورتوں کو دین سکھاؤ۔ مرد خود سکھائیں یا کوئی بی بی دوسری بیبیوں کو سکھا دیں اور سکھانے کے ساتھ ان کو کاربند بھی بنا دیں اس کے بغیر برأت نہیں ہو سکتی اس پر آپ یہ نہ کہیں کہ عورتیں راہ پر آتی ہی نہیں کیونکہ آپ کو خدا تعالےٰ نے حاکم اور ان کو محکوم بنایا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُونَ عَلَی النِّسَاءِ. (مرد عورتوں پر حاکم ہیں) (منازعۃ الھویٰ ج ۲۰)

ازالہ شبہات میں، تقلیدِ محقق لازم ہے

آج کل علماء بھی خود طریق علاج نہیں جانتے۔ تو اب عوام نے اپنا علاج خود کرنا شروع کیا کہ قرآن وحدیث کا ترجمہ پڑھنے لگے اور ترجمہ دیکھ کر شبہات کا خود ہی جواب دینے لگے مگر میں تجربہ سے کہتا ہوں کہ ایسے عوام کو خود ترجمہ پڑھنا حرام ہے۔ بلکہ تم کو لازم ہے کہ کسی محقق سے رجوع کرو اور جو طریق وہ بتلائے اس پر عمل کرو اپنی رائے کو دخل نہ دو پھر وہ بھی تم کو قرآن کا ترجمہ پڑھائے گا یا پڑھنے کی رائے دے گا۔ مگر قابل بنا کر۔ اور اگر اس کے سامنے بھی اپنی رائے چلائیں گے تو اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے اپنے بچہ کے لئے تمام ایک نصاب تعلیم تجویز کر دو اور وہ اس میں اپنی رائے کو دخل دے تو کیا آپ کو اس کی رائے کی کچھ وقعت ہو گی......؟ ہرگز نہیں صاحبو! دنیا و دین کا کام بدوں تقلید محقق کے نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے اگر ایک سرکاری مکان دو لاکھ روپے میں تیار ہوا ہو مگر انجینئر اس کو پاس نہ کرے اور یہ کہے کہ دو ماہ میں یہ مکان گر جائے گا تو اسی وقت لاکھوں کی عمارت کو بیکار کر دیا جاتا اور اس کو خالی کر دیا جاتا بلکہ بعض دفعہ گرا دیا جاتا ہے یہاں کوئی اپنی عقل کو دخل نہیں دیتا بلکہ بلا چون وچرا انجینئر کی تقلید کی جاتی ہے یہی حال ڈاکٹروں کی تقلید کا ہے کہ انکی تجویز میں کوئی دخل نہیں دیتا۔ (غایۃ النجاح ج ۲۰)

قرآن میں ہر مضمون کا ہونا ضروری نہیں

قرآن میں ہر واقعی بات مذکور ہونا چاہئے اور اس کے متعلق کسی بزرگ ؒ کی طرف ایک شعر منسوب کیا جاتا ہے۔

جَمِیعُ العِلمِ فِی القُراٰنِ لٰکِن　　تَقَاصِرُ عَنہُ اَفہَامُ الرِّجَالِ

(قرآن میں تمام علوم ہیں لیکن لوگوں کی افہام اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں ۱۲) مگر میں کہتا ہوں کہ اول تو سند صحیح سے اس کا ثبوت دو کہ یہ شعر کس بزرگ کا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسمیں یہی تو کہا گیا ہے کہ قرآن میں تمام علوم ہیں جمیع الجہل فی القرآن تو نہیں کہا تو اب تم اس کا ثبوت دو کہ جن تحقیقات کو تم قرآن میں ٹھونستے ہو یہ علم ہے جہل نہیں۔ اور اگر علم سے مراد مطلق دانستن ہے تو میں کہونگا کہ اگر ویسرائے کا امتحان قانون وغیرہ میں ہو رہا ہو تو کیا کوئی اس وقت یہ کہے گا کہ ویسرائے کا امتحان پارچہ سازی و پارچہ و درزی میں بھی ہونا چاہئے کیونکہ علم لغوی تو یہ بھی ہے یقیناً کوئی اسکی جرأت نہ کرے گا بلکہ یہ کہا جائے گا کہ ویسرائے کے علم کے سامنے یہ جہل ہے علم نہیں اسی طرح جن باتوں کو آپ قرآن میں اپنی رائے سے ٹھونستے ہیں وہ علوم قرآن وحدیث کے سامنے علم نہیں بلکہ جہل محض ہیں۔

صاحبو! عوام کو لازم ہے کہ اپنے کو جاہل سمجھیں عاقل اور ذی رائے نہ سمجھیں اور اگر عاقل وذی رائے سمجھیں تو دنیا کی باتوں میں رائے چلالیا کریں۔ قرآن وحدیث کو تختہ مشق نہ بنائیں۔ بلکہ علماء کو بھی لازم ہے کہ اپنے کو عالم نہ سمجھیں مگر جاہل بھی نہ سمجھیں کہ اس میں ناشکری ہے بلکہ علماء سابقین سے اپنے کو کم سمجھیں۔ (غایۃ النجاح ج ۲۰)

صاحبو! آج کل جو لوگ قرآن میں اپنے رائے کو دخل دیتے ہیں ان کو ایمان عزیز نہیں ورنہ اگر جان کی طرح ان کو ایمان بھی عزیز ہوتا تو قرآن میں اپنی رائے کو نہ ٹھونستے نہ علماء سے مزاحمت کرتے جیسا کہ اطباء سے مزاحمت نہیں کرتے اور اگر وہاں طبیب یا ڈاکٹر کی رائے سے مزاحمت کریں گے تو وہ نکال باہر کردے گا پھر نہ معلوم دین ہی اتنا سستا کیوں ہے کہ اس میں ہر شخص اپنی رائے کو دخل دیتا ہے۔

نکاح کی غرض وغایت

یہ نکاح کا اصل موضوع لہٗ ہے یعنی سکون حاصل ہونا باقی خدمت وغیرہ یہ سب فرع ہیں وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ۔ اور تمہارے درمیان باہمی محبت اور ہمدردی پیدا کی، یہ بھی دلائل قدرت میں سے ہے کہ جو دو شخص ابھی ایک ساعت پہلے اجنبی محض تھے اب ان میں نکاح کے بعد کیسی محبت ہو جاتی ہے کہ دوسرے تعلقات میں اس کی نظیر نہیں ملتی اسی لئے حق تعالیٰ نے اس کو صیغہ امر سے بیان نہیں کیا کہ تم کو آپس میں مودت ورحمت کا برتاؤ رکھنا چاہئے بلکہ صیغہ خبر

سے بیان فرمایا کہ ہم نے تمہارے درمیان خاص تعلق پیدا کر دیا یعنی ہم نے تمہاری مدد کی ہے بدوں ہماری مدد کے اجنبیت میں ایسا تعلق نہیں ہو سکتا تھا اور یہاں مودت و رحمت دو لفظ اختیار کئے گئے اس سے مطلب یہ ہے کہ اس تعلق میں کبھی مودت کا غلبہ ہوتا ہے کبھی رحمت و ہمدردی کا چنانچہ ابتداء میں عموماً محبت کا غلبہ ہوتا ہے اور انتہا میں رحمت و ہمدردی کا۔ اور اس عنوان میں عورتوں کی اس شکایت کا بھی جواب ہو گیا جو عورتوں کو مردوں سے اکثر ہوا کرتی ہے۔ جب نکاح کو چند سال گزر جاتے ہیں تو عورتیں مردوں سے کہا کرتی ہیں کہ اب تمہارے دل میں ہماری ویسی محبت نہیں رہی جیسی شروع میں تھی اب وہ ولولہ اور تقاضا اور جوش عشق نہیں رہا اس شکایت کا منشا جہل ہے اور اگر مرد لا جواب ہو جائے تو یہ اس کا جہل ہے دونوں جاہل ہوں گے تو شکایت بڑھے گی عاقل اس اعتراض کو کبھی تسلیم نہ کریگا وہ اس کا یہ جواب دے گا۔

جوش کا کم ہونا کمالِ محبت کی دلیل ہے

قاعدہ یہ ہے کہ قدامت کے بعد جوش کم ہو جاتا ہے مگر جوش کا کم ہو جانا زوال محبت کی دلیل نہیں بلکہ کمال محبت کی دلیل ہے کیونکہ جوش خود نقص کی دلیل ہے دیکھو ہنڈیا میں جب تک جوش رہتا ہے کچی ہے اور جب جوش کم ہو کر سکون ہو جاتا ہے اس وقت سمجھتے ہیں کہ ہنڈیا پک گئی اسی لئے انبیاء علیہم السلام اور کاملین میں کیفیات کا جوش کم ہوتا ہے اور متوسطین میں ان سے زیادہ اور چھٹ بھیوں میں تو سب سے زیادہ جوش ہوتا ہے مگر سب جانتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کامل ہیں تو اسکی محبت بھی سب سے کامل ہے حالانکہ وہاں جوش نہیں۔ پس عورتوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ...... بیوی کے پرانی ہو جانے سے اگر مرد کا جوش کم ہو جائے تو یہ محبت کے کم ہونے کی دلیل نہیں بلکہ اس کی دلیل ہے کہ محبت کامل ہو گئی ہے مگر رنگ بدل گیا ہے پہلے محبت و عشق کا رنگ تھا اب رحمت و ہمدردی کا رنگ ہے پہلے محبت تھی مگر کسی قدر تکلف اور اجنبیت بھی تھی اب بالکل بے تکلفی ہے کہ ایک دوسرے کا ہمراز و دمساز اور راحت و غم کا شریک ہے گویا دو قالب ایک جان ہیں یہ نکتہ ہے مودت و رحمت دو لفظوں کے اختیار کرنے میں (غایۃ النجاح ج ۲۰)

علم اعتبار کی حقیقت کی توضیح

علم اعتبار کی حقیقت یہ ہے کہ ایک مشبہ کو دوسرے مشبہ بہ سے واضح کیا جائے ثابت نہ کیا

جائے بلکہ مشبہ ثابت بدلیل آخر ہے اور یہ نہ مجاز میں داخل ہے خواہ مجاز مرسل ہو خواہ استعارہ کیونکہ کنایہ میں موضوع لہ کے مراد نہ ہونے پر قرینہ ہوتا ہے اس لئے غیر موضوع لہ مراد ہوتا ہے اور یہاں نہ موضوع لہ کے غیر مراد ہونے کا کوئی قرینہ ہے نہ غیر موضوع لہ مراد ہے اور نہ یہ کنایہ میں داخل ہے کیونکہ کنایہ میں معنی موضوع لہ متروک نہیں ہوتے بلکہ کلام کا مدلول اصلی وہی موضوع لہ ہوتا ہے مگر مقصود اس کا لازم یا ملزوم ہوتا ہے جیسے طَوِیلُ النِّجَادِ کہ اس میں مدلول وضعی متروک نہیں مدلول کلام وہی ہے مگر مقصود طویل القامة ہے کیونکہ طویل النجاد کے لئے طویل القامة لازم ہے اور اعتبار میں وہ معنی نہ مقصود ہے نہ مدلول کلام ہے۔ پس یہ اعتبار گویا قیاس تصرفی ہے اور مشابہ ہے قیاس فقہی کے مگر ہمیں قیاس فقہی نہیں کیونکہ قیاس فقہی میں علت جامعہ مؤثر ہے حکم مقیس میں اس لئے وہ حکم منسوب الی القیاس ہوتا ہے یہاں یہ بھی نہیں صرف مقیس مقیس میں تشابہ ہے۔ اور اس مشابہت کو حکم میں کوئی اثر نہیں بلکہ وہ حکم خود مستقل دلیل سے ثابت ہے یہ حقیقت ہے علم اعتبار کی پس صوفیہ تو اس کے حدود سے نہیں نکلتے کیونکہ وہ معانی منقولہ کے نہ مدلولیت کے منکر ہیں نہ مقصودیت کے اور جہلاء صوفیہ خود ان کے مدلولیت ہی کے منکر ہیں اور جدید تعلیم یافتہ مدلولیت کے تو منکر نہیں مگر مقصودیت کے مابین بلکہ مقصود معانی سیاسیہ ہی کو سمجھتے ہیں ان سب فرقوں کے سب فرقوں کو اچھی طرح سمجھ لو۔

اب سمجھئے کہ جس مضمون کو میں اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں وہ اس آیت کا نہ مدلول ہے نہ مقصود ہے بلکہ صرف اس کو اس کے مدلول سے مشابہت حاصل ہے پس یہ بیان اس آیت کے تحت میں بطور علم اعتبار کے ہوگا۔ (غایۃ النجاح ج ۲۰)

مسلمانوں کی حضرات اہل بیتؓ سے محبت:

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ فرماتے ہیں کہ مجھے وہم ہوا کرتا تھا کہ حضرات اہل بیت سے مجھے محبت نہیں ہے۔ اور اکثر اہل سنت کے متعلق لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان کو جتنی محبت صحابہ سے ہے اتنی اہل بیت سے نہیں ہے۔ چنانچہ ایک صاحب نے مجھ سے یہ شبہ کیا بھی تھا کہ میں نے کہا کہ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں صحابہ کے منکر تو ہیں۔ اس لئے ان کی نفرت اور حمایت میں اہتمام کیا جاتا ہے اور اہل بیت کے منکر نہیں اس لئے ان کے متعلق

اس قدر اہتمام نہیں کیا جاتا۔ اس وجہ سے شبہ ہوتا ہے کہ اہل بیت سے محبت نہیں تو جیسے اکثر لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے۔ حضرت مرزا صاحب کو بھی یہ خیال ہوا اور اس کی وجہ سے پریشان ہوئے۔ آخر ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک شخص نے آپ کے سامنے صحابہ کی شان میں گستاخی کی آپ سن کر غصہ سے بے تاب ہوئے۔ اور تلوار نکال کر چاہا کہ اس کا کام تمام کر دیں اس نے کہا کہ امام حسینؓ کے واسطے مجھ کو چھوڑ دو۔ بس امام حسینؓ کا نام سنکر آپ کی یہ حالت ہوئی کہ بدن پر لرزہ پڑ گیا اور پھر اس پر ہاتھ نہ اٹھ سکا اس سے آپ کو تسلی ہوئی کہ مجھ کو اہل بیت کے ساتھ بھی محبت ہے۔ (اجابۃ الداعی ج ۱۶)

صالح جنات کیلئے جنت

اب وہ مسئلہ بتلاتا ہوں کہ اس میں علماء کا اختلاف ہوا ہے وہ یہ کہ اگر جن عمل صالح کریں تو ان کو جنت ملے گی یا نہیں ایک قول امام صاحبؒ کا ہے عذاب سے تو بچیں گے لیکن جنت میں جانے کا حکم نہیں کیا جا سکتا اور اسی آیات سے استدلال کیا ہے کہ اس میں ایمان لانے پر مغفرت اور عذاب سے نجات کا وعدہ ہے جنت کا وعدہ نہیں تو امام صاحب نے بہت احتیاط کی ہے کہ جس کی تصریح نہ تھی اس میں توقف فرمایا اصل قول تو امام صاحب کا اتنا ہے اور یہ بھی احتیاط کی بنا ہے کہ اثبات بھی نہ کریں اور انکار بھی نہ کریں مگر اب مشہور قول یہ ہے کہ وہ جنت میں نہ جاویں گے۔ باقی پھر کہاں ہوں گے۔ تو اس کے متعلق مختلف احتمال ہیں بعض کے میں کہا ہے یہ ہے امام صاحب کے مذہب کا حاصل مگر جو میری سمجھ میں آتا ہے وہ عرض کرتا ہوں کہ ظاہراً یہ امام صاحب کی احتیاط ہے اور یہ بھی ثابت نہیں کہ آخر تک امام صاحب اسی قول پر رہے کیونکہ دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر جن اچھے عمل کریں گے تو جنتی ہوں گے۔ میں تو اس کو قریب قریب قطعی سمجھتا ہوں ایک تو سورۂ رحمٰن میں جنت کی نعمتیں ذکر کر کے فرمایا ہے فبا ی الا ربکما تکذبان (پھر تم (اے جن وانس اپنے رب کی کونسی نعمت کا انکار کرتے ہو) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی نعمتیں دونوں کو ملیں گی نیز یہ بھی فرمایا کہ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ (یعنی حوروں کو ان سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہوگا نہ کسی جن نے) تو اگر جن کا احتمال ہی نہ تھا۔ تو یوں کیوں فرمایا اور اس سے بھی صاف لیجئے کہ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي

اُلسَّعِيۡرِ ایک فریق جنت میں ہوگا۔ اور ایک فریق دوزخ میں ہوگا تو دو فریق فرمائے ہیں تیسرا فریق نہیں فرمایا اور یہ یقین ہے کہ دوزخ سے بچے رہیں گے۔ تو اب اگر وہ جنت میں جاویں تو تیسرا فریق ہونا لازم آتا ہے نہ فریق فی الجنۃ (جنت کے فریق) میں داخل ہوئے نہ فریق فی السعیر (دوزخ کے فریق) میں۔ (اجابۃ الداعی ج۱۶)

اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت

واقع کے اعتبار سے تو اللہ تعالیٰ کو یہ بھی اختیار ہے اور قانون کے اعتبار سے میں نے اس لئے کہا کہ واقع کے اعتبار سے تو اللہ تعالیٰ کو یہ بھی اختیار ہے کہ بندہ کے حقوق بھی خود ہی معاف فرما دیں اس لئے کہ وہ حقوق العباد درحقیقت اللہ ہی کے حقوق ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کے مالک ہیں تو بندے کے اموال اور انفس اور عزت وآبرو کے مالک بھی وہی مالک ہیں تو جو کوئی کسی بندے کو مالی یا جسمانی ضرر پہنچائے گا تو اس نے فی الواقع اللہ کے ملک میں تصرف کیا اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کسی کا غلام ہو اور اس کے پاس مال ہوا تو اگر کوئی اس غلام کا وہ مال لے گا تو واقع میں اس نے اس کے مولا کی حق تلفی کی پس اس واقعیت کے لحاظ سے حقوق العباد کو حقوق اللہ کہنا صحیح ہے لیکن کیا انتہا ہے رحمت کا کہ ان حقوق اللہ کا نام حقوق العباد رکھ دیا ہے جیسے اپنے غلام یا اپنے بچہ سے اپنی کسی شے کی نسبت یہ کہیں کہ یہ شے تمہاری ہے اس کہنے سے وہ شے اس کی نہیں ہو جاتی لیکن ان کی دلجوئی کے واسطے کہتے ہیں کہ یہ شے تمہاری ہے بلکہ بچہ کو تو اگر کوئی شے ہبۃً دیدیں تو وہ بھی مالک ہو جاتا ہے او غلام مملوک تو کسی شے کا کسی صورت سے مالک ہی نہیں ہوتا یہی راز ہے شریعت کا کہ شارع نے غلامی کو موانع ارث سے قرار دیا ہے یعنی اگر کوئی شخص مر جائے تو ایک بیٹا جو کسی کا غلام ہے وارث چھوڑ دے تو اس کو میراث نہ ملے گی اس لئے اگر اس کو میراث ملے تو وہ مالک نہ ہوگا بلکہ اس کا مولا مالک ہوگا جو اس مورث سے اجنبی ہے تو توریث اجنبی کی لازم آوے گی اس لئے غلام کو میراث نہ ملے گی دیکھئے شریعت کا کیا عدل ہے غلام کو میراث نہیں دی اس لئے کہ وہ جب مالک ہی نہ ہوگا تو اس کی حسرت ہی حسرت ہوگی پس یہ مسئلہ بھی فرع ہے اسی کی کہ غلام کسی شے کا مالک نہیں ہوتا اور بیٹا ہبہ سے مالک ہو جاتا ہے (التوکل ج۲۱)

خودکشی حرام ہونے کی وجہ

ہماری جان بھی ہماری نہیں ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے خودکشی کو حرام فرمایا ہے اگر جان ہماری ہوتی تو ہم اس میں جس طرح چاہتے تصرف کر سکتے یہی وجہ ہے کہ جن معاصی میں دوسروں کو ضرر پہنچتا ہے وہ تو ظاہر ہے کہ حرام ہیں ہی اور ان کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ اس کو کیا اختیار ہے کہ دوسرے کی چیز میں تصرف کرے

مگر ایک حکمت اسکی مجھ جیسے نادان کی سمجھ میں بھی آتی ہے اور اس سے قدر ہوگی شریعت کی کہ شریعت کا وجود ہمارے لئے کس کی قدر نعمت ہے کہ اگر قانون کی شریعت نہ ہوتا تو زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر اشیاء کی نسبت عباد کی طرف نہ ہوتی اور یہ قانون مقرر نہ کیا جاتا تو حقیقت اور واقعیت کا مقتضا تو یہ تھا کہ کوئی شخص کسی شئے کا مالک نہ ہوتا کیونکہ واقع میں حق تعالیٰ ہی سب کے مالک ہیں۔ (التوکل ج۲۱)

گناہ کے دو اثر:

گناہ کے دو اثر ہیں ایک آجل یعنی عذاب کا ہونا دوسرے عاجل یعنی گناہ سے قلب میں ایک ظلمت پیدا ہو جانا جو سبب ہوتا ہے آئندہ دوسرے معاصی کے صدور کا اور جب بندہ توبہ کرتا ہے تو قبولیت توبہ کے بھی دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ عذاب سے نجات ہو جاوے دوسرے یہ کہ قلب میں ظلمت اور کدورت جو گناہ سے ہوئی تھی وہ نہ رہے تو یہ محض توبہ سے نہیں جاتی بلکہ بار بار توبہ کرنے سے ندامت سے گھل جانے اور مجاہدات اور مراقبات طویلہ کرنے سے جاتی ہے ہاں توبہ بشرائطہا کرنے سے عذاب سے نجات ہو جاوے گی۔ باقی یہ کدورت اور ایک قسم کی رکاوٹ اور حجاب جو فیما بین اللہ و بین العبد پیدا ہو گیا ہے سو نفس توبہ اس کیلئے کافی نہیں ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی بزرگ کے حق میں ہم سے کوتاہی ہو جاوے مثلاً ان کو ٹھوکر لگ جاوے اور پھر ان سے اس بے ادبی کو معاف کرایا اور انہوں نے معاف کر دیا لیکن اس معاف کرنے سے تسلی نہیں ہوتی بار بار کہتے ہیں کہ حضرت بڑی حماقت ہوئی بہت قصور ہوا اور وہ برابر کہہ رہے ہیں کہ میں نے معاف کر دیا تم اس قدر کیوں پریشان ہوتے ہو مگر دل ہے کہ مانتا نہیں جب بہت کہ سن لیں گے اس وقت اطمینان ہوتا

ہے جب ادنیٰ سی عظمت کا یہ اثر ہے تو حق تعالیٰ کی عظمت تو غیر محدود ہے اتنا جلدی قلب صاف ہونا مشکل ہے وہاں تو یہ حالت ہوتی ہے

بردل سالک ہزاراں غم بود   گرز باغ دل خلالے کم بود
(اگر دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہو جاوے تو سالک کے دل میں ہزاروں غم ہوتے ہیں)
(التوکل ج ۲۱)

صحابہؓ چونکہ جان نثار تھے جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس لئے ان کا دل ابھی اس لئے صاف نہ ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے مکدر ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ تکدر بمقتضائے بشریت تھا۔ (التوکل ج ۲۱)

دنیا میں کفر کا وجود بھی حکمت خداوندی ہے:

بات یہ ہے کہ یہ حق تعالیٰ کی حکمت کا مقتضا ہے کہ عالم میں کفر کا رہنا بھی ضرور ہے اسی کی نسبت حافظ شیرازی کہتے ہیں

در کارخانہ عشق از کفر ناگزیر است   آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد
(عشق کے کارخانے میں کفر بھی ناگزیر ہے کیونکہ آگ کس کو جلائے گی اگر ابولہب نہ ہو)

اگر کوئی کہے کہ اگر آگ ابولہب کو نہ جلاتی تو کیا حرج ہے جواب یہ ہے کہ راز دان حقائق نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ کے اسماء جمیل ہیں اور جمال کی سبب ہر اسم مقتضی ظہور کو ہے اور ان ہی اسماء میں سے منتقم بھی ہے وہ ہی ظہور کو چاہتا ہے اور اس کے ظہور کی یہی صورت ہے کہ دنیا میں کفر و معصیت کرنے والے بھی ہوں تا کہ وہ دوزخ میں جاویں علی ہذا غفور بھی نام پاک باری تعالیٰ کا ہے اس کے ظہور کا مقتضے یہ ہے کہ معاصی کا وجود بھی عالم میں ہو (لیکن اس سے کوئی شخص معصیت و کفر کے ارتکاب سے معذور نہ قرار دیا جاوے گا اس لئے کہ رضا اور شے ہے اور مشیت دوسری چیز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سب کچھ تعالیٰ کی مشیت اور تخلیق سے ہوتا ہے لیکن رضا کا تعلق ایمان اور اعمال صالحہ سے ہے اور ہم کو خیر و شر دونوں راہ بتا دیئے گئے ہیں پس جس راہ کو ہم اختیار کریں گے اس کے خواص ولوازم آثار اس پر مرتب ہوں گے ۱۲ جامع) (التوکل ج ۲۱)

انبیاء اور اولیاء کی ایک شان:

انبیاءؑ بھولے بھالے نہیں ہوتے عقل کامل ان کو عطا ہوتی ہے اور بعض بزرگوں کی

نسبت جو بھولے ہونے کو صفت کمال شمار کیا جاتا ہے تو یہ صفت ان بزرگوں کی ہے جن کے متعلق ارشاد اور تربیت نہیں ہے او جن حضرات کو ارشاد اور تربیت اور ہدایت کا کام سپرد ہوتا ہے وہ بھولے نہیں ہوتے وہ سب سے زیادہ عاقل اور ہوشیار ہوتے ہیں انبیا کی بھی یہی شان تھی کہ بڑے عاقل ہوتے تھے۔ کوئی شخص ان کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ (التوکل ج ۲۱)

بندہ کو علم غیب عطا نہ ہونے میں حکمت:

بندہ کو غیب کا عمل جو عطا نہیں کیا گیا اس میں بڑی مصلحت ہے اور حکمت ہے ورنہ جس چیز کا نہ ہونا معلوم ہو جاتا اس کو یہ کیوں کر مانگ سکتا اور اس صورت میں کہ دعا کا جو مقصود ہے عبدیت کا اور تذلل اور افتقار اس سے یہ محروم رہتا پس رضا بالقضا اور دعا اور حرکت اور سکون سب جمع ہو گئے اور کوئی اشکال نہ رہا جیسے گھڑی کے کل پرزے جب علیحدہ علیحدہ کر دیئے جاویں تو ناواقف اگر ان کو بے ٹھکانے جوڑ دے تو گھڑی نہ چلے گی اور رواقف ہر پرزے کو اس کے ٹھکانے پر رکھ دیگا تو گھڑی چل جاوے گی۔ (التوکل ج ۲۱)

اجابت دعا کے دو درجے:

وہ جواب یہ ہے کہ منظوری اور اجابت اور قبول کے دو درجے ہیں ایک یہ کہ درخواست لے لی جائے اور اس پر توجہ کی جائے دوسرے یہ کہ درخواست کے موافق فیصلہ بھی کر دیا جائے۔ صاحبو! درخواست کا لے لیا جانا بھی ایک قسم کی منظوری اور بڑی کامیابی ہے آپ نے مقدمات میں دیکھا ہوگا کہ جب کسی مقدمہ کی اپیل کی جاتی ہے تو وہاں بھی دو درجے ہیں ایک یہ کہ اپیل لے لیا جائے اور اس میں غور کیا جائے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ بڑی ناکامی اس شخص کی جس کا اپیل لیا ہی نہ جائے اس کے بعد دوسرا درجہ کامیابی یہ ہے کہ اپیل منظور کر لینے کے بعد درخواست کے موافق فیصلہ کر دیا جائے اور پہلے فیصلہ کو منسوخ کر دیا جائے اور جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب سمجھئے کہ **اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ** منظوری کی قسم اول پر محمول ہے قسم ثانی پر محمول نہیں جس کی دلیل خود نص کے الفاظ ہی ہیں (الاصابہ ج ۲۱)

اجابت کے معنی درخواست لے لینا ہے:

اجابت جس کا وعدہ ہے اس کے معنی درخواست لے لینا اور درخواست پر توجہ کرنا ہے یہ

اجابت یقینی ہے اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا آگے دوسرا درجہ ہے کہ جو مانگا ہے وہی مل جائے اس کا وعدہ نہیں بلکہ وہ انشاء سے مقید ہے کہ اگر مشیت ہوگی تو ایسا ہو جائے گا ورنہ نہیں (الا صابہ ج ۲۱)

معمولی چیز بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو:

اور کسی حاجت کے بھی یہ مت سوچو! کہ یہ تو معمولی سی بات ہے اس کے واسطے اللہ تعالیٰ سے کیا دعا کریں کیونکہ حدیث میں اللہ تعالیٰ سے نمک تک مانگو اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شبہ کو رفع کیا ہے وہ یہ کہ بعض لوگ چھوٹی سی چیز مانگنی شان خداوندی کے خلاف سمجھتے ہیں جیسے سکندر سے کسی نے ایک روپے کا سوال کیا تھا سکندر نے کہا کہ۔ ایک روپیہ مانگنا میری شان کے خلاف ہے سائل نے کہا پھر سلطنت دیدو کہا یہ تیری شان کے خلاف ہے سلاطین دنیا کے مذاق پر قیاس کر کے بعض کو یہ شبہ ہوا کہ شاید اللہ تعالیٰ بھی چھوٹی چیز کے سوال سے ناخوش ہوں گے مگر یہ غلط ہے کیونکہ سلاطین چھوٹی چیز کے سوال سے اس واسطے ناخوش ہوتے ہیں کہ ان کے نزدیک کوئی چیز بڑی بھی ہے اور حق تعالیٰ کے سامنے کسی چیز کی بھی کچھ وقعت نہیں ان کے نزدیک عرش اور نمک کی ڈلی برابر ہے حالانکہ عرش اتنا بڑا ہے کہ ساتوں آسمان زمین اس کے سامنے بے حقیقت ہیں۔ شیخ عبدالکریم جیلی بڑے صاحب کشف ہیں ان کو ایک دریا مکشوف ہوا ہے جس کی ایک ایک موج اتنی بڑی ہے کہ ساتوں آسمانوں اور زمینوں کو غرق کر دے مگر ملائکہ محافظ ہیں وہ اس کی موجوں سے زمین و آسماں کو بچاتے ہیں مگر عرش اس سے بھی بڑا ہے عرش کی برابر کوئی چیز نہیں ہے عرش کا پیدا کرنا اور نمک کی ڈلی کا پیدا کرنا خدا تعالیٰ کے نزدیک برابر ہے کیونکہ ان کو تو صرف حکم کرنا پڑتا ہے ایک کلمہ کن سے وہ عرش بھی بنا دیتے ہیں اور نمک کی ڈلی بھی۔ پس جو شخص نمک کی ڈلی مانگنے کو شان خداوندی کے خلاف سمجھتا ہے وہ کسی چیز کو خدا تعالیٰ کے سامنے عظیم و وقیع بھی سمجھتا ہے اور یہ خیال غلط ہے اس لئے حق تعالیٰ سے ہر چیز مانگو اس کا یہ مطلب نہیں کہ چھوٹی چیز کو بڑی سمجھ کر مانگو بلکہ مطلب یہ ہے کہ بڑی کو بھی چھوٹی سمجھو۔ صاحبو! جب خدا تعالیٰ کے نزدیک ہر چیز آسان ہے کوئی چیز دشوار و مشکل نہیں تو اس سے کیوں نہیں مانگتے (الا صابہ ج ۲۱)

انس سے متعلق احادیث مختلفہ میں تطبیق:

بعض احادیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا من احب

الناس الیک کہ آپ کو دو آدمیوں میں کس سے محبت بہت زیادہ ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کے جواب میں کبھی تو فرمایا کہ حضرت عائشہؓ سب سے زیادہ محبوب ہیں اور کبھی حضرت فاطمہ کا نام لیا اور بعض روایات میں ابوبکر صدیق کا نام آیا ہے۔ محققین نے فرمایا ہے کہ ان احادیث میں تعارض کچھ نہیں کیونکہ محبت کے الوان وانواع ہیں۔ ایک نوع محبت کی وہ ہے جو بیوی سے ہوتی اس نوع میں حضرت عائشہؓ کے مساوی کوئی نہیں۔ ایک نوع محبت کی وہ ہے جو اولاد سے ہوتی ہے۔ اس میں حضرت فاطمہؓ کے برابر کوئی نہیں ایک نوع وہ ہے جو دوستوں سے ہوتی ہے اس نوع میں حضرت صدیقؓ کے برابر کوئی نہ تھا وعلی ہذا القیاس۔ (الفصل والانفصال ج ۲۱)

قرآن پاک کو سب سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے:

قرآن کو سب سے زیادہ وہ شخص سمجھتا ہے جو عادات وجذبات انسانیہ پر نظر رکھتا ہو نہ کہ دقائق منطقیہ پر کیونکہ قرآن میں جذبات وعادات کی رعایت بہت زیادہ ہے مصنفین کی طرح دقائق فلسفہ کی رعایت نہیں کی گئی (الفصل والانفصال ج ۲۱)

ارواح کو عالم اجسام میں کیوں بھیجا گیا:

اہل ظاہر اس سوال کا جواب دیں کہ ارواح کو عالم اجسام میں بھیجا گیا۔ کیا چیز ان کو یہاں کھینچ کر لائی۔ حضرت وہ وہ چیز ہے جس کو اہل ظاہر نہیں سمجھ سکتے۔ سنئے یہاں ارواح کو بھیجنے سے مقصود قرب حاصل کرنا تھا۔ یعنی وہ قرب جو اعمال سے ہوتا ہے اور احوال سے نہیں ہوتا کیونکہ اعمال اختیاری ہیں اور احوال غیر اختیاری اور اس قرب کا مدار صرف اختیار پر ہے اور بہت سے اعمال وہاں یعنی عالم ارواح میں ممکن نہ تھے۔ کیونکہ بعض اعمال کا تعلق جسد سے ہے اور وہاں روح مجرد تھی مثلاً روزہ کیسے رکھا جاتا کیونکہ بھوک ہی نہ تھی۔ حج کیسے ہوتا وہاں خانہ کعبہ ہی نہ تھا۔ زکوۃ کیسے ادا ہوتی وہاں مال ہی نہ تھا۔ اور مصائب پر صبر کیسے ہوتا وہاں بیماری اور موت ہی نہ تھی۔ پس یہ قرب خاص اعمال پر موقوف تھا اس لئے حکمت حق مقتضی ہوئی کہ ارواح کو عالم اجسام میں بھیجا جائے تا کہ قرب خاص حاصل ہو۔ یہ ہے سلوک پھر اس کے بعد جذب حاصل ہوتا ہے مگر چونکہ اثناء سلوک میں استعداد کامل ہو جاتی ہے اس لئے اب اس کے جذب کا ایسا غلبہ نہیں ہوتا کہ حواس معطل ہو جائیں اور اعمال سے محروم ہو جائیں۔

حدیث میں ہے کہ دو شخص ساتھ ساتھ مسلمان ہوئے تھے ان میں سے ایک تو شہید ہو گیا اور دوسرے رفیق کا ایک ہفتہ کے بعد بستر پر انتقال ہوا تو حضرات صحابہؓ نے دوسرے کو یہ دعا دی اللھم الحقہ بصاحبہ کہ اے اللہ اس کو اس کے ساتھی کے ساتھ ملا دیجئے یعنی اس کو بھی وہی درجہ عطا فرمایئے جو اس کے رفیق کو بوجہ شہادت ملا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے یہ کیا کہا۔ سبحان اللہ حضرات صحابہؓ کی بھی کیا شان تھی کہ ان کو ہر وقت بارگاہ وحی سے فیضان علوم ہوتا تھا۔ اور الحمد للہ ہم بھی صاحب نصیب ہیں کہ ہم پر بھی ہر دم فیضان ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ وہاں فیضان بالمشافہ تھا۔ یہاں بواسطہ ہے اور یہ فرق ایسا ہے جیسے ایک شخص سے محبوب سامنے ہو کر باتیں کرے اور ایک سے پردہ میں ہو کر باتیں کرے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو بھی فیضان ہو رہا ہے مگر بواسطہ کیونکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متجلی ہیں جیسا قرآن میں اللہ تعالیٰ شانہ، جلوہ فرما ہیں اس پر مجھے مخفی کا شعر یاد آتا ہے

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل　　ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

میں اپنے کلام میں اس طرح پوشیدہ ہوں جیسے پھول کی خوشبو پھول کی پتی میں جو مجھ سے ملاقات کا شوق رکھتا ہے میرا کلام دیکھے۔ (الفصل والانفصال ج ۲۱)

فضیلت شہادت

شہادت کی فضیلت علی الاطلاق نہیں ہے ورنہ لازم آئے گا کہ شہید انبیاء سے بھی افضل ہو۔ دوسرے یہ کہ تمنائے شہادت بجائے شہادت ہے۔ حدیث میں ہے **انما الاعمال بالنیات. نیة المومن خیر من عملہ** دوسری حدیث میں ہے **من طلب الشہادة صادقاً من قلبہ اعطیھا ولو لم تصبہ** (رواہ مسلم)

اور اگر کسی کے قلب میں تمنائے شہادت بھی نہ ہو تو اس کا ایمان ناقص ہے حدیث میں ہے **من لم یغزِ ولم تحدث بہ نفسہ لقی اللہ وفی دینہ ثلثہ**..... اور **بحمد اللہ** ہر مسلمان ان کے لئے آمادہ ہے کہ اگر دین کے واسطے جان دینے کی نوبت آئے تو جان دینے کو حاضر ہیں اور جب ہم جیسے مہمل بھی اس کے لئے آمادہ ہیں تو وہ صحابی اس کے طالب اور اس کے لئے آمادہ کیوں نہ ہوں گے اور اسی بنا پر ہم کہیں گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہری شہادت خفیہ حضرت حمزہؓ کی شہادت جلیہ سے افضل ہے گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو

ظاہری شہادت حاصل نہیں ہوئی مگر آپ کو اس کی تمنا تو بے حد تھی حدیث ہے ودت ان اقتل فی سبیل اللّٰہ ثم احی ثم اقتل ثم احی ثم اقتل (الحدیث) اور بعض دفعہ ذکر خفی ذکر جلی سے افضل ہوتا ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادۃ خفیہ دوسروں کی شہادت جامہ سے افضل ہے اور اگر اس قاعدہ شرعیہ کو تسلیم نہ کیا جائے تو سخت اشکال وارد ہو کہ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض کمالات حاصل نہیں ہوئے اور یقیناً شہادت بھی کمالات میں سے ہے پس یہ اشکال اسی تقریر سے رفع ہو جائے گا جو میں نے نصوص حدیث سے بیان کی ہے۔

شہادت کی فضیلت کا سبب:

شہادت کی فضیلت کس وجہ سے ہے۔ سو ظاہر ہے کہ شہادت کے دو جز ہیں ایک اقدام یعنی اعداء اللہ کی طرف پیش قدمی کرنا ان پر حملہ کرنا۔ دوسرے گردن کٹ جانا۔ اور قواعد سے یہ بات معلوم ہے کہ مبنیٰ فضیلت کا امور اختیاریہ ہیں تو اب خود سمجھ لو کہ ان دونوں میں امر اختیاری کونسا ظاہر ہے کہ اقدام ہی اختیاری ہے گردن کٹ جانا اختیاری نہیں یہ تو دوسرے کے فعل پر موقوف ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب سمجھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقدام میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ حضرات صحابہؓ خود فرماتے ہیں کہ ہم میں بڑا بہادر وہ شمار ہوتا تھا جو معرکہ جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آگے دشمن کی صف میں گھسے رہتے تھے تو شہادت کا جو مبنیٰ اختیاری ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سب سے افضل تھے لہٰذا آپ کی شہادت بھی سب سے افضل ہے چوتھے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بعض اعمال کا اجر بے حساب ہے چنانچہ ذکر اللہ کے فضائل جو احادیث میں مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے ذکر اللہ شہادت سے بھی افضل ہے جس کی وجہ میری سمجھ میں آتی ہے کہ شہادت میں تو جو کچھ ہونا ہوتا ہے ایک دفعہ ہو جاتا ہے۔ تلوار کے ایک ہاتھ میں فیصلہ ہو جاتا ہے اور ذکر اللہ میں ہر دم دل پر آرہ چلتا ہے۔ ذاکرین کی حالت دیکھ لی جائے کہ ان پر کیسی کیسی حالتیں گزرتی ہیں۔

بردل سالک ہزاراں غم بود   گرز باغ دل خلالے کم بود

اللہ والے کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں۔ اگرچہ دل کے باغ میں گنجائش کم ہوتی ہے

اوراس حالت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا زیبا ہے کہ

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زمان از غیب جانے دیگر ست

خنجر تسلیم سے مرنے والوں کیلئے ہر وقت اللہ کی طرف سے دوسری جان موجود ہے کہ ان کیلئے تو بار بار موت وحیات کا تکرار ہوتا رہتا ہے۔ (خصوصا ذکر نفی اثبات میں تو ذاکر کامل کو بار بار موت وحیات کا تکرار ہونا بہت ظاہر ہے **کما لا یخفی علی من له ذوق بالذاکر مع المعرفة رزقنا ه الله تعالیٰ دائماً ابدًا**) پس یہ مسلم نہیں کہ شہادت کی فضیلت علی الاطلاق ہے بلکہ بعض اعمال شہادت سے بھی افضل ہیں۔ (الفصل والانفصال ج ۲۱)

شہادت سے بغیر مشقت کے درجات مل جاتے ہیں:

شہادت سے درجات بے مشقت مل جاتے ہیں۔ دوسرے طرق میں جو شہادت سے افضل ہیں مشقت ضرور ہے شہادت سے بے مشقت درجات ملنے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی لکھنؤ میں ایک خان صاحب تھے جو نہ نماز پڑھتے نہ روزہ رکھتے تھے جب کوئی ان کو اصلاح اعمال کے لئے کہتا اور اس کا ثمرہ حصول جنت اور نجات دوزخ بتلاتا تو کہتے میاں جہاں تلوار کے دو ہاتھ ادھر دو ہاتھ ادھر مارے تو سب کاٹی سے پھٹتی چلی جائے گی۔ اور جنت میں جا پہنچیں گے۔ وہاں پہنچنا مشکل ہے لوگ ان کی باتوں پر ہنستے تھے پھر جس وقت مولانا امیر علی صاحب کے پاس آئے اور پوچھا کہ مولانا کیا مجھ جیسا فاسق بھی خدا کے یہاں مقبول ہو سکتا ہے اور کیا شہادت سے میری بھی مغفرت ہو جائے گی فرمایا مقبولیت سے کیا چیز مانع ہے یقیناً شہادت سے جنت ملے گی۔ یہ سنتے ہی خان صاحب نے تلوار ہاتھ میں لی اور دو ہاتھ ادھر مارے اور دو ہاتھ ادھر بہت سے کافروں کو مار کر خود بھی شہید ہو گئے سو واقعی تلوار کے دو ہاتھ میں کائی سی پھٹ گئی اور خان صاحب نے ذرا سی دیر میں جنت لے لی بس یہ ضرور ہے کہ شہادت سے بے مشقت ذرا سی دیر میں درجات مل جاتے ہیں یہ بات دوسرے اعمال میں نہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتی کہ دوسرا کوئی عمل شہادت کے برابر نہ ہو۔ (الفصل والانفصال ج ۲۱)

احکام کا علم نہ ہونا قابل قبول عذر نہیں

بعض لوگ کہتے ہیں کہ احکام پوچھنا نہ چاہئے کیونکہ معلوم ہونے پر پھر خلاف کیا تو

سخت گناہ ہوگا۔ اور بلا معلوم ہوئے جو کوتاہی ہو جاوے وہ قابل گرفت نہیں مگر یہ محض من گھڑت لغویات ہے کیا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ ایسے بھولے ہیں کہ آپ کے بہلانے میں آجاویں گے۔ کیونکہ صاحب اگر اللہ تعالیٰ یہ دریافت فرمائیں کہ تم نے خبر کیوں نہیں حاصل کی؟ جواب کیا دو گے۔ یہ عذر بے علمی کا جب مقبول ہو سکتا ہے جبکہ باوجود کوشش کے معلوم نہ ہو سکے اور جب دل میں ایک بات کے متعلق شک ہے اور بتلانے والے موجود ہیں تو پھر یہ عذر کیسے معتبر ہو سکتا ہے۔ اور ایسے باطل خیالات اور مقالات لوگوں کے ذہن اور دہن میں دین ہی کے باب میں آتے ہیں۔ دنیا کے معاملات میں کبھی نہیں آتے چنانچہ دنیا کے احکام کو دیکھتے ہیں کہ اگر مجرم عدم علم قانون کا عذر کرے تو یہ ان کے نزدیک معتبر نہیں ہوتا۔ وہاں کوئی بھی چون و چرا نہیں سکتا وہاں تو خود ہی فتویٰ لگا دیتے ہیں کہ وکیل اور بیرسٹر موجود ہیں ملزم کو ان سے دریافت کرنا چاہئے تھا اور یہ سمجھنا کہ جان کر گناہ کرنا زیادہ عذاب کا باعث ہے من وجہ صحیح ہے مگر علی الاطلاق من کل الوجوہ غلط ہے۔ (شفاء العی ج ۲۱)

بے علم دو گناہوں کا مرتکب ہے:

مسلمان کے دو فرض ہیں علم اور عمل پس فرض علم کو ادا کر کے وہ ایک فرض سے تو سبکدوش ہو گیا اور بے علم دو گناہوں کا مرتکب ہے۔ پس بتلائیے دو گناہ زیادہ ہیں یا ایک یقیناً دو گناہ زیادہ ہیں البتہ جاننے والے کا عملی گناہ نہ جاننے والے کے عمل گناہ سے اشد ہوگا مگر جاننے والا بے علمی کے گناہ سے محفوظ ہوگا اور جاہل بلا عذر کو بے علمی کا گناہ بھی ہوگا۔ پس لازم ہے کہ عزم عمل کا انتظار نہ کرے بلکہ احکام دریافت کرتا رہے جب عمل کی توفیق ہوگی اس وقت یہ علم کام آوے گا۔ جیسا کہ کسی خارشی نے علاج تو نہیں کیا مگر مجرب نسخہ یاد کر لیا ہے۔ سو یہ بھی مفید ہے کیونکہ جب کبھی اس کو علاج کی طرف توجہ ہوگی تو نسخہ پاس موجود ہے علاج کر لے گا اور اگر نسخہ بھی یاد نہیں تو مشقتیں اٹھانا پڑیں گی۔ ایک نسخہ تلاش کرنے کی اور دوسرے دوا استعال کرنے کی۔ پس اسلم یہی ہے کہ ہر حال میں احکام شرعیہ معلوم ہو جاویں۔ (الفصل والانفصال ج ۲۱)

امراض باطنی کو مرض نہ سمجھنا جہالت ہے:

امراض جسمانی کو تو لوگ مرض سمجھتے ہیں مگر روحانی مرض کو مرض ہی نہیں جانتے۔ اگر کسی

کودق یاسل ہو جائے تو مزاج پرسی کے جواب میں مریض ہونا ظاہر کیا جاوے گا اور اگر ان امراض مذکورہ سے محفوظ ہوں تو ہمیشہ یہی کہتے رہتے ہیں کہ الحمد للہ اچھا ہوں چاہے باطن میں کتنے ہی امراض ہوں۔ امراض باطنہ کی تو پرواہ ہی نہیں کی جاتی۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

چند خوانی حکمت یونانیاں   حکمت ایمانیاں راہم بخواں
صحت ایں حس بجوئید از طبیب   صحت آں حسن بجوئید از حبیب

یونانی حکمت کی کتابیں کب تک پڑھتے رہو گے۔ کچھ حکمت ایمانی یعنی معرفت پڑھو۔ اس حس جسمانی کی درستی چاہتے ہو تو طبیب جسمانی سے رجوع کرو۔ اور اگر حس روحانی کی درستی منظور ہے تو مرشد کامل سے رجوع کرو۔ (شفاء العی ج ۲۱)

امراض جسمانی سے روحانی امراض اشد ہیں

مرض جسمانی پر تو ثواب دیا جاتا ہے بخار سے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جیسے خزاں میں درختوں سے پتے گرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر کسی کے کانٹا لگ جاوے اس پر بھی حق تعالیٰ اجر عطا فرماتے ہیں بخلاف اس مرض روحانی کے کہ اس میں ثواب تو در کنار الٹا خدا کے غضب اور عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے مگر افسوس کہ اسکو بیماری ہی نہیں سمجھتے حتی کہ اس کی سزا کو دیکھ کر ذہن میں یہ بات نہیں آتی چنانچہ جب کوئی جسمانی بیماری ہم کو لاحق ہوتی ہے تو یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ ہمارے افعال کا نتیجہ ہے بلکہ آب و ہوا خراب ہونے کی طرف گمان کیا جاتا ہے اور اسی کی صفائی کا اہتمام ہوتا ہے اور امراض باطنہ کی طرف اور اصلاح اعمال کی جانب اصلاً توجہ نہیں کرتے حالانکہ بعض امراض جسمانیہ مسبب ہو جاتے ہیں امراض روحانیہ یعنی معاصی اور سبب نہیں ہوتے امراض روحانیہ کے کیونکہ وہ اپنی ذات میں رحمت ہیں۔ البتہ اگر سوءِ فہم سے مرض میں شکایت کی تو اس عارض کے سبب گناہ نہ ہوگا۔ باقی فی نفسہ مرض جسمانی سبب رحمت ہی ہے۔ عدم تحمل سے کوئی سخت کلمہ کہہ دیا۔ سو یہ قبح بالواسطہ ہے کہ جو اس کے تصرف سے پیدا ہو گیا غرض امراض جسمانی اور امراض روحانی میں ایک طرف سے سببیت و مسببیت کا خاص علاقہ ہو جاتا ہے جیسا کہ خود امراض جسمانی بھی ایک دوسرے مرض میں علاقہ قائم کیا جاتا ہے مثلاً زکام کو بخار کا سبب قرار دیکر زکام کا علاج کرتے ہیں مگر روحانی اور جسمانی مرض میں علاقہ کا اعتقاد نہیں کرتے حالانکہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَمَآ اَصَابَکُم

مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ ۔ یعنی تم کو جو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کی بدولت ہے پس معلوم ہوگیا کہ امراض روحانی یعنی معصیت بھی سبب ہوجاتا ہے امراض تکالیف جسمانی کا بعض روایا تکا ترجمہ کرتے ہوئے مولانا رومی کا ارشاد ہے

ابر ناید از پئے منع زکوٰت　　　وز زنا افتد وبا اندر جہات

زکوٰۃ ادا نہ کرنے سے بادل نہیں آتے اور زنا سے پورے اطراف میں مصیبت آجاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس میں جوڑ نہیں۔ (شفاء العی ج ۲۱)

بزرگوں سے امور دنیا میں مشورہ لینے کی مثال

بزرگوں سے ان کاموں میں مشورہ لینے کی وہی مثال ہے جیسا کہ سنار سے کھرپا بنوانا۔ اللہ والوں کا کام دین سکھانے کا ہے یہ کام ان سے نہ لینا چاہئے۔ یہ تو دنیاداروں کا برتاؤ ہے اور جو دیندار ہو وہ بزرگوں سے تعبیر کا کام لیتا ہے حالانکہ اس کو بزرگی سے کیا علاقہ اگر تعبیر دنیا کوئی بزرگی کی بات ہوتی تو ابوجہل بھی بزرگ ہوتا کیونکہ وہ بڑا معبر مشہور تھا۔ بات یہ ہے کہ جس کو کشف یا علم تناسب سے مناسبت ہوتی ہے وہ تعبیر اچھی دے سکتا ہے مگر یہ امر بزرگی سے الگ ہے بزرگی یہ ہے کہ اللہ کا ہوجاوے چاہے ساری عمر میں ایک مرتبہ بھی کشف وفراست نہ ہو۔ غرض بزرگوں کو تعبیر کی تکلیف دینا بھی زیبا نہیں پھر ان میں جو منتظمیں وہ حقیقت پر مطلع ومتنبہ کردیتے ہیں اور جو زیادہ خلیق ہیں ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

کشند از برائے دلے بارہا　　　خورند از برائے گلے خارہا

ایک دل کی دلداری کے لئے باربار بوجھ اٹھاتے ہیں اور ایک پھول کے لئے بہت کانٹے کھاتے ہیں۔ (شفاء العی ج ۲۱)

اموال اور اعمال کی نسبت ہماری طرف مجازی ہے

جہاں کہیں اموال اور اعمال کی اضافت ہماری طرف کردی گئی ہے یہ صرف ہمارا جی خوش کرنے کے فرمادیا گیا ہے کہ یہ تمہاری چیز ہے۔ نیز انتظام تمدن کے لئے یہ نسبت لگادی گئی ہے کیونکہ اگر نسبت بھی نہ ہوتی تو میری ٹوپی آپکے ہاتھ میں ہوتی اور آپ کا عمامہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو اس صورت میں انتظام کیونکر ہوتا جو چیز آپ کے ہاتھ میں وہ بھی خوشخدا کی جو

میرے ہاتھ میں وہ بھی خدا کی اور بندے خدا کے سب برابر تو اب انتظام کیسے ہوتا اس لئے حق تعالیٰ نے ایک گونہ نسبت ہمارے ساتھ ان چیزوں کی فرمادی تاکہ نظام عالم درست رہے جب اس نسبت کے ہوتے ہوئے یہ حالت ہے کہ دن رات مقدمات عدالتوں میں بھرمار رہتی ہے تو عدم نسبت کی حالت میں تو کیا کچھ نہ ہوتا۔ غرض یہ نسبت محض مجازی ہے جو بمصلحت قائم کی گئی ہے حتی کہ جن چیزوں سے اسباب ظاہری کے اعتبار سے بھی یہ نسبت زائل ہوجاتی ہے وہاں بھی انتظام کیلئے ایک نہ ایک نسبت باقی رہتی ہے۔ (القرض ج۲۱)

خودکشی کے حرام ہونے کا راز:

خودکشی حرام ہے اس لئے کہ جان ہماری ملک نہیں خداتعالیٰ کی ملک ہے اس میں ناجائز تصرف کا ہم کو اختیار نہیں اسی لئے مال میں بھی ہر قسم کا تصرف جائز نہیں ہر جگہ صرف کرنے کے ہم مجاز نہیں کیونکہ ہم محض تحویلدار ہیں مالک ومختار نہیں لیکن اتنا فرق ہے کہ دنیا میں اگر کوئی خزانچی ہوتا ہے تو خزانچی کو کم ملتا ہے اور تحویل ساری گورنمنٹ یا مالک ہوتی ہے اور یہاں اگر دس لاکھ آپ کی تحویل میں ہیں تو مشکل سے ایک ایک لاکھ کی تقسیم کا حکم فرمایا گیا ہوگا اور نو لاکھ پورے آپ ہی کو دیدیئے کہ اپنے صرف میں لاؤ اسی سے تو دھوکہ ہوا کہ ہم یوں سمجھ بیٹھے کہ یہ ہمارا مال ہے اگر تھوڑا سا آپ کو دیکر سارا لے لیا جاتا تو اس وقت آنکھیں کھلتیں کہ ہم مالک نہیں تحویلدار ہیں اب اس رحمت سے دھوکا میں پڑ گئے اور جو لوگ شریف النفس ہوتے ہیں وہ تو رحمت سے اور پگھل جاتے ہیں اور ہماری یہ حالت ہے ؎

چو با سفلہ گوئی بلطف و خوشی   فزوں گرددش کبر و گردن کشی

جب کسی بدذات سے بات کرتے ہیں لطف وخوشی سے تو وہ تکبر اور غرور سے کہیں بڑھ جاتا ہے

(القرض ج۲۱)

قرض کی فضیلت:

ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کے دروازے پر لکھا دیکھا کہ قرض میں ایک کے عوض اٹھارہ ملیں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریلؑ سے پوچھا کہ اے جبریلؑ یہ کیا بات ہے کہ قرضہ کا ثواب صدقہ سے زیادہ کیا اچھا جواب دیا کہ صدقہ تو شخص بھی لے لیتا ہے جس کو ضرورت نہ ہو اور قرض وہی لیتا

ہے جس کی جان پر آبنی ہو تو ایسے شخص کی امداد زیادہ فضیلت ہے صاحبو! اس وقت نہ معلوم کتنے اللہ کے بندے ہوں گے جن کی جان پر بن رہی ہے مگر ہمیں کیا ہم تو آرام سے دونوں وقت کی کھاتے پیتے ہیں اور رات کو سو رہتے ہیں

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست   حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(اے وہ شخص جس کے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ان شیروں کا حال کیا جان سکتا ہے جو کہ اپنے سروں پر مصیبت کی تلوار کے زخم پر زخم کھائے جاتے ہیں)

مصیبت زدہ کی تکلیف کا اندازہ ناز پروردہ کیسے کر سکتا ہے تو ایسے لوگوں کو اول تو مفت امداد دینی چاہئے اور اگر کسی پر یہ گراں ہو تو میں سہل طریقہ بتلاتا ہوں کہ قرض ہی سے ان کی امداد کرو۔ (القرض ج ۲۱)

ما انا علیہ و اصحابی کا مفہوم:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری امت کے بہتر فرقے ہوں گے جس میں سے جنت میں ایک جائے گا وھوا ما انا علیہ و اصحابی اور فرقہ وہی جو میری اور مرے صحابہ کی طرز پر ہو اور ما انا علیہ و اصحابی صرف نماز روزہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ معاشرت کو بھی عام ہے اور یہاں سے میں ایک شبہ کو رفع کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ شاید کوئی صاحب اعتراض کریں کہ آج کل تو کوئی بھی ما انا علیہ و اصحابی پر پورا عامل نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ باریک کپڑے یہ طرز و انداز لباس کا جواب ہے کہاں تھا یہ سواریاں ریل وغیرہ کہاں تھیں تو سمجھ لو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے موافق ہو یا قول کے تو اگر ایک عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے مطابق نہیں مگر قول کے مطابق ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً اس کی اجازت دی ہے تو وہ بھی ما انا علیہ و صحابی میں داخل ہے تو اب یہ شبہ جاتا رہا ما انا علیہ و اصحابی کے خلاف وہ عمل ہوگا جو نہ عمل رسول صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ کے مطابق ہو نہ قول سے اس کی اجازت نکلتی ہو جو کام دونوں کے خلاف ہوگا وہ البتہ مخالفت ما انا علیہ و اصحابی کا مصداق ہوگا۔ (القرض ج ۲۱)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذکاوت

آج کل کے شیعوں اور جاہل صوفیوں کے دل میں بھی وہی باتیں آتی ہیں جو پہلے لوگوں کے دل میں آتی تھیں۔ **تشابهت قلوبهم** (ان سب کے قلوب باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہیں) اومنشاء ان خیالات کا یہ تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذکاوت اور نور فہم اعلیٰ درجہ کا تھا ان کے قضاء یا فیصلے اور حکیمانہ اقوال بہت عجیب وغریب ہوتے تھے جس سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کچھ خاص اسرار دوسروں سے علیحدہ بتلائے ہیں اس وجہ سے یہ سوال کیا گیا جس کا جواب حضرت علیؓ نے بڑی تاکید کے ساتھ قسمیں کھا کر یہ دیا **والذی برأ النسمة وفلق الحبة ماخصّنا رسول الله علیه وسلم بشی الامافی هذه الصحیفة اوفهماً اوتیه الرجل فی القرآن** قسم اس ذات کی جس نے جان کو پیدا کیا اور دانہ کو پھاڑا (اور اس میں سے درخت وغیرہ کو نکالا) کہ ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کے ساتھ خاص نہیں کیا مگر وہ باتیں جو اس صحیفے میں ہیں یا وہ فہم جو انسان کو قرآن سمجھنے کے عطا ہوا اور صحیفہ میں تو بعض احکام زکوٰۃ اور صدقہ کے متعلق تھے جو دیگر صحابہ کو بھی معلوم تھے اور فہم ایسی چیز ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دینے کی نہ تھی ہاں یہ نعمت حق تعالیٰ کے دینے کی تھی۔ حضرت علیؓ کے جواب کا حاصل ظاہر ہے یعنی جن لوگوں کا میری نسبت یہ خیال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خاص علوم بتلائے ہیں یہ خیال بالکل غلط ہے البتہ حق تعالیٰ نے مجھے قرآن کی فہم عطا فرمائی ہے جس وجہ سے یہ عجیب وغریب فیصلے اور حکیمانہ اقوال میری زبان سے نکلتے ہیں۔ مگر بعض لوگ پھر بھی ایسی بھدی طبیعت کے تھے کہ ان کا خیال نہ بدلہ اور انہوں نے یہ نہ سمجھا کہ حضرت علیؓ تقیہ کرتے ہیں اور بات کو چھپانا چاہتے ہیں چنانچہ اب بھی بعض نادانمعتقد اپنے شیخ کے بارے میں کچھ سے کچھ خیال پکا لیتے ہیں اور اگر وہ اس کی تردید کریں تو یوں کہتے ہیں کہ یہ حضرت کی تواضع ہے۔

ابوطالب کو آپ کی حمایت سے نفع:

ابوطالب کے بارے میں حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوطالب نے آپ کے ساتھ بہت جان نثاری کی ھی اس سے کچھ نفع

بھی ہوا آپ نے فرمایا **نعم لولا انا لکان فی الدّرک الاسفل من النار والاٰن فی رجله نعلان من النار یغلی به دماغه** (کما قال) کہ بے شک ان کو میری نصرت وحمایت سے نفع ہوا ہے اگر میں نہ ہوتا تو وہ جہنم کے نیچے والے طبقے میں ہوتے اور اس وقت صرف ان کے پیروں میں دو جوتیاں آگ کی ہیں جن سے ان کا بھیجا پکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود پھر بھی افسوس کے ساتھ یہی کہا جاتا ہے کہ ابوطالب کی طبعی محبت کام نہ آئی کیونکہ اصل نفع تو یہ ہے کہ جہنم سے نجات ہوجائے سو یہ ان کو حاصل نہیں ہوا۔ باقی عذاب کم ہوجانا یہ بھی اگرچہ ایک قسم کا نفع ہے جس کا نفع ہونا خود ان کو بھی معلوم نہ ہوگا کیونکہ اس وقت وہ اگرچہ پوری طرح آگ میں نہیں ہیں صرف آگ کی دو جوتیاں ان کے پیروں میں ہیں جن سے ان کا دماغ پکتا ہے مگر وہ اب بھی یہی سمجھتے ہوں گے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو عذاب نہیں۔ تیسری دلیل کفار کے عذاب متفاوت ہونے کی عقلی ہے وہ یہ کہ بعض کفار بہت ظالم ہوتے ہیں بعضے رحمدل ہوتے ہیں بعضے خائن وغاصب ہوتے بعضے دیانتدار اور سخی ہوتے ہیں کوئی فرعون ہے کوئی غریب کمزور تو ظاہر یہ ہے کہ ان کے عذاب میں بھی تفاوت ہوگا مگر جتنا جس کے لئے تجویز ہوجائے گا پھر اس سے کم نہ ہوگا اور ابدالاباد کے لئے جہنم سے نکلنا بھی نصیب نہ ہوگا۔ (تحقیق الشکر ج ۲۱)

مطعم بن عدی کا شکریہ:

فرمایا **لو کان مطعم بن عدی حیاً و کلّمنی فی ھو لاء النتنی لترکتھم له**۔ کہ اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور مجھ سے ان سڑیل کافروں کی نسبت کچھ کہتے تو میں ان کی خاطر ان سب کو چھوڑ دیتا اوفدیہ معاف کردیتا۔ راوی حدیث اس حدیث کو بیان کرکے اخیر میں کہتے ہیں یشکرله کہ اس بات سے ہے آپ مطعم بن عدی کے ایک احسان کا شکریہ ظاہر فرمانا چاہتے تھے اور وہ احسان یہ تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے واپس ہوئے اور اہل طائف نے ایمان قبول نہ کیا آپ کے ساتھ گستاخی سے پیش آئے اور لڑکوں شریر کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگا دیا کہ وہ کمبخت آپؐ کے اوپر ڈھیلے پتھر پھینکتے تھے تو آپ وہاں سے مغموم ہوکر لوٹے اور مکہ کے قریب آکر ٹھہرے اور مطعم بن عدی کو یہ کہلا کر بھیجا کہ میں مکہ میں داخل ہوتے ہوئے ڈرتا ہوں کہیں مکہ والے مجھ کو ایذا نہ دیں اگر تم مجھ کو اپنی پناہ میں لے تو میں مکہ میں آجاؤں چنانچہ مطعم بن عدی نے بیت اللہ میں کھڑے ہوکر کفار

مکہ سے خطاب کر کے کہدیا کہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو میں نے پناہ دی ہے وہ میری حمایت میں ہیں خبردار ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچائے اس کے بعد آپ مکہ میں تشریف لائے۔ تو غزوہ بدر میں آپ کو اس کا یہ احسان یاد آ گیا اور یہ فرمایا کہ اگر آج وہ زندہ ہوتا اور ان سڑیل کافروں کی سفارش مجھ سے کرتا تو میں اس کی سفارش قبول کر لیتا اور ان سب کو چھوڑ دیتا تو جب آپ غیروں کا اتنا احساس مانتے تھے تو اپنوں کو تو آپ کہاں بھول جاتے۔ ایک تو یہ مقدمہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ نصوص سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ شکر کا تتمہ یہ بھی ہے کہ اگر وہ محسن نہ ہو تو اس کی اولاد کے ساتھ احسان کیا جائے۔ (تحقیق الشکر ج۲۱)

حضرت علیؓ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب حسی:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت علیؓ سے بہت تعلق تھا جس کو آپؐ نے مختلف عنوانات سے مختلف اوقات میں ظاہر بھی فرمایا ایک دفعہ ارشاد فرمایا **من کنت مولاہ فعلی مولاہ** جس کا میں دوست علی بھی اس کے دوست ہیں اسکے بعد حضرات صحابہ نے نہایت مسرت کے ساتھ حضرت علیؓ کو مبارک باد دی کہ انت مولانا کہ آپ ہمارے دوست (یا آقا) ہیں۔ ایک بار فرمایا **انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ** تم کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰؑ سے تھی۔ حضرات شیعہ اس کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں اس سے حضرت علیؓ کی خلافت بلا فصل کا مسئلہ نکالتے ہیں۔ اس وقت میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا مگر ان احادیث سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت علیؓ سے قرب اور تعلق بہت تھا اور قرب حسی تو ضرور ان سے زیادہ تھا۔

حضرت صدیق اکبرؓ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب معنوی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد تمام صحابہ پریشان ہو گئے اگر کوئی شخص مستقل رہنے والا ثابت قدم تھا تو وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے اس وقت تمام صحابہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ واقعی ابوبکر صدیقؓ ہم سب سے افضل اور اعلم ہیں صحابہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ایک عجیب بات معلوم ہوتی تھی اس وقت ان کے خیال سے وہ آیات بھی غائب ہو گئیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا ذکر تھا کہ آپ کا بھی وصال ہو جائے گا جیسا

کہ دوسرے انبیاء گزر گئے اور عام لوگ وفات پاتے ہیں جس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ممبر پر کھڑے ہو کر یہ آیات پڑھی۔ **وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افائن مات اوقتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علٰی عقبیه فلن یضر اللّٰه شیئا وسیجز ی اللّٰه الشکرین** (اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نرے رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے اور بھی بہت رسول گزر چکے ہیں سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا شہید ہی ہو جائیں تو کیا تم کل الٹے پھر جاؤ گے اور جو شخص الٹا پھر بھی جائے گا تو خدا تعالیٰ کا نقصان نہ کرے اور اللہ تعالیٰ جلد ہی ثواب دیدیگا شکر گزار لوگوں کو) اور

انک میت وانهم میتون ثم انکم یوم القیٰمة عند ربکم تختصمون (آپ کو بھی مرنا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے پھر قیامت کے روز تم مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کرو گے) اس وقت صحابہ کی آنکھیں کھل گئیں اور سب کی زبانوں پر یہی آیتیں تھیں یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیتیں گویا آج ہی نازل ہوئی ہیں۔ حضرات صوفیہ نے اس واقعہ کا راز بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی آپ سے بعد نہ ہوا تھا جیسا قرب حیات میں تھا وصال کے بعد بھی ویسا ہی حاصل تھا اس لئے ان کو دوسرے صحابہ کی طرح بدحواسی اور زیادہ پریشانی نہیں ہوئی وہ اسی طرح مستقیم رہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مستقیم تھے یہی وجہ ہے کہ حدیث میں حضرت عمرؓ کے لئے آیا ہے **لو کان بعدی نبیاً لکان عمر** اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے اور حضرت صدیقؓ کے بارے میں یہ بات نہیں فرمائی اس کے جواب مختلف طور پر علماء نے دیئے ہیں مگر مجھ کو اپنے استاذ کا جواب زیادہ پسند ہے۔

وللناس فیما یعشقون مذاهب (تحقیق الشکر ج ۲۱)

توکل سے اطمینان اور سکون قلب حاصل ہوتا ہے:

حضرت بہلولؒ سے کسی نے کہا کہ روٹی گراں ہوگئی کہا ہم کو کیا فکر ہے ہماری روٹی کا ذمہ انہوں نے لیا ہے اور ہم پر عبادت فرض کی ہے کہ ہم کو عبادت میں لگنا چاہئے روٹی وہ آپ دیں گے۔ (التنبه ج ۲۱)

دین کے دسویں حصہ پر عمل کا مفہوم:

یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جس کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک وہ زمانہ آوے گا کہ دسواں حصہ بھی اگر کوئی عمل کرے گا تو اس کی نجات ہو جاوے گی۔ مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں پانچ وقت کی نماز فرض تھی تو اب نصف وقت کی نماز کافی ہوگی۔ یعنی اگر فرض و وتر کا مجموعہ بیس رکعتیں ہوں تو دو رکعتیں کافی ہو جاویں۔ چونکہ یہ شبہ ہو سکتا تھا اس لئے میں اس حدیث کی توضیح کرتا ہوں کہ یہ تخفیف کیفیت کے اعتبار سے ہے نہ کہ کمیت کے اعتبار سے یعنی اعمال میں جو خلوص اس وقت تھا اگر اس وقت نو حصہ کم بھی ہو تو نجات ہو جائے گی۔ تو یہ خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت ہم پر ہے کہ ہم زمانہ تخفیف میں پیدا ہوئے۔ یہ تو تخفیف کا بیان ہے۔ (فوائد الصحبہ ج ۲۱)

ولی کا صحابہ کے برابر نہ ہونے کا راز:

غیر صحابی خواہ کتنا ہی بڑا ہو جاوے لیکن صحابی کے برابر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت غوث الاعظمؒ سے حضرت امیر معاویہؓ کی بابت پوچھا گیا تو فرمایا کہ اگر معاویہ گھوڑے پر سوار ہوں اور اس کے پیروں کی گرد اڑ کر اس گھوڑی کی ناک پر جا بیٹھے تو حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کی وہ ناک کی گرد عمرو بن عبدالعزیزؒ اور اویس قرنیؒ سے افضل ہے۔ ہم کو اس فتوے کی قدر نہیں ہے مگر اہل محبت جانتے ہیں کہ حضرت غوث الاعظمؒ نے کیا بات فرمائی۔ قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔ (گوہر کی قدر بادشاہ جانتا ہے یا جوہری جانتا ہے) تو صحابہ میں بڑی بات یہ تھی کہ وہ حضرات پورے عاشق تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے علمی عملی وہ اصلاح کی کہ نہ کوئی فلسفی اپنی قوم کی کر سکا اور نہ کوئی سلطان اپنی رعایا کی کر سکا کیونکہ ان کے پاس تو نور ہی دوسرا تھا جس کو فرماتے ہیں۔ **اومن كان ميتا فاحيينا ہ وجعلنا له نورا يمشى به فى الناس** (کیا جو مردہ ہو پس اس کو ہم زندگی بخشیں اور اس کے لئے ایک نور کر دیں کہ وہ اس کو لوگوں میں لئے پھرتا ہے) اس کو نور سے تعبیر کیجئے یا برکت صحبت کہئے سب کا خلاصہ ایک ہی ہے۔

عباراتنا شتّى وحسنک واحد   وكل الىٰ ذاک الجمال بشير

(ہمارے عنوانات بیان مختلف ہیں مگر تیرا حسن ایک ہی ہے ہر عنوان اسی حسن کی طرف اشارہ کرتا ہے)

اگر ہم بھی اس مقام پر پہنچنا چاہیں جس پر صحابہ تھے (یعنی باعتبار عطا کے کیونکہ وہ جاہ تو ہم کو کہاں نصیب) (فوائد الصحبہ ج ۲۱)

طلاق کا ایک اہم مسئلہ:

لفظ اختاری (اختیار کر تو) کنایات میں سے اس کو باب الکنایات میں دیکھ کر بعض لوگوں کو ہی لغزش ہوئی کہ وہ یہ سمجھے کہ اگر کوئی اپنی بیوی کو بہ نیت طلاق یہ لفظ کہہ دے تو طلاق ہو جاوے گی۔ حالانکہ یہ مسئلہ ایک تو بات تفویض طلاق سے متعلق ہے اور دوسرے باب کنایات سے تو باب کنایات میں تو یہ لکھا ہے کہ کنایہ ہے اور باب تفویض میں یہ لکھا ہے کہ وقوع کی شرط یہ ہے کہ عورت اخترت نفسی (میں نے اپنے نفس کو اختیار کیا) بھی کہے اور اگر عورت کچھ نہ کہے تو مرد کے صرف اختیاری کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی اسی لئے میں نے ان شافعی المذہب سے انکار کر دیا۔ اور مولوی طیب صاحب عرب شافعی کا نام بتلا دیا تھا کیونکہ دیانت کی بات یہی تھی اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہیں کہ جب تک کامل شیخ اس کے غوامض پر مطلع نہ کرے اس وقت تک وہ حل نہیں ہوسکتیں اس لئے صحبت کی حاجت ہوئی۔ سو ایک ضرورت تو صحبت کی اصلاح علمی کے لئے ہے۔ (فوائد الصحبہ ج ۲۱)

اسلام میں حرج نہیں:

مولانا فضل الرحمٰن صاحب علیہ الرحمۃ سے ایک شخص نے آ کر پوچھا کہ ایک عورت کا شوہر گم ہو گیا ہے۔ مولوی صاحبؒ نے فرمایا کہ مرد کی نوے برس کی عمر تک انتظار کرو۔ کہنے لگا کہ جناب اس میں تو بڑا حرج ہے اور دین میں حرج نہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ بھائی اگر یہ حرج ہے تو جہاد میں بھی حرج ہے۔ سو حرج کے یہ معنی نہیں۔ حرج کہتے ہیں پریشانی اور الجھن کو سو اسلام میں یہ نہیں۔ ہاں تعب و مشقت ہے تو کیا دنیا کے کاموں میں تعب اور مشقت نہیں ہے۔ (فوائد الصحبہ ج ۲۱)

عامل شریعت کو پریشانی نہیں ہوتی:

واللہ جو شخص شریعت پر عمل کرے گا تمام پریشانیوں سے نجات میں رہے گا۔ اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ ہم بہت دینداروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اکثر تکلیف میں رہتے ہیں مثلاً ان کی

آمدنی کم ہوتی اور خرچ تنگی سے ہوتا ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ تکلیف جسم پر ہے روح پر نہیں اور پریشانی ہوتی روح کی تکلیف سے پس اس کی مثال دلدادگان شریعت کے اعتبار سے ایسی ہے جیسے کسی عاشق سے کوئی مدت کا بچھڑا ہوا محبوب ملے اور دور ہی سے دیکھ کر یہ محب اس کو سلام کرے اور اس کے گلے سے لگا لینے کا متمنی ہوا اور اس کی عین تمنا کے وقت وہ محبوب دوڑ کر اس کو گلے سے لگا لے اور اس قدر زور سے دبا دے کہ اس کی ہڈیاں بھی ٹوٹنے لگیں۔ اب میں اہل وجدان سے پوچھتا ہوں کہ اس دبانے سے عاشق کو کچھ تکلیف ہوگی یا نہیں۔ یقیناً یہ تکلیف ہوگی لیکن یہ ایسی تکلیف ہے کہ ہزاروں راحتیں اس تکلیف پر قربان ہیں۔ اگر عین اسی تکلیف کی حالت میں محبوب کہے کہ اگر تجھ کو کچھ تکلیف ہو تو چھوڑ دوں اور جو تیرا رقیب سامنے موجود ہے اس کو اسی طرح دبا لوں تو وہ کیا جواب دے گا۔ ظاہر ہے یہ جواب دے گا کہ

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہو۔ دوستوں کا سر سلامت رہے کہ آپ اس پر خنجر آزمائی کریں) (فوائد الصحبہ ج ۲۱)

ویرانہ کا اصل سبب معاصی ہیں

صاحبو! یہ مسلم ہے کہ اُلو ویرانہ کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں کہ ویرانہ اس کے آنے سے پیدا ہو بلکہ ویرانہ دیکھ کر وہ آیا اور خود ویرانہ آپ کے اعمال بد سے ہوا تو منحوس ہم ہوئے نہ کہ وہ۔ ہم کو اپنی نحوست اس کے اندر نظر آتی ہے۔ پس ہماری مثال اس حبشی کی سی ہے کہ راستے میں ایک آئینہ پڑا ہوا پایا' اس نے جو اپنی صورت دیکھی تو بہت خفا ہوئے اور آئینہ کو زمین پر پٹک دیا کہ لاحول ولاقوۃ ایسا بدصورت تھا جب تو پھینک گیا۔ سو اس نے اپنی زشتی کو اس کی زشتی سمجھا' اُلو بے چارہ ایک صوفی منش جانور ہے کہ خلوت کو پسند کرتا ہے اگر آپ نظر کو عمیق کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ آپ کے لیے واعظ ہے کہ آپ کو آپ کے گناہوں پر آگاہ کرتا ہے جن سے ویرانہ پیدا ہوا یا ہونے والا ہے اور اصل سبب ویرانہ کا معاصی ہیں جب آپ کو خود کسی طرح متنبہ نہیں ہوتا تو اُلو آن کر بولتا ہے جس سے آپ کے کان میں پڑ جائے کہ ہم نے ویرانہ بنا دیا ہے لیکن آپ نے اس کو غلط سمجھا کہ اُلو کے بولنے کو اس کا سبب سمجھا۔ اس کا سبب معاصی ہیں ان کا علاج استغفار ہے اس کو اڑانے اور مارنے سے کیا ہوگا اگر حبشی نے

آئینہ کو پٹک کر توڑ دیا تو کیا صورت درست ہو گئی اس کو چاہیے کہ اگر کسی تدبیر سے کر سکے تو صورت درست کرے پھر اسی آئینہ کو دیکھے جس نے بری صورت دکھائی تھی اب وہی آئینہ اس کو اچھی صورت دکھائے گا۔ (تفصیل الذکر ج ۲۳)

مستورات کو بہشتی زیور کو سبقاً سبقاً پڑھنے کی ضرورت

اس کتاب کی تصنیف خاص عورتوں ہی کے واسطے ہوئی ہے۔ بیبیو اس کو ضرور پڑھو اور اپنی اولاد کو پڑھاؤ لیکن اتنی بات یاد رکھو کہ گو تم پڑھی لکھی ہو مگر بطور خود مطالعہ نہ کرو۔ بہشتی زیور کو سبقاً سبقاً پڑھو۔ اپنے خاوند سے یا اپنے بیٹوں سے کسی اور محرم سے اور کوئی بھی نہ ہو تو کسی عورت سے جس نے باقاعدہ کسی سے پڑھا ہو اور اس کتاب کو ہمیشہ اپنے مطالعہ میں رکھو۔ ایک دفعہ پڑھ لینے سے کچھ نہیں ہوتا اور پھر جب کوئی بات پیش آئے بہشتی زیور میں اس کالم کو تلاش کرو، اکثر تو اسی سے نکل آیا کریں گے اور اگر کوئی مسئلہ نہ ملے تو کسی مولوی معتبر سے پوچھے۔ اپنے خاوند سے یا کسی اور محرم سے زبانی دریافت کرالو یا آج کل تو سہل ترکیب یہ ہے کہ دو پیسے خرچ کرو اور بذریعہ تحریک چاہے جہاں سے جواب منگالو۔ یہ تو ان کے واسطے ہے جو پڑھی لکھی ہیں اور جو بیبیاں ناخواندہ ہیں وہ اپنی اصلاح اس طرح کریں کہ جہاں دنیا کے سینکڑوں کاموں کے وقت ہیں وہاں ایک دین کا بھی وقت مقرر کرلیں۔ چند بیبیاں بیٹھ جائیں اور ایک پڑھی ہوئی بی بی یا کوئی لڑکی یا محارم میں سے کوئی مرد بیٹھ جائے اور بہشتی زیور ورق ورق کر کے سنا ڈالے اور بیبیاں تھوڑی دیر کے لیے چخ چخ کو بند کر کے دھیان لگا کر سنیں اور پڑھنے والا ہر بات کو مناسب طریق سے سمجھائے۔ جب کتاب ختم ہو جائے تو پھر شروع سے دہراؤ۔ اسی طرح بار بار سنو اور پڑھو، گھر کے مرد اس بات کا خیال رکھیں کہ جو کچھ کتاب میں پڑھایا سنایا جاتا ہے عورتیں اپنے افعال میں اس کی کاربند ہیں یا نہیں اس طرح سارے گھر کی اصلاح ہو سکتی ہے نہ کہیں سکول میں جانے کی ضرورت رہی نہ مدرسہ میں۔ یہ سب داخل ہیں اس آیت میں "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا" (اے ایمان والو! کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرو)۔ (تفصیل الذکر ج ۲۳)

فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ. اِنَّ الشَّیْطَانَ جَاثِمٌ عَلٰى
قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ فَاِذَا ذَكَرَ اللّٰهَ خَنَسَ وَاِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ ○

’’جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! شیطان انسان کے دل سے چپکا رہتا ہے جب وہ دل سے اللہ کو یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب وہ ذکر اللہ سے غافل ہوتا ہے تو شیطان اس کے دل میں وسوسے ڈالتا ہے۔‘‘ (القاف ج ۲۲)

کسی چیز کی خاصیت جاننے کا نفع

ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چیزوں کی دو خاصیتیں بیان فرمائی ہیں۔ ان دو چیزوں کو سب جانتے ہیں لیکن ان کی خاصیتوں سے آگاہی کم ہے اور اس آگاہی نہ ہونے سے دو قسم کی مضرتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ جب کسی چیز کی خاصیت کا علم نہیں ہوتا تو اگر اس میں کچھ نفع ہے تو اس کے حاصل کرنے کی طرف رغبت نہیں ہو سکتی اور اگر اس میں نقصان ہے تو اس سے بچنے کی کوشش نہیں ہو سکتی۔ سنکھیا سے جو لوگ ڈرتے اور احتیاط کرتے ہیں اس کی وجہ علم خاصیت ہی ہے کہ جانتے ہیں کہ اس کا کھانا قاتل ہے ورنہ ممکن تھا کہ اس کی صورت اور رنگ اور آب و تاب کو دیکھ کر کسی نادان کو رغبت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بہت سی وہ چیزیں جن کی خاصیت معلوم نہیں ہے کھالی جاتی ہیں اور نقصان پہنچتا ہے۔ بہت دفعہ کسی نافع چیز کے دھوکے میں زہر کھالیا گیا ہے۔ مثلاً طباشیر سمجھ کر سنکھیا کھالیا گیا اور موت تک نوبت آ گئی۔ اس کی وجہ کیا ہے وہی جہل عن الخاصیت اسی طرح اعمال کی حالت ہے جس کام کا اثر معلوم نہ ہو عجب نہیں اس پر عمل کر لیا جائے جس کو یہ معلوم نہ ہو کہ گلے میں پھانسی ڈالنے سے مر جاتے ہیں عجب نہیں کہ وہ کبھی ایسا کر بیٹھے چنانچہ بعض جگہ لڑکوں سے ایسا بھی ہوا کہ ہنسی ہنسی گلے میں رسی ڈالی اور کھینچ لی اور ہنسی کی گل پھنسی ہو گئی اور قتل نفس ہو گیا۔ پس ثابت ہوا کہ مضر چیز سے بچانے کی تدبیر یہی ہے کہ اس کی خاصیت بتلا دی جائے اسی طرح نافع چیز کی حالت ہے کہ اس کی طرف رغبت جبھی ہو سکتی ہے جبکہ اس کی خاصیت اور منفعت معلوم ہو اور اگر کسی چیز کا فائدہ معلوم نہ ہو تو بسا اوقات ایسی ایسی مفید چیزیں پاس پڑی رہتی ہیں جو بہت قیمتی اور کام کی ہوتی ہیں مگر ان سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا‘ ناواقف کے ہاتھ بہت دفعہ ہیرے اور جواہرات آ گئے ہیں اور ان کو کوڑیوں میں دے دیا‘ اس کو یہ نقصان ہوا اور مشتری کو علم خاصیت کی وجہ سے یہ فائدہ پہنچا کہ لاکھوں روپیہ کی چیز کوڑیوں میں مل گئی۔ یہی حالت ہے۔ (القاف ج ۲۲)

اعمال کے خواص جاننے کے فائدے

علم خاصیت ہی ایک ایسی چیز ہے کہ آدمی کا نافع کی تحصیل میں جو ناگواریاں بھی پیش آئیں ان کو آسان کر دیتا ہے۔ دیکھئے بدمزہ دوا کی خاصیت اجمالاً مریض کو یا تفصیلاً طبیب کو معلوم نہ ہو تو مسہل کون دے جس کی بدمزگی دور کرنے کے لیے پان اور الائچی کی ضرورت ہوتی ہے بازو باندھے جاتے ہیں یہ سب کچھ اسی لیے کیا جاتا ہے کہ یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ایسی بدمزہ چیز قے ہو کر پیٹ میں سے نکل جائے پس اس کو آسان کرنے والی چیز اگر ہے تو وہی علم خاصیت ہے کہ اس دوا سے امید ہے کہ تندرست ہو جائیں گے۔ غرض کہ علم خاصیت ہی جالب نفع ہے اور علم خاصیت ہی منفعت ہے خاصیت نہ جاننے کا پہلا ضرر یہ ہے کہ بدون علم خاصیت کے استعمال نافع اور طرز المضر دونوں سے محرومی رہتی ہے اور دوسری مضرت یہ ہے کہ اگر بالفرض نافع کے استعمال سے محرومی بھی نہ ہوئی بلکہ اتفاقاً یا کسی کی تقلید سے اس کا استعمال بھی کر لیا تب بھی بدون علم خاصیت کے گو اجمالاً ہی معتد بہ نفع مرتب نہیں ہوتا گو ظاہر میں اس صورت میں خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس کو علم خاصیت کی ضرورت نہیں کیونکہ جو غرض تھی علم خاصیت سے یعنی استعمال نافع وہ اس کو حاصل ہے۔

لیکن میں اس صورت میں بھی یہی کہتا ہوں کہ علم خاصیت کی اس شخص کو بھی ضرورت ہے اور بلا اس کے اس کو پورا فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور یہ بات گو اول وہلہ میں بالکل اجنبی سی معلوم ہوگی خصوصاً طالب علموں کو کیونکہ ان کو ہر بات میں لم اور کیف کی ضرورت ہے مگر میں اس کو ایسا قریب الی الفہم کر دوں گا کہ انشاء اللہ تعالیٰ کچھ شک وشبہ باقی نہ رہے گا۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ اطباء دوا سے امراض کا علاج کرتے ہیں اور یہ بات مسلم ہے کہ دواؤں میں خواص ہیں لیکن تحقیق اطباء کی یہ ہے کہ گو دوا سے مرض کو آرام ہوتا ہے مگر فاعل دوا نہیں ہے بلکہ طبیعت فاعل ہے اسی واسطے معالجہ میں تقویت طبیعت کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی واسطے قوی الطبع شخص کو اثر دوا کا جلد ہوتا ہے اور ضعیف الطبع کو اثر دیر میں ہوتا ہے جوان آدمی کو جلد فائدہ پہنچتا ہے اور بڈھے کو دیر میں ایک مقدمہ تو اس کو سمجھئے یعنی گو دوا سے فائدہ پہنچتا ہے مگر فاعل طبیعت ہے اور اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملائے کہ جیسے مقوی دوا کے استعمال سے قوت آتی ہے۔ (القاف ج ۲۲)

مالیخولیا میں علاج سے کم نفع ہونے کا سبب

چنانچہ مالیخولیا میں جو نفع کم ہوتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ مریض کو اعتقاد نہیں ہوتا کیونکہ اعتقاد صحت خیال سے ہوتا ہے اور مالیخولیا فساد خیال ہی کا نام ہے اور اس کے جملہ خیالات فاسد ہیں بلکہ مجنون کو تو الٹی ہی سوجھتی ہے اسی لیے مجنون کے علاج میں بڑے ہوشیار اور عاقل طبیب کی ضرورت ہے تاکہ وہ تدبیر سے خیال کو بدلے۔ (القاف ج ۲۲)

مزاج میں لطافت کی زیادتی کا اثر

انسانوں میں سب سے بڑا آدمی بادشاہ ہوتا ہے جس کا استقلال اس درجہ ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی مہم سے بھی طبیعت میں تغیر نہیں آتا مگر بات کا اثر اس پر بھی ہوتا ہے بلکہ اوروں سے زیادہ ہوتا ہے اس زیادتی کی وجہ ضعف طبیعت نہیں ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ جوں جوں آدمی بڑا ہوتا جاتا ہے مزاج میں لطافت زیادتی آتی جاتی ہے اور لطافت زیادہ ہونے سے حس بڑھ جاتی ہے اور تو ادنیٰ شے سے بھی انفعال ہوتا ہے۔ بادشاہوں کی نسبت کہا گیا ہے: گاہے بسلامے برنجند دگاہے بدشنامے خلعت دہند۔

اعمال کی قسمیں

اعمال کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کے خواص عقل سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ عقل سے مراد ادراک حواس و عقل سب ہے کوئی عقل بالمعنی الفلسفی نہ لے اور دوسری قسم وہ جن کی خاصیت عقل سے معلوم نہیں ہو سکتی اور ان کی خاصیت کے معلوم ہونے کے لیے ایک چیز کی ضرورت ہے جو وراء العقل یعنی عقل سے بالاتر ہے اس کا نام وحی ہے اعمال شرعی اسی دوسری قسم کے اعمال ہیں جن کے منافع و مضار صرف وحی سے اور ارشاد انبیاء علیہم السلام سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ عقل ان کے ادراک کے لیے کافی نہیں۔ میری اس تقریر سے یہ خلجان رفع ہو جائے گا کہ بہت سے مذہبی کام محض اعتقاد سے مفید تسلیم کر لیے گئے ہیں جیسے نماز روزہ وغیرہ کہ مسلمان ہر روز پانچ مرتبہ دنیاوی کاموں کا حرج کرتا ہے اور ایک مہینہ تک بھوکا رہتا ہے ان میں اور ان کے نتیجہ متوقعہ میں علاقہ کیا ہے جس کی امید پر ان کو کیا جاتا ہے۔ (القاف ج ۲۲)

طبیب روحانی کا کمال

طبیب روحانی طبیب ظاہری سے زیادہ کامل بھی ہے کیونکہ طبیب ظاہری بہت سے امراض میں جواب بھی دے دیتا ہے اور طبیب باطنی کسی مرض کو لاعلاج نہیں کہتا' برے سے برے اور سخت سے سخت مرض کا علاج کرسکتا ہے۔ علاج کر کے دیکھو۔ پس اس سے بھی مزاحمت کا حق کسی کو نہیں۔ آج کل عجیب مذاق ہوگیا ہے کہ ذرا کسی نے پڑھ لکھ لیا اور اعمال شرعی میں دخل دینے کے لیے تیار ہوگیا اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عقل کی بات ہے حتیٰ کہ زبان پر بھی یہ لفظ آتا ہے کہ ہم ایسے بیوقوف نہیں ہیں کہ بلا سوچے سمجھے مان لیں اور اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ بلا علت معلوم کیے کسی بات کو تسلیم کرلیں اب تعلیم کا زمانہ ہے حیرت ہے کہ یہی بات ڈاکٹر اور طبیب سے کیوں نہیں کی جاتی ۔ (القاف ج ۲۲)

علوم شرعیہ کو مدرک بالوحی مان لینے کا عظیم نفع

حقیقت واقعیہ کسی چیز کی بھی ہم کو معلوم نہیں۔ بس ہم کو ایک حد پر قناعت ہوگئی ہے اس وجہ سے آگے تلاش نہیں کرتے اور جس حد کا علم ہوگیا ہے اسی کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہم اپنی ذات اور افعال تک کی حقیقت واقعیہ نہیں جانتے' آنکھ سے ہروقت دیکھتے ہیں مگر اس کی حقیقت نہیں بتاسکتے کہ دکھائی کس طرح دیتا ہے اس کی حقیقت سے صرف اسی درجہ پر قناعت کرلی ہے کہ آنکھ کھولتے ہی تو چیز دکھائی دے جاتی ہے اور اس پر ایسا شرح صدر ہے کہ اس میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا اور نہ ذہن اس سے آگے کبھی جاتا ہے اور اس کو بدیہی سمجھتے ہیں۔ جس کے لیے دلیل کی احتیاج ہی نہیں یہ اس قناعت ہی کا نتیجہ ہے ورنہ جن لوگوں نے اس کی تحقیق کرنی چاہی ان کو دیکھیے کس مصیبت میں پڑ گئے اور اس مسئلہ میں کتنے اقوال ہوگئے پھر بھی جس کو تحقیق کہتے ہیں وہ حق نہ ہوئی اس سے وہ قناعت ہی اچھی تھی اسی طرح علوم شرعیہ کو مدرک بالوحی مان لینے سے بہت سے بکھیڑوں سے نجات مل جاتی ہے اور اس کے بعد کوئی توجیہ مناسب بھی کردی جائے تو مزید اطمینان کا باعث ہے تو یہ بیان اہل علم کی غلطی کا ہوا۔ (القاف ج ۲۲)

مصلح کا اصل کام تعلیم دین ہے

علماء نائب انبیاء علیہم السلام ہیں جو طریقہ ان کا تھا وہی ان کا ہونا چاہیے ان کی تقلید یہ

کیسے ہوئی کہ اہل دنیا میں بھی دنیا کی تعلیم دیں اور اہل دین بھی دنیا ہی کی تعلیم دیں۔ آخر اس صورت میں دین کی تعلیم دینے کون آئے گا۔ شاید فرشتے آئیں گے لیکن اگر ایسا ہوا تو ان کے متعلق بھی مصلحان قوم کا فتویٰ یہی لگے گا کہ ان کو بھی تمدن ہی سکھلانا چاہیے۔ غرض دین کا نام نہ آنے پائے۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ طریقہ تو یہ اور دعویٰ انبیاء علیہم السلام کی تقلید کا۔ حضرت ان کی صحیح تقلید یہی ہے کہ دنیا کی تعلیم قدر ضرورت سے آگے نہ بڑھائی جائے اور یہ کہ اصلی کام مصلح کا تعلیم دین سمجھا جائے اور دنیا کی تعلیم دنیا والوں کے حوالہ کی جائے۔ نیز یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ انہوں نے تعلیم دنیا کس وقت میں کی جس وقت کی ضرورت تھی اور انسان کو کسی ذرا حاجت کا پورا کرنا نہیں آتا تھا۔ (القاف ج ۲۲)

صنعت گری کا پہلا استاد کوا ہے

دیکھو قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تو اتنی بات سمجھ میں نہ آئی کہ اس کی لاش کو کیسے چھپاؤں، کرنے کو تو کر گیا مگر اب اس کا چھپانا مشکل ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ سال بھر تک لاش کندھے پر لادے پھرا اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی جس کو کوئی آدمی جانتا نہ ہو وہ چاہے واقع میں کیسا ہی آسان کام ہو مگر مشکل ہوتا ہے۔ دیکھئے منہ میں لقمہ رکھنا بھی کام ہے مگر بچہ کتنے دنوں میں سیکھتا ہے۔ غرض بہت پریشان تھا اور ڈرتا تھا کہ آدم علیہ السلام کو خبر نہ ہو جائے، دو کوے لڑتے ہوئے، آئے قرآن شریف میں ہے کہ حق تعالیٰ نے ان دو کووں کو بھیجا، اللہ اللہ گناہ کے بعد بھی حق تعالیٰ ہی کی رحمت کی ضرورت ہوتی ہے یہ ان ہی کی شان ستاری ہے کہ گناہ گار کو فضیحت سے بچنے کی تدبیر بھی خود ہی بتاتے ہیں:

گنہ بیندو پردہ پوشد بحلم

(گناہ دیکھتا ہے اور حلم سے پردہ پوشی کرتا ہے)

غرض ایک کوے نے دوسرے کو مار ڈالا، پھر چونچ سے زمین کو کرید کر گڑھا کر کے اس میں اس کو سرکا کر مٹی برابر کردی، تب قابیل کی سمجھ میں آیا کہ یہ تدبیر عیب چھپانے کی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی خود بھی کیا اور اس بار سے سبکدوش ہوا اور بہت ہی خفیف ہوا کہ اتنی سی بات بھی مجھے نہ آئی۔ دیکھئے انسان اس وقت اپنی ضروریات کے پورا کرنے سے اس قدر عاری تھے ایسے وقت میں حق تعالیٰ نے بذریعہ انبیاء علیہم السلام کے دنیا کی ضروریات کا علم بھی دیا۔ اس

وقت پر قیاس کرنا محض غلط ہے جب وہ ضرورتیں پوری ہوگئیں تو منصب نبوت سے ان کو الگ کرلیا گیا اور اس قصہ سے معلوم ہوا کہ صنعت میں کوا قابیل کا بھی استاد ہے۔ (القاف ج ۲۲)

کلمہ طیبہ کے حصول خواص کے ضروری شرائط

ہر چیز کے اثر کے لیے تحقیق شرط اور ارتفاع مانع ضروری ہے تو حضور کے اس ارشاد "مَنْ قَالَ لَااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ" (جس شخص نے لا الہ الا اللہ "اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں" کہا وہ شخص جنت میں داخل ہوا) کا یہ مطلب کیوں نہیں لیا جاتا کہ اس میں تو خاصیت یہی ہے کہ جنت میں لے جائے مگر اس کے لیے کچھ شرائط اور موانع بھی ہیں۔ اگر موانع کا وجود یا شرائط کا فقدان ہوا تو اس کے وجود یا فقدان کے درجہ کے موافق یہ اثر ہوگا کہ لا الہ الا اللہ کا اثر باطل یا ضعیف ہوجائے گا اگر پورا معارض موجود ہوگیا جیسے کفر و شرک تو اس کا اثر بالکل باطل ہوجائے گا اور اگر پورا معارض موجود نہ ہوا جیسے معاصی تو اثر ضعیف ہوجائے گا۔ یہ تو اس معارض کا اثر ہے اور لا الہ الا اللہ کا اثر یہ ظاہر ہوگا کہ انجام کار جنت میں پہنچے گا۔ اب یہ مسئلہ بالکل بے غبار ہوگیا۔ خلاصہ یہ کہ لا الہ الا اللہ کا پورا معارض تو کفر ہے قولاً یا اعتقاداً اگر کوئی ساری عمر لا الہ الا اللہ کہتا رہا مگر کلمہ کفر بھی بکتا رہا یا کوئی عقیدہ کفر کا رہا تو بوجہ وجود قوی مانع کے لا الہ الا اللہ کا کچھ اثر نہیں ہوسکتا جیسے انڈے کھانے کے ساتھ فصد کھلوانے سے انڈے کا کوئی اثر نہ ہوسکا اور ناقص معارض گناہ ہیں اگر کوئی کلمہ پڑھنے کے ساتھ گناہوں میں بھی مبتلا ہو تو لا الہ الا اللہ کا اثر ضعیف ہوجائے گا لیکن کچھ نہ کچھ رہے گا اور وہ اس طرح ظاہر ہوگا کہ اول گناہوں کی سزا ہوگی پھر لا الہ الا اللہ کا اثر ظاہر ہوگا اور دخول جنت نصیب ہوگا۔ (القاف ج ۲۲)

ہر عمل کے الگ الگ خواص

اعمال میں جدا جدا خاصیت ہے اور اپنا اپنا اثر سب کرتے ہیں ان دونوں حدیثوں میں تعارض نہ رہا جس میں یہ ہے: "قَالَ لَااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ" وہ بھی ٹھیک ہے اور جس میں یہ ہے: "لَایَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِّنْ کِبْرٍ" (جس کے دل میں ذرا برابر کبر ہے وہ جنت میں داخل نہ ہوگا) وہ بھی ٹھیک ہے کلمہ کا وہ اثر ہے اور کبر کا یہ اثر ہے۔ ایمان موجب دخول جنت ہے اور کبر مانع دخول جنت تو اگر مانع ایسا قوی ہوا کہ پورا

معارض ایمان کا ہو گیا مثلاً حق تعالیٰ کی بندگی ہی سے انکار کر دیا تو ایمان کا اثر باطل ہو جائے گا اور اگر ضعیف ہوا تو بقدر اپنے وجود کے اثر کرے گا اور اخیر میں غلبہ ایمان کو رہے گا بالکل سمجھ میں آتی ہوئی بات ہے مگر مدعیان عقل نے حدیث "قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" میں اپنے مطلب کے واسطے من کو تو عام لے لیا کہ جو بھی لا الہ الا اللہ کہہ لے خواہ اعمال کرے یا نہ کرے اس کے لیے دخول جنت ثابت ہے لیکن اگر ان سے کہا جاتا ہے کہ اسی حدیث کے دوسرے لفظ یعنی دخل الجنۃ کو عام کیوں نہیں لیا جاتا جس سے یہ معنی ہو جاتے ہیں کہ دخول جنت بیشک ثابت ہے مگر عام ہے اس سے کہ ابتداء ہو یا بعد سزا و جزا ہو جو شخص سزا پا کر جنت میں جائے تو اس پر بھی تو دخل الجنۃ صادق ہے تو نہیں سمجھتے ذرا سی بات تھی کہ لفظ من کو عام لے کر دخل الجنۃ کو بھی عام لینا چاہیے پھر کوئی اشکال نہیں مگر نہیں سمجھتے اور یاد رکھو کہ ترجمہ دیکھنے سے یہ باتیں سمجھ میں نہیں آ سکتی ہیں ان کے لیے تو استاد کی ضرورت ہے۔ (القاف ج ۲۲)

وسوسہ گناہ کا مقدمہ ہے

ہر گناہ میں اول وسوسہ ہی ہوتا ہے پھر دل میں وہ خیال پکتا ہی جاتا ہے تو وسوسہ کوئی معمولی بات نہ ٹھہری بلکہ مقدمہ ہے گناہ کا ہاں اس پر گرفت نہیں ہے بلکہ جب تک عزم اور فعل میں نہ آ جائے مگر وسوسہ کے بعد اس کے فعل میں آ جانے کا اندیشہ تو ضرور ہے تو اس بھروسے پر رہنا کہ اس خیال کو ہم آگے نہ بڑھنے دیں گے خلاف عقل ہے جب نفس چل نکلا اور کئی درجے طے کر گیا تو پھر عین وقت پر نفس کو روکنا سخت مشکل ہے۔ جیسے گھوڑا جب چل نکلے اور تیزی میں آ جائے تو مقام منہی عنہ سے اس کو ایک فرلانگ پہلے سے روکنا چاہیے ورنہ اگر ایک دم روکو گے تو نہیں رکے گا بلکہ تم ہی گر پڑو گے۔ اسی طرح اگر نفس کو روکنا ہے تو بہت دور پہلے سے روکئے اس بھروسے نہ رہے کہ وسوسہ تو گناہ نہیں اور فعل کی نوبت ہم آنے نہ دیں گے نفس تو وہ چیز ہے کہ بڑے بڑے شاطروں کے قابو میں نہیں آتا کیونکہ گھوڑا تو ایک حیوان ہے جس کو عقل نہیں آپ کے قبضہ میں ہے جہاں چاہیں رک سکتا ہے۔ اپنی طرف سے وہ کوئی عذر رکنے میں نہیں کر سکتا۔ صرف وہ اپنی ایک طبعی بات سے مجبور ہے کہ تیز دوڑتے ہوئے ایک دم رک جانا اور بعض اوقات اس کو دشوار ہوتا ہے۔ نفس کی تو حالت یہ ہے اس کو آپ کے ساتھ دشمنی بھی ہے اور اس کی طبیعت بھی مکر بھی ہے وہ کوئی دقیقہ آپ کو نقصان پہنچانے میں اٹھا نہیں رکھتا اور اس کو وہ

تدبیریں آتی ہیں کہ بڑے بڑے عقل مند بھی ان کو سمجھ نہیں سکتے۔ ایسی حالت میں اس کی باگ کو ڈھیلا چھوڑ کر یہ امید رکھنا کہ موقع پر روک لیں گے خام خیال ہے۔ (القاف ج ۲۲)

اسرار شریعت

شریعت نے اس کا بہت لحاظ کیا ہے کہ جس عمل سے روکنا ہے اس سے بہت دور پہلے سے روکا ہے اسرار شریعت میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس قاعدہ سے کس قدر کام لیا گیا ہے۔ دیکھئے شریعت نے نماز عصر اور نماز فجر کے بعد نوافل سے منع کیا۔ اس واسطے کہ اگر اجازت دی جاتی تو ممکن تھا کہ ایسے وقت میں بھی لوگ نماز پڑھنے لگتے جو نماز کا وقت نہیں ہے یعنی عین طلوع اور عین غروب کے وقت اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ ممنوعات سے بچانے کے لیے شریعت نے پہلے سے انتظام کیا ہے اور دیکھئے حق تعالیٰ نے زنا کی حرمت اس لفظ سے بیان فرمائی ہے کہ **لاتقربوا الزنا** حالانکہ یہ لفظ بھی کافی تھا **لاتزنوا** یعنی زنا نہ کرو مگر بطور تاکید اور پیش بندی کے یہ لفظ اختیار کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ زنا کے قریب بھی مت جاؤ اور آدم علیہ السلام کو **اکل من الشجرہ** سے منع فرمانے کے لیے بھی "**لَاتَقْرَبَاهٰذِهِ الشَّجَرَةَ**" اختیار کیا گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے قریب بھی مت جاؤ اور ایک حدیث تو اس بارے میں صریح موجود ہے۔ "**مَنْ يَرْتَعْ حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِکُ اَنْ يَّقَعَ فِيْهِ**" یعنی ارشاد فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کوئی سرکاری چراگاہ کے آس پاس بکریاں چرائے گا تو ممکن ہے کہ کوئی بکری چراگاہ میں بھی گھس جائے۔ یہ ٹکڑا ہے ایک حدیث کا وہ یہ ہے کہ:

اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتَ فَقَدِاسْتَبْرَءَ لِدِيْنِهٖ وَمَنْ يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِکَ اَنْ يَّقَعَ فِيْهِ o

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حلال بین ہے اور حرام بین ہے اور دونوں کے درمیان میں مشتبہات ہیں یعنی وہ اعمال ہیں جن کا حلال وحرام ہونا پوری طرح واضح نہیں ہے ان کی نسبت فرماتے ہیں کہ جو شبہات سے بھی بچا رہے اس نے اپنے دین کو محفوظ کر لیا اور جو کوئی سرکاری چراگاہ کے قریب اپنے مویشی کو لے جائے گا (یعنی شبہات کا ارتکاب کرے گا جو حرام کی سرحد سے ملی ہوئی ہے) تو عجب نہیں کہ مویشی چرگاہ میں بھی گھس جائیں اور وہ سرکاری مجرم ہو جائے۔ (القاف ج ۲۲)

مشقت اور مجاہدہ سے ثواب بڑھ جاتا ہے

اگر ذکر کے بعد بھی وساوس باقی رہیں تو ثواب وہی ہوگا جو ذکر بلاوسوسہ میں ہوتا۔ راز یہ ہے کہ اصل ثواب رضا اور قرب کے قصد سے ہوتا ہے اور دفع وساوس سے بھی رضا وقرب ہی کا قصد ہوتا ہے سو یہ فعل اب بھی پایا ہی گیا۔ لہٰذا ثواب بھی حاصل ہوگا بلکہ یہاں ایک بشارت اور ہے کہ جو شخص باوجود ہجوم وساوس کے ذکر کرتا ہے وہ مجاہدہ اور پریشانی کا ثواب اور زیادہ پائے گا اور اس بات میں وہ من وجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ اور شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی بڑھ جائے گا کیونکہ جنید رحمۃ اللہ علیہ اور شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر بلا مجاہدہ ہے اور اس کا ذکر مع المجاہدہ ہے اور یہ تو بڑی بات مگر میں اپنی طرف سے نہیں کہتا ہوں بلکہ حدیث میں یہ مضمون موجود ہے صحیح حدیث میں ہے کہ جو شخص فتنہ کے وقت دین پر عمل کرے گا اس کو پچاس آدمیوں کا ثواب ملے گا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے پچاس کا یا ان میں سے پچاس کا حضور کا جواب سننے کے قابل ہے فرماتے ہیں کہ تم میں سے پچاس کا اس سے معلوم ہوا کہ زمانہ فساد میں عمل بالدین کا ثواب پچاس ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ملتا ہے اور اس میں راز یہی ہے کہ فساد کے وقت دین پر عمل کرنا بہت دشوار ہے۔ اس مجاہدہ کی وجہ سے ثواب اتنا بڑھ گیا معلوم ہوا کہ مشقت اور مجاہدہ سے ثواب بڑھ جاتا ہے تو جو شخص ہجوم وساوس کے ساتھ بھی ذکر میں لگا رہے اس حدیث کے مطابق اس کا ثواب ذکر بلاوسوسہ کے برابر بلکہ من وجہ زیادہ ہوگا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی کیا شفقت تھی کہ سوال کر کے ہم لوگوں کے لیے کیسی بشارت چھوڑ گئے۔ (القاف ج ۲۲)

مختلف اوقات میں مختلف دعاؤں کی حکمت

شریعت نے ہر وقت کے لیے جدا جدا خاص خاص دعائیں سکھلائی ہیں، اٹھنے کی دعا الگ اور بیٹھنے کی دعا الگ اور سونے کی الگ اور جاگنے کی الگ اور کھانے سے پہلے کی الگ اور بعد کی الگ اور پینے کی الگ اور یہ سب اسی یاد کے طریقے ہیں اور اس تعدد طرق سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دل اکتائے نہیں۔ غرض محبوب نے تم کو ہزاروں آئینے دیئے ہیں کہ خواہ اس کو دیکھو خواہ اس کو دیکھو۔ (القاف ج ۲۲)

شریعت میں کسب دنیا کی اجازت ہے انہماک کی نہیں

شریعت میں دنیا کے کاموں کی اجازت ہے مگر انہماک کی اجازت نہیں۔ مثلاً پیشاب، پاخانہ ضروریات میں سے ہے اور عقلاً ایک وقت ان کے واسطے دینا بھی ضروری اور واجب قرار دیا گیا ہے مگر وہ وقت ان سے فراغت کرنے کے لیے دیا گیا نہ کہ عطر کی طرح اس کو سونگھنے اور لگانے کے لیے اسی طرح دنیا کے واسطے بھی وقت دینا چاہیے مگر اس سے فراغت کے واسطے نہ کہ دلچسپی کے واسطے۔ بس اس مثال کو پیش نظر رکھئے اور اسی درجہ میں دنیا کے کاموں میں لگئے۔ یہ اصلاح کا ایک چھوٹا سا گر ہے سوچ کر دیکھو تو معلوم ہو کہ زیادہ وقت فضول کاموں میں جاتا ہے یا نہیں اگر فرضاً جوارح ظاہری بھی دین کے کام میں ہوں تب بھی قلب تو ضرور ادھر ادھر کے خیالات میں مصروف رہتا ہے۔ میں کہتا ہوں ان فضول خیالات کی ضرورت ہی کیا ہے، جس ضروری کام کو کرنا ہو اس کے متعلق جو سوچنا ہے تھوڑی دیر بقدر ضرورت سوچ لیجئے۔ (القاف ج ۲۲)

قرض کا ثواب صدقہ سے زیادہ کیوں ہے

حدیث شریف میں آیا ہے کہ صدقہ کا دس حصہ ثواب ملتا ہے اور قرضہ کا اٹھارہ حصہ کیونکہ قرض عادتاً وہی لیتا ہے جس کو ضرورت ہو اور خیرات تو بلا ضرورت بھی لے لیتا ہے اور ظاہر ہے کہ ضرورت میں دینے کا زیادہ ثواب ہے تو اس شخص نے اس کی تکلیف تو رفع کی اور خود تکلیف اٹھائی اور دوسرے کو اس کی تکلیف رفع کر کے وہی شخص نفع پہنچا سکتا ہے جو خود تکلیف اٹھائے اس لیے قرض کا ثواب صدقہ سے زیادہ ہے اور گو صدقہ دینے میں بھی کچھ نفس کو تکلیف ہوتی ہے مگر تھوڑی ہی دیر کے لیے یہ خیال کر کے روپے جیب سے نکل گئے مگر یکسوئی ہو گئی اور قرض میں تو بار بار یاد آنے کی سخت تکلیف ہوتی ہے۔ بس قرضہ دینے میں زیادہ اجر ہے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ صدقہ خیرات بند کر دیا جائے کیونکہ حیثیتیں مختلف ہوتی ہیں جیسا کہ ماں، بہن کی محبت اور قسم کی ہے اور بیوی کی محبت اور طرح کی ہے۔ پس اسی طرح صدقہ کا اجر ایک حیثیت سے زیادہ ہے اور قرض کی فضیلت دوسری حیثیت سے۔ غرض جب قرض دار نے قرضہ ادا کیا تو قرض خواہ کو اس نے انتظار کی تکلیف سے نجات دیدی۔ اس واسطے حدیث میں تعلیم دی گئی ہے کہ قرض ادا کرنے والے کو دعا دیا کرو چنانچہ طبعاً بھی ادا

کرنے کا ممنون ہوتا ہے۔ غرض مخلوق کا احسان تو ادائے قرض کے وقت بھی مانتے ہیں مگر خدا تعالیٰ کو (نعوذ باللہ) ایسا قرض دار سمجھتے ہیں کہ گویا اس سے قرض وصول کرنے میں ہم نے خود احسان کیا کہ وصول کر لیا اگر کوئی کسی کو ایک وقت عمدہ کھانا کھلا دے تو یاد رہتا ہے کہ اس نے کھانا کھلایا تھا اور تعریف کرتے رہتے ہیں لیکن خدا کی کبھی ایسی یاد نہیں آتی جس کی بے شمار نعمتیں ہم کو رات دن ملتی رہتی ہیں۔ بس یوں سمجھتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) ہم نے ہی یہ سب کچھ کمایا ہے خدا کا اس میں کیا دخل ہے۔ یہ خیال نہیں کرتے کہ ہاتھ اسی نے دیئے اور سب سامان وہی مہیا کرتا ہے۔ درحقیقت ہر چیز ملک تو خدا ہی کی ہے (شرط التذکر ج ۲۲)

ایک جوہری اور حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کی حکایت

میرے استاد رحمتہ اللہ علیہ نے ایک حکایت بیان فرمائی تھی کہ کوئی شخص حضرت خضر کی ملاقات کے لیے دعا کیا کرتا تھا' ایک روز خضر علیہ السلام تشریف لائے اور دریافت کیا کہ کیا چاہتے ہو۔ اسی نے کہا ایسی دعا کر دیجئے کہ دنیا میں مجھے کوئی غم نہ ہو' فرمایا یہ دعا تو کر نہیں سکتا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ تو دنیا میں جس شخص کو سب سے زیادہ بے غم دیکھے اس کی موافق تیری حالت ہونے کی دعا کر دوں تو ایسے شخص کو منتخب کر لے۔ وہ پھرتا پھرتا حیران ہو گیا اور کوئی امیر و رئیس بے غم نہ ملا' آخر ایک جوہری کو دیکھا جو صبح کو دکان پر آتا' خوبصورت لڑکے اس کے ساتھ ہوتے بہت سے نوکر چاکر بھی ہمراہ آتے' صبح سے شام تک خرید و فروخت کرتا اور غرباء کو بہت کچھ خیرات کرتا' اس نے اس کو مجموعی حالت سے خیال کیا' یہ ضرور بے غم ہو گا' میں ایسا ہونے کی دعا کرا لوں' پھر دل میں کہا کہ قبل دعا کرا لینے کے اس سے تو حال دریافت کر لینا چاہیے شاید کوئی مخفی حالت ہو۔ چنانچہ اس سے تمام واقعہ بیان کیا اور کہا بھائی صاحب مجھ کو خضر علیہ السلام سے دعا کرانی ہے کہ تمہارے جیسا ہو جاؤں' بتلاؤ تو سہی تم کو تو کوئی غم نہیں ہے اس نے سرد آہ بھری اور کہا بھائی مجھ کو تو ایسا غم ہے کہ کسی دشمن کو بھی نہ ہو اور قصہ سنایا کہ ایک بار میری بیوی جو میری بڑی ہی محبوبہ تھی سخت بیمار ہو گئی' میں رونے لگا اس نے کہا روتے کیوں ہو میں مر جاؤں گی تم اور شادی کر لینا' میں نے کہا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ وہ بولی ممکن ہے اب تو تیرا ایسا ہی خیال ہے مگر پھر نہیں رہ سکتا' بہت دیکھا یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ جب اس کو کسی طرح یقین نہ آیا میں نے شدت عشق میں اپنا عضو تناسل اس کے سامنے کاٹ ڈالا کہ

اب تو یقین آ گیا، اتفاق سے وہ مری نہیں اچھی ہوگئی اور میں بیکار ہوگیا، اب وہ کم بخت نوکروں سے سازش رکھتی ہے اور یہ سب بچے دوسروں ہی سے ہیں۔ اب میں دیکھتا ہوں اور گھلتا ہوں، اس نے کہا بھائی تو تو بڑے ہی گندے غم میں مبتلا ہے اللہ بچاوے۔ آخر حضرت خضر علیہ السلام کے پاس گیا اور سارا حال سنایا۔ پوچھا اب کیا خیال ہے اس نے کہا بس دین کی دعا کر دیجئے، غرض اہل دنیا کی تو یہ حالت ہے بے شک چین جس کا نام ہے دنیا اور آخرت دونوں کا دینداروں ہی کو میسر ہوتا ہے۔ (شرط التذکر ج ۲۲)

پل صراط کی حقیقت

پل صراط کا بال سے باریک ہونا اور تلوار سے تیز ہونا ایک امر عقلی ہے جس کو میں عقلی طور پر ثابت کر سکتا ہوں وہ اس طرح کہ ہر شے کی ایک حقیقت ہوتی ہے اور ایک صورت پل صراط ایک صورت ہے اس کی حقیقت معلوم کرنا چاہیے تو کشف سے معلوم ہوا کہ وہ شریعت کی صورت مثالیہ ہے اور شریعت اس کی حقیقت ہے اور یہ کشف اس لیے مقبول ہے کہ شریعت کے خلاف نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ اشارات نصوص سے اس کی تائید پر استدلال بھی کیا جا سکے۔ بس یہ صراط مستقیم یعنی شریعت قیامت میں بشکل پل صراط بن جائے گی اور شریعت ہر چیز کے افراط وتفریط کے درمیان ایک وسط چیز ہے اور وسط حقیقی وہ ہے جو تقسیم نہ ہو سکے ورنہ وسط وسط نہ رہے گا اس میں خود طرفین اور وسط نکلے گا اور بال منقسم ہے پس شریعت بال سے بھی باریک ہوئی اور چونکہ اس پر چلنا دشوار ہے اس لیے تلوار سے تیز بھی ہوئی بس یہی باریک اور تیز چیز صورت پل صراط میں ظاہر ہوگی تو دیکھئے ہم نے عقلی طور پر حقیقت پل صراط کی بتلا دی مگر اب بتلائیے ہم ایسی باتیں اگر آپ کو بتا دیں تو ان کو سمجھے گا کون۔ چنانچہ اس جلسہ میں بھی بہت لوگ اس مضمون کو نہیں سمجھے ہوں گے بعض کہتے ہیں کہ بس بیان کر دیا جائے چاہے کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اول تو اس سے نفع کیا بلکہ بعض کو غلط فہمی سے ضرر ہوتا ہے اور دوسرے کو یہ اہل کمال کا تو یہ حکیمانہ مذاق ہوتا ہے کہ

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں کہ راز آشکارا ہو جائے ورنہ رندوؤں کی مجلس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو معلوم نہ ہو)

(شرط التذکر ج ۲۲)

علم صرف درسیات پر موقوف نہیں

صحبت علماء سے بعض عوام جاہل نہیں رہتے خواص ہو جاتے ہیں۔ گو اکثر اخص الخواص نہ ہوں پس جاہل وہ ہے جو خدا کا راستہ نہ جانتا ہو اور جو واقف ہو وہ عالم ہے گو لکھا پڑھا نہ ہو البتہ ایسا شخص عالم لازم ہے عالم متعدی نہیں اس کو وعظ وغیرہ کی اجازت نہ ہوگی یا یوں کہو کہ عالم ہے معلم نہیں جیسا کہ ہر تندرست طبیب نہیں اس لیے علاج نہیں کرسکتا بلکہ علاج طبیب ہی کرتا ہے اسی طرح جو ناخواندہ صحبت علماء میں ضروریات دین سے واقف ہو گیا ہو وہ تندرست تو ہے چاہے دوسروں کو نفع نہ پہنچا سکے مگر اس کو جاہل نہیں کہہ سکتے کیونکہ علم لکھنے پڑھنے ہی پر موقوف نہیں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کثرت سے ایسے تھے جو کثرت سے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ (شرط التذکر ج ۲۲)

سبقت رحمتی علی غضبی کی عجیب مثال

حدیث شریف میں آیا ہے: "سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ" (میری رحمت میرے غضب سے بڑھ گئی) اس کی مثال بلاتشبیہ ایسی ہے جیسا ایک شخص بڑا فصیح و بلیغ ہو اور وہ کسی گنوار کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے اور اپنے درجہ فصاحت سے گر کر اور متنزل ہو کر اس سے اسی زبان میں گفتگو کرتا ہے یا جیسے بڑا آدمی بچہ سے توتلا بن کر بات کرتا ہے اس لیے کہ مخاطب نہایت کم درجہ کا ہے جیسے میرٹھ میں میں نے ایک انگریز وکیل کو ایک گنوار سے کہتے سنا کہ تیرا یہی مطبل (مطلب) ہے اس لیے کہ اگر وہ اپنے درجے پر رہ کر اپنی استعداد کے موافق کلام کرے تو کسی شخص کی سمجھ میں نہ آئے۔ تفضّل حسین خان ایک زمیندار تھے لغت بہت بولتے تھے، گاؤں والے ایک مرتبہ ان کے پاس آئے تو آپ ان سے کہتے ہیں امسال تمہاری کشت زار گندم پر تقاطر امطار ہوا یا نہیں، گاؤں والے آپس میں کہنے لگے کہ اس وقت چلو میاں قرآن پڑھ رہے ہیں اور بلاتشبیہ میں نے اس لیے کہا کہ یہاں تو بڑے لوگوں کی چھوٹوں سے اغراض بھی وابستہ ہوتی ہیں اس لیے اگر وہ ایسا کریں گے تو خود اپنا بھی نقصان ہے۔ بخلاف خداوندی تعالیٰ شانہ کے کہ اگر وہ اپنی عظمت کے موافق بھی ہمارے ساتھ معاملہ فرماتے تو عین عدل تھا اور ان کا کچھ نقصان نہ تھا اس لیے کہ وہ غنی بالذات ہیں مخلوق کی ان کو کسی درجے میں بھی احتیاج

نہیں ہے، باوجود اس کے اپنی علو شان کے موافق برتاؤ نہیں فرمایا بلکہ ہم کو اپنی ہم کلامی کی اجازت دے دی اور پھر رحمت پر رحمت یہ ہے کہ کسی زبان کی قید نہیں رکھی بلکہ جو زبان جس کی ہو اسی زبان میں اپنی درخواست پیش کر سکتے ہیں۔ (شرف المکالمہ ج ۲۲)

حکایت حضرت حبیب عجمی رحؒ

حضرت حبیب عجمی رحمتہ اللہ علیہ ایک مرتبہ تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اُدھر سے گزر ہوا، دیکھا تو ان کے الفاظ درست نہیں ہیں اس لیے ان کی اقتداء نہ کی، خواب میں حق تعالیٰ کو دیکھا تو پوچھا کہ اے اللہ بہترین اعمال کیا ہے حکم ہوا کہ حبیب عجمی کے پیچھے پڑھنا اس سے معلوم ہوا کہ اصل شے اخلاص ہے، کوئی یہ نہ کہے کہ فقہاء نے تو یہ لکھا ہے کہ "اَوْلٰهُمْ بِالْاِمَامَةِ اَقْرَاءُ هُمْ" کہ اولیٰ امامت کے لیے وہ ہے جو اقرء ہو بات یہ ہے کہ یہاں اقتداء اور امامت کی بحث نہیں ہے کیونکہ وہ پہلے سے کھڑے پڑھ رہے تھے اس حکایت کی غرض یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کے یہاں وہ عمل مقبول ہے جو دل سے ہو البتہ حروف کی تصحیح بے شک واجبات سے ہے سو ان کی اقتداء جائز ہو گی تو مطلب یہ نہیں کہ حرفوں کو بھی صحیح نہ کرے لیکن شکایت تو اس کی ہے کہ اصلاح قلب کو لوگوں نے بالکل ہی پس پشت ڈال دیا ہے اس کی طرف مطلق التفات نہیں ہے حالانکہ مدار قلب پر ہے۔ بہت سے اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ ظاہری حالت انکی اچھی نہیں ہوتی ہے لیکن چونکہ قلوب ان کے اللہ تعالیٰ کی محبت سے پر ہیں اس لیے وہ مقبول ہیں اور بہت سے ایسے ہیں کہ ظاہر ان کا بہت اچھا ہے لیکن قلب میں چونکہ حب دنیا ہے اس لیے مطرود ہیں۔

اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ ہم جو ادب کے ساتھ تسبیح و تقدیس کرتے ہیں واقع میں ان کی شان کے لائق وہ بھی نہیں کیونکہ ہماری تسبیح سے اس کی ذات عالی کہیں زیادہ ہے۔ مولانا نے اس کی عجیب مثال بیان فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں:

شاہ را گوید کسی جولاہہ نیست — ایں نہ مدح اوست مگر آگاہ نیست

یعنی اگر بادشاہ کو کوئی کہے کہ وہ جولاہہ نہیں ہے تو یہ مدح نہیں ہے لیکن چونکہ اس شخص کو بادشاہ کے علو مرتبہ کی خبر نہیں تو اپنے نزدیک اس نے مدح کی ہے مگر واقع میں ذم ہے۔ پس یہی حالت ہمارے تنزیہ کی ہے کہ وہ ان کے اظہار عظمت کے لیے کافی

نہیں حتیٰ کہ سید الحامدین فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام پر فرماتے ہیں: "لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ" (یعنی میں تیری تعریف نہیں کرسکتا تو اسی تعریف کے لائق ہے جو تو نے اپنی ذات کے لیے کی ہے) وجہ یہ ہے کہ ہم ممکن ہیں اور ممکن سے واجب کے کمالات کا احاطہ نہیں ہوسکتا ہے خوب کہا ہے:

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں!
(عنقا کسی سے شکار نہیں ہوتا جال کو سمیٹ لو)

حتیٰ کہ قیامت کے دن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کریں گے تو فرماتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کی حمد ایسے الفاظ سے کروں گا کہ اس وقت وہ الفاظ میرے ذہن میں نہیں ہیں۔

ای برادر بے نہایت در گہیست   ہر چہ بروی میرسی بروی مایست
(اے بھائی بے نہایت درگاہ جس درجہ پر پہنچو اس پر مت ٹھہرو بلکہ آگے کو ترقی کرو)

(شرف المکالمہ ج ۲۴)

الحاصل کلام یا رویت کی دنیا میں تمنا کرنا غیر ضروری ہی نہیں بلکہ مصلحت بھی نہیں ہے اور جن سے کلام ہوا ہے وہ بھی بلا واسطہ نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝

یعنی کسی بشر کی مجال نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے بات کرے مگر بطور وحی کے یا پس پردہ یا فرشتہ بھیج دے پس جو چاہے وحی کرے اس لیے کہ وہ اس سے برتر ہے کہ بشر سے کلام فرمائے اور چونکہ حکیم ہے اس لیے مصلحت بھی اسی میں ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا ہم سے ہم کلام نہ ہونا عین مصلحت اور حکمت ہے۔ (شرف المکالمہ ج ۴۲)

حصول حظ کیلئے رویت اور ہم کلامی کی ضرورت نہیں

رہا یہ کہ اس کے نہ ہونے سے حظ میں کمی ہے سو یاد رکھو کہ یہ کمی ہماری طرف سے ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو اس طرف التفات نہیں ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتے ہیں اور وہ ہماری پکار سنتے ہیں۔ آپ تجربہ کر لیجئے اور قرآن شریف پڑھنے اور دعاء اور ذکر کے وقت اس کا تصور کیا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ سن رہے ہیں، دیکھئے کس قدر حظ ہوتا ہے دیکھو اگر کوئی کسی پر عاشق

ہوجائے اور معشوق یوں کہے کہ تم عرض حال کرو ہم پس پردہ بیٹھے سنتے ہیں تو عاشق صادق کو اپنا اذن ایک دولت معلوم ہوگا کہ میری ایسی قسمت کہاں کہ میں کچھ کہوں اور وہ سن لے اور رو روکر اور نوع بنوع سے اپنا عرض حال کرے گا اور اس میں اس کو وہی لطف ہوگا کہ جس طرح سامنے بیٹھ کر سنتا ہے۔ پس حظ کے حاصل کرنے کے لیے رویت اور ہم کلامی کی ضرورت نہیں

مثنوی مولانا روم میں فحش قصے بیان ہونے کی عجیب مثال

مولانا کی مثنوی میں بھی بہت سے فحش قصے ہیں ایسے کہ اگر یہ کتاب مولانا کی نہ ہوتی تو ہم تو اس کو ہاتھ بھی نہ لگاتے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مولانا نے جہاں کہیں ایسے قصے لکھے ہیں وہاں بغیر ان کے کام نکل ہی نہیں سکتا تھا تو اب اس کی مثال ایسی ہوگئی جیسے اناج کی کاشت کہ اناج کیسی پاکیزہ چیز ہے لیکن اس کی کاشت میں پہلے کھاد دینا پڑتا ہے اگر اس پر اناج کی پیداوار موقوف نہ ہوتی تو اس کا ڈالنا لطیف طبیعتیں کبھی گوارا نہ کرتیں۔ یہ لوگ چونکہ اہل تحقیق اور عارف ہیں یہ فحش سے بھی وہ پاکیزہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دوسرا کوئی نہیں نکال سکتا۔ ان کے فحش کلام سے بھی انوار پیدا ہوتے ہیں اور جن کے دلوں میں گندگی بھری ہوئی ہے اور دین اور عرفان سے ان کو مس نہیں ان کے پاکیزہ کلام سے بھی گندگی اور ظلمات ہی پیدا ہوتے ہیں لہٰذا ناولوں کو مثنوی پر قیاس نہیں کر سکتے۔ (جلاء القلوب ج ۲۲)

حقوق اللہ کہنے کی عجیب مثال

بعض اعمال کو جو حقوق اللہ کہا گیا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہے کہ وہ خدا کے ذاتی نفع کے کام ہیں جن کو وہ اپنی کسی ضرورت سے تم سے لینا چاہتے ہیں بلکہ اس کی حقیقت وہی ہے جو طبیب اور مریض کی مثال میں بیان کر چکا ہوں کہ بعض وقت طبیب کسی مریض سے خاص تعلق کی وجہ سے کہتا ہے کہ میرا کام سمجھ کر دوا پی لو اسی طرح بعض اعمال کو حقوق اللہ کہہ دیا گیا ہے تاکہ ہم خدا ہی کا کام سمجھ کر ان کو کر لیں اور اس کی جزا کے مستحق ہو جائیں۔ اب لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کا کام کر رہے ہیں۔ بعضے رات کو اٹھتے ہیں بارہ تسبیح کا ذکر کرتے ہیں پھر دل میں ناز کرتے ہیں کہ ہم ذاکر ہیں اور اپنی بزرگی کے خود ہی معتقد ہو جاتے ہیں۔ گویا خدا تعالیٰ پر احسان رکھتے ہیں۔ ارے بیوقوف تم خدا کا کام کرتے ہو یا اپنا اور اس

میں بزرگی کی کیا بات ہے اول تو یہ خدا کا کام نہیں تمہارا ہے اگر ہو بھی تو تم نے کیا کیا خدا ہی نے تو توفیق دی اور اسباب مہیا کیے تب تم کام کر سکے تو اس کی حقیقت وہ ہی ہوئی یا نہیں جو میں نے ابھی کہا کہ ایک شخص کسی کو کچھ دیتا ہے مگر دینے والا ایسا کریم ہے کہ اپنا نام کرنا اور احسان جتلانا نہیں چاہتا اس واسطے پہلے اس کو ایک اشرفی دے دیتا ہے پھر کہتا ہے کہ اس اشرفی کی یہ چیز ہم سے خرید لو۔ کون عقلمند خریدار ہے جو اس خریداری کا احسان الٹا اس دینے والے پر رکھے۔ درحقیقت تو سب اسی کا احسان و کرم ہے ایسے دینے والے پر تو قربان ہو جانا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے دماغ بگڑ گئے ہیں، دین تو خود ہمارا کام تھا نماز پڑھتے روزہ رکھتے تمام ارکان دین بجالاتے اور احسان مانتے کیونکہ ہم کو ان کا فائدہ ملنے والا ہے لیکن خیالات اُلٹے ہو گئے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور اس پر ناز کرتے ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ دوسرے کا کام ہے، جب ایسا مذاق خراب ہو گیا ہے تو عجب نہیں کہ عین کو بیکار اور اپنے ذمہ بار سمجھنے لگیں۔ پھر نتیجہ یہ ہو کہ ان تمام ثمرات سے جو اس پر موعود ہیں محروم رہیں۔ اسی محرومی سے بچانے کے لیے بعض اعمال کو حق اللہ کہہ دیا گیا ہے کہ اپنا کام سمجھ کر نہیں کرتے تو خدا ہی کا کام سمجھ کر کر لو۔ یہ خلاف حقیقت ہے اس عنوان میں بھی ایک کام کی بات ہے وہ یہ کہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی کام کرتا ہے اور اس میں لگا رہتا ہے تو کام خود فہم درست کر لیتا ہے۔ دیکھئے بچہ کو پڑھنے بٹھاتے ہیں تو اس پر اس قدر گرانی ہوتی ہے اور وہ کسی طرح پڑھنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ اگر مربی یہ کہہ کر اس کو چھوڑ دے کہ یہ کام تیرا ہی تو تھا تیرا دل نہیں لگتا تو جا بھاڑ میں تو اس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ ہمیشہ جاہل ہی رہے اس کو کوئی سمجھدار اور اس کا بہی خواہ پسند نہیں کرتا بلکہ بچہ کو خوشامد وغیرہ سے زجر و تنبیہ سے لالچ سے پیسے دے کر راہ پر لگاتے ہیں۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ جب وہ الٹا سیدھا جس طرح بھی ہو پڑھنے میں لگ جاتا ہے تو اس کی سمجھ خود درست ہو جاتی ہے اسی معنی کو کہا جاتا ہے کہ کام خود بخود فہم کو درست کر لیتا ہے۔ بس اسی فائدہ کے لیے یہ کہا گیا کہ اگر تم دین کو کام نہیں سمجھتے اور اس سے تمہیں وحشت ہے تو اس کو خدا ہی کا کام سمجھ کر کر لو۔ جب کام میں لگ جاؤ گے تو کام تمہارے فہم کو درست کر لے گا۔ یہ وجہ ہے بعض اعمال کو حق اللہ کہنے کی۔ بہر حال کام میں لگانا چاہتے ہیں اور اس کے ثمرات دینا چاہتے ہیں اس کی قدر کرنا چاہیے کہ باوجود

بے نیازی کے کام بتانے کے ساتھ اس کا طریقہ بھی بتاتے ہیں اگر کام ان ہی کے بتائے ہوئے طریقہ سے کیا جائے گا تو نفع یقینی اور بہت ہوگا اگر قرآن سے تعلیم ان طریقوں کے مطابق لی جائے جو قرآن نے بتائے ہیں تو ناممکن ہے کہ نفع نہ ہو۔ (جلاء القلوب ج ۲۲)

دین کا کوئی جزو بھی زائد نہیں

میں تو کہتا ہوں کہ دین کا کوئی جزو بھی زائد نہیں حتیٰ کہ مستحبات بھی اپنے درجہ میں غیر زائد ہیں گو اتنا تفاوت ہے کہ واجبات کی کمی میں خسران ہے اور مستحبات کی کمی میں حرمان مگر ضرر تو ان کی کمی میں بھی ہوا۔ اب لوگ مستحبات کو یہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ کوئی ضروری کام نہیں، کریں گے تو ثواب ملے گا، نہ کریں گے تو گناہ نہ ہوگا۔ صاحبو! گناہ نہ ہونا اور بات ہے اور منفعت ہونا اور بات ہے اگر آپ کو مستحبات کے ثمرات معلوم ہو جائیں تو ان کا بھی کافی اہتمام کرنے لگیں۔ اگر مستحبات کے ثمرات سامنے آ جائیں تو کوئی ایک ادنیٰ سے مستحب کو بھی نہ چھوڑیں گے۔ گو یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ مستحبات سے ضرورت کو اٹھا لیا اس وجہ سے کہ ہم لوگوں میں ہمت کم ہے اگر سب کو فرض کر دیا جاتا تو غالباً ہم مستحبات ہی کو نہیں بلکہ فرائض کو بھی چھوڑ دیتے اور یہ فرق علوم دینیہ کی تکمیل کے لیے ظاہر کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ علماء کو جزائے خیر دے جنہوں نے احکام دین کے مراتب کو خود شریعت کے اشارات سے سمجھ کر قائم کیا اور یہ منجانب اللہ دین کی حفاظت ہے کہ ایسے وقت میں یہ ترتیب ہوگئی جبکہ دین میں کچھ گڑبڑ بھی نہیں ہونے پائی تھی اگر اس وقت علماء دین کو بلا ترتیب چھوڑ دیتے تو اس وقت میں جبکہ ہوا اور رائے کا دور دورہ ہے دین میں خلط مبحث ہو جاتا اور اس کے کسی جزو کا بھی پتہ نہ چلتا۔ الحمد للہ کہ اب دین کی ایسی ترتیب ہوگئی کہ تمام احکام کے مراتب محفوظ ہیں، فرائض الگ ہیں، سنن الگ ہیں، مستحبات الگ ہیں جس کی علت و حکمت وہ ہے جو ابھی مذکور ہوئی مگر ہم لوگوں نے اس کا نتیجہ اُلٹا نکالا کہ مستحبات کو زوائد سمجھ لیا اور ان کا اہتمام بالکل چھوڑ دیا۔ یہ مانا کہ ضرورت کو ان سے اٹھا لیا گیا ہے مگر جو ثمرات اور درجات ان پر موعود ہیں وہ بھی تو بلا ان کے نہیں ملیں گے اور وہ ثمرات معمولی چیز نہیں ہیں۔ دیکھئے کوئی اعلان کرتا ہے کہ جو کوئی صبح کو میرے مکان پر پہنچ جائے گا اس کو ایک لاکھ روپیہ ملے گا، یہ اعلان امر اور وجوب کے درجہ میں نہیں ہے۔ انعام اور بخشش کے درجہ میں ہے جس کو زائد ہی کہہ سکتے ہیں لیکن ہے کوئی ایسا جو اس اعلان کو سن کر وہاں پہنچ نہ جائے۔ ایک لاکھ روپیہ تو بڑی چیز ہے

ایک روپیہ کا بھی اعلان ہو بلکہ دو لڈوؤں کا بھی اعلان ہو تب بھی وقت مقررہ سے پہلے ہی پہنچ جائیں گے۔ خیر اس اعلان میں تو یقین یا کم از کم ظن غالب ہوتا ہے شے موعود کے مل جانے کا اور جوئے میں تو یقین بلکہ ظن بھی نہیں ہوتا۔ صرف امید موہوم پر ہزاروں روپیہ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اس احتمال پر کہ شاید ہم ہی جیت جائیں پھر جس پر یقین ہو ایسے ثمرات کے ملنے کا جو دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں اس پر کیا ہونا چاہیے۔ (جلاء القلوب ج ۲۲)

مستحبات کی عجیب مثال

مستحبات کی مثال احکام کے اندر ایسی ہے جیسے دعوت کے کھانوں میں چٹنی کہ چٹنی کسی معنی کو زائد ہی ہے نہ اس پر بقائے حیات موقوف ہے نہ پیٹ بھرنا موقوف ہے۔ پھر دیکھئے چٹنی کا بھی کتنا اہتمام ہوتا ہے کہ فرمائش کر کے چٹنی منگائی جاتی ہے اور صرف ایک ہی قسم کی چٹنی سے سیری نہیں ہوتی بلکہ طرح طرح کی چٹنیوں اور اچاروں کا مطالبہ ہوتا ہے اور بلا چٹنی کے دعوت پھیکی کہی جاتی ہے۔ اسی طرح صرف فرائض و موکدات ادا کر لینے سے ضرورت کا مرتبہ تو پورا ہو جائے گا اور آخرت میں عذاب بھی نہ ہوگا لیکن بلا مستحبات کے جنت سونی سونی رہے گی اس کے جنت کا حصہ دوسروں کے حصہ کے نسبت ایسا رہے گا جیسا کم درختوں کا باغ زیادہ درختوں والے باغ کے سامنے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام ہے جو شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت پہنچایا گیا ہے: "اَلْجَنَّةُ قَیْعَانٌ وَغِرَاسُهَا سُبْحَانَ اللّٰهِ" یعنی فرما دیجئے گا اپنی اُمت سے کہ جنت چٹیل میدان ہے اور اس میں درخت لگانے کی ترکیب یہ ہے کہ سبحان اللہ پڑھا جائے یہ باعث حدیث سے ثابت ہے کہ اگر ایک دفعہ بھی کوئی سبحان اللہ کہتا ہے تو اس کے لیے فوراً ایک درخت جنت میں لگ جاتا ہے۔ دیکھئے ظاہر میں یہ کوئی ایسی ضروری بات نہ تھی جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہم لوگوں تک پہنچایا۔ بات یہ ہے کہ وہ حضرات رحیم و کریم ہیں خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام انہوں نے ہم کو ایسی تدبیر بتا دی جس سے جنت کے زیادہ درخت مل جائیں اس میں یہ تعلیم بھی ہوگئی کہ فرائض پر بس مت کر لینا آگے بھی ہمت کرنا۔ (جلاء القلوب ج ۲۲)

کسب حلال کی ضرورت

حدیث ہے: "کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَةِ" (حلال کمانا فرض ہے بعد

فرائض کے) اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا باوجود سید التارکین ہونے کے یہ ارشاد ہے کہ جس کے پاس کچھ نقدی ہو اس کو محفوظ رکھنا چاہیے اگر ہم محتاج ہوتے تو امراء ہم کو ہاتھ کا رومال بنا لیتے یعنی ذلیل کرتے جیسے رومال کہ اس سے میل کچیل پونچھا جاتا ہے۔ شریعت میں کہیں بھی یہ تعلیم آپ دکھا سکتے ہیں کہ روپے پیسے کو ضائع کر دو اور بے موقع اڑا دو بلکہ اس کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ اگر مسلمان شریعت پر عامل ہوتے تو نہ دوسروں کے دست نگر ہوتے نہ دوسروں سے مغلوب ہوتے اس لیے سخت ضرورت ہے کہ جس کے پاس مال ہو وہ تھوڑا بہت جمع کر کے بھی رکھے نفس کی تسلی کے لیے۔ غرض خرچ کو کم کیا جائے اور اسراف سے بچا جائے۔ (جلاء القلوب ج ۲۲)

ربوا سے متعلق محرفین کی اختراع

قرآن کی آیت سود کے بارے میں صریح موجود ہے: "وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" (حرام کیا سود کو) پھر بھلا کسی کی مجال ہے کہ اس کی حلت کا فتویٰ دے دے جیسا بد دینوں نے یہ شیوہ اختیار کیا ہے۔ چنانچہ بعضے ذہین مگر جاہل لوگوں نے اس میں بھی ایک ایجاد کی ہے اور یہ کہہ دیا ہے کہ قرآن میں ربوا بکسر راء ہے ہی نہیں جس کے معنی سود کے ہیں بلکہ ربوا بضم راء ہے اور مشتق ہے ربودن سے۔ جیسے دلبر با ہوش ربا ء۔ ربودن کے معنی اچک لے جانا تو اس سے ممانعت ہوئی ڈکیتی اور غصب کی اور کہتے ہیں یہ مولویوں کی اختراع ہے کہ ربوا پر زیر لگا دیا۔ یہ تحریف نئے لوگوں کی ایجاد ہے اللہ بچائے۔ غرض اول تو بہت سے ذرائع حرام ہیں ضرورت ہی کا درجہ مسلم نہیں اور اگر تمہاری خاطر سے مان بھی لیا جائے تب بھی غایت سے غایت یہ ہے کہ حرام کماؤ مگر دین میں تو ترمیم مت کرو، گناہ کو گناہ ہی کے مرتبہ میں رہنے دو اور میں اس وقت تمہاری خاطر سے کہتا ہوں کہ خیر گناہ کر لو لیکن جب تمہاری ایک درخواست میں نے منظور کی تو تم بھی میری دو درخواستیں منظور کر لو۔ (جلاء القلوب ج ۲۲)

ہمارے گناہوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت

میں کہتا ہوں کہ اگر ملامت سے آپ ڈرتے ہیں تو گناہ میں بھی تو ملامت ہوتی ہے تو ملامت ہی کے خوف سے گناہ کو چھوڑنا چاہیے وہ ملامت معلوم بھی ہے کس کی ہوتی ہے وہ اللہ کی ہوتی ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوتی ہے کیونکہ گناہ کرنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

ملامت کرتے ہیں اور رنجیدہ ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دکھتا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہفتہ میں دوبار عرض اعمال اُمت ہوتا ہے۔ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جب مسلمانوں کے گناہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتے ہوں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کس قدر رنج ہوتا ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو یہ ہے کہ کفار پر بھی اس قدر رنج فرماتے تھے گویا جان دینے کو تیار ہیں۔ قرآن میں ہے: ''لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَنْ لَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ'' یعنی شاید آپ اپنی جان کو تلف کردیں گے اس رنج میں کفار ایمان نہیں لاتے۔ جب کفار پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر شفقت تھی تو مسلمانوں پر کیا کچھ ہوگی جس وقت مسلمانوں کی بداعمالیاں پیش ہوتی ہوں گی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا گزرتی ہوگی۔ کیا یہ مسلمان گوارا کرسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دے۔ (جلاء القلوب ج ۲۲)

غیر محقق کو محقق کے اتباع کے بغیر چارہ نہیں

کسی محقق کا دامن پکڑیے اور جو وہ کہے اس کو تسلیم کیجئے تمام فنون میں یہی طریقہ ہے آپ کیسے ہی بڑے آدمی ہوں اور کیسے ہی تعلیم یافتہ ہوں لیکن ڈاکٹر نہ ہوں اور آپ کا بچہ بیمار ہو تو آپ کو ڈاکٹر ہی کے پاس جانا پڑے گا اور جو وہ کہے گا وہی کرنا ہوگا۔ اس کے نسخہ کو آپ پڑھ بھی نہ سکیں گے مگر یہ نہ کہہ سکیں گے کہ ذرا سمجھا دیجئے کہ نسخہ کیا لکھا ہے اور کس مرض کا لکھا ہے، اسی کا نام تو اتباع ہے۔ وہ ڈاکٹر اس وقت بمقابلہ آپ کے محقق ہے آپ غیر محقق ہیں۔ اس واسطے اس کی ہر بات کو تسلیم ہی کرنا پڑے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ غیر محقق کو محقق کے اتباع سے چارہ نہیں، دنیا کے کاموں میں یہ سب کے نزدیک مسلم ہے پھر دین کے کاموں میں کیوں مسلم نہیں۔ غرض یا تو محقق بنئے یا محقق کا اتباع کیجئے اور اس کے سامنے قیل وقال نہ کیجئے میں یہ بتا دوں گا کہ محقق کس کو کہتے ہیں اور وہ کیسے مل سکتا ہے کوئی پہلو نہ چھوڑوں گا۔ انشاء اللہ مگر سب سے پہلے اس پندار کو دماغ سے نکال دیجئے کہ ہم محقق ہیں پھر محقق کی تلاش شروع کیجئے اور عزم کر لیجئے کہ اگر کوئی محقق مل گیا تو ہم اس کی جوتیوں میں پامال ہو جائیں گے جس کو مولانا فرماتے ہیں:

پیش یوسف نازش وخوبی مکن   جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

(یوسف یعنی کامل کے روبرو ناز وخوبی یعنی دعویٰ کا اظہار کمال مت کرو بجز آہ و نیاز یعقوبی کے اور کچھ مت کرو)

اس کے سامنے ناز سے کام نہیں چلتا، نیاز ہی سے کچھ کام چل سکتا ہے۔ اب میں ان سے ملنے کا طریقہ بتلاتا ہوں سو اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو غیر مکتسب یعنی منجانب اللہ ایسا محقق مل گیا۔ (جلاء القلوب ج ۲۲)

خودکشی کے حرام ہونے کا راز

اہل اللہ اپنی ذات یا اپنے ہاتھ پاؤں اور تمام متعلقات کی حفاظت نوکر کی طرح کرتے ہیں مالک کی طرح نہیں کرتے ہم تو کھاتے ہیں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے اور وہ سرکاری مشین کی حفاظت کے لیے کھاتے ہیں اور یہاں سے "لَاتَقْتُلُوْا اَنْفُسَکُمْ" (اپنی جانوں کو ہلاک مت کرو) کا راز بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ حق تعالیٰ نے قتل نفس سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ یہ آپ کی جان انہی کی ملک ہے تمہاری ملک نہیں ہم سب خدا ہی کی چیزیں ہیں اس لیے انہوں نے اپنی چیزیں بدون اجازت کے تصرف کرنے سے منع فرما دیا۔ اسی مرتبہ میں حکم ہے:

اِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا۝

"بلاشک جسم کا تجھ پر حق اور تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا تجھ پر حق ہے۔"

پس کسی کو یہ حق نہیں کہ کوئی دوا بار دکھا کر نامرد ہو جائے یا آنکھوں میں گرم سلائی لگا کر اندھا ہو جائے۔ عارفین پر چونکہ یہ راز منکشف ہو گیا ہے اس لیے وہ اپنی جان کو سرکاری چیز سمجھ کر اس کی خوب حفاظت کرتے ہیں اور اسی نیت سے بعض دفعہ عمدہ غذا اور عمدہ لباس بھی استعمال کرتے ہیں لوگ اس کو تن پروری سمجھتے ہیں مگر نہیں وہ اس سے بہت دور ہیں لیکن

در نیابد حال پختہ ہیچ خام　　بس سخن کوتاہ باید والسلام

(ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا پس کلام کو کوتاہ کرنا چاہیے) (ذم النسیان ج ۲۲)

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رتبہ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رتبہ تو یہاں تک ہے کہ ان سے پوچھا گیا:

هَلْ عَرِفْتَ رَبَّکَ بِمُحَمَّدٍ اَمْ عَرِفْتَ مُحَمَّدًا بِرَبِّکَ۝

کہ آپ نے حق تعالیٰ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے پہچانا یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو

خدا کے واسطے سے پہچانا تو فرمایا: "عَرِفْتُ مُحَمَّدًا بِرَبِّیْ" کہ میں نے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے واسطے پہچانا۔ اگر آج کوئی شخص یہ بات کہہ دے تو بس کفر ہو گیا، بجائے قدر کرنے کے غریب پر چار طرف سے کفر کے فتوے لگیں گے کیونکہ حقیقت شناس دنیا سے اُٹھ گئے۔ چنانچہ ایک شخص نے میرے ایک دوست سے کہا کہ تم جو توحید کے مضامین زیادہ بیان کرتے ہو (کہ حق تعالیٰ کے افعال میں نہ کسی ولی کو دخل ہے نہ نبی کو وہاں کوئی دخیل کار نہیں ہے وغیرہ وغیرہ) اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے تعظیمی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ توبہ توبہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم سے تھوڑا ہی روکتے ہیں بلکہ خدا کی توہین سے روکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ حق تعالیٰ کو گھٹا دو غور کر کے دیکھا جائے تو جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صفات الوہیت ثابت کرتے ہیں حقیقت میں وہ آپ کی بے تعظیمی کرتے ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ صفات الوہیت درجہ کمال میں تو آپ کے لیے ثابت کر نہیں سکتے لامحالہ درجہ نقصان میں ثابت کریں گے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناقص قرار دیا (نعوذ باللہ) اور ہم آپ کے لیے صفات الٰہی کو ثابت نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کی نفی کر کے صرف صفات بشریہ اور کمالات نبوت کو آپ کے لیے ثابت کرتے ہیں اور ان میں سے ہر صفت کو درجہ کمال میں ثابت کرتے ہیں تو ہم آپ کو بشر کامل و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کامل کہتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہو گے تو ناقص خدا کہو گے اور ہم انسان کہتے ہیں مگر کامل انسان تو بتلاؤ بے تعظیمی کس نے کی، بے ادب وہ ہے جو آپ کو ناقص کہے یا وہ جو کامل کہے (ذم النسیان ج ۲۲)

لیلۃ التعریس میں نماز فجر قضا ہونے کا سبب

سونے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو نہ ٹوٹتا تھا اس پر شاید لیلۃ التعریس کے قصہ سے کسی کو شبہ ہوگا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل نہیں سوتا تھا تو پھر اس واقعہ میں آپ کی نماز فجر کیوں قضا ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ روشنی صبح کا دیکھنا آنکھ کا فعل ہے قلب کا فعل نہیں، مبصرات کا ادراک قلب کو بواسطہ بصر ہی کے ہو سکتا ہے اور اس وقت آپ کی آنکھیں سو رہی تھیں اس لیے صبح کا ادراک نہ ہو سکا اس پر پھر یہ اشکال ہوتا ہے کہ وقت کا اندازہ کرنا تو قلب

کا فعل ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وقت کا اندازہ کیوں نہ کر لیا یہ اشکال اور اس کا جواب میں نے کہیں منقول نہیں دیکھا یہ ابھی میرے قلب پر وارد ہوا ہے اور جواب بھی حق تعالیٰ نے ساتھ ساتھ قلب میں ڈال دیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قلب سے وقت کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ قلب کسی فکر اہم میں مشغول نہ ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب اس وقت مشاہدہ جمال الٰہی میں مشغول تھا اور کامل یکسوئی کے ساتھ ادھر متوجہ تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آنکھیں بند کیے ہوئے تھے اور آنکھیں بند کر کے قلب کو پوری یکسوئی ہوتی ہے۔ جیسا کہ مشاہدہ ہے اس لیے وقت کا اندازہ بھی نہ ہو سکا۔ دوسرا جواب بہت ہی سہل یہ ہے کہ نوم عین سے مراد نعاس ہے اور نعاس میں بھی اندازہ پر قدرت نہیں ہوتی۔

(قلت والجواب الاصلی ماورد فی الحدیث انه کان من اللّٰه لیشرع لهم ای احکام القضاء فلم یکن صلی اللّٰه علیه وسلم نسی بل قدنسی وما نام بل قد نوم ۱۲ جامع)

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند کو اپنی نیند پر قیاس نہ کرو آپ تو نیند میں بھی حق تعالیٰ سے غافل نہ ہوتے تھے اور تم جاگتے ہوئے بھی غافل ہو۔

بہ بین تفاوت رہ ا یکجاست تا بکجا
(اس راہ کا فرق تو دیکھو کہ کہاں سے کہاں تک ہے) (التبیت ج ۲۲)

قاتل کی توبہ کا معروف واقعہ

حدیث میں ایک قصہ آیا ہے کہ ایک شخص نے ننانوے خون کیے تھے پھر اس کو توبہ کا خیال ہوا تو ایک عالم کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اتنے خون کیے ہیں اب میری توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں۔ عالم نے کہا نہیں تیری توبہ قبول نہیں ہو سکتی اس کو غصہ آ گیا اور اس عالم کو ختم کر کے پورے سو کر دیئے پھر دوسرے عالم کے پاس گیا (شاید ان کو پہلے عالم کا قصہ معلوم ہو چکا ہوگا ۱۲) ان سے پوچھا کہ میری توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں انہوں نے کہا کہ حق تعالیٰ کی رحمت کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا ہوا ہے اگر تو توبہ سچے دل سے کرے گا تو ضرور قبول ہو گی لیکن تیری توبہ کی شرط یہ ہے کہ اپنی بستی کو چھوڑ کر فلاں بستی میں جا کر سکونت اختیار کر (کہ وہاں صلحاء رہتے ہیں صحبت نیک سے تیری کامل اصلاح ہو جائے گی ۱۲) غرض

انہوں نے ہجرت عن الوطن کو قبول توبہ کی شرط بتلایا۔ اس شخص کے دل میں طلب پیدا ہوگئی تھی اس لیے وطن سے بہ نیت ہجرت چلا، راستہ ہی میں تھا کہ اس کی موت آ گئی، اس نے اتنا کیا کہ مرتے مرتے بھی اس بستی کی طرف گھسٹتا رہا جہاں ہجرت کر کے جا رہا تھا۔ چنانچہ نزع کے وقت بھی اس نے اپنے سینہ کو اس زمین کی طرف بڑھا دیا کہ جس قدر سعی ممکن ہے وہ تو کرلوں بس یہ عمل مقبول ہوگیا۔ چنانچہ اس کے انتقال کے وقت ملائکہ رحمت و ملائکہ عذاب دونوں آئے اور ان میں باہم اختلاف واقع ہوا۔ ملائکہ رحمت کہتے تھے کہ یہ جنتی ہے کیونکہ یہ بقصد توبہ ہجرت کر کے اپنے وطن سے چل پڑا تھا اب پہنچنا نہ پہنچنا تقدیری بات ہے اس نے تو اپنی سی کوشش تکمیل توبہ میں کرلی ہے۔ ملائکہ عذاب نے کہا کہ نہیں یہ دوزخی ہے کیونکہ ساری عمر گناہوں کا مرتکب رہا ہے اور اخیر میں توبہ بھی کی ہے تو وہ بھی ناقص ہے ابھی اس کی توبہ صحیح نہیں ہوئی تکمیل توبہ کے لیے زمین صلحاء میں پہنچ جانا شرط تھا اور یہ ابھی پہنچا نہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ملائکہ بھی استنباط و اجتہاد کرتے ہیں۔ پہلے میں یہ سمجھتا تھا کہ ملائکہ اجتہاد نہیں کرتے بلکہ ہر امر میں ان کے پاس نص آتی ہے جیسا کہ ''یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ'' (وہ وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم کیا جاتا ہے) سے بظاہر معلوم ہوتا ہے مگر اس حدیث سے ثابت ہوا کہ وہ بھی اجتہاد کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس بھی بعض دفعہ نص کلیت کے ساتھ آتی ہے اور جزئیات میں استنباط کرتے ہیں جس میں بعض اوقات اختلاف کی بھی نوبت آتی ہے اگر استنباط نہ کرتے تو ان میں باہم اختلاف نہ ہوا کرتا۔ اب حق تعالیٰ نے اس معاملہ کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک اور فرشتہ بھیجا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کی لاش سے دونوں طرف کی زمین کی پیمائش کرلو، اگر اس کا وطن نزدیک ہو تو یہ دوزخی ہے اگر جائے ہجرت نزدیک ہو تو جنتی ہے۔ چنانچہ زمین ناپی گئی اور واقع میں وطن ہی کی زمین نزدیک تھی مگر حق تعالیٰ کا وطن کی زمین کو حکم ہوا کہ دور ہو جاؤ اور ہجرت کی زمین کو حکم ہوا کہ نزدیک ہو جا۔ چنانچہ جائے ہجرت بالشت بھر نزدیک نکلی (اور یہ وہی مقدار تھی جو نزع کے وقت اس نے کچھ حرکت کی تھی ۱۲) آخر کار وہ جنتی قرار پایا اور ملائکہ رحمت کے سپرد ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو عمل بقصد کامیابی کیا جائے اس میں اگر دنیا میں ناکامی بھی رہے تو آخرت میں یہ ناکامی کامیابی ہی کی برابر شمار ہوتی ہے۔

قلت والیه الاشارة قوله تعالیٰ ومن یخرج من بیته مهاجرا الی الله ورسوله ثم یدرکه الموت فقد وقع اجره علی الله

''جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کرے پھر اس کو راستہ میں موت آ جائے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو گیا۔''

وقال صلّى اللّٰه عليه وسلّم نيت المؤمن ابلغ من عمله ١٢)

''مومن کی نیت اس کے عمل سے ابلغ ہے'' (زكوٰة النفس ج ٢٢)

تولّی کی قسمیں

قرآن کریم میں وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ یعنی اعراض مت کرو مجرم ہو کر مطلق وَلَا تَتَوَلَّوْا نہیں فرمایا۔

اس لئے کہ تولّی کی دو قسمیں ہیں ایک صورت تولّی ایک حقیقت تولّی۔ صورۃً تو یہ کہ بشریت سے غلطی ہو گئی۔ ایسی غلطیوں سے انسان بچ نہیں سکتا۔ اور حقیقت تولّی ہوتی ہے مقابلانہ و باغیانہ تو فرماتے ہیں کہ باغیانہ تولی مت کرو یعنی باغی مت بنو اور گناہ سے تو کیسے پاک ہو سکتے ہیں لیکن اگر گناہ ہو جائے تو ساتھ کے ساتھ توبہ کر لو۔ حدیث شریف میں ہے كُلُّكُمْ خَطَّاءُ وْنَ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ (مسند احمد ٢:١٩٨، سنن الترمذی: ۲۴۹۹) یعنی تم سب خطاوار ہو اور بہتر خطاوار توبہ کرنے والے ہیں۔ یہ تعلیم ہے حق تعالیٰ کی اور یہ طریقہ وہ ہے کہ جس سے قومی مالی جسمی، دینی دنیوی ترقی ہے اس کو پلے باندھو یا درکھو کہ ہماری دینی دنیوی فلاح دین کے ساتھ وابستہ ہے جب کبھی اس کے خلاف ہوا ہے تنزل اور پستی اور ادبار اور قحط سب ہی بلائیں مسلط ہو جاتی ہیں۔

اب حق تعالیٰ سے دعا کرو کہ حق تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں، آمین ثم آمین۔

میرے نزدیک یہی معنی ہیں اس حدیث کے اِنَّ اللّٰهَ يَبْغَضُ الْبَلِيْغَ مِنَ الرِّجَالِ الخ (سنن الترمذی: ٢٨٥٣، مشكوة المصابيح: ۴٨٠٠) (بلا شبہ اللہ تعالیٰ اس شخص سے بغض رکھتے ہیں جو جہان میں غلو فی البلاغت اختیار کرے) یعنی اس کا مصداق وہی درجہ ہے جس میں تکلف سے بلاغت کا جلب کرے تا کہ سننے والے سمجھیں کہ اس کو قوت ہے بیان میں یہی غلو فی البلاغت مبغوض ہے باقی اگر یہ قصد نہ ہو اور تکلف بھی نہ ہو بلکہ تکلف کلام میں بلاغت آ جائے تو اس کا مضائقہ نہیں۔ اور ایک غلو ہے سننے والوں کے لیے وہ یہ ہے کہ اگر بیان میں کوئی خاص رنگ نہ ہو تو اس بیان سے وہ منتفع ہی نہ ہوں بلکہ منتظر رہیں دوسرے رنگ کے

مگر صاحب میرا تو مشاہدہ ہے کہ جس چیز کا وہ حکم دیتے ہیں اس کو خود ہی عطا بھی فرما

دیتے ہیں۔ مثلاً یہ جو حدیث میں ہے کہ **لا یومن احد کم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین** (تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایمان والا نہ ہوگا جب تک میں اس کے نزدیک اسکے والدین اسکی الاد اور سب لوگوں سے زیادہ پیار نہ ہو جاؤں) (مسند احمد ۳: ۱۷۷، کنز العمال: ۷۰) اس میں محبت کا امر بھی فرمایا گیا ہے اور مدد بھی کی گئی ہے کہ خود ہی ہم کو ایسی محبت عطا بھی فرمادی۔ مگر اس طرح عطا فرمائی کہ بعض اوقات اس محبت کا اس وقت ظہور نہیں ہوتا۔ بلکہ ظہور چند روز کے بعد ہوگا اس میں یہ بھی حکمت ہے کہ جب چند روز کے بعد اس کا ظہور ہوگا تو بندہ اس کو اپنے اکتساب کا نتیجہ سمجھ کر اس سے خوش ہوگا۔ گویا یہ خوشی اللہ میاں نے ہم کو دینا چاہی تھی اس لئے اس کا ظہور جلدی نہیں فرمایا۔ (آثار الحوبہ ج ۲۳)

عمل... دخول جنت کی علّت تامّہ نہیں

حضرت عائشہؓ نے ایسے ایسے سوالات کر کے ہمارے لئے راستہ صاف کر دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا **ولا انا** (**المعجم الکبیر للطبرانی ۷: ۳۰۷**) کہ ہاں میں بھی عمل سے جنت میں نہ جاؤں گا بلکہ محض فضل ورحمت سے جاؤں گا۔ اور یہ جواب بڑی علامت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سچا ہونے کی کہ باوجود یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کیا کیا فضائل ہیں کیسے کیسے کمالات ہیں مگر اس پر بھی صاف صاف فرماتے ہیں ولا انا جھوٹا مدعی ہرگز یہ جواب نہیں دے سکتا۔ معنی حدیث کے یہ ہیں کہ عمل علت تامہ نہیں دخول جنت کی اور ہو بھی کیسے سکتی ہے اس لئے کہ جتنی بڑی جزا ہے اتنا ہی بڑا عمل تھوڑا ہی ہے۔ ہماری اعمال تو اس نوکر کے کام کے برابر بھی نہیں جو چار روپے ماہوار پر آپ کا کام کرتا ہے۔ وہ مہینہ بھر تک صبح سے شام تک محبت ومشقت کرتا ہے تو آپ اس کو چار روپے دیتے ہیں اگر حق تعالیٰ بھی ہمارے ساتھ اسی طرح برتاؤ فرماتے تو شاید ہمارے عمر بھر کے اعمال کی قیمت چار (۴) آنے بھی نہ ہوتی۔ پھر اس پر غیر متناہی نعمتیں عطا فرمانا جو ختم ہی نہیں ہوں گی اور جن کے متعلق ارشاد ہے کہ **وما لاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر** (جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا نہ کسی دل میں اس کا وسوسہ ہوا) (مسند احمد ۲: ۴۳۸، الترغیب والترہیب ۴: ۵۱۱) تو کیا یہ نعمتیں ہمارے اس عمل کا عوض ہوسکتی ہیں ہرگز نہیں اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے آپ ترازو کے ایک پلے میں تورائی کا دانہ رکھیں اور دوسرے میں چکی کا پاٹ۔ بھلا ان دونوں میں کوئی نسبت بھی ہے؟ اور

یہ مثال بھی پوری مثال نہیں کیونکہ چکی کا پاٹ پھر متناہی ہے حساب کر کے رائی کے دانہ سے اس کی نسبت معلوم ہوسکتی ہے اور نعمائے آخرت غیر متناہی ہیں جس سے عمل متناہی کو کچھ بھی نسبت نہیں۔ مگر حق تعالیٰ ہمارے اس رائی کے دانہ کو بھی اتنا وزنی فرما دیتے ہیں جتنا وہ چکی کا پاٹ ہے تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھ جائیں کہ ان کے پاس اتنے اعمال ہیں۔

چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے **لاینبغی للمؤمن ان یذل نفسه** (مشکوۃ المصابیح: ۲۵۰۳، کنز العمال: ۵۳۰۴) صحابہ نے اس کی تفسیر دریافت فرمائی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **یتحمّل من البلاء لمالا یطیقه** یعنی اپنے نفس کو ذلیل کرتا یہ ہے کہ انسان اپنے ہاتھوں ناقابل برداشت مصیبت میں پڑے سو یہ حقیقت میں معصیت ہے قرب نہیں۔ (آثار الحوبہ ج ۲۳)

مصائب سے حق تعالیٰ شانہ کا قرب بڑھتا ہے

جو مصیبت غیر اختیاری ہو اس سے کچھ بُعد نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں تو اس کی ہر قسم کی مدد بھی کی جاتی ہے اور وہ حال ہوتا ہے کہ۔

درد از یا رست و درماں نیز ہم   دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم

(درد محبوب حقیقی کی طرف سے ہے اور علاج بھی ان کی طرف سے ہے تو میرا دل بھی ان پر قربان اور جان بھی)۔

اس سے تو قرب بھی بڑھتا ہے اور محبت بھی بڑھتی ہے۔ چنانچہ ایام مصیبت کی حالت کو یاد کر کے دیکھ لیجئے اور خیر ہم لوگ تو جیسے مصائب میں مبتلا ہیں اسی طرح گناہوں میں بھی پھنسے ہوئے ہیں۔ مگر جو حضرات ہم سے پہلے گزر چکے ہیں مثلاً انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام ان کے حالات میں غور کیجئے کہ ان پر کیسی کیسی شدتیں ہوئی ہیں، ہائے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

زاں بلا ہا کا نبیاء برداشتند   سر بچرخ ہفتمیں برداشتند

(یہ مصائب حضرات انبیاء علیہم السلام نے برداشت کئے بلکہ ساتویں آسمان کے سر تک برداشت کئے)۔

یعنی انبیاء علیہم السلام پر کیسی کیسی ایذائیں امت کی طرف سے ہوئی اور وہ بلائیں ان کی ترقی کا سبب بنیں اور حدیث میں بھی آیا ہے کہ بعض امتوں کے لوگ آروں سے چیرے گئے ہیں مگر ان لوگوں کے استقلال میں فرق نہ آیا۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ آخر کس چیز نے ان کو مستقل بنائے رکھا وہ کیا چیز تھی وہ محبت تھی کیونکہ

از محبت تلخہا شیریں بود (محبت کے باعث تلخیاں میٹھی (خوشگوار) ہو جاتی ہیں)۔

بجرم عشق توام میکشند و غوغائیست　　تو تیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

یعنی عاشق اپنے محبوب سے کہہ رہا ہے کہ ذرا آپ بھی آ کر یہ تماشا دیکھ جاتے تو اچھا تھا کہ

کسب معصیت میں حکمت بیان کرنا کفر کے قریب ہے

اہل طریق سے طریق کے دھوکہ میں بعض ایسی دقیق غلطی ہو جاتی ہے کہ وہ کفر تک پہنچتی ہے۔ ایک صاحب مجھ کو سفر میں ملے کہنے لگے کہ صاحب اگر کبھی نفس میں گناہ کا تقاضا پیدا ہو اور تقاضہ کے روکنے سے اس میں اور زیادتی ہو تو ایسی صورت میں اگر ایک بار اس معصیت کا ارتکاب کر لیا جائے تاکہ قلب فارغ ہو جائے اور یکسوئی کے ساتھ ذکر و شغل میں لگ سکے تو اس میں کیا مضائقہ ہے کیونکہ جب تک وہ تقاضا قلب میں رہے گا اس وقت تک قلب ادھر ہی مشغول رہے گا۔ اور جب تقاضا جاتا رہے گا تو پھر آئندہ معصیت کا بھی اندیشہ نہ رہے گا۔ اس وقت اس معصیت سے استغفار کر لے۔ میں نے کہا توبہ کرو تم قریب بکفر ہو معاصی میں حکمتیں بیان کرتے ہو۔ اگر کوئی کہے کہ معصیت بھی ایک واقعہ ہے اور ہر واقعہ میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ہر فعل کے اندر دو مرتبے ہوتے ہیں، خواہ وہ فعل طاعت ہو یا معصیت ایک مرتبہ خلق کا اور ایک کسب کا تو خلق معصیت میں حکمت بیان کرنا تو فعل حق میں حکمت بیان کرنا ہے یہ تو محمود ہے باقی کسب معصیت میں حکمت بیان کرنا تو یہ قریب بکفر ہے۔ اور درحقیقت یہ بھی شیطان کا ایک دھوکہ ہے کہ گناہ کر لینے سے تقاضا کم ہو جائے گا کیونکہ ارتکاب معصیت سے فی الحال کچھ دیر کو تقاضا کم ہو جائے گا مگر اس کا یہ اثر ہوگا کہ آئندہ کے لئے مادہ معصیت قوی ہو جائے گا اور جڑ پکڑ جائے گا۔ پھر اس کا ازالہ قدرت سے باہر ہو جائے گا کیونکہ انسان جب تک کوئی گناہ نہیں کرتا اس وقت تک گناہ اس کی نظر میں پہاڑ کی طرح بھاری اور خطرناک ہوتا ہے اور جب ایک دفعہ کر لیا اب ایسا خطرناک نہیں دکھلائی دیتا ہے معمولی بات ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ ارتکاب کے بعد پھر بچنا آسان نہیں۔ اسی کو شیخ سعدیؒ نے بیان فرمایا ہے۔

شکم صوفئے رازبوں کرد فرج　　دو دینار بر ہر دو آں کرد خرج
یکے گفتش از دوستاں در نہفت　　چہ کردی بدیں ہر دو دینار گفت

بدینارے از پشت راندم نشاط   بہ د یگر شکم را کشیدم سماط
فرو مائیگی کردم وابلہی   کہ ایں ہمچناں پر شدد ال تہی

(صوفی کے شکم اور فرج نے خراب کر دیا دونوں دینار ان دو پر خرچ کر دیئے دوستوں میں سے ایک نے اس سے چھپ کر کہا کہ تم نے دونوں دینار کا کیا کیا تو اس نے کہا کہ ایک دینار میں نے خوشی پر خرچ کیا اور دوسرے سے پیٹ کو موٹا کیا۔ میں نے گھٹیا کام کیا کہ یہ اس سے پُر کیا اور وہ خالی ہے)۔

یعنی جس چیز کو بھر لیا تھا۔ یعنی شکم کو وہ تو پھر خالی ہو گئی اور جس کو خالی کیا تھا۔ یعنی شرم گاہ کو وہ پھر بھر گئی دونوں فعل بے نتیجہ ہوئے۔ اور بالفرض اگر تقاضا نہ بھی رہا تو پھر اس پر خوش نہ ہونا چاہیئے کیونکہ وہ تقاضا جاتا رہنا مسبب ہے گناہ (یہ تحقیق آب زر سے لکھنے کی ہے، **فللّٰہ درہ ثم للّٰہ درہ ۱۲**) سے اور تقاضا کا باقی رہنا، مسبب تھا طاعت سے اس لئے میں جزم کے ساتھ کہوں گا کہ طاعات کے ساتھ تقاضائے معصیت موجب قرب ہے اور معصیت کے ساتھ عدم تقاضا موجب قرب نہیں ہوسکتا بلکہ ارتکاب سے پہلے جو اس تقاضے کی وہ مخالفت کر رہا تھا یہ مقاومت نفس اور مجاہدہ کی ایک فرد تھی جو موجب قرب ہے۔ (آثار التوبہ ج ٢٣)

توبہ سے متعلق دو احادیث

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے دو حدیثیں بیان کی ہیں جن میں سے ایک اپنی طرف سے روایت کی ہے مگر یہ ان کا اپنی طرف سے بیان کرنا بھی ایسا ہی ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہی بیان کی گئی ہے۔ اس لئے کہ صحابہ کی شان وہ ہے جیسے کسی نے کہا ہے۔

درپسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

''آئینہ کے پس پردہ مجھے بٹھا رکھا ہے جو کچھ استاد ازل نے کہا وہی میں کہتا ہوں''

تو حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مثال مومن کی جو ڈرتا ہے اپنے گناہوں سے ایسی ہے جیسے ایک شخص پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہے اور ڈرتا ہے کہ کہیں گر نہ پڑے (پھر حضرت حکیم الامت مجدد الملۃ قطب الاقطاب رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا) کہ مجھ کو یاد ہے کہ ایک بار میرا کوئٹہ کا سفر ہوا تھا۔ وہاں ہم سیر کرتے چلے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک پہاڑ دیکھا جس کا ایک بہت بڑا حصہ آگے کو جھکا ہوا ایک بہت تھوڑی جگہ

پر لٹکا ہوا ہے۔ اور صدیوں سے اسی صورت سے موجود ہے تو جب ہم اس کے نیچے پہنچے تو بڑا ہی ڈر معلوم ہوا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب گرا۔ اسی طرح مومن بھی اپنے گناہوں سے ڈرتا ہے۔ گو ادنیٰ ہی گناہ ہوا اس سے بھی ڈرتا ہے۔ بخلاف فاجر کے کہ وہ گناہ کو مثل مکھی کے سمجھتا ہے کہ آئی اور اڑا دیا۔ تو معلوم ہوا کہ گناہ کو سخت سمجھ کر توبہ کرنا علامت ہے ایمان کی اور اس کو ہلکا سمجھنا علامت ہے بے ایمانی کی اور اوپر جو آیا ہے کہ جو گناہ کو بڑا نہ سمجھے اس کو مطلب یہ ہے کہ اتنا بڑا نہ سمجھے کہ توبہ سے مانع ہو جائے اور یہاں بڑا سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ اتنا چھوٹا نہ سمجھے کہ توبہ کی ضرورت نہ سمجھے غرض اصل چیز تو یہ ہے جو اعتقاد توبہ سے مانع ہو وہ مذموم ہے خواہ بڑے ہونے کا اعتقاد خواہ چھوٹا ہونے کا اعتقاد۔

دوسری حدیث وہ ہے جو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے یعنی اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندے کے توبہ کرنے سے اتنا خوش ہوتے ہیں جیسا ایک شخص اونٹنی پر سوار ہو کر سفر کے لئے روانہ ہوا چلتے چلتے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جو چٹیل میدان ہے نہ وہاں کوئی چیز کھانے کی نہ پینے کی نہ کوئی درخت ہے جس کے سایہ کے نیچے آدمی قیام کر سکے۔ غرض کہ تمام سامان ہلاکت کے موجود ہیں اور اس کے پاس جو اونٹنی ہے اسی پر تمام سامان کھانے پینے کا لدا ہوا ہے یہ گویا ایک مثال فرض کی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ بس وہ شخص اس جنگل میں جا کر اُتر پڑا اور سر رکھ کر سو گیا۔ سوتے سوتے آنکھ کھلی تو اونٹنی ندارد اب وہ بڑا حیران و پریشان ہوا۔ ہر طرف تلاش کیا مگر کہیں پتہ نہ چلا بے سروسامانی سے یہاں تک نوبت پہنچی کہ وہ اپنی زندگی سے بھی ناامید ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ مرنا تو ہے ہی پھر پریشانی میں کیوں مروں۔ مرنا بھی سکون ہی کے ساتھ اچھا (پھر حضرت حکیم الامۃ نے ارشاد فرمایا کہ) جیسے ایک بخیل کی حکایت مشہور ہے۔ کہ ایک بار وہ بیمار ہو گیا اس کے لڑکے نے کہا ابا جان علاج کرائیے! کہنے لگا کہ اگر علاج نہ کرایا تو کیا ہوگا۔ کہا ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ کہنے لگا اچھا حساب لگاؤ کہ علاج میں کیا خرچ ہوگا۔ چنانچہ اندازے سے حساب لگا کر بتایا گیا۔ پھر کہا اچھا اس کا بھی حساب کرو کہ اگر ہم علاج نہ کرائیں اور مر جائیں تو مرنے میں کیا خرچ ہو گا بتلایا گیا کہ مرنے میں اتنا خرچ ہوگا۔ جو علاج کے خرچ سے کم تھا، کہنے لگا کہ بس اب

ہماری رائے مرنے ہی کی ہوگئی ہے کیوں کہ اس میں خرچ کم ہے۔ بخل ہو تو ایسا تو ہو۔ تو اس نے حساب اسی لئے لگایا کہ یکسوئی کے ساتھ مروں۔ خیر میں یہ بیان کر رہا تھا کہ جب وہ شخص نا امید ہو گیا تو اس نے اونٹنی کا تلاش کرنا چھوڑ دیا اور مرنے کے لئے تیار ہو گیا کلائی پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں گویا مرنا اختیار میں نہ تھا۔ تو مرنے کی شکل بنانا تو اختیار میں تھا۔ اسی حالت میں وہ سو گیا۔ اب آنکھ جو کھلی تو کیا دیکھتا ہے کہ اونٹنی سامنے کھڑی ہے اور سارا سامان جو اس کے اوپر لدا ہوا تھا موجود ہے اب اس کی خوشی کی کچھ انتہا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ وہ تو زندگی سے مایوس ہو کر مرنے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ تو دیکھتا ہے کہ خلاف امید اونٹنی کھڑی ہے اور اس پر اس کا سامان بھی جوں کا توں رکھا ہوا ہے تو اب وہ کیسا خوش ہوگا آگے حدیث میں اس کے خوشی کے بعض آثار بھی مذکور ہیں جو ابھی آتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جتنا یہ شخص خوش ہوگا۔ اس سے زیادہ اللہ میاں خوش ہوتے ہیں۔ جب بندہ توبہ کرتا ہے۔ بھلا انہیں کیا ضرورت تھی خوش ہونے کی ان کا اس میں کیا نفع تھا۔ مگر وہ اپنے بندہ کو بہت ہی چاہتے ہیں، عام طور سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آیت لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ سے بہت کچھ امید رحمت کی ہوتی ہے میں کہتا ہوں کہ اس آیت کی شان نزول پر نظر کر کے کہ نو مسلموں کے باب میں ہے۔ حدیث میں اس سے بھی زیادہ رحمت حق پر دلالت ہے تو گو توبہ سے بندہ کا ہی بھلا ہوتا ہے مگر دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مرتبہ اتنا اپنی صحت سے جی خوش نہیں ہوتا جتنا اپنے پیارے کی صحت سے ہوتا ہے۔ مثلاً کہا کرتے ہیں کہ تیری بیماری مجھے لگ جائے۔ گو امتحان پر بہت کم لوگ پورے اترتے ہیں۔ مگر خیر زبان سے تو کہتے ہیں۔ جو ایک درجہ میں علامت ہے غایت محبت کی جب ہی تو اس کی بھلائی سے اپنا جی خوش ہوا۔ پھر انسان کو اپنی غرض بھی مطلوب رہتی ہے اور اگر کوئی بالکل ہی بے غرض ہو تو کم از کم اپنے پیارے کی راحت سے قلب کو راحت تو ضرور ہوگی یہ بھی ایک غرض ہی ہے کیونکہ انفعال خاصہ بشری ہے تو انسان کے اندر اس کا بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ کام اپنی راحت قلب کی وجہ سے کیا ہوگا۔ لیکن حق تعالیٰ تو انفعال سے بھی پاک ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ما بری از پاک و ناپاکی ہمہ   در گراں جانی و چالاکی ہمہ

(ہم تو ایسے مقدس ہیں کہ پاکی سے بھی پاک ہیں، پاکی سے پاک ہونے کی معنی یہ ہیں کہ جیسی پاکی تم سمجھتے ہو ہم اس سے پاک ہیں)۔

من نگردم پاک از تسبیح شان　　پاک ہم ایشاں شوند و درفشاں

(یعنی لوگوں کی تسبیح وتقدیس سے ہم پاک نہیں ہوں گے بلکہ اس سے وہی پاک ہو گئے)۔

یعنی حق تعالیٰ جل جلالہ، تو اتنے پاک ہیں کہ تمہاری سمجھی ہوئی پاکی سے بھی پاک ہیں ان کی تو وہ شان ہے کہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ثم وراء الوراء تو انسان کا تو انسان کی بیماری سے دل دکھتا ہے اسی لئے اس کی صحت چاہتا ہے۔ حق تعالیٰ تو اس سے بھی پاک ہیں بس حق تعالیٰ کو جو بندہ سے محبت ہے وہ بالکل بے علت و بے غرض محبت ہے۔ غرض وہ تمہارے ساتھ اس درجہ کے رحیم وشفیق ہیں (آثار الحوبہ ج ۲۳)

صحبت صالح کی علامات

جب اطاعت میں انسان کمال پیدا کرتا ہے تو یہ ثمرہ حاصل ہوتا ہے کہ بے کتاب کے اس کو علم حاصل ہوتے ہیں پس حدیث میں یہ علم اور ایسا عالم مراد ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جس شخص کے اندر تین باتیں ہوں اس کی صحبت کو غنیمت سمجھو۔ ایک یہ کہ وہ فقیہہ ہو۔ دوسرے محدث ہو۔ تیسرے صوفی ہو۔ (آثار الحوبہ ج ۲۳)

شبہات کا شافی علاج

ایک بار میں چھتاری گیا۔ نواب صاحب چھتاری نے بلایا تھا وہاں میرا بیان ہوا جس میں بہت سے علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ بھی جمع تھے۔ میں نے بیان میں یہ بھی کہا کہ آپ لوگوں نے جو یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ جہاں کسی عالم سے ملاقات ہوئی اور آپ نے اپنے شبہات کا دفتر اس کے سامنے کھول دیا۔ یہ طریقہ کامیابی کا نہیں اس سے آپ کے مرض کو شفا نہیں ہو سکتی۔ میں بتلاتا ہوں شفا کا طریقہ کیا ہے۔ آپ اپنے قلب کے اندر محبت پیدا کریں۔ محبت وہ چیز ہے کہ اگر ایک کسی عورت کسی فلسفی سے یہ کہے کہ لنگوٹا باندھ کر بازار کے اس سرے سے اس سرے تک گشت لگاؤ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر وہ کسی کا سچا عاشق ہے تو کبھی بھی پس وپیش نہیں کرے گا۔ بھلا وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ بی بی تمہاری اس میں کوئی منفعت نہیں اور میری اس میں ذلت ہے بلکہ اگر کوئی دوسرا بھی اس سے وجہ دریافت کرے گا تو یہ فلسفی اس سے بھی یہ کہے گا اجی پوچھو مت کہیں اس کی رائے نہ بدل جائے اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیئے کہ اس نے ایک تدبیر تو بتلا دی ہے اپنے ملنے کی۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود　　　گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

تو دیکھئے اس کسی کے امر و عمل میں اس عمل میں اس شخص کو وسوسہ تک نہیں ہوا کہ اس میں کیا حکمت ہے؟ کیا فائدہ ہے؟ نہ خود اس سے حکمت پوچھتا ہے نہ کسی دوسرے کو پوچھنے دیتا ہے۔ نہ کسی کے اعتراض پر توجہ کرتا ہے تو یہاں کون سی چیز تھی جس کی وجہ سے وسوسہ تک بھی نہ آیا۔ یہ محبت تھی اور کچھ نہیں۔ (آثار المحبہ ج ۲۳)

اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کی آسان تدبیر

اب رہا یہ سوال کہ محبت حق پیدا کیونکر ہو تو میں نے کہا میں تم کو ایسی آسان بات بتلاتا ہوں کہ سارے علی گڑھ کی تعلیم میں ایسا آسان سبق آج تک تم کو نہ ملا ہوگا۔ وہ یہ کہ محبت والوں کے پاس بیٹھنا شروع کر دو

غدر سے پہلے ہمارے ضلع میں ایک ڈپٹی نصر اللہ خان صاحب تھے جو کہ خود مستقل شیخ تھے اور ہمارے حضرات کو دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنی بیاض میں جس کا نام دل کشا ہے، ان ہمارے حضرات کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ ۔

آہن کہ بپارس آشنا شد　　　فی الحال بصورتِ طلا شد

تو صحبت عجیب چیز ہے غرض اس عالم کے کہنے کے موافق وہ بیچارہ اپنی بستی کو چھوڑ کر دوسری بستی کی طرف چلا اور آدھے ہی راستہ پر پہنچا کہ موت کا وقت آگیا ۔

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند　　　دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

اب وہ بیچارہ کیا کرتا مجبور تھا۔ اور کچھ تو اس سے ہو نہ سکا۔ بس اپنے سینہ کو اس دوسری زمین کی طرف بڑھا دیا چونکہ اس نے توبہ کا سامان شروع کر دیا تھا مگر ظاہراً ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی اس لئے رحمت کے فرشتے بھی آئے اور عذاب کے بھی، ملائکہ رحمت تو کہتے تھے کہ اس کی روح کو ہم لے جائیں گے کیونکہ اس نے توبہ کا سامان کرنا شروع کر دیا ہے اور ملائکہ عذاب کہتے تھے کہ اس کی روح کو ہم لے جائیں گے کیونکہ ابھی توبہ مکمل نہیں ہوئی۔

بندہ کا کام ہمت کرنا ہے

بندہ کو چاہئے ہمت کرے پھر اس کی تکمیل اللہ تعالیٰ خود کر لیتے ہیں۔ جیسے باپ دیکھ لیتا ہے کہ بچہ دس قدم چلا اور گر گیا تو خود ہی رحم کھا کر اس کی مدد کرتا اور اس کو گود میں اٹھالیتا

ہے تو جیسے باپ یہ چاہتا ہے کہ بچہ اپنی طرف سے کوشش کرے چلنے کی اسی طرح حق تعالیٰ ہماری طلب کو دیکھنا چاہتے ہیں مگر ہم تو سرکتے ہی نہیں اپنی جگہ سے۔ اور حق تعالیٰ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ چل کر گرا بھی ہے یا نہیں وہ صرف طلب کو دیکھتے ہیں پھر خود ہی امداد فرماتے ہیں ورنہ بغیر ان کی امداد کے بندہ کیا کر سکتا ہے۔

مابداں مقصد عالی نتو انیم رسید — ہاں مگر لطف شاپیش نہد گامے چند
نہ گردد قطع ہرگز جادۂ عشق از ددیدنہا — کہ می مالد بخود ایں راہ چوں تاک از دبردنہا

تو یہ طریق تو انہیں کے قطع کرنے سے قطع ہو سکتا ہے۔ (آثار الحوبہ ج ۲۳)

حروف مقطعات

سوال عن الحکمت میں کیا حکمت ہے

مثلاً یہ سوال کہ حدیث و قرآن میں یہ حکم کس لئے فرمایا گیا اس میں کیا حکمت ہے کیا بھید ہے؟ میں اس قسم کے سوال کرنے والوں کو جواب بھی ایسا ہی دیتا ہوں جس سے اُن کو اپنی غلطی پر تنبیہ ہو جائے اب بعض تو سمجھ جاتے ہیں اور بعض الٹا مجھ ہی کو بدنام کرتے ہیں مگر میں اس بدنامی سے خوش ہوں جو نافہم کی طرف سے ہو۔

واذا اتتک مذمّتی من ناقص — فھی الشھادۃ لی بانی کامل

(اور جب میری مذمت تمہارے پاس کسی نافہم سے آئے تو سمجھ لو کہ یہ میرے لئے کامل ہونے کی شہادت ہے)

چنانچہ ایک صاحب نے کسی خاص مسئلہ کی نسبت پوچھا کہ اس حکم میں کیا حکمت ہے میں نے کہا پہلے آپ یہ بتلائیے کہ آپ کے سوال عن الحکمت میں کیا حکمت ہے؟ اس پر وہ خاموش ہو گئے لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ اگر یہ کچھ حکمت بیان کریں گے تو میں اس پر اعتراض کر کے آخیر میں ان کو عاجز کر دوں گا وہ اپنا عجز تسلیم نہ کرتے مگر طلبہ اور اہل فہم اُن کا عجز سمجھ جاتے۔

غالباً حروف مقطعات کی مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھی

چنانچہ کانپور میں جلالین کا درس میرے پاس ہو رہا تھا اور ایک کورٹ انسپکٹر بھی اس وقت میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے میں نے الٓمٓ کے متعلق یہی بیان کیا کہ غالباً حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کو اُن کی مراد پر اطلاع تھی مگر صحابہؓ کو اطلاع نہ تھی اور سلاطین کا قاعدہ ہے کہ بعض اسرار کو وہ وزیر ہی تک محدود رکھتے ہیں عام رعایا کو ان پر مطلع نہیں کرتے اسی طرح یہ بھی اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اسرار ہیں اس تقریر کو سن کر وہ کورٹ انسپکٹر کہنے لگے کہ واقعی یہ بالکل صحیح ہے میں نے کہا کہ آپ تو اس کی ایسی تصدیق کر رہے ہیں جیسے آپ کو اس کا مشاہدہ ہو رہا ہو آپ نے اس قوت کے ساتھ کیونکر اس کی تصدیق کی کہنے لگے کہ میں ابھی اناؤ سے آ رہا ہوں ایک ضرورت کی وجہ سے میں کلکٹر سے ملنے گیا تو اُن کی میز پر ایک کتاب رکھی ہوئی تھی میں اُس کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔ کلکٹر نے مجھے اس کے دیکھنے سے منع کیا اور کہا اس کو بند کر کے رکھ دیجئے یہ آپ کے دیکھنے کی چیز نہیں میں نے وجہ پوچھی تو کہا کہ اس میں محکمہ سی آئی ڈی کی اصطلاحات ہیں اور اس کا محکمہ آپ کے محکمہ سے الگ ہے آپ اس کو نہ دیکھیں۔

تو معلوم ہوا کہ سلاطین کے بعض اسرار ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر سب عہدہ داروں کو مطلع نہیں کیا جاتا بلکہ ہر محکمہ کے جدا احکام اور اسرار ہیں ایک محکمہ والے کو دوسرے محکمہ کے اسرار معلوم کرنے کا حق نہیں تو دیکھئے اس شخص پر چونکہ یہ حالت گذر چکی تھی اس لئے اس نے میری تقریر کو سن کر سب سے پہلے تصدیق کی اور اس طرح تائید کی جیسے اس کو حقیقت کا مشاہدہ ہو رہا ہے پس جن اسرار پر اطلاع سے ہم کو روک دیا جائے ان کو اپنے حق میں منہی عنہ سمجھنا چاہئے اور ان کے درپے نہ ہونا چاہئے اور اس میں راز یہ ہے کہ اسرار میں غموض زیادہ ہوتا ہے اگر ان کو بیان بھی کر دیا جائے تو سب لوگ ان کو سمجھ نہیں سکتے۔ پھر حقیقت تک تو بیان کے بعد بھی نہ پہنچیں گے بس یہ ہوگا غیر حقیقت کو حقیقت سمجھ کر دھوکے میں پڑ جائیں گے اسی لئے صوفیہ نے اہل ظاہر کو مخاطب کر کے فرمایا ہے اَنْتُمْ تَخَافُوْنَ الْمَعَاصِیَ وَنَحْنُ تَخَافُ الْكُفْرَ کہ تم کو تو صرف گناہ ہی کا خطرہ رہتا ہے اور ہم کو قدم قدم پر کفر کا خطرہ رہتا ہے کیونکہ ان کے سامنے جن اسرار کا انکشاف ہو رہا ہے وہ نہایت عالی ہیں ان میں اگر کبھی دھوکا پڑ گیا تو کفر تک نوبت پہنچے گی۔ (استمرار التوبہ ج ۲۳)

گناہوں کی تفصیلات کا علم ضروری ہے

ہم کو گناہوں کی تفصیل معلوم نہیں تو جب گناہ ہی کا علم نہ ہوگا اور توبہ گناہ ہی سے ہوتی ہے تو توبہ کیونکر ہوگی افسوس ہے ہم لوگوں کو علم سے اس قدر اجنبیت ہوگئی ہے کہ اگر کوئی عالم

ہمارے سامنے ہمارے افعال کا گناہ ہونا بیان کرتا ہے تو سن کر تعجب ہوتا ہے علم سے اجنبیت کے متعلق ایک حکایت یاد آ گئی ایک معتبر راوی سے معلوم ہوا کہ ایک بڑے انگریزی کے فاضل کو سفر میں پانی نہ ملا تو نماز کے وقت آپ نے تیمم کیا اور مٹی لے کر اس سے کلی بھی کی خدا جانے کیا کیا ہوگا منہ میں مٹی لے کر اس کو تھوکا ہوگا یا اور کوئی صورت نکالی ہوگی ملاحظہ کیجئے کہ ناواقفی کس حد تک پہنچ گئی۔ عورتوں کی یہ حالت ہے کہ اگر دس بیس عورتوں کو جمع کر کے ان کی نمازیں سنی جائیں تو شاید ایک کی بھی نماز صحیح نہ نکلے اور اگر ان سے کہا جاتا ہے کہ مردوں سے سیکھ کر نماز صحیح کرلو تو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ہم کو تو شرم آتی ہے انہیں شرم والیوں سے اگر ان کا شوہر یہ کہے کہ میں تم کو ایک ہزار کا زیور بنادوں گا بشرطیکہ تم نماز صحیح کرلو تو دیکھیں اس وقت ان کی شرم کہاں جاتی ہے خاص کر اگر کسی بوڑھی عورت سے کہا جاتا ہے تو وہ تو ذرا بھی متوجہ نہیں ہوتی اور کہتی ہے کہ اب بوڑھے طوطے کیا پڑھیں گے لیکن اگر انہیں بوڑھے طوطوں کو کوئی دنیا کا لالچ ہو تو دیکھئے کیسی زبان کھلتی ہے۔ افسوس ہے کہ عورتوں کو تو ثواب عذاب کا مردوں سے زیادہ خیال ہوتا ہے کہ وہ عذاب سے ڈرتی ہیں اور ثواب کی طرف راغب ہوتی ہیں پھر بھی وہ کیوں متوجہ نہیں ہوتیں ہاں اگر کسی نے تصحیح قرآن شریف میں محنت و مشقت کی اور پھر بھی حروف درست نہ ہوئے تو وہ معذور ہے پھر اس سے جس طرح بھی ادا ہو سکے جائز ہے لیکن محنت کئے بغیر معاف نہیں ہوگا۔ غرض کوشش کرنی چاہیئے کہ نماز صحیح ہو جائے اسی طرح نماز تنگ وقت میں پڑھنا بھی عام عادت ہوگئی ہے۔ خاص کر اکثر عورتیں کام کاج میں اس قدر دیر کر دیتی ہیں کہ مکروہ وقت میں نماز پڑھتی ہیں لیکن اس کو ذرا بھی برا نہیں سمجھا جاتا۔

علیٰ ہذا جلدی جلدی نماز پڑھنا کہ گویا ایک بے گار ہے جس طرح بنے اس سے جان چھڑاؤ اس میں بعض اوقات ایسی صورتیں پیش آجاتی ہیں کہ نماز بالکل ہی نہیں ہوتی کہ پڑھی بھی اور ثواب بھی نہ ملا بلکہ اُلٹا گناہ ہوا عورتوں سے تعجب ہے کہ وہ ان باتوں کی طرف ذرا خیال اور توجہ نہیں کرتیں اسی طرح بہت سے ایسے امور ہیں کہ ان کے گناہ ہونے کی خبر بھی نہیں سو اس کا علاج یہی ہے کہ علم دین پوری طرح حاصل کیا جائے۔ (تفصیل التوبہ ج ۲۳)

گناہ کی دو قسمیں

گناہ دو قسم کے ہیں ایک تو وہ ہیں کہ اگر ان کو نہ کیا جائے تو دنیا کا کوئی کام اٹکتا ہے

بعض وہ ہیں کہ اگر ان کو چھوڑ دیا جائے تو کوئی نقصان نہیں ہے۔ مثلاً لباس خلاف وضع اسلامی پہننا اگر اس کو ترک کر دیا جائے تو دنیا کا کوئی بھی نقصان نہیں ہے۔ اسی طرح ٹخنوں سے نیچے پاجامے پہننا کہ ان کے ترک سے دنیا کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ یا مثلاً عورتیں اس قدر باریک لباس پہنتی ہیں کہ اس میں پورے طور پر ستر نہیں ہوتا تو ان باتوں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو کوئی نقصان بھی نہیں ہے رشوت وغیرہ میں تو آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بغیر ان کے ہمارے کام چلنے دشوار ہیں لیکن ان معاصی بے لذت میں کیا نفع ہے اور ان کے ترک میں کیا نقصان ہے علیٰ ہذا کسی امرد یا اجنبی عورت کو بُری نظر سے دیکھنا کہ اس میں کچھ بھی نفع نہیں نہ اس کے ترک میں کوئی ضرر۔ اگر کہو کہ صاحب نہ دیکھنے میں تکلیف ہوتی ہے تو یہ بالکل غلط ہے بلکہ تکلیف دیکھنے میں ہوتی ہے کہ اول نظر پڑتے ہی قلب میں ایک سوزش پیدا ہوئی اس کے بعد جب وہ نظر سے غائب ہو گیا تو اس سوزش میں ترقی شروع ہوئی حتیٰ کہ بعض لوگوں کا اس میں خاتمہ ہو گیا اور اگر مان بھی لیا جائے کہ نہ دیکھنے میں کچھ تکلیف ہوتی ہے تو تھوڑی سی تکلیف کا پھر وہ بھی چند دن کی برداشت کر لینا کیا دشوار ہے اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ بہت ہی تکلیف ہوتی ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ آخر ضرر کیا ہوا کیا اس تکلیف سے تنخواہ بند ہو گئی یا کھانا بند ہو گیا ہرگز نہیں اور خود یہ تکلیف وہی کوئی معتد بہ ضرر نہیں غرض ان معاصی کو تو فی الفور چھوڑ دیا جائے اور جن معاصی کو بہ زعم خود موقوف علیہ حوائج دنیویہ کا سمجھ رکھا ہے ان کو اگر ترک نہ کر سکیں تو روزانہ ندامت و استغفار اور یہ دعا کہ اے اللہ ہم کو اس سے نجات دے یہ تو ممکن ہے اتنا ہی کر لیا کرو یہ بے فکری و بے پروائی تو بہت بُری چیز ہے۔ (تفصیل التوبہ ج ۲۳)

نماز پنجگانہ کی دلیل پوچھنے والے کی حکایت

ایک صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ نماز پانچ وقت کی کیوں مقرر ہوئی میں نے بطور نظیر کے ان سے پوچھا کہ اول یہ بتلائیے کہ آپ کی ناک چہرے پر کیوں لگائی گئی کمر پر کیوں نہیں لگائی گئی جب اس ترتیب کے وجوہ اور مصالح سب آپ کو معلوم ہو جائیں تو اس کے بعد اوقات نماز کی تعیین کے مصالح دریافت کیجئے گا غرض جس کو فن سے مناسبت نہیں ہوتی اس کا بولنا ہمیشہ بے موقع ہوتا ہے اور اس لئے وہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ (ضرورۃ التوبہ ج ۲۳)

احکام شرعیہ کے ساتھ ہمارا مشرب عاشقانہ ہونا چاہیئے

صاحبو! شریعت کے احکام کے ساتھ ہمارا بالکل وہ مذہب ہونا چاہیئے جو عاشق کا معشوق کے ساتھ اور مملوک کا مالک کے ساتھ ہوتا ہے مشہور ہے کہ ایک شخص نے ایک غلام خریدا اور اس سے پوچھا کہ تیرا کیا نام ہے اس نے کہا کہ جو آپ مقرر کریں پھر آقا نے پوچھا کہ تو کیا کھایا کرتا ہے غلام نے کہا جو آپ کھلائیں اسی طرح لباس کے متعلق سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ جو کچھ آپ پہنائیں وہی لباس ہے تو صاحبو! کیا خدا سے جو علاقہ ہمارا ہے وہ غلامی نہیں ہے۔ بلکہ اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہم کو حقیقی غلامی حاصل ہے۔ دیکھو انسانی غلامی سے انسان ایک وقت میں نکل بھی سکتا ہے۔ یعنی جب کہ آقا غلام کو آزاد کر دے برخلاف ہماری غلامی کے کہ یہ طوق ہماری گردن سے کبھی نکل ہی نہیں سکتا کیونکہ اس غلامی سے آزادی کی یہی صورت ہے کہ نعوذ باللہ ہم بندے نہ رہیں اور خدا خدا نہ رہے اور یہ غیر ممکن تو ہماری آزادی بھی غیر ممکن نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری آزادی محال عقلی ہے اور ہم ہمیشہ کے لئے غلام ہیں تو ہم کو غلام ہی کا برتاؤ بھی کرنا چاہیئے اور کسی حکم کے امتثال میں گرانی نہ ہونی چاہیئے اور میں کہتا ہوں کہ احکام کے دشوار معلوم ہونے سے ان میں کسی قسم کا شبہ کرنا تو بالکل ہی لغو ہے کیونکہ احکام کا نفس پر گراں گذرنا یہی تو دلیل ہے اس حکم کے خداوندی حکم ہونے کی کیونکہ جو حکم نفس کے موافق ہو اس کو تو نفس خود ہی اپنے لئے تجویز کر لیتا ہے اُس میں کسی دوسرے کے حکم کرنے کی کیا ضرورت تو خدا کی جانب سے تو وہی احکام مقرر ہوں گے جو کہ نفس پر بار ہوں تا کہ خدا تعالیٰ دیکھیں کہ جو کچھ کرتے ہو اس سے اپنے نفس کا خوش کرنا منظور ہے یا خدا کا اور اس خوش کرنے میں بھی ہماری ہی مصلحت ہے نہ کہ خدا کی۔

من نکردم خلق تا سُودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جُودے کنم

(میں نے مخلوق کو اپنے لئے پیدا نہیں کیا بلکہ اس لئے پیدا کیا ہے تا کہ اپنے بندوں پر سخاوت کریں)۔

اتنا وسیع نظام عالم ہمارے ہی فائدے کے لئے ہے اور ہمیں کو نفع پہنچانا مقصود ہے اور ہر ہر طرح ہماری ہی مصلحتوں پر نظر ہے البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہماری مصالح حال کی بھی جن کو ہم نے اختراع کر کے مصلحت کا لقب دیا ہے ان احکام میں رعایت ہو لہٰذا ہم کو بھی یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ فی الحال ہماری کیا مصلحت ہے بلکہ اگر مصالح حال پر نظر ہوتی تو

احکام بتلانے کی ہی کیا ضرورت تھی جب ہم نے مصالح کو اختراع کیا تھا ان کے مناسب تجاویز بھی خود ہی سوچ سکتے تھے۔ (ضرورۃ التوبہ ج ۲۳)

اسرار احکام معلوم کرنے کا طریقہ

اول قلب میں نور پیدا کرو خود بخود یہ کیفیات پیدا ہوں گی اور ہر چیز کی سینکڑوں حکمتیں نظر آنے لگیں گی۔ دیکھو اگر کوئی معمولی شخص کسی والی ملک سے کہے کہ مجھے اپنے خزانے کے جواہرات دکھا دو تو اس کی سخت غلطی ہے اور کبھی یہ شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔ البتہ کامیابی کی یہ صورت ہے کہ پہلے صاحب جواہرات سے ایک خاص تعلق پیدا کرے اور اس کے خواص میں داخل ہو جائے اس کے بعد بغیر درخواست ہی کبھی وہ مہربان ہوگا تو خود دکھلا دے گا اسی کو کہتے ہیں۔

بینی اندر خود علوم انبیاء　　بے کتاب و بے معید و اوستا

(تو اپنے اندر انبیاء علیہم السلام کے علوم کو بغیر کتاب اور مددگار کے اور بغیر استاد کے دیکھے گا)

علم چوں بر تن زنی مارے بود　　علم چوں بر دل زنی یارے بود

(تو علوم ہے اگر نفس کی موافقت میں کام لے تو وہ سانپ کے جیسا بن جاتا ہے اور جب تو علم کو روحانیت پر چلائے تو وہ تیرا دوست بن جائے گا)۔

تو دل پر مؤثر بناؤ اس کے بعد دیکھو کن علوم کا انکشاف ہوتا ہے اب لوگ چاہتے ہیں کہ ساری باتیں استاد کے سامنے بیٹھ کر حل کر لیں حالانکہ یہ محض فضلِ خداوندی سے ہوتا ہے اور وہ بھی جب کہ خدا تعالیٰ چاہیں کہ فضل اسی خاص طریقے سے ہو کیونکہ کبھی کسی خاص شخص کے بارے میں یہی فضل ہوتا ہے کہ اس کو اسرار پر مطلع نہ کیا جائے جیسا کہ بعض کے لئے مطلع ہونا فضل ہوتا ہے اور وجہ اس فرق کی یہ ہے کہ بعض آدمیوں کو جو کچھ اسرار معلوم ہونے لگتے ہیں تو ان کو ناز ہو جاتا ہے حتی کہ بعض بعض اپنے کو اکابر کی برابر سمجھنے لگتے ہیں لہٰذا اس لئے یہی مناسب ہے جب ہر ایک کے لئے مصلحت جدا ہے تو خود کچھ بھی تجویز نہ کرو۔

تو بندگی چو گدایاں بشرطِ مُزد مکن　　کہ خواجہ خود رویں بندہ پروری داند

(تو فقیروں اور مزدوروں کی طرح مزدوری حاصل کرنے کے لئے عبادت کر کیونکہ جو مالک ہے وہ اپنے بندوں کی پرورش کے طریقوں سے خود واقف ہے)۔ (ضرورۃ التوبہ ج ۲۳)

علوم ظاہری کا ماحصل

ابن العربی کا ایک خط اپنی کشکول میں علامہ بہاء الدین عاملی نے نقل کیا ہے جو انہوں

نے اپنے ایک معاصر عالم کو لکھا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ آپ ایک روز بیٹھے رو رہے تھے آپ کے کسی شاگرد نے وجہ پوچھی تو آپ نے وجہ بیان کی کہ میں اتنے سال سے ایک دعوے کو دلیل عقلی سے صحیح سمجھے ہوئے تھا آج ایک مقدمہ اس دلیل کا مخدوش معلوم ہوا تو میں اس لئے رو رہا ہوں کہ اتنے زمانے تک جہل میں مبتلا رہا اور اب بھی اطمینان نہیں کہ جواب جو ثابت ہوا وہ بھی صحیح ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ تم نے اپنے علم ظاہری کی قوت دیکھی اب چاہیئے کہ دوسرا علم حاصل کرو جس کا طریقہ یہ ہے کہ خلوت اور دوام ذکر اختیار کرو بس اس قسم کا مضمون لکھا ہے۔ امام رازیؒ اتنے تبحر کے بعد جب کہ ان کو کچھ حقیقت شناسی کا رائحہ نصیب ہوا اس وقت یوں کہتے ہیں۔

نهاية اقدام العقول عقال وغاية سعي العٰملين ضلال
ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا سوى ان جمعنا فيه قيل يقال

(اور ہماری ساری عمر کی بحثا بحثی نے ہمیں اس کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچایا کہ ہم نے یہ باتیں لکھ کر جمع کر لی ہیں کہ یوں کہا گیا ہے اور یوں کہا جائے گا)۔

کہ ساری عمر کے مباحث اور علوم کا نتیجہ جو اخیر میں کھلا تو یہ تھا کہ قیل کذا وقال فلان کذا (اس طرح کہا گیا ہے اور فلاں نے اس طرح کہا ہے)۔ (ضرورۃ التوبہ ج ۲۳)

مومن کے لئے خلود فی النّار نہیں

ہر مومن کی نجات ضرور ہے گو اخیر میں ہو اور اولاً جزا و سزا اعمال کی بھگتنی پڑے چنانچہ حدیث میں اس معنی کی تصریح موجود ہے **لَا يَبْقٰى فِي النَّارِ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِّنْ اِيْمَان ؟** (سنن ابن ماجه: ٥٩، سنن الترمذي: ١٩٩٨ بلفظ آخر) (نہیں باقی رہے گا دوزخ میں کوئی ایسا شخص جس کے دل میں ذرہ بھر بھی ایمان ہو) کہ دوزخ میں کوئی وہ شخص نہیں رہے گا۔ دوزخ اس کے رہنے کا مکان نہیں ہے۔ مکان اصلی اس کا جنت ہے مگر بعارض دوزخ میں آ گیا ہے، غرض جس کے دل میں ذرا سا بھی ایمان ہے جس کی وجہ سے اس کو کافر نہ کہہ سکیں اس کے واسطے بھی جنت ثابت ہے اور **خُلُوْدُ فِي النَّار** نہ ہوگا۔ اور کبھی نہ کبھی دوزخ سے نکال لیا جائے گا حتی کہ اس قدر ضعیف اور قلیل الایمان شخص بھی جس کے دل میں اس قدر تھوڑا حصہ ایمان کا ہوگا۔ جس کا پتہ انبیا اور ملائکہ کو بھی نہ لگے گا۔ اور اس کی

اطلاع فقط اللہ تعالیٰ کو ہوگی۔ وہ بھی نکال لیا جائے گا۔ چنانچہ ایک حدیث ہے جو شفاعت کے بارہ میں وارد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ اخیر میں فرمائے گا کہ سب لوگ شفاعت کر چکے انبیاء بھی اور ملائکہ بھی اور مومنین بھی۔ (اول الاعمال ج ۲۳)

حدیث شفاعت میں ایک لطیف تحقیق

شفاعت دراصل تو رحمت ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو کسی دوسرے سے سفارش کرنا نہیں ہے یہ فرما کر ایک لپ بھر کر دوزخیوں کی جنت میں داخل کر دیں گے یہ لپ بھر کنایہ ہے تعداد کثیر سے۔ اس حدیث میں غور کرنا یہ ہے کہ تھوڑے تامل سے بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ اس سے میرے اس دعوے کا اثبات ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے قلب میں اتنا خفیف ایمان ہوگا جس کا پتہ کسی شفاعت کرنے والے کو حتی کہ انبیا اور ملائکہ کو بھی نہ چلے گا اور ان کو بھی نجات ہوگی۔ یہ بات ذرا غامض (پوشیدہ کلام) معلوم ہوتی ہے مگر تھوڑی تقریر کے بعد غامض نہ رہے گی وہ تقریر یہ ہے کہ نص قطعی موجود ہے اس پر کہ کافر کی کبھی مغفرت نہ ہوگی چنانچہ سورہ بینہ میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ وَالْمُشْرِکِیْنَ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ خَالِدِیْنَ فِیْھَا (جو لوگ اہل کتاب اور مشرکین میں سے کافر ہوئے وہ دوزخ کی آگ میں ڈالے جائیں گے جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے) اور اس مضمون کی آیتیں صدہا قرآن شریف میں موجود ہیں چنانچہ عقیدہ اہل سنت کا یہی ہے کہ کافر کے لئے خلود فی النار ضرور ہوگا۔ اور اس کی کبھی مغفرت نہ ہوگی۔ تو اب یہ لوگ جن کو حق تعالیٰ نے اخیر میں دوزخ سے نکالا وہ اس دلیل سے مومن تو ضروری ہیں تو اب دیکھنا یہ ہے کہ کسی نے ان کی سفارش کیوں نہیں کی کیونکہ مومنین کے لئے سفارش کی اجازت ہو چکی، اس کی وجہ اگر ہو سکتی ہے تو یہی کہ یہ لوگ اس قدر ضعیف الایمان ہوں گے کہ کسی کو ان کے ایمان کا احساس نہ ہو سکے گا باوجود یہ کہ سب حدید البصر ہیں مومن کے لئے حدیث میں وارد ہے اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ (سنن الترمذی: ۳۱۲۷، کنز العمال: ۳۰۷۳۰) یعنی مومن کے تاڑ لینے سے ڈرو کیونکہ وہ نور خدا سے دیکھتا ہے۔ (اول الاعمال ج ۲۳)

جمیع العلم فی القرآن کا جواب

اس سے مراد علوم مقصود یعنی علوم دین ہیں اور پھر علوم دین میں کے بھی اصول کو کہیں فروع

بھی ہیں مگر جملہ فروع نہیں یہی تو وجہ ہے کہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اُوْتِیْتُ مِثْلَ الْقُرْاٰنِ (مجھے قرآن کے اس کا مثل (حدیث) بھی دیا گیا ہے) چنانچہ میں گدھے کو حرام کرتا ہوں دیکھ لیجئے اس کی حرمت قرآن میں نہیں ہے صرف حدیث سے ثابت ہے غرض اصول اور مہمات دین تو سب کے سب مذکور ہیں قرآن میں اور بعض فروع بھی ہیں فروع کے احاطہ کا اہتمام نہیں کیا گیا اور آج کل اسی کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہر ہر فرع بھی قرآن ہی سے نکالی جائے بلکہ دین تک بھی اس کا حصہ نہیں رہا دنیا کی باتیں بھی قرآن ہی سے نکالنا چاہتے ہیں اور اس کو قرآن کا بڑا کمال سمجھتے ہیں، اخباروں میں ایسے مضمون چھپتے ہیں مثلاً ایک سوال نوجوانوں کا یہ شائع ہو رہا ہے کہ داڑھی کا ثبوت قرآن میں کہاں ہے (اول الاعمال ج ۲۳)

شریعت کی حفاظت علماء حضرات سے وابستہ ہے

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے زمانہ میں ایک عالم نے کسی صوفی کا رد لکھا تھا شاہ صاحب کو جوش آیا اور ارادہ جواب لکھنے کا کیا اسی وقت ان کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت مکشوف ہوئی اور ان کو منع کیا۔ شاہ صاحب اس کو لکھ کر آگے لکھتے ہیں کہ مجھ کو زیادہ گوشۂ خاطر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علماء کی طرف معلوم ہوا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ شریعت کی حفاظت اور عالم کے انتظام کا قیام ان ہی حضرات سے وابستہ ہے اور نرے صوفی آزاد ہوتے ہیں جو چاہتے ہیں کہہ اٹھتے ہیں جو لوگ اس کی حقیقت تک نہیں پہنچتے وہ گمراہ ہوتے ہیں اور جو صوفی علم شریعت نہیں رکھتے وہ تو خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں مولانا فرماتے ہیں۔

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند — از سخنہا عالم را سوختند
نکتہا چوں تیغ پولا داست تیز — چوں نداری تو سپر واپس گریز
پیش ایں الماس بے اسپر میا — کز بریدن تیغ را بنود حیا

(بڑے ظالم تھے وہ لوگ جنہوں نے آنکھیں بند کر کے ایسی باتوں سے ایک عالم کو ویران کر دیا۔ بہت سے نکتے تلوار کی طرح تیز ہیں اور سیر سے مراد فہم یعنی اگر فہم نہ ہو تو دور رہو اس کے سامنے بدون سپر کے نہ آؤ کیونکہ ایمان اگر اس کے سامنے نہ پڑے گا یہ اس کو قطع کر دے گا)۔ (الافتضاح ج ۲۳)

شہوتِ شیخ شباب سے اشد ہے

میں کہا کرتا ہوں کہ شہوت شیخ (بوڑھا) شہوت شباب سے اشد ہے کیونکہ جوان نفس زندہ ہے اس کو شہوت کا احساس بھی جلد ہوتا ہے اور احساس کے بعد اس میں قوت کف بھی زیادہ ہے وہ اپنے نفس کو جلد ہوائے نفسانی سے روک سکتا ہے اور شیخ کا نفس چونکہ مر چکا ہے اس لئے اس کو ہوائے نفس کا احساس جلد نہیں ہوتا بلکہ بہت دیر میں ہوتا ہے تو اس حالت میں استرسال نفس (ڈھیل دنیا) زیادہ ہوتا ہے، پھر اس ڈھیل کے بعد شیخ کو ہوائے نفس کا جس وقت احساس ہوتا ہے تو اب وہ ضبط پر قادر نہیں ہوتا۔ کیونکہ جس طرح اس کی قوت شہوت کمزور ہے اسی طرح قوت ضبط بھی کمزور ہے۔ اب وہ لاکھ کوشش کرے کہ کسی طرح نفس کو سوء نظر سے روکوں مگر قدرت نہیں ہوتی۔ (العبرہ بذبح البقرہ ج ۲۳)

اور جوان کی جس طرح شہوت کامل اور زندہ ہے اسی طرح اس کی قوت ضبط بھی کامل اور زندہ ہے اسی لئے جوان کو بوڑھے سے زیادہ عفت پر قدرت ہے اور اس کی عفت شیخ کی عفت سے کامل بھی ہوتی ہے کیونکہ نہ اس کو زیادہ استرسال ہوتا ہے اور نہ استرسال کے بعد ضبط دشوار ہوتا ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شدتِ نزع کا سبب

انبیاء علیہم السلام کو جب دنیوی اسباب سے تعلق نہیں ہوتا تو چاہیئے ان سے مفارقت سہل ہو پھر ان کا نزع کیوں شدید ہوتا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نزع میں بہت شدت ہوئی حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شدت نزع دیکھ کر میں کسی کی سہولت نزع دیکھ کر اس کی تمنا نہیں کرتی اسی طرح بعض اولیآ کو بھی نزع شدید ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے تو بات یہ ہے کہ شدید نزع کا سبب تو تعلقات ہی ہیں جس قدر روح کو ناسوت سے تعلق ہوگا۔ اسی قدر نزع میں شدت ہوگی۔ مگر تعلقات دو قسم پر ہیں ایک وہ جو مانع عن الآخرت ہیں جیسے جائیداد اور مال وغیرہ کی محبت ان سے جو شدت ہوتی ہے اس سے تکلیف سخت ہوتی ہے۔ دوسرے وہ تعلقات ہیں جو آخرت سے مانع نہیں ہیں بلکہ معین آخرت ہیں اور یہ وہی تعلقات ہیں جو اس کے مصداق میں داخل ہے۔

اسیرش نہ خواہد خلاصی زبند (اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا) (العبرہ بذبح البقرہ ج ۲۳)

بعض اہل اللہ کی شدّتِ نزع کا موجب

اہل اللہ کو حقیقی تعلق تو بجز ذاتِ حق کے کسی سے نہیں ہوتا اور اس کا مقتضا سہولت نزع ہے مگر بعض حضرات کو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد خلق و تربیت طالبین کی خدمت سپرد ہوتی ہے اور یہ بدون توجہ الی الخلق کے نہیں ہو سکتی اس لئے ان کو امر حق سے مخلوق کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے اور اصلاح و ارشاد کے لئے ان سے ایک گونہ تعلق ہو جاتا ہے اور یہ تعلق چونکہ بامر حق ہے اس لئے آخرت سے مانع نہیں ہوتا بلکہ موجب اجر اور سبب ترقی ہے۔ جس سے جس قدر اصلاح و ارشاد کا فیض ہوگا اسی قدر اس کے درجات میں اضافہ ہوگا چونکہ یہ خدمت سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کے سپرد کی گئی ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کو مخلوق کے ساتھ یہ تعلق زیادہ ہوتا ہے اور انبیاء میں بھی ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد سب سے زیادہ یہ خدمت تھی کیونکہ قیامت تک آنے والی مخلوق کے لئے آپ ہی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں آپ کے بعد کوئی دوسرا رسول آنے والا نہیں تو آپ کو سب سے زیادہ ارشاد اصلاح کی فکر و اہتمام تھا اس لئے آپ کو نزع میں شدت زیادہ ہوئی کیونکہ روح کو امت کے ساتھ تعلق تھا اور وصال کے وقت بھی آپ کو ان کا اہتمام تھا مگر یہ تعلق لذیذ اور یہ فکر خوش گوار تھا۔ آپ کے لئے اس میں اجر اور ترقی درجات تھی اس لئے شدت نزع سے جسم کو تو تکلیف ہوئی مگر روح کو کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ انبیاءؑ کے بعد بعض اولیاء ایسے ہوتے ہیں جن کے سپرد خدمت ارشاد و تبلیغ ہوتی ہے ان کو بھی نزع میں بوجہ طالبین کی فکر کے شدت ہوتی ہے مگر ان کو انبیاء کے برابر شدت نہیں ہوتی کیونکہ ان کی ذمہ داری انبیاء کے برابر نہیں ہے اس لئے ان کو مخلوق کے ساتھ اصلاح و ارشاد کا تعلق بھی ان سے کم ہوتا ہے اور جن بعض اولیاء کے سپرد یہ خدمت نہیں ہوتی وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں ان کو نہ کسی کی فکر ہے نہ کسی سے تعلق ہے ان کا نزع بہت سہل ہوتا ہے۔ ایسے لوگ مرتے ہوئے بڑے شاداں و فرحاں ہوتے ہیں بعضے غزل پڑھتے ہوئے جاتے ہیں، بعضے ہنستے ہوئے جان دیتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم　　راحت جاں طلبم وزپئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے راحت جاں طلب کروں اور محبوب حقیقی کے پاس جاؤں میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش و خرم اور غزلیں پڑھتا ہوا جاؤں)۔

ایک بزرگ مرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم　　جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(اب وقت آگیا ہے کہ میں عریاں ہوں جسم کو چھوڑ کر سراسر جان بن جاؤں)

ان کی یہ حالت دیکھ کر بعض لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان اولیاء سے افضل ہیں جن کے سپرد خدمت ارشاد ہے کیونکہ وہ موت کے وقت ان کے برابر بے فکر نہیں ہوتے ان کو اپنی ذمہ داری کی بھی فکر ہوتی ہے اپنے متعلقین کا بھی خیال ہوتا ہے اسی وجہ سے ان کو نزع میں شدت بھی واقع ہوتی ہے مگر یہ اعتقاد افضلیت صحیح نہیں بلکہ اکثر وہی اولیاء افضل ہوتے ہیں جو صاحب ارشاد ہیں کیونکہ ان کی حالت انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہے اور جو جتنا انبیاء کے مشابہ ہوگا وہ دوسروں سے افضل ہوگا لیکن تم کو اس تجویز کا حق نہیں ہے کہ اپنے لئے صاحب ارشاد ہونے کی تمنا کرو۔ (العبرہ بذبح البقرہ ج ۲۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کمال

حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن وسیاست اور انتظامی قابلیت بدرجہ کمال موجود ہے گو اس جوہر سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا اور اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **كَيْفَ اَنْتُمْ اِذَانَزَلَ فِيْكُمْ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ عَدْلًا مُقْسِطًا** (او کما قال) (صحیح مسلم: ۱۵۵، فتح الباری ۶: ۴۹۱) تمہارا کیا حال ہوگا اس وقت جب کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام تمہارے اندر (آسمان سے) نازل ہو کر آئیں گے۔ عادل ومنصف ہو کر حکومت کریں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت سے مسرت ظاہر فرمائی ہے جب کہ عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں میں حکومت کریں گے اور آپ ان کے متعلق عدل واقساط کی خبر دے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ عدل وانصاف بدون قابلیت انتظام کے نہیں ہوسکتا، عدل وہی کرسکتا ہے جس میں سیاست کا مادہ بدرجہ کمال موجود ہو۔

نیز احادیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس وقت بہت امن وامان اور خیر وبرکت ہوگی جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہایت عمدگی اور خوبی کے ساتھ سلطنت کا انتظام کریں گے، اگر ان میں فی نفسہ یہ مادہ موجود نہیں تو اس وقت کیونکر سلطنت کا انتظام کرلیں گے۔ پس معلوم ہوا کہ اس شخص نے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جامعیت پر جو اعتراض کیا ہے وہ نہایت لغو ہے۔ (العبرہ بذبح البقرہ ج ۲۳)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب انبیاء میں اکمل ہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات ثابت کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ آپ کے بھائیوں میں نقص نکالا جائے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خوش ہو سکتے ہیں۔ یاد رکھو انبیاء علیہم السلام سب کامل ہیں ان میں ناقص کوئی نہیں یہ اور بات ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکمل ہیں تفاضل بین الانبیاء (انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت دینے) سے اسی واسطے منع کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بھائیوں کی تنقیص گوارا نہیں۔ (العبرہ بذبح البقرہ ج ۲۳)

بعض اولیاء کی حالت رفیعہ

بعض اولیا ایسے بھی ہیں کہ صاحب ارشاد نہیں ہیں مگر ان کی حالت یہ ہوگی۔

اَلْمُتَحَابُّوْنَ فِی اللّٰہِ عَلٰی مَنَابِرَمِنَ الْمِسْکِ یَوْمَ الْقِیَامَۃ یَغْبِطُھُمُ الْاَ نْبِیَاءُ وَالصِّدِّیْقُوْنَ (او کما قَال) (مسند احمد ۵:۲۳۶، کنز العمال: ۲۴۶۹۳)

حدیث میں ہے کہ متحابین فی اللہ قیامت کے دن منابر مسک پر بےفکر بیٹھے ہوں گے ان کی اس حالت پر انبیاء و صدیقین کو رشک آئے گا کہ یہ بڑے بےفکر ہیں علماء قشر تو تھک گئے اس کی تفسیر میں لگے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے مگر حقیقت تک نہ پہنچے وہ نہ بتلا سکے کہ یہ کون لوگ ہیں اسی لئے عارف شیرازی ایسے مدارس سے برأت ظاہر کرتے ہیں۔

از قال و قیل مدرسہ حالے دلم گرفت (مدرسہ کی قیل وقال سے کسی حال نے میرے دل پر اثر نہیں کیا) (العبرہ بذبح البقرہ ج ۲۳)

خانقاہ اور مدرسہ دونوں کی ضرورت

از قال و قیل مدرسہ حالے دلم گرفت یک چند نیز خدمت معشوق و مے کنم

(مدرسہ کی قیل وقال دل گرفتہ نہیں ہوا چند دن محبوب اور عشق کی طرف متوجہ ہوتا ہوں)

قال و قیل مدرسہ سے دل گرفتہ ہونے کا سبب یہی ہے کہ وہاں حقائق کا انکشاف نہیں ہوتا بلکہ لفظوں ہی کے پھیر میں رہتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مدارس بےکار ہیں ہرگز نہیں ان کی بھی ضرورت ہے اور ان کے بعد خانقاہ میں آنے کی بھی ضرورت ہے۔ نہ تنہا مدرسہ کافی ہے نہ تنہا خانقاہ کافی ہے۔ مدرسہ بمنزلہ وضو کے ہے اور خانقاہ بمنزلہ نماز کے ہے تو

جو صوفی مدرسہ میں نہ جائے وہ ایسا ہے جیسے کوئی نماز بلا وضو ٹرخائے تو وہ صوفی نہ ہوگا بلکہ صافی ہوگا مگر وہ صوفی نہیں جس کے متعلق کہتے ہیں۔

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے　　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(یعنی صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے پختگی مجاہدات کے بعد ہوتی ہے)

بلکہ وہ صافی جس سے برتن اور پتیلیاں صاف کیا کرتے ہیں اور جو عالم مدرسہ سے فارغ ہو کر خانقاہ میں نہ جائے وہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص وضو کر کے اسی پر قناعت کر لے اور نماز نہ پڑھے تو وہ اس کا مصداق ہے۔

أَيُّهَا الْقَوْمُ الَّذِىْ فِى الْمَدْرَسَةِ　　كُلُّ مَا حَصَّلْتُمُوْهُ وَسْوَسَه

(مدرسہ والو! جو کچھ مدرسہ میں علم لفظی حاصل کیا وہ وسوسہ تھا) (العبرہ بلذبح البقرہ ج ۲۳)

مشاہدہ جمالِ حق کی دو صورتیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کبھی میرے دل پر بھی بادل چھا جاتا ہے اور میں اس کی وجہ سے دن میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں علماء قشر اس کی حقیقت نہ سمجھ سکے انہوں نے کہہ دیا کہ یہ حدیث متشابہات میں سے ہے اور ہم نہیں جانتے کہ یہ غین کیا چیز ہے اور یہ طریقہ اسلم ہے کہ جس بات کی حقیقت معلوم نہ ہو اس سے سکوت کیا جائے مگر کسی کو معلوم ہو جائے تو اس کے بیان کرنے میں بھی مضائقہ نہیں چنانچہ بہت سی آیات متشابہات میں متاخرین نے مناسب توجیہات بیان کی ہیں جیسے **یَدُ اللّٰہِ وَوَجْھُہُ اللّٰہِ وَاَمْثَالُھَا** (اللہ کا ہاتھ اللہ کا چہرا اور مثل ان کے) اسی طرح اگر کسی کی سمجھ میں غین کی حقیقت آ جائے تو نصوص کے خلاف بھی نہ ہو اور شانِ نبوت کے بھی خلاف نہ ہو تو اس کا بیان کر دینا مذموم نہ ہوگا۔ محققین نے اس کا مطلب سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مشاہدہ جمال حق کی دو صورتیں ہیں ایک حضور بلا واسطہ (جو مقام فناء میں ہوا کرتا ہے ۱۲) دوسرے حضور بواسطہ (جو مقام بقا میں ہوتا ہے ۱۲) حضور بلا واسطہ تو یہ ہے کہ سوائے حضرت حق کے اور کسی چیز کی طرف اصلا التفات نہ ہو ہر دم خدا تعالیٰ کی طرف بدون کسی واسطہ کے متوجہ رہے (مقام فنا میں حضور غالب ہوتا ہے ۱۲) اور حضور بواسطہ یہ ہے کہ مخلوق کی طرف بھی توجہ و التفات ہو مگر مخلوق آئینہ بن جائے رویت جمال الٰہی کے لئے (مقام بقا میں یہی صورت حضور ہوتی ہے

۱۲) تو پہلی صورت کی نظیر یہ ہے کہ کوئی شخص محبوب کو بدون کسی حجاب کے دیکھتا رہے کہ اس کا چہرہ عاشق کے سامنے ہو اور دوسری صورت کی نظیر یہ ہے کہ محبوب عاشق سے کہہ دے کہ مجھ کو مت گھورو بلکہ سامنے جو آئینہ رکھا ہے اس میں سے میری صورت کو دیکھو اس وقت بھی عاشق کی توجہ محبوب ہی کی طرف ہے مگر رویت بواسطہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس دیدار میں اور پہلے دیدار میں فرق ضرور ہے جو بات بلاواسطہ دیکھنے میں ہے وہ آئینہ سے دیکھنے میں کہاں اسی طرح حضور بلاواسطہ (جو مقام فنا میں ہوتا ہے ۱۲) حضور بواسطہ سے (جو مقام بقا میں ہوتا ہے) اکمل والذ ہے سالک کو اس میں زیادہ لذت آتی ہے کیونکہ اس میں غیر کی طرف اصلا التفات نہیں ہوتا اور حضور بواسطہ میں گو اس کی نظر بالذات حضرت حق ہی پر ہوتی ہے مگر فی الجملہ واسطہ پر بھی نظر ہوتی ہے اور عاشق پر اتنا واسطہ بھی گراں ہے۔ (العبرہ بذبح البقرہ ج ۲۳)

ضرورت مجاہدہ

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی مالا بدمنہ میں لکھتے ہیں۔

از سینہ درویشاں باید جست (درویشوں کے سینہ سے ڈھونڈنا چاہیئے)

اور تم کہتے ہو کہ سینہ میں کیا رکھا ہے بجز بلغم کے۔ سو میرے پاس اس بات کا جواب تھا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ جو چیز سینہ سے بدون مجاہدہ طالب کے دی جاسکتی ہے وہ تو بلغم کے سوا کچھ نہیں اور جس چیز کو قاضی ثناء اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ درویشوں کے سینہ سے حاصل کرنی چاہیئے میں اس کی نفی نہیں کرتا لیکن وہ مجاہدہ سے ملتی ہے بدون مجاہدہ کے نہیں مل سکتی (العبرہ بذبح البقرہ ج ۲۳)

متواضعین کی شہرت ہو ہی جاتی ہے

حدیث میں وعدہ ہے مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ (کنز العمال: ۵۷۳۰، مشکوۃ المصابیح: ۵۱۱۹) (جو شخص انکساری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا درجہ بلند کرتے ہیں)۔

اور جو شخص اپنے کو بڑھانا چاہتا ہے حق تعالیٰ اس کو گرا دیتے ہیں اسی حدیث سے لازم آتا ہے کہ مَنْ تَرَفَّعَ وَضَعَهُ اللّٰهُ (جو شخص اپنے کو بڑھاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پست کر دیتے ہیں) پس اگر کسی کو شہرت ہی مطلوب ہو تو اس کی بھی یہی صورت ہے کہ فنا اختیار کرے اور طلب شہرت کو دل سے نکال دے۔

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقارا

یعنی دیکھو عنقا نے اپنے آپ کو غائب کر دیا تو اس کا کیسا نام ہوا اسی طرح تم فنا اختیار کرو تو حق تعالیٰ تم کو رفعت و شہرت عطا کریں گے طلب شہرت سے شہرت حاصل نہیں ہو سکتی۔

(العبرہ بذبح البقرہ ج ۲۳

اطاعت رسول کی اہمیت

قرآن کریم میں ہے اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (خوشی سے اللہ کا کہنا مانو اور خوشی سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا مانو)۔

اب اس آیت کے اسلوب سے ایک اور امر ضروری مستنبط ہوتا ہے اس کو بھی اختصار کے ساتھ عرض کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں تین ذاتوں کی اطاعت کا حکم فرمایا ہے اپنی ذات پاک کا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور (جو لوگ تم میں سے جو اولی الامر ہیں) کا اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تو مکرر اطیعوا لائے اور اولی الامر کے لئے تکرار اطیعوا کا نہیں کیا سو اس کی وجہ یہ تو ہے نہیں کہ حق تعالیٰ کی اطاعت علیحدہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت جدا بلکہ اس اسلوب میں ایک فائدہ کی طرف اشارہ لطیف یہ ہے کہ ہر چند کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت عین اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے لیکن بعض خصوصیات کے اعتبار سے من وجہ استقلال ظاہری کا حکم رکھتی ہے۔

پس اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جیسے قرآن مجید حجت مستقلہ ہے اسی طرح حدیث شریف بھی حجت مستقلہ (دائمی حجت) ہے اور میں قرآن مجید کے ساتھ حدیث شریف کی برابری کا دعویٰ نہیں کرتا ہوں۔ لیکن اس اعتبار سے دونوں برابر ہیں کہ جیسے قرآن مجید کے احکام ماننا ضروری ہے اسی طرح احادیث سے جو احکام ثابت ہیں ان پر بھی ایمان وایقان واجب ہے کسی کو کہنا جائز نہیں کہ جو مسئلہ قرآن شریف میں نہیں ہے میں اس کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ بہت سے مسائل ایسے ہیں جو قرآن شریف میں نہیں احادیث سے ہی ثابت ہوتے ہیں۔

سود کا وبال:

اس کے بارے میں ارشاد ہے یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقات یعنی اللہ تعالیٰ ربوا (سود) کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں۔ مٹانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آج گن

کر سو روپے رکھتے تھے دوسرے دن پچاس رہ گئے یا بالکل نہیں رہے۔ یہ بات ہے کہ مال کا اصل مقصود یہ ہے کہ اپنی یا اپنی اولاد کے کام آئے۔ کھانے پہننے اور دیگر حوائج میں صرف ہو اور سود خوار کی آمدنی کسی کے کام نہیں آتی۔ فضول اڑ جاتی ہے۔ یا تو مکانات کی تعمیر میں روپیہ اڑ جاتا ہے یا رنڈیوں اور شراب خواری میں ضائع ہو جاتا ہے اور دوسرا وبال سود کا یہ ہے کہ سود خوار سے کسی کو محبت نہیں ہوتی اور سرمایہ راحت آپس کی محبت والفت ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ سود خوار لوگوں میں نہ باپ کو بیٹے سے محبت ہے، نہ بیٹے کو باپ سے۔ سود خوار ہر شخص کے نزدیک ساقط النظر ہوتا ہے اور نیز اس کو کسی وقت راحت نہیں ہوتی۔ ہر وقت ادھیڑ بن میں رہتا ہے اور اسی فکر میں رہتا ہے کہ کسی طرح دس کے بیس ہو جائیں۔ دنیا کی نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔ یہ مٹانے کی روح ہے۔ اب بے تکلف آپ کی سمجھ میں **یمحق اللہ الربوا** اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں کے معنی آ گئے ہوں گے۔ نیز کبھی قرض داروں کے پاس روپیہ مارا بھی جاتا ہے۔ بہر حال یہ دعویٰ بالکل محفوظ ہے کہ شریعت آسانی کی طرف بلا رہی ہے اور آپ کا دستور وعرف دشواری میں ڈال رہا ہے اور نیز یہ بھی محقق ہوا کہ شریعت پر عمل کرنے سے راحت ہی راحت ہے اور شریعت کو چھوڑنے میں دشواری ہی دشواری ہے۔ مگر لوگوں کی یہ حالت ہے کہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم مطلق العنان رہیں، اس لئے شریعت کی پابندی دشوار معلوم ہوتی ہے لیکن واقع میں دین میں کوئی مشقت نہیں۔ (ذکر الموت ج ۲۴)

موت ھاذم اللذات ہے:

حدیث میں ہے فرمایا: **اکثروا ذکر ھا ذم اللذات** (سنن الترمذی: ۲۳۰۷)

یعنی لذات کی قطع شکستہ کرنے والی شئے (موت) کو بہت یاد کیا کرو۔ سبحان اللہ کیا خوبصورت عنوان ہے۔ حکم فرمایا ہے یہ نہیں فرمایا کہ موت کو یاد کیا کرو بلکہ موت کو **ھاذم اللذات** سے تعبیر فرمایا۔ اس میں ایک بڑی گہری بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ بات یہ ہے کہ آدمی جو گناہ کرتا ہے یا دنیا کے مال وجاہ میں منہمک ہوتا ہے تو مقصود اور غایت سب کی تحصیل لذت ہے اور جب یہ یاد کرے گا کہ یہ سب ایک دن ختم ہو جائے گا اور اس کا تصور ہوگا تو مزہ ہی نہ آئے گا اور جب مزہ ہی نہ آئے گا تو وہ گناہ بھی چھوٹ جائے گا۔ دنیا میں اس کی بہت مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً کسی بڑے عہدے پر ہے، مثلاً ڈپٹی کلکٹر ہے لیکن

اس پر کوئی مقدمہ بھی قائم ہے۔ جس سے خوف غالب ہے کہ اس عہدہ سے برطرف کر دیا جائے گا۔ اس کو اس کلکٹری میں خاک بھی لذت نہ ہوگی۔ غرض کلیہ قاعدہ ہے کہ جس شئے میں انقطاع کا خوف ہوتا ہے اس میں لذت نہیں رہتی۔ (ذکر الموت ج ۲۴)

عیادت میں تھوڑی دیر بیٹھنے میں حکمت:

حدیث شریف میں آیا ہے **من عاد منکم مریضا فلیخفف الجلوس** (مسند احمد ۳: ۱۱۸) (یعنی جو شخص تم میں سے کسی مریض کی عیادت کرے تو چاہئے کہ کم بیٹھے)۔ سبحان اللہ شریعت کی کس قدر گہری نظر ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی پوری نظر ہے اور یہ بجز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی کا کام نہیں۔ کوئی کتنا ہی بڑا فلاسفر ہو مگر اس کی نظر ایسے دقائق تک کہاں پہنچ سکتی ہے۔ اکثر لوگ آج کل ایسی غلطی کرتے ہیں کہ بیمار کے پاس بیٹھ کر مجلس آرائی کرتے ہیں۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ آرام کرے یا کروٹ بدلے لیکن ان کے لحاظ سے بے چارہ ایک حالت میں لیٹا رہتا ہے۔ یہ بڑی سخت غلطی ہے۔ ہاں اگر مریض سے ایسی بے تکلفی ہو کہ اس کو اس سے کچھ لحاظ نہ ہو اور اس لئے آرام میں خلل نہ ہو بلکہ اس سے انس و راحت ہو تو وہ مستثنیٰ ہے اس لئے کہ علت اس حکم کی ایذا ہے اور وہ یہاں مرتفع ہے۔ حاصل یہ کہ مرض میں کسی شئے کی حلاوت نہیں رہتی۔ ہر امر میں بے لطفی ہو جاتی ہے۔ نہ کھانے کو جی چاہتا ہے، نہ پینے کو۔ اسی واسطے تو فرمایا ہے **لا تکرھو مرضاکم علی الطعام** (سنن ابن ماجہ: ۳۴۴۴) اور مریضوں کو کھانے پینے پر مجبور نہ کرو۔ آج کل اس کے بھی خلاف کرتے ہیں اور مریض کو مجبور کرتے ہیں کہ کچھ کھا ہی لے۔ خاص کر مائیں بچوں کو بے انتہا مجبور کرتی ہیں۔ یاد رکھو بعض مرتبہ کھانے سے اور مرض بڑھ جاتا ہے بلکہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسا ہرگز نہ کرو۔ اس کے آگے فرماتے ہیں **فان اللہ یطعمھم ویسقیھم** یعنی اللہ تعالیٰ ان کو کھلا پلا دیتے ہیں۔ حقیقت میں بعض مریضوں پر بیس بیس دن گزر جاتے ہیں اور بالکل نہیں کھاتے اور پھر جس قدر کمزوری ہونا چاہئے اس قدر نہیں ہوتی۔ تندرست آدمی اگر اتنے دنوں تک نہ کھائے تو بہت ضعیف ہو جائے۔ اس کے اعتبار سے مریضوں کو اتنا ضعف نہیں ہوتا، اگر کوئی کہے کہ ہم رات دن بیمار کے پاس بیٹھے رہتے ہیں، کسی وقت جدا نہیں ہوتے

اور خود بھی بیمار پڑتے ہیں مگر کبھی اللہ تعالیٰ کو کھلاتے پلاتے نہیں دیکھا۔ بات یہ ہے کہ کھلانے پلانے سے جو مقصود ہے وہ حاصل ہو جاتا ہے۔ (ذکر الموت ج ۲۴)

تین شخصوں پر لعنت:

حدیث شریف میں تین شخصوں پر لعنت آئی ہے۔ اول ملک کذاب یعنی جھوٹے بادشاہ پر اس لئے کہ جب وہ بادشاہ ہے تو اس کو جھوٹ کی کیا ضرورت، جھوٹ تو وہ بولے جو کسی سے دبتا ہو اور جب اللہ تعالیٰ نے اس کو سلطنت عطا فرمائی ہے تو اس کو کیا حاجت ہے۔ دوسرے عائل متکبر پر لعنت آئی ہے یعنی غریب ہو کر تکبر کرے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض غریب باوجود اپنی شکستہ حالی کے بھی اینٹھ مروڑ میں رہتے ہیں۔ امیر بے چارے ریچ جاتے ہیں مگر یہ غریب اپنی شیخی میں رہتے ہیں۔ خاص کر تقریبات میں اکثر اینٹھ جاتے ہیں اور بلائے سے بھی نہیں آتے۔ تقریب والے مناتے ہیں، خوشامدیں کرتے ہیں مگر ان کی ناک ہی سیدھی نہیں ہوتی۔ ہمارے یہاں ایک مال دار شخص تھے، ان کے یہاں تقریب تھی۔ ایک مفلس شخص کو جو کہ ان کے یہاں مدعو تھے اور انتظار طعام میں بیٹھے تھے ان کے یہاں کا سامان دیکھ کر بہت حسد ہوا۔ سوچنے لگے کہ کوئی عیب نکلے۔ چنانچہ ایک بات نکلی سقاء کارخانہ میں جا رہا تھا۔ اس کی مشک میں ایک سوراخ تھا۔ اس میں سے پانی نکل کر ان کے کپڑوں پر گرا۔ بس شیخ صاحب کہاں تھے چھنک کر کھڑے ہو گئے اور خدا جانے گھر والے کو کیا کیا کہا۔ اب مناتے ہیں منتے نہیں، ایسوں کا علاج تو یہ ہے کہ ان کو منہ نہ لگانا چاہئے۔ اگر خفا ہو جائیں بلا سے۔ تیسرے شیخ زانی پر لعنت آئی ہے اور بدنگاہی اور دل کے اندر خیال پکانا بھی زنا ہی میں داخل ہے اور وجہ یہ ہے کہ تقاضا کرنے والی تو کوئی چیز اندر ہے نہیں جو مجبور کرے۔ اس پر بھی کمبخت مبتلا ہوتا ہے تو یہ زیادہ موجب وعید ہے۔ یہ وقت تو وہ تھا کہ ذکر و فکر میں گزارتا۔ (ذکر الموت ج ۲۴)

دن میں چالیس مرتبہ موت کو یاد کرنے کا اجر:

حدیث شریف میں وارد ہے کہ اگر کوئی شخص دن بھر میں چالیس مرتبہ موت کو یاد کرے تو اس کو شہادت کا مرتبہ ملتا ہے اور شہادت کا مرتبہ معلوم ہے کتنا بڑا ہے کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور بے حساب و کتاب جنت میں جاتا ہے۔ (ذکر الموت ج ۲۴)

گناہ کا اثر:

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ بعض دن گھوڑا شرارت کرتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ آج مجھ سے ضرور کوئی گناہ ہوا ہے۔ چنانچہ سوچنے سے گناہ یاد آ جاتا ہے اور بعض دن گناہ کی وجہ سے بیوی بچے مجھ سے لڑتے ہیں، یہ تو نافرمانی کی سزائیں ہیں، اسی طرح فرمانبرداری پر جزائیں ملتی ہیں۔ چنانچہ اس کے بعض آثار کی نسبت فرماتے ہیں۔

تو ہم گردان از حکم داور پیچ　　کہ گردن نہ پیچید زحکم تو ہیچ

تم اللہ تعالیٰ کے حکم سے روگردانی مت کرو تمہارے حکم سے بھی کوئی روگردانی نہ کرے گا۔

(ذکر الموت ج ۲۴)

علماء ومشائخ کی آبروریزی کا گناہ

علماء ومشائخ کی عزت وآبرو عام لوگوں سے علاوہ عرف کے شرعاً بھی بڑھی ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے **من لم یرحم صغیر ناولم یوقر کبیر ناولم یجبل عالیمنا فلیس منا** (سنن ابی دائود الادب:٦٥) جو کوئی ہمارے چھوٹوں پر رحم اور بڑوں کا لحاظ اور ہمارے علماء کی تعظیم نہ کرے وہ ہمارے میں سے نہیں، یہ تو علماء کی شان میں ہے، بزرگوں اور مشائخ کی بابت ایک حدیث قدسی میں ہے، **من آذی لی ولیا فقد آذنته بالحرب** (اتحاف السادة المتقین ٥:٢٩٥) جو کوئی میرے ولی کو تکلیف پہنچائے میں ان کو اعلان جنگ دیتا ہوں۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علماء اور مشائخ کی غیبت میں اور ان کی آبروریزی کرنے میں کیا کچھ گناہ ہوگا اس لئے میں کہتا ہوں کہ علماء ومشائخ کی غیبت عوام کی غیبت سے زیادہ سخت ہے مگر ان کی کسی کو بھی کچھ پرواہ نہیں، اکثر گناہ کر کے جی بھی برا ہوا کرتا ہے، مگر غیبت ایسی عام ہوگئی ہے کہ اس کے بعد جی بھی برا نہیں ہوتا، یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کچھ ہم نے گناہ کا کام بھی کیا ہے یا نہیں۔ اس حالت پر نظر کر کے یوں معلوم ہوتا ہے کہ غیبت بہت ہی بڑا گناہ ہے کیونکہ گناہ کو ہلکا سمجھنا قریب بکفر ہے اور غیبت کو عام طور پر اعتقاداً نہ ہو تو عملاً تو ضرور ہلکا سمجھا جاتا ہے اس سے بچنے کا بہت ہی اہتمام چاہئے۔ (رجاء اللقاء ج ۲۴)

زمین کے روپیہ میں برکت نہ ہونے کا مفہوم

حدیث میں اگرچہ زمینداری سے ممانعت بھی آئی ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہے

کہ اگر زمین کسی کے پاس ہو اور کسی ضرورت سے اس کو بیچے تو فوراً اس کے روپیہ سے کوئی دوسری زمین خرید لے ورنہ برکت نہ ہوگی۔ میں ان دونوں حدیثوں سے یہ سمجھا ہوں کہ جس کے پاس زمین نہ ہو وہ تو زمین نہ خریدے اور جس کے پاس پہلے سے ہو یا میراث میں مل جائے وہ اس کو فروخت نہ کرے اور اگر فروخت کرے تو فوراً زمین ہی میں وہ روپیہ لگا دے، واقعی اس کا تجربہ ہوا ہے۔ زمین فروخت کر کے روپیہ ادھر ادھر اٹھ جاتا ہے اور یہی معنی اس کے کہ اس میں برکت نہیں ہوتی تو دیکھئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نعمت کی احتیاط اور قدر کی کہاں تک تعلیم دی ہے (رجاء اللقاء ج ۲۴)

کمال عبدیت

حدیث میں آیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھانا نوش فرما کر جو الفاظ فرماتے تھے ان میں یہ بھی ہے **غیر مودع ولا مستغنی عنه ربنا** کہ اے پروردگار میں اس کھانے کو رخصت نہیں کرتا اور نہ اس سے مستغنی ہوں۔ دوسرے وقت پر اس کا محتاج ہوں گا اور اس وقت بھوک ختم ہوگئی ہے اس لئے اس کو اٹھواتا ہوں، کچھ ٹھکانا ہے اس عبدیت کا کہ کھانا اٹھوانے میں چونکہ بظاہر استغنا کی صورت ہوتی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم استغنا کی صورت سے بھی اتنا بچتے تھے۔ (رجاء اللقاء ج ۲۴)

متن قرآن کے تین اصول مسائل:

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ متن قرآن یعنی اس کے اصول مسائل تین چیزیں ہیں۔ توحید اور رسالت اور معاد یہ تینوں اصول اور متن ہیں باقی سب ان کی شرح ہیں۔ (السوق لاھل الشوق ج ۲۴)

پل صراط

پل صراط پر صرف مومنین اور منافقین اتارے جاویں گے کیونکہ پل صراط کے بارہ میں وارد ہے کہ وہ ایک پل ہے جو جہنم کے اوپر بچھایا جاوے گا اور اس پر چلنے والے بعضے پار اتر جاویں گے (وہ مومنین ہوں گے) اور بعض پار نہ اتر سکیں گے بلکہ کٹ کر دوزخ کے اندر گر پڑیں گے۔ پس اگر کہا جاوے کہ وہ کٹ کر گرنے والے عام کفار ہوں گے تو ان کے متعلق یہ

مضمون کہاں صادق ہوگا **ادخلوا ابواب جھنم** کیونکہ اوپر سے گرنے والے کو داخل من الوسطہ کہا جاسکتا ہے **داخل من الابواب** نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں ایک گروہ کفار کا بھی ایسا ہوگا جو صراط پر اتارا جاوے گا اور وہ منافقین کا گروہ ہے اور نکتہ اس میں یہ ہے کہ صراط جنت کی سڑک ہے کہ اس سے عبور کر کے جنت میں جاسکیں گے تو اس پر چلنے کے مستحق وہی ہو سکتے ہیں جو جنت میں جانے کا ارادہ رکھیں اور وہ مومنین ہیں یا وہ جن میں شبہ ہے مومنین کا یعنی مشابہت ہے مومنین کے ساتھ اور وہ منافقین ہیں جو زبان سے مدعی ہیں مومن ہونے کے۔ مومنین تو حقیقتاً جنت کے مستحق ہیں اور منافقین صرف ظاہراً وادعاً۔ چنانچہ اس کا اثر یہ ہوگا کہ مومنین عبور کر جاویں گے اور منافقین کٹ کر جہنم میں گر جاویں گے۔ یہ خلاصہ ہے شاہ صاحب کی تحقیق کا کہ کافر محض جس نے زبان سے بھی ایمان ظاہر نہیں کیا پل صراط پر نہیں چلایا جائے گا بلکہ یہ لوگ ابواب جہنم سے داخل کئے جائیں گے۔ پل صراط پر صرف مومنین چلائے جائیں گے خواہ حقیقی مومن ہوں یا ادعائی خلدین فیھا حال مقدرہ ہے، ادخلو کی ضمیر انتم سے مطلب یہ ہے کہ جہنم میں جاؤ۔ اس حال میں کہ خلود تمہارے واسطے تجویز شدہ ہے۔ **فبئس مثوی المتکبرین** پس وہ بری ہے جگہ متکبرین کی۔ یہاں یہ بات قابل غور کرنے کے ہے کہ متکبرین سے مراد کون لوگ ہیں؟ ظاہر ہے کہ وہی کفار مراد ہیں جن کو دروازہ جہنم سے داخل کیا جائے گا (السوق لاھل الشوق ج ۲۴)

حق کی پہچان:

میں نے ایک مکتوب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا دیکھا ہے جو بیاور ضلع اجمیر کسی کو لکھا تھا۔ اس مکتوب میں یہ الفاظ تھے کہ حق وہ ہے جو مدلول ہو نص کا بلا کلفت مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آپس میں کسی بات میں جھگڑتے ہیں ایک فریق کہتا ہے کہ قرآن سے یہ ثابت ہے اور دوسرا فریق کہتا ہے کہ یہ ثابت ہے تو اس میں قول فیصل یہ ہے کہ اپنے اغراض اور خیالات کو الگ کر کے اور ان سے بالکل قطع نظر کر کے دیکھو کہ نص قرآنی کا مدلول بلا کلفت کیا ہے۔ جس میں اونچ نیچ اور تکلف اور تاویل کی بالکل ضرورت نہ ہو، بس وہی حق ہے۔ (السوق لاھل الشوق ج ۲۴)

بوقت دخول ابواب جنت کھولے جانے میں حکمت:

جنت کے بارہ میں بھی ہمارے استاد رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ جنت کے

دروازہ بھی پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے بلکہ بعد میں کھولے جاویں گے اور اس میں چند نکتے ہیں ایک تو یہ نکتہ کہ عادت ہے کہ دفعتاً نعمت پر نظر پڑنے سے حظ زیادہ ہوتا ہے مثلاً ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی کو ایک لاکھ روپیہ ملنے والا ہے اول اس کو خبر ملی کہ کلکتہ میں میرا اتنا روپیہ ہے پھر وہاں سے اس کی روانگی کی خبر ملی کہ وہاں سے چل دیا پھر معلوم ہوا کہ الہ آباد بینک میں آ گیا ہے پھر معلوم ہوا کہ مراد آباد کے خزانہ میں آ گیا ہے حتیٰ کہ لا کر سامنے رکھ دیا گیا تو اس کو خوشی تو ضرور ہوگی مگر اتنی جتنی اس صورت میں ہوگی کہ ایک شخص کو مطلق خبر نہیں اور وہم و گمان میں بھی نہیں کہ میرا کہیں اتنا روپیہ ہے یکلخت کوئی سب روپیہ سامنے لا کر رکھ دے کہ یہ تم کو ملا ہے اس صورت میں ایسا حظ ہوگا کہ عجب نہیں مارے خوشی کے شادی مرگ ہو جاوے۔ ایسے واقعات ہوئے بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ کسی ملزم کو پھانسی کا حکم ہوا، پھر اپیل میں رہائی کا حکم ہوا تو اس حکم کو یکلخت نہیں سنایا گیا اس وجہ سے کہ نا امیدی کے بعد ایک دم یہ خبر سن کر کہیں مارے خوشی کے مر نہ جائے اس کی وجہ زیادت حظ و سرور ہی ہے۔

معلوم ہوا کہ ایک دم نعمت پر نظر پڑنے میں زیادہ حظ ہوتا ہے بہ نسبت نظر تدریجی کے، اس واسطے جنت کے دروازے بند ہوں گے اور جب جنتی اس کے پاس پہنچیں گے تب ایک دم کھول دیئے جائیں گے اور ایک نکتہ ہے اس کے سمجھنے کے لئے دو مقدموں کو ملانے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اہل جنت، جنت میں جانے کے بعد باہر نہیں نکلیں گے۔ ایسی جگہ میں سے کون نکلنا گوارا کرتا ہے، ہاں اہل دوزخ بعض دوزخ میں سے نکلیں گے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چند روز کے بعد نجات پا کر نکالے جائیں گے۔ غرض اہل جنت اندر جانے کے بعد پھر باہر نہ نکلیں گے۔ ایک مقدمہ یہ ہوا اور ایک مقدمہ یہ ہے کہ جنت باہر سے بھی مزین ہے اگرچہ عادت یہ ہے کہ باغ کو باہر سے نہیں سجایا کرتے جیسا کہ مشہور ہے: ؎

بنقاش احتیاج نیست دیوار گلستان را
(نقاش کو نقش و نگار کیلئے گلستان کے دیوار کی ضرورت نہیں)

مگر وہاں ایسا نہیں، وہاں اندر سے تو جنت ہے ہی جیسی ہے باہر سے بھی مزین اور مرصع ہے اور یہ ظاہر ہے کہ باہر کی زینت ایسی نہیں ہو سکتی جیسی اندر کی ہوگی کیونکہ اندر کی زینت مقصود اصلی ہے اور باہر کی بالتبع اور مقصود اور تابع میں فرق ہوتا ہے تو اگر دروازے

جنت کے پہلے سے کھول دیئے جاویں تو اندر کی زینت کے سامنے باہر کی زینت کو کون دیکھے، اس واسطے اول دروازے بند ہوں گے تاکہ باہر کی زینت کو بھی دیکھ لیں پھر کھول دیئے جاویں گے کیونکہ اندر سے باہر کون آوے گا۔ نیز اس واسطے بھی جنت کے دروازے پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے کہ جہنم میں تو لوگ بجبر واکراہ جاویں گے تو اگر دروازہ کھلے ہوئے ہونے کی کوئی وجہ ہوسکتی ہے تو جہنم کے لئے ہوسکتی ہے کہ سب سامان عذاب کا تیار ہوگا صرف دھکیل دینے کی ضرورت ہوگی۔ اگر دروازے بند ہوں تو شاید کچھ دیر لگے اور یہاں تو خوشی سے جاویں گے اور ہر قسم کا اطمینان ہوگا تو مزے لیتے ہوئے اور سیر کرتے ہنستے بولتے ہوئے جاویں گے تو کیا جلدی ہے کہ دروازے پہلے سے کھلے ہوئے ہوں۔ باہر کی سیر کر کرا کے جب اندر جانا چاہیں گے کھول دیئے جائیں گے۔ ان میں بعض نکتے حضرت استاذنا علیہ الرحمۃ کے ارشاد فرمائے ہوئے ہیں۔ یہ تقریر اس صورت میں ہے کہ وفتحت کا واؤ عاطفہ لیا جاوے کیونکہ اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دروازے پہلے سے کھلے ہوئے نہ ہوں گے اور اگر واؤ کو حالیہ لیا جاوے تو حال قید ہوتا ہے عامل کے لئے تو معنی یہ ہوں گے کہ آئیں گے جنت کے پاس اس حال میں کہ دروازے کھلے پڑے ہوں گے اس صورت میں اس کا یہ مدلول ہوگا کہ دروازے پہلے سے کھلے ہوئے ہوں گے۔ (السوق لاھل الشوق ج ۲۴)

موت کے وقت مومن کا حال:

موت سے تو ہر شخص کو کراہت ہوتی ہے اور زندگی ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے کیونکہ یہ تو طبعی امر ہے تو سب ہی کو عام ہے اس کا جواب حدیث شریف میں آچکا ہے، حق تعالیٰ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے درجات بلند فرمائیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کر کے اس اشکال کو حل کرلیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

من احب لقاء الله احب الله لقاءه ومن كره لقاء الله كره الله لقاءه

(الصحیح للبخاری ۸: ۱۳۳) کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنا چاہتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی لقاء سے کراہت کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی لقاء سے کراہت فرماتے ہیں۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلنا یکرہ الموت (ہم میں ہر شخص موت کو مکروہ سمجھتا ہے) یعنی حق تعالیٰ کی لقاء تو

موت کے بعد ہوگی اور موت سے طبعاً ہر شخص کو کراہت ہے تو من احب لقاء اللہ کا مصداق کون ہوگا؟ سب من کرہ اللہ لقاء اللہ ہی کے مصداق ہوں گے اور اس کا جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کون دے سکتا تھا۔ آپ نے فرمایا یہ محبت و کراہت مراد ہے سو مومن موت کے وقت لقاء اللہ کا مشتاق ہو جاتا ہے جبکہ اس کو فرشتے بشارتیں سناتے اور تسلی دیتے ہیں اور جنت کی نعمتیں اور راحتیں دکھلاتے ہیں اس وقت اس کی وہ حالت ہوتی ہے جیسے ایک پرندہ پنجرہ میں ہو اور اس کو ایک ایسے سبزہ زار میں رکھ دیا جائے جہاں چار طرف پھول پھلواری اور ہر قسم کے میوہ جات ہوں اور اس طرح کہ ہم جنس پرندے آزادی کے ساتھ اس باغ میں میوے وغیرہ کھاتے پھرتے ہوں اور خوشی سے چہچہاتے ہوں تو اس وقت یہ پرندہ جو پنجرہ میں مقید ہے پھڑ پھڑاتا ہے اور پنجرے سے نکلنے اور اپنی ہم جنسوں کے ساتھ سبزہ زار میں چلنے پھرنے کا مشتاق ہوتا ہے اور کافر موت کے وقت حق تعالیٰ کے پاس جانے سے کراہت کرتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ عذاب کے فرشتے ڈراؤنی صورت میں چاروں طرف کھڑے ہیں۔ میری روح نکلی اور ان لوگوں نے مجھے عذاب کرنا شروع کیا، اس وقت اس کی روح جسم سے نکلنا نہیں چاہتی جیسے پنجرہ کے گرد چاروں طرف بلیاں دانت نکالے بیٹھی ہوں تو اس وقت پرندہ پنجرہ سے نکلنا نہ چاہے گا بلکہ کوشش کرے گا کہ پنجرے ہی سے چمٹا رہے کیونکہ اسی میں خیر ہے پنجرہ سے باہر قدم رکھا اور بلیوں نے اس کو دبوچا تو یہ کراہت مراد ہے جو عین موت کے وقت ہوتی ہے باقی طبعی کراہت مراد نہیں ہے کیونکہ طبعاً زندگی ہر ایک کو عزیز ہے۔ (خیر الحیات وخیر الممات ج ۲۴)

ایک بے استعداد طالب علم کا حال:

ایک بے استعداد طالب علم کو سند فراغ دیتے ہوئے استاد نے یہ گر بتلایا تھا کہ جب تم سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جائے تو جواب میں یہ کہہ دینا کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے اس سے تمہارا جہل مخفی رہے گا۔ واقعی بات تو بہت گہری بتلائی مگر اس کے استعمال کے لئے بھی تو کسی قدر عقل کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ایک شخص سمجھ گیا کہ یہ جو ہر بات کے جواب میں یہی کہتا ہے کہ اس میں اختلاف ہے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کچھ آتا جاتا نہیں اس کا امتحان کرنا چاہئے۔ اگلے دن اس نے آ کر پوچھا کہ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** میں آپ کی کیا تحقیق ہے؟ اس احمق نے کہا یہاں بھی وہی جواب دیا کہ اس میں اختلاف ہے اب تو سب پر قلعی کھل گئی۔ یہ ویسا ہی

قصہ ہے جیسے طوطی کی دریں چہ شک (اس میں کیا شک ہے) کی حکایت ہے کہ شخص نے طوطی کو یہ جملہ سکھا دیا تھا "دریں چہ شک" پھر بازار میں آ کر دعویٰ کیا کہ میری طوطی فارسی بولتی ہے۔ چنانچہ ایک سوداگر نے خریدنے کا قصد کیا مالک نے دام بہت بتلائے۔ سوداگر نے طوطی سے پوچھا کہ کیا تیری قیمت اتنی ہے جتنی مالک بتلا رہا ہے؟ کہا دریں چہ شک (اس میں کیا شک ہے) سوداگر بہت خوش ہوا اور خرید کر گھر لایا۔ اب جو بات بھی کرتا ہے اس کے جواب میں دریں چہ شک ہی آتا ہے۔ کہنے لگا میں بہت احمق تھا جو تجھے اتنی رقم دے کر تجھے لایا۔ طوطی نے کہا دریں چہ شک (اس میں کیا شک ہے) یہاں تو یہ جواب واقعی برمحل تھا۔ بہر حال میں نے خود کوئی دعویٰ نہ کیا بلکہ ان کے سوال ہی میں سے سوال نکالتا رہا، حتیٰ کہ وہ خاموش ہو گئے پھر میں نے ان سے یہ بھی کہہ دیا کہ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ ملانوں کے پاس آپ کے سوالات کے جوابات نہیں ہیں اور یہ خیال نہ کریں کہ اس حدیث کی حقیقت کو آپ کی طرح وہ بھی نہیں سمجھتے۔ بحمد اللہ ہمارے پاس حقائق و اسرار بہت کچھ ہیں مگر ہم آپ کو نہیں بتلاتے۔

کیونکہ اسرار کا بیان کرنا ہمارے ذمہ نہیں، ہمارے ذمہ احکام کا پہنچانا ہے، پھر میں نے یہ شعر پڑھا:

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز — ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

راز کا فاش کرنا مصلحت کے خلاف ہے ورنہ مجلس عارفین میں ایسی بات نہیں کہ نہ ہو۔

(خیر الحیات وخیر الممات ج ۲۴)

حق تعالیٰ شانہ کا امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فضل عظیم:

ایک شاعر کے متعلق کسی قصور پر بادشاہ نے حکم قتل صادر فرمایا تو وہ بادشاہ سے لجاجت کے ساتھ معافی چاہنے لگا کہ مجھے قتل سے معاف کیا جائے۔ بادشاہ نے کہا ہرگز نہیں کیونکہ تمہارے قتل میں حکمت ہے کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ شاعر نے کہا حضور یہ حکمت تو اس طرح بھی حاصل ہو سکتی ہے کہ آپ کسی دوسرے کو مار دیجئے تاکہ مجھے عبرت ہو۔ یہ جواب سن کر بادشاہ کو ہنسی آ گئی ایشیائی بادشاہوں کی تو ہنسی ہی معافی ہے۔ اس کو چھوڑ دیا تو جیسے اس شاعر نے کہا تھا کہ دوسرے کو مار دیجئے تاکہ مجھے عبرت ہو حق تعالیٰ نے آپ کے واسطے ایسا ہی کیا کہ دوسروں کو تمہارے لئے نمونہ عبرت بنا دیا۔ تم کو ہلاک کر کے کسی کے لئے نمونہ عبرت نہیں بنایا۔ (خیر الحیات وخیر الممات ج ۲۴)

علم خضر علیہ السلام کی مثال

علم خضر کی مثال ان کے سامنے ایسی تھی جیسے وائسرائے کے علم کے سامنے کوتوال کا علم کہ جزئیات وو قائع کا علم کوتوال کو وائسرائے سے زیادہ ہوتا ہے مگر اصول سلطنت اور کلیات قانون کے علم میں وائسرائے کی برابر کوئی حاکم بھی نہیں ہوتا۔ خضرؑ کا مرتبہ علم باطن میں بھی موسیٰ سے بڑھا ہوا تھا کیونکہ علم باطن بھی شریعت ہی کا ایک جزو ہے کیونکہ شریعت نام ہے مجموعہ احکام ظاہرہ و باطنہ کا اور علم باطن کی حقیقت احکام باطنہ ہے اور جب یہ بھی علم شریعت ہی کا جزو ہے تو یقیناً موسیٰ اس میں خضرؑ سے اکمل تھے کیونکہ موسیٰ انبیاء اور اولوالعزم سے ہیں۔ اور خضرؑ کی نبوت خود مختلف فیہ ہے اور نبی کے لئے علم شرائع میں غیر نبی سے اور اس طرح اس شخص سے بھی جس کی نبوت مختلف فیہ ہے کامل ہونا ضروری ہے پس خضرؑ سے علم باطن میں بھی موسیٰ اکمل تھے اور یہ میں نے اس لئے بیان کر دیا کہ اس میں بہت لوگوں کو دھوکہ ہو گیا ہے بعض لوگ خضرؑ کو علم باطن میں موسی سے افضل سمجھتے ہیں اور غضب یہ ہے کہ بعض علماء بھی اس غلطی میں مبتلا ہو گئے مگر یہ علماء وہ ہیں جو صرف اہل ظاہر ہیں جنہوں نے علم باطن کی حقیقت کو نہیں سمجھا ان کو دھوکہ اس سے ہوا کہ قرآن میں جو وقائع خضرؑ کے مذکور ہیں جس کی حقیقت موسیٰ کو ابتداء میں معلوم نہیں ہوئی ان حضرات نے ان واقعات کو علم باطن کی قبیل سے سمجھا ہے حالانکہ ان کو علم باطن سے کچھ تعلق نہیں بلکہ ان کا تعلق صرف کشف کونی سے ہے اور کشف کونی ہی میں خضر سے بڑھے ہوئے تھے اور کشف کونی کو علم موسیٰ سے کچھ بھی نسبت نہیں اس کی مثال بالکل وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ کوتوال کو شہر کے واقعات و حالات کا علم وائسرائے سے زیادہ ہوتا ہے مگر اس سے کوتوال کا درجہ وائسرائے سے نہیں بڑھ جاتا کیونکہ اس علم کو اس علم سے کچھ بھی نسبت نہیں جو وائسرائے کو حاصل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ علم ظاہر اور علم باطن اور کشف الٰہی میں جس سے اسرار و حکم معلوم ہوتے اور معرفت ذات و صفات میں ترقی ہوتی ہے۔ موسیٰ ہی افضل تھے صرف کشف کونی میں جس کو قرب حق میں کچھ بھی دخل نہیں گو بعض مقربین کو عطا ہو جاتا ہے۔ خضرؑ بڑھے ہوئے تھے (الحدود والقیود ج ۲۵)

مثنوی کے شعر سے غلط استدلال

مولانا فرماتے ہیں۔

خلق را تقلید شان برباد داد　　کہ دوصد لعنت بریں تقلید باد
مخلوق ایسی تقلید سے برباد ہوئی کہ ایسی تقلید پر دوسو لعنتیں۔

بعض لوگ جو تقلید فی الاحکام کے منکر ہیں مقلدین کے مقابلہ میں مولانا کا یہ شعر پڑھ دیا کرتے ہیں کہ دیکھو مولانا نے تقلید پر لعنت فرمائی ہے مگر یہ ان کا جہل ہے مولانا نے مطلق تقلید پر لعنت نہیں فرمائی بلکہ خاص تقلید پر لعنت فرمائی ہے کیونکہ انہوں نے یوں نہیں فرمایا کہ دوصد لعنت بر تقلید باد بلکہ بریں تقلید باد فرمایا۔ جس میں اشارہ اس تقلید پر جس کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے اور اسے پہلے یہ قصہ بیان فرمایا ہے کہ ایک صوفی گدھے پر سوار ہو کر ایک خانقاہ میں پہنچے خانقاہ والے سچے متوکل تھے بلکہ رہزن طریق نام کے متوکل تھے۔ اور اس وقت ان کے یہاں کئی وقت کا فاقہ تھا۔ صوفی کو گدھے پر سوار دیکھ کر خوش ہوئے۔ کہ شکار ہاتھ لگا۔ بس اس کے گدھے کو بیچ کر دو چار دن مزے اڑائیں گے۔ چنانچہ صوفی کی خوب خاطر کی اور گدھے کو اصطبل میں بھیج دیا۔ پھر ایک آدمی کے ہاتھ بازار میں بھیج کر فروخت کرادیا اور اس کی قیمت سے عمدہ عمدہ کھانے تیار کرائے گئے۔ رات کو کھانے کے بعد سماع شروع ہوا تو ایک شخص نے قوال سے کہہ دیا کہ یہ گانا۔

خر برفت　وخر برفت　وخر برفت
گدھا گیا اور گدھا گیا اور گدھا چلا گیا

قوال نے ایسا ہی کہا۔ کیونکہ خانقاہ والوں کو سب لطف امروزہ اسی کی بدولت تھا ان کو وجد ہونے لگا اور اس کا تکرار شروع کردیا سب کی دیکھا دیکھی وہ درویش بھی یہی کہنے لگے۔ خر برفت وخر برفت وخر برفت۔ کچھ عرصہ کے بعد مجلس سماع ختم ہوئی اور سب لوگ پڑ کر سو رہے صبح درویش نے اپنے خادم سے کہا کہ گدھے پر زین کستا کہ آگے روانہ ہوں خادم نے کہا حضور گدھا تو رات ہی سے غائب ہے نہ معلوم کون لے گیا۔ درویش نے کہا ارے کمبخت تو نے رات ہی کیوں نہ اطلاع کی تاکہ تفتیش کی جاتی خادم نے کہا حضور میں تو اطلاع کرنے گیا تھا مگر جب آپ کے پاس پہنچا تو میں نے مجلس سماع میں آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا خر برفت وخر برفت وخر برفت میں سمجھا کہ حضور کو گدھے کے جانے کا کشف ہوگیا

ہے۔ درویش نے کہا کمبخت مجھے تو کچھ بھی خبر نہ تھی میں تو دوسروں کے دیکھا دیکھی کہہ رہا تھا مولانا اس تقلید کی نسبت فرماتے ہیں۔

خلق را تقلید شان برباد داد
کہ دوصد لعنت بریں تقلید باد

کہ ایسی تقلید جیسی اس درویش نے کی تھی یعنی بے سمجھے اس تقلید پر مولانا لعنت فرما رہے ہیں۔

(الحدود والقیود ج ۲۵)

کاملین اور محققین کی تقلید کا حکم

کاملین و محققین کی تقلید کو اور حقیقت سمجھنے کے بعد جو تقلید ہو اس پر مولانا لعنت نہیں فرماتے بلکہ اس کا تو امر فرماتے ہیں۔

چوں گزیدی پیر ہین تسلیم شو
ہم چو موسیٰ زیر حکم خضر رو

جب کسی کو پیر بنایا تو اس کی اطاعت ہر بات میں کرو۔ اور اس کی تو اس قدر تاکید فرماتے ہیں کہ کامل کے سامنے بولنے کو بھی منع فرماتے ہیں۔

صبر کن در کار خضر اے بے نفاق
تا نگوید خضر رو ہذا فراق

اے بے نفاق خضرؑ کے کام میں صبر کرو تاکہ خضرؑ یہ نہ کہہ دیں کہ جدائی ہے۔

قال را بگذار مرد حال شو
پیش مرد کاملے پامال شو

قال کو چھوڑو، حال کے مرد بنو کسی اللہ والے کے سامنے روندے جاؤ۔

اور لقائے تو جواب ہر سوال
مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

آپ کی ملاقات ہر سوال کا جواب ہے اور بغیر بحث مباحثہ کے آپ کی ملاقات سے ہر مشکل حل ہو جاتی ہے۔

اور شیخ کی سختی پر اور اسکے امتحان پر ثابت قدم رہنے کی تاکید فرماتے ہیں۔

چوں بیک زخمے گریزانی زعشق
تو بجز نامے چہ مے دانی زعشق

جب تو ایک ہی زخم سے عشق سے بھاگتا ہے تو سوائے عشق کے نام کے اور کیا جانتا ہے۔

گر نداری طاقت سوزن زدن
از چنیں شیر ژیاں بس دم مزن

جب تم کو سوئی چبھنے کو برداشت نہیں تو پھر ایک شیر کا نام مت لینا۔

تو جو لوگ مولانا کے ایک شعر سے مطلق تقلید کی مذمت ثابت کرتے ہیں وہ مولانا کے اس کلام کو بھی تو دیکھیں کہ اس میں وہ کس تاکید سے تقلید کا امر فرما رہے

ہیں ۔ سب مجموعہ کو ملا کر حاصل یہ نکلے گا کہ مولانا کورانہ تقلید کی مذمت فرماتے ہیں نہ اس تقلید کی جو بصیرت اور تحقیق کے ساتھ ہو چنانچہ فرماتے ہیں ۔

ایک شعر کا صحیح مفہوم

کور کورا نہ مرد در کربلا   تانفتی چوں حسین اندر بلا

(تم اندھے ہوکر کربلا نہ جاؤ جب تک حضرت حسینؓ کی مجاہدات سے تصفیہ باطن نہ کرلو)

اس میں صاف طور تقلید کورانہ سے منع فرما رہے ہیں مگر اس شعر کا صحیح مطلب بھی سن لیجئے کیونکہ بہت لوگ اس کا مطلب غلط سمجھے ہوئے ہیں عام طور سے اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اندھے بن کر کربلا میں نہ جاؤ کہیں تم بھی حسین رضی اللہ عنہ کی طرح گرفتار بلا نہ ہو جاؤ پھر اس پر اشکال کرتے ہیں کہ اس میں حسینؓ کی تنقیص لازم آتی ہے سبحان اللہ ترجمہ تو غلط تم کرو اور تنقیص کا الزام مولانا پر رکھو ۔ اسکا صحیح ترجمہ یوں ہے کہ لفظ تا تعلیل کے واسطے نہیں بلکہ غایت کے واسطے ہی یعنی تم اندھے ہوکر کربلا میں نہ جاؤ جب تک کہ امام حسینؓ کی طرح بلا مجاہدہ کا تحمل نہ کرلو یعنی پہلے مجاہدات سے تصفیہ باطن کرو پھر کربلا میں جانے کا نام لینا کیونکہ امام حسینؓ بھی مجاہدہ سے فارغ ہوکر کربلا میں گئے تھے ۔ اس لئے پہلے نہیں گئے اس پر کچھ بھی اشکال نہیں اور اس توجیہ کی ضرورت اس وقت ہے کہ یہ شعر مولانا کا ہو مگر میرے نزدیک یہ شعر مولانا کا نہیں ہے کیونکہ مثنوی میں میری نظر سے نہیں گزرا ۔ بہرحال ممانعت کورانہ تقلید سے ہے ۔ اور حقیقت سمجھ کر تقلید کرنے کا مضائقہ نہیں وہ ایک درجہ تحقیق ہی ہے ۔ (الحدود والقیود ج ۲۵)

جنت بہت بڑا انعام ہے

مولانا محمد یعقوب صاحب مجازی معنی کے اعتبار سے فرماتے تھے کہ جنت کیا ہوگی گویا چھوٹی سی خدائی ہوگی کیونکہ آدمی وہاں جس چیز کی خواہش کرے گا فوراً موجود ہو جائے گی ۔ **ولکم فیھا ماتشتھی انفسکم ولکم فیھا ماتدعون.** اور تمہارے واسطے وہاں ہے جو چاہے دل تمہارا اور تمہارے لئے ہے جو کچھ مانگو ۔ اور اللہ تعالیٰ دل کی بات کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں بس ادھر آپ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی اور ادھر اس کا ظہور ہو گیا بس اللہ تعالیٰ کے دربار کی ایسی شان ہے کہ:

نیم جان بستاند وصد جاں دہد   انچہ دروہمت نیاید آں دہد

فانی اور حقیر جان لیتے ہیں اور اس کے بدلے میں باقی جان عطا فرماتے ہیں جو وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا۔

کس نیاید ایں چنیں بازار را کہ بیک گل میخری گلزار را

تم ایسا بازار کہاں سے لاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلے پورا باغ خرید لو۔ (الحدود والقیود ج ۲۵)

طالب علم کیلئے تین ضروری کام

طالبان علم تین باتوں کا لحاظ رکھے اور ہمیشہ کے لئے ان پر دوام رکھے ان شاء اللہ اس کی استعداد اچھی ہوگی اور یہی تین باتیں اس کے واسطے کافی ہونگی۔ ایک یہ کہ سبق سے پہلے مطالعہ کرے دوسرے سبق سمجھ کر پڑھے بدون سمجھے آگے نہ چلے تیسرے یہ کہ سبق پڑھنے کے بعد ایک بار اس کی تقریر کر لیا کرے خواہ تنہا یا جماعت کے ساتھ تکرار کر کے اس سے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ زیادہ محنت کا انجام اچھا نہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے ایک بار فرمایا کہ شوق باقی رکھ کر کام کیا کرو یعنی سارا شوق پورا کر کے کام سے نہ اٹھا کرو بلکہ ایسے حال میں اٹھ کھڑے ہو کہ کچھ حصہ شوق کا باقی ہو پھر فرمایا کہ تم نے چکی پھرائی ہے۔ میں نے کہا حضرت نہیں۔ فرمایا تم نے دنیا کو کیا خاک دیکھا۔ ہمارے اکابر کیسے زندہ دل تھے یوں چاہتے تھے کہ بچے کھیلنے کے زمانہ میں کھیلیں اور کام کے وقت اچھی طرح کام کریں۔ پھر خود ہی بتایا کہ چکی پر ڈورا لپیٹ کر اس کو پھراتے ہیں اور چکی پھراتے ہوئے سارا ڈور نہیں اتارا کرتے بلکہ تھوڑا سا ڈور چھوڑ دیتے ہیں تا کہ سہولت سے پھر لوٹ آئے اگر سارا ڈور اتر جائے تو دوبارہ چڑھانا پڑے گا اسی طرح سارا شوق ختم کر کے کتاب چھوڑو گے تو دوسرے دن از سر نو شوق پیدا کرنا پڑیگا۔ نہیں اس لئے تھوڑا سا شوق باقی رکھ کر کتاب چھوڑا کرو تا کہ اگلے دن کتاب پڑھنے کو خود جی چاہے اطباء بھی تو کہتے ہیں کھانا تھوڑی سی بھوک باقی رکھ کر چھوڑنا چاہیے تا کہ دوسرے وقت اشتہائے صادق ہو ورنہ مشورہ کے لئے کمیٹی کرنا پڑے گی۔ اس وقت کھاؤں یا نہ کھاؤں پھر یار دوست سوڈا واٹر اور نمک سلیمانی کی رائے دینگے اور اس کا انجام یہ ہوگا کہ کبھی بند پڑ جائیگا تو حقنہ کرانا پڑے گا۔ (الحدود والقیود ج ۲۵)

دعا کے حدود وقیود

دعا کیسی اچھی چیز ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کا مغز بتایا ہے مگر اس

کے لئے بھی حدود و قیود ہیں کہ دعا میں فضول قیدیں نہ بڑھائے جیسے ایک صحابی زادہ نے دعا کی تھی۔ **اللھم انی اسئلک القصر الابیض عن یمین الجنة.** کہ اے اللہ میں جنت کے دائیں جانب والا کوشک ابیض آپ سے مانگتا ہوں ان کے باپ نے اس پر ٹوکا کہ یہ قید کیسی ہے خدا سے جنت الفردوس مانگو یہ کیا کہ دائیں جانب کا حصہ ہو اور سفید محل ہو۔ یہ تجاوز عن الحدود ہے اور میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا میں حد سے تجاوز کو پسند نہیں فرماتے اسی طرح یہ بھی دعاء کا ادب ہے کہ بے تمیزی کی دعا نہ کرے اسی لئے میں نے مناجات مقبول اور بعض بزرگان سلف نے حزب اعظم وغیرہ تالیف کی ہے جس میں ادعیہ ماثورہ کو جمع کیا گیا ہے۔ تاکہ لوگ اپنی طرف سے گھڑ گھڑ کر دعا نہ کیا کریں۔ کیونکہ اختراعی دعا میں بے ادبی کا اندیشہ ہے کیونکہ جاہل آدمی کا ادب ہی کیا ممکن ہے وہ اپنی جہالت سے بے ادبی کو ادب سمجھ جائے جاہلوں کا ادب تو ایسا ہوتا ہے جیسے ایک گنوار کا اپنے ربیب کے ساتھ مقدمہ تھا ڈپٹی نے اس سے پوچھا کہ یہ لڑکا تیرا کیا لگتا ہے کہا یہ میرا کڈھیلوا ہے ڈپٹی صاحب نے یہ وحشی لغت کیوں سنا تھا پوچھا کڈھیلوا کیا بلا ہے گنوار نے کہا تو نہیں جانتا لے میں تجھے بتاؤں کڈھیلوا اسے کہیں جیسا تیرا باپو مر جا اور تیری ماں مجھے کر لے اور تو اس کی گیلوں آئے تو تو میرا کڈھیلوا ہوگا اب بھی سمجھا ڈپٹی نے کہا کہ ایسا سمجھا کہ عمر بھر نہ بھولوں گا مولانا جاہلوں کے ادب کی مثال دیتے ہیں۔

شاہ را گوید کسے جولاہ نیست　　ایں نہ مدح ست اوگر آگاہ نیست

بادشاہ کو اگر کوئی جولاہا کہے کہ تو یہ اس کی تعریف نہیں ہے مگر وہ اس کے مرتبہ سے واقف نہیں ہے۔ (الحدود والقیود ج ۲۵)

حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ کی حکایت

ایک حکایت میں میں نے نصاب الاحتساب کے مصنف قاضی ضیاء الدین سنامی کے ایک بزرگ سے سنی ہے جو الہ آباد میں مجھ سے ملے ہیں وہ اپنے کسی بزرگ کی کتاب سے نقل کرتے تھے اور وہ ایسے بزرگ تھے جن سے حضرت خضر علیہ السلام ملا کرتے تھے ان کے یہاں ایک کتاب پر حضرت خضر علیہ السلام کے ہاتھ کی ف لکھی ہوئی ہے شاید انہوں نے حاشیہ کے طور پر کوئی فائدہ لکھنا چاہا تھا۔ مگر ف لکھ کر آگے نہیں لکھ سکے۔ وہ کتاب تبرک کے طور

پر ان کے کتاب خانہ میں رکھی ہوئی ہے۔ ان واقعات پر جزم تو نہیں کیا جا سکتا مگر تکذیب کی بھی کوئی حد نہیں کہ میرے نزدیک راوی غیر معتبر نہیں ہے تو ان بزرگ سے کسی نے سماع کی بابت سوال کیا تھا کہ اس میں آپ کا فیصلہ کیا ہے یہ جائز ہے یا نہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ عزیز من تم نے ایسی بات کا سوال کیا ہے جس کا فیصلہ کرنا ہمارا تمہارا کام نہیں بس میں بجائے جواب کے تم کو ایک حکایت سناتا ہوں۔ وہ یہ کہ قاضی ضیاء الدین سنامی حضرت سلطان الاولیا سلطان نظام الدینؒ کے ہم عصر ہیں سلطان جی صاحب سماع تھے سنامی ان کو سماع سے منع کرتے تھے۔ ایک بار قاضی صاحب کو معلوم ہوا کہ سلطان جی کے یہاں سماع ہو رہا ہے تو وہ اپنی فوج کو ساتھ لے کر روکنے آئے یہاں پہنچ کر دیکھا تو ایک بڑا شامیانہ قائم تھا اور اس کے اندر سلطان جی کی جماعت کا اس قدر ہجوم تھا کہ قاضی صاحب کو اندر جانے کی جگہ نہ ملی تو انہوں نے حکم دیا کہ خیمہ کی طنابیں کاٹ دو تا کہ مجمع منتشر ہو جائے فوج نے خیمہ کی طنابیں کاٹ دیں مگر خیمہ اسی طرح ہوا پر معلق رہا گرا نہیں قاضی صاحب نے اپنی جماعت سے فرمایا کہ اس سے دھوکہ نہ کھانا بدعتی سے خوارق کا صدور ہو سکتا ہے۔ اور یہ موجب قبول نہیں اس وقت تو وہ واپس ہو گئے۔ دوسرے وقت حضرت سلطان جی کے مکان پر گئے اور فرمایا کہ تم سماع سے توبہ نہ کرو گے۔ سلطان جی نے فرمایا اچھا اگر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پچھوا دیں جب تو تم منع نہ کرو گے کہا اچھا پچھوا دو قاضی صاحب کو سلطان جی کی بزرگی کا علم تھا جانتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرا سکتے ہوں اس لئے سوچا کہ اس دولت کو کیوں چھوڑوں۔ چنانچہ سلطان جی نے ان کی طرف توجہ کی تو انکو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت مکشوف ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرما رہے ہیں کہ فقیر کو تنگ کرتے ہو قاضی سنامی نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کچھ خبر نہیں کہ میں کس حال میں ہوں جاگ رہا ہوں یا سو رہا ہوں۔ اور صحیح طور پر سن رہا ہوں اور سمجھ رہا ہوں یا مدہوش ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات حضرات صحابہ نے بحالت یقظہ آپ سے سن کر بیان فرماتے ہیں۔ وہ اس ارشاد سے اولی واقدم ہیں جو میں اس وقت سن رہا ہوں اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا۔ اور یہ حالت ختم ہو گئی۔ تو سلطان جی نے فرمایا کہ دیکھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا قاضی صاحب نے کہا اور دیکھا ہم نے کیا عرض کیا۔ پھر سلطان جی نے قاضی صاحب کے سامنے ہی منشد کو یعنی قوال کو اشارہ کیا اس نے سماع شروع کیا۔ قاضی

صاحب بھی بیٹھے رہے کہ اس بدعت کو یہیں بیٹھ کر توڑوں گا۔ قوال نے کوئی شعر پڑھا۔ سلطان جی کو وجد ہوا اور وہ کھڑے ہو گئے۔ قاضی صاحب نے اس دفعہ بھی ان کو بٹھلا دیا تھوڑی دیر میں غلبہ وجد سے سلطان جی پھر کھڑے ہوئے اور قاضی صاحب نے اس دفعہ بھی ان کو بٹھا دیا تیسری دفعہ سلطان جی پھر کھڑے ہوئے اس دفعہ قاضی صاحب نے ہاتھ باندھ کر سلطان جی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اس پر قاضی صاحب کی جماعت کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کیا ہونے لگا۔ سب کا خیال ہوا کہ بس اب آئندہ قاضی صاحب سلطان جی کو سماع سے منع نہ کریں گے مگر جب مجلس سماع ختم ہوئی تو قاضی صاحب یہ کہہ کر اٹھے اچھا میں پھر بھی آؤنگا اور تم کو اس بدعت سے روکوں گا واپسی کے وقت قاضی صاحب کی جماعت نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا بات تھی۔ کہ تیسری دفعہ میں آپ سلطان جی کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ فرمایا بات یہ ہے کہ سلطان جی کو پہلی بار جو وجد ہوا تو ان کی روح آسمان اول تک پہنچی یہاں تک میری بھی رسائی تھی میں ان کو وہاں سے واپس لے آیا۔ اور بٹھا دیا۔ دوسری بار جو وجد ہوا تو ان کی روح عرش کے نیچے پہنچی یہاں تک بھی میری رسائی تھی میں وہاں سے بھی انکو واپس لے آیا۔ تیسری بار جو وجد ہوا تو ان کی روح فوق العرش پہنچی میں نے چاہا کہ وہاں سے بھی واپس لاؤں کہ ملائکہ عرش نے مجھے روک دیا کہ عرش کے اوپر نظام الدین ہی جا سکتے ہیں تم نہیں جا سکتے۔

اس وقت مجمع کی عجیب حالت تھی۔ اور اس وقت مجھے عرش کی تجلیاں تک نظر آئیں میں ان تجلیات کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو گیا تھا اس بدعتی کے سامنے تھوڑا ہی دست بستہ ہوا تھا وہ چاہے عرش سے اوپر پہنچ جائے مگر اس بدعت سے پھر بھی اس کو منع کرونگا۔ وہ بھی بڑے پکے تھے کہ سلطان جی کے مقامات سے بھی واقف تھے اور خود بھی صاحب مقامات تھے اور جانتے تھے کہ سلطان جی کا مقام مجھ سے اعلیٰ وارفع ہے مگر بایں ہمہ بدعت ہی سمجھتے ہیں یہ بڑا کمال ہے ورنہ ناقص تو ایسے وقت دھوکہ میں آجائے اور بدعت کے بدعت ہونے میں تامل کرنے لگے مگر قاضی صاحب کو اس پر بھی تامل نہیں ہوا یہ انکے کمال کی دلیل تھی اور واقعی ایسے ہی صاحب کمال کو سلطان جی جیسے پر احتساب کا حق بھی تھا۔ پھر اتفاق ایسا ہوا کہ قاضی صاحب کا وقت وصال سلطان جی سے پہلے آیا سلطان جی ان کو عیادت کو گئے اور دروازہ پر پہنچ کر اجازت مانگی قاضی صاحب نے فرمایا کہ سلطان جی سے کہہ دو کہ یہ وقت وصال حق کا وقت ہے اس وقت میں بدعتی کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا سلطان جی نے جواب دیا کہ قاضی صاحب سے عرض کردو کہ وہ

بدعتی ایسا بے ادب نہیں کہ بارگاہ سنت میں بدعت سے ملوث ہوکر آتا وہ حضرت والا کے مذاق سے واقف ہے اور آپ کے مذاق کی پوری رعایت کرکے حاضر ہوا ہے میں اس بدعت سے توبہ کرکے حاضر ہوا ہوں۔ اس پر مجمع گویا ذبح ہوگیا تھا۔ یہ جواب سن کر قاضی صاحب پر حالت طاری ہوگئی اور آبدیدہ ہوکر اپنا عمامہ سر سے اتار کر خادم کو دے دیا۔ کہ سلطان جی سے کہو کہ اس عمامہ پر پاؤں رکھتے ہوئے تشریف لائیں۔ بس ان میں یہی ایک کسر تھی جو جاتی رہی باقی ان کے مقامات عالیہ اور کمالات سے میں ناواقف نہیں ہوں۔

گر برسرو چشم من نشینی   نازت بکشم کہ نازنینی

اگر تو میرے سر اور آنکھوں پر بیٹھے تو تیرا آنا آٹھاؤں اس سے کہ تو نازنیں ہے۔

خادم قاضی صاحب کا عمامہ لے کر سلطان جی کے پاس حاضر ہوا تو آپ نے عمامہ کو سر پر رکھ لیا کہ یہ عمامہ شریعت ہے میں اس کو اپنے سر پر رکھ کر حاضر ہوں گا چنانچہ تشریف لائے اور قاضی صاحب نے فرمایا۔

آنانکہ خاک رابنظر کیمیا کنند   آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند

وہ گوشہ جو تیری خاک ہے مٹی کو کیمیا بناتے ہیں کیا وہاں ہماری جانب رسائی ہے۔

حضرت اب میرا آخری وقت ہے اللہ میرے اوپر توجہ فرمائے چنانچہ حضرت سلطان جی نے توجہ شروع کی اور ایسی توجہ کی کہ قاضی صاحب کی روح نہایت فرح وشادمانی کے ساتھ عالم بالا کو پرواز ہوگئی۔ حضرت قاضی صاحب کا وصال ہوگیا تو سلطان جی روتے تھے اور فرماتے تھے کہ افسوس شریعت کا ستون گرگیا۔ اس حکایت کو ذکر کرکے وہ بزرگ فرماتے ہیں کہ بھائی نہ میں نظام الدین ہوں جو اجازت دوں نہ ضیاء الدین ہوں جو منع کروں یہ حکایت میں نے اخبار الاخیار میں بھی دیکھی ہے مگر مختصر۔ (الحدود والقیود ج ۲۵)

تقسیم کار کا اصول

ہر قوم کے لئے تقسیم خدمات ضروری ہے بدون اس کے کام نہیں چل سکتا تمام اہل تمدن اس کی ضرورت پر متفق ہیں۔ چنانچہ جنگ میں فوج جاتی ہے فوجی افسر جاتے ہیں منشی محرر کیلکٹر اور جج۔ وغیرہ نہیں جاتے پھر نہ معلوم مولویوں کے ذمہ سارا کام کیوں رکھا جاتا ہے کہ وہ حدیث وفقہ وتفسیر کا علم بھی حاصل کریں۔ فتوی بھی لکھیں وعظ بھی کہیں درس

وتدریس بھی کریں، مدرسے بھی قائم کریں، مدارس کے لئے چندہ بھی کریں، مناظرہ بھی کریں، اور لیڈروں کے ساتھ جھنڈا لیکر سیاسیات میں بھی شریک ہوں یہ طریقہ تقسیم خدمات کے بالکل خلاف ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ علماء کا جو کام ہے وہ اس سے کسی وقت غافل نہیں اس لئے یہ اعتراض لغو ہے کہ جب مولوی علماء کا جو کام نہ کریں تو لیڈر کیا کریں۔ انہوں نے دین کی خدمت کرنا شروع کردی۔ سو میں نے بتا دیا ہے کہ جو خدمت مولویوں کے ذمہ ہے یعنی معانی قرآن وحدیث کا حل کرنا احکام شرعیہ بیان کرنا وہ اس خدمت کو بخوبی انجام دے رہے ہیں اس میں لیڈروں کو دخل دار معقول کی کیا ضرورت ہے۔ مطالب قرآن وحدیث اور احکام تو لیڈروں کو علماء سے پوچھنا چاہیے اور ترقی قومی کے اسباب ووسائل لیڈروں کو سوچنا چاہئے اور ہر تدبیر کے جواز وعدم جواز کو اپنی رائے سے طے نہ کیا کریں بلکہ اول علماء سے استفتاء کرلیا کریں (الحدود والقیود ج ۲۵)

احکام شرعیہ میں رعایت جذبات

حدیث شریف ہے **لایحل لاحدان یھجر اخاہ فوق ثلثۃ ایام** (الادب المفرد للبخاری ۳۹۹) کسی مسلمان کو یہ جائز نہیں کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال وغیرہ موقوف رکھے دیکھئے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ چاہے آپس میں کیسا ہی رنج وتکرار ہو بولنا مت چھوڑو حالانکہ شریعت کو یہ بھی اختیار تھا کہ ایسا حکم دیدیتی چنانچہ بعض مشائخ نے طالبین کی اصلاح کیلئے کبھی ایسا حکم دیا ہے مگر ایسی ہمت سالکین کو ہوسکتی ہے۔ ہر شخص کو نہیں ہوسکتی۔ رنج وتکرار کا طبعی تقاضا ہے کہ جس سے تکرار ہو اس سے کلام نہ کیا جاوے۔ چونکہ احکام شرعیہ عام ہیں اس لئے اس جذبہ کی رعایت کر کے حکم دیا گیا کہ غصہ اور رنج میں بول چال چھوڑ دینا جائز ہے مگر اس کی حدود مقرر ہیں کہ تین دن سے زیادہ نہ ہونا چاہیے اس میں نکتہ یہ ہے کہ رنج وتکرار کے بعد فوراً سلام وکلام کرنے میں غصہ کو گھونٹنا پڑے گا اور غصہ کے گھونٹنے سے کینہ اور حسد پیدا ہو جاتا ہے اس لئے غصہ نکالنے کی اجازت دی گئی۔ کہ بول چال ترک کرسکتے ہو۔ مشائخ کو بھی ایسے موقع پر غصہ گھونٹنے کا حکم نہ دینا چاہیے بلکہ موقع اور حالت کو دیکھ کر حکم دینا چاہیے اسی لئے شیخ بننا بڑا مشکل ہے غرض عام حکم یہ ہے کہ تین دن تک نہ بولنا جائز ہے اور تین دن سے زیادہ ترک کلام جائز نہیں کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ تھوڑی

دیر گزر جانے سے غصہ کم ہو جاتا ہے۔ پھر رات گزر جانے سے اگلے دن طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے بوجھ نہیں رہتا۔ پھر تیسرے دن غصہ نکل جاتا رہتا ہے۔ اب شریعت ایسے وقت میں دونوں کو ملانا چاہتی ہے کہ ان کے دلوں پر غصہ کا بوجھ نہیں رہا۔ تجربہ ہے کہ تین دن کے بعد غصہ اور رنج کا طبعی اثر باقی نہیں رہتا ہاں اگر کوئی سوچ سوچ کر خود ہی رنج و غصہ کو تازہ کرنا چاہے تو اور بات ہے مگر یہ رنج و غصہ کسبی ہوگا طبعی اثر نہ ہوگا۔ شریعت نے طبعی تقاضہ کی رعایت کی ہے کیونکہ وہ اختیار سے باہر ہے، کسبی امور کی رعایت نہیں کی کیونکہ ان کا وجود وعدم اپنے اختیار میں ہے مگر یہ حدود اس رنج و غصہ میں ہیں جو دنیوی سبب سے ہو اور اگر دینی سبب سے ہو تو تین دن سے زیادہ بھی ترک کلام و سلام جائز ہے جب تک کہ وہ سبب باقی ہے۔ مثلاً نعوذ باللہ کوئی مرتد ہو گیا یا کوئی شخص فاسق و فاجر و زنا کار ہے وغیرہ وغیرہ لیکن اس میں بھی یہ شرط ہے کہ قطع تعلق کا منشاء محض وہ معصیت ہی ہو بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ قطع تعلق تو کرتے ہیں کسی دنیوی سبب سے مثلاً ان کو کسی سے کوئی زک پہنچی ہے اس لئے بول چال قطع کرتے ہیں۔ مگر ان کا نفس مولوی ہے وہ اس کے لئے دینی سبب نکال لیتا ہے کہ میں نے تو اس شخص سے قطع تعلق اس لئے کیا ہے کہ یہ فاسق ہے بدعتی ہے اس مرض میں آج کل مولوی زیادہ مبتلا ہیں کہ وہ دنیا کو دین بنا لیتے ہیں مگر ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ان تاویلوں سے مخلوق کو دھوکہ دے سکتے ہیں مگر خدا کے یہاں یہ ترکیبیں اور حیلے نہیں چل سکتے۔ (حرمات الحدود ج ۲۵)

دشمنی اور دوستی کا اعتدال

دشمنی اور دوستی کیلئے بھی شریعت نے ایک حد مقرر کی ہے اور اس میں بھی اس حکمت کا جریان بہت واضح ہے بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف ارشاد فرمایا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے احبب حبیبک ھونا ما عسی ان یکون بغیضک یوما ما وابغض بغیضک ھونا ما عسی ان یکون حبیبک یوما (سنن الترمذی ۱۹۹۷، کنز العمال ۲۴۷۴۲)، یعنی دوستوں کے ساتھ دوستی اعتدال کے ساتھ کرو شاید وہ کسی وقت تمہارا دشمن ہو جائے تو تمہارے سارے راز معلوم ہونے کے سبب تم کو ضرر پہنچاوے۔ اور دشمن کے ساتھ دشمنی بھی اعتدال سے کرو شاید وہ کسی وقت دوست ہو جائے تو آنکھیں سامنے کرتے ہوئے حجاب نہ ہو۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر ساری دنیا کے عقلاء جمع ہو جاویں تو اس ذات پاک

حضور کے برابر ہرگز حکمتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ آپ نے دوستی اور دشمنی کی کیسی حد بتلا دی کہ دوستی ایسی کرو کہ وہ کسی وقت دشمن ہو جائے تو تم کو پریشانی نہ ہو۔ اور دشمنی بھی ایسی کرو کہ اگر کسی وقت دوست ہو جائے تو آنکھیں سامنے کرتے ہوئے ندامت نہ ہو۔ یہ وہی حکمت ہے لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا (شاید کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی بات پیدا کر دیں)۔ کہ دوستی اور دشمنی کرتے ہوئے یہ سوچ لیا کرو کہ شاید حق تعالیٰ بعد میں کوئی نئی بات پیدا کر دیں۔ پھر نادم ہونا پڑے تو اسی وقت اس کی رعایت کر لینی چاہیے کیا کوئی حکیم ہے جس کی باتوں میں ایسی حکمتیں ہوں ہرگز نہیں۔ اب ہماری حالت یہ ہے کہ نہ ہماری دوستی کی کوئی حد ہے نہ دشمنی کی۔ دوستی کریں گے تو ایسی کہ دوست کو بھائی اور اولاد سے بڑھا دیں گے۔ بھائی سے تو روپے پیسے کا بھی حساب ہوتا ہوگا اور دوست سے کسی چیز کا حساب نہیں وہ جو چاہے کرے پورا خود مختار ہے۔ اس کے سامنے اپنے سارے راز بیان کر دیتے ہیں حتیٰ کہ خاندانی جھگڑے بھی سب اس کے سامنے کھول دیتے ہیں۔ عزیزوں سے تو کچھ پردہ بھی ہوتا ہے مگر دوستوں سے کسی بات کا پردہ ہی نہیں ہوتا جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی وقت وہ دشمنی پر آمادہ ہو گیا تو ان حضرت کے سارے راز ظاہر کر دے گا میں کہتا ہوں کہ دوستوں سے اپنے خاص راز ہرگز ظاہر نہ کرو پیر سے زیادہ کوئی دوست نہیں ہوتا۔ (حرمات الحدود ج ۲۵)

راحت کا راز

حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ ہمارے استاد الاستاد فرماتے تھے کہ راحت اگر چاہتے ہو تو کسی سے توقع نہ رکھو۔ کیونکہ اکثر رنج و غم کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ہم کو کسی سے امید تو اور کچھ اور اس سے برتاؤ اور کچھ ظاہر ہوا۔ پھر مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہ بھائی میں کہتا ہوں کہ تم مجھ سے بھی امید نہ رکھو اللہ اکبر یہی تو اہل اللہ کی علامت ہے کہ وہ معاملات میں اپنے کو بھی دوسروں کے برابر سمجھتے ہیں۔ (حرمات الحدود ج ۲۵)

غیر عامل واعظ کیلئے وعید

اگر واعظ خود عامل نہ ہو تو اس کی فضیلت سامعین عاملین پر کسی دلیل سے ثابت نہیں بلکہ حدیث میں ایسے واعظ پر وعید ہے حدیث میں ہے کہ ایک شخص جہنم میں اپنی آنتیں گھسیٹتا ہوا گھومے گا اور اس کی بدبو سے جہنم والے تنگ آ جائیں گے تو وہ کہیں گے ارے فلانے تیرا یہ کیا حال ہے تو ہم

کوامرونہی کیا کرتا تھا وہ کہے گا ہاں لیکن میں تم کو نیک کام کا امر کرتا تھا اور خود عمل نہیں کرتا تھا اور تم کو گناہوں سے منع کرتا تھا اور خود نہیں بچتا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ نفع لازم ہی اصل ہے ورنہ اگر کوئی شخص نماز کی ترغیب دیتا ہو اور خود نہ پڑھتا ہو اس کی فضیلت کافی نہیں بلکہ محل وعید سے یوں خلاف قاعدہ مغفرت ہو جائے تو اور بات ہے باقی قانون نہیں ہے۔ (التراحم فی التراحم ج ۲۵)

ہدایت غیر کا حد سے زیادہ اہتمام مطلوب نہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی ہے کہ اے اللہ جب آپ کسی قوم کو فتنہ میں ڈالنا چاہیں تو مجھے ایسی حالت میں اٹھا لیجئے کہ میں فتنہ میں مبتلا نہ ہوں بلکہ اس سے بچا رہوں آپ نے یہ دعا نہیں فرمائی کہ مجھے اس فتنہ کے رفع کرنے کی ہمت دیجئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت غیر کا حد سے زیادہ اہتمام مطلوب نہیں ہے بلکہ اپنا بچاؤ مقدم ہے اپنے بچنے کا سامان کرنا چاہیے کیونکہ بعض فتنے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا دفع کرنا قدرت سے باہر ہوتا ہے اس وقت طلب مدافعت مناسب نہیں بلکہ اپنا بچاؤ کرنا چاہیے۔ رہا یہ کہ اس حدیث سے یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ مراد ایسا فتنہ ہے جس کا دفع قدرت سے باہر ہو حدیث میں اس قید پر کیا قرینہ ہے سو قرینہ اس کا اذا اردت بقوم فتنۃ ہے۔ کہ جب آپ کسی قوم کو فتنہ میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر چکیں اور ظاہر ہے کہ ارادہ کا تخلف محال ہے تو اس فتنہ کا رفع بھی محال ہے اس لئے ایسے وقت کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کی کہ مجھے ہی اس سے پہلے اٹھا لیجئے اور مجھے ہی فتنہ سے بچا لیجئے پھر یہ بات معلوم کرنا کہ فتنہ کا رفع دفع کرنا قدرت سے باہر ہے یا نہیں۔ یا تو دلیل قطعی سے معلوم ہوگا۔ جیسا کہ حضرات انبیاءؑ کو وحی سے معلوم ہو جاتا ہے یا دلیل ظنی سے اس طرح معلوم ہو کہ اسکے ظن غالب میں اس کا رفع قدرت سے باہر ہو جیسا کہ آجکل فتن کی حالت ہے کہ فتنوں کی گھٹائیں آ رہی ہیں ایک فتنہ ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا فتنہ نکل کھڑا ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا کہ اخیر زمانہ میں فتنے ایسے پے در پے آئیں گے جیسے موتیوں کی لڑی ٹوٹ جائے کہ ایک کے بعد دوسرا گرتا چلا جاتا ہے۔ آجکل یہی حالت ہے جس کو دیکھ کر اہل درد یوں کہتے ہیں۔

یک تن و خیل آرزو دل بچہ مدعا دہم　　تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

ایک جسم ہے اور دل کی بہت آرزوئیں ہیں کس کس کو مدعا دوں سارا بدن داغ داغ ہے۔ پھایہ کہاں کہاں رکھوں۔ (التراحم فی التراحم ج ۲۵)

نفع رسانی کی حدود

دوسروں کی نفع رسانی کا اس وقت اہتمام کیا جائے جبکہ اپنا ضرر نہ ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے سوال کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس ایک دینار ہے اس کو کیا کروں۔

قال انفقه علی نفسک (مشکوۃ المصابیح: ۱۹۴۰) (فرمایا اس کو اپنی ذات پر خرچ کرو۔ **قال آخر قال انفقه علی اهلک** (مسند الحمیدی ١١٧٦). (اس نے کہا میرے پاس ایک دینار اور بھی ہے فرمایا اس کو اپنے گھر والوں پر خرچ کرو۔ **قال و آخر قال انفقه علی ولدک** (شرح السنة ٦: ١٩٣) (اس نے کہا میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ فرمایا اس کو اپنی اولاد پر خرچ کرو، **المراد به البالغون من الاولاد فان الصغار قددخلوا فی الاهل لکو نهم فی عیاله واهل الرجل اهل بیته الذین بعدقال و آخر انفقه علی خادمه** ، کہا میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ فرمایا اس کو اپنے خادم پر خرچ کرو۔ **قال و آخر وقال فانت اهلک علیه.** (کہا میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ فرمایا اب تم کو اختیار ہے (جہاں چاہو خرچ کرو)۔ صوفیہ کا مذاق تو یہ ہے کہ خود بھوکے رہو اور دوسروں کو دے دو اور اسی کا نام ایثار ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول اپنے اوپر پھر اپنے متعلقین پر انفاق کا امر فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ نفع لازمی نفع متعدی سے مقدم ہے۔ (التراحم فی التراجم ج ۲۵)

صحابہ نے تابیر کو اس سال چھوڑ دیا تو اس مرتبہ پھل کم آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اس سال پھل کم کیوں آئے معلوم ہوا کہ تابیر نہ کرنے سے ایسا ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا تابیر کر لیا کرو اس وقت آپ نے یہ بھی فرمایا **انتم اعلم باموردنیاکم** (الصحیح لمسلم' الفضائل: ١٤١' کنز العمال ٣٢١٨٤)، تم دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ دنیوی کاموں کا طریقہ اور اسباب کے خواص تم زیادہ جانتے ہو یعنی مجھے اس خاصیت کی اطلاع نہ تھی۔ اور یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ دنیوی کاموں کے احکام میں تم خودمختار ہو۔ اگر یہ مطلب ہوتا تو آپ پہلے ہی سے منع کیوں فرماتے آپ نے ممانعت اسلئے کی ٹوٹکہ اور شگون کا آپ کو شبہ ہوا تھا جب یہ احتمال رفع ہو گیا اور معلوم ہوا کہ تابیر میں یہ خاصیت فطری ہے اس وقت آپ نے اجازت دے دی۔ (الباب لاولی الالباب ج ۲۵)

چند فضول سوالات

کانپور میں ایک عربی خواں طالب علم سے ایک انگریزی خواں نے سوال کیا کہ بتلاؤ ثوابت کی شمار کیا ہے انہوں نے کہا کہ مرصودہ کا عدد تو لکھا ہے کہ ایک ہزار بائیس ہیں مگر غیر مرصودہ معلوم نہیں وہ بولا بس یہی ریاضی پڑھی ہے۔ اس نے سائل سے یہ سوال کیا کہ اچھا آپ بتلا دیں کہ سمندر میں مچھلیاں کتنی ہیں اور یہ سوال زمین کا ہے اور آپ کا سوال آسمان کا ہے پہلے آپ زمین کا حال بتلا دیں تو میں بھی آسمان کا حال بتلا دوں گا۔ اب وہ خاموش ہیں طالب علم نے کہا بس یہی جغرافیہ پڑھا ہے آج کل یہ بھی ایک مرض ہے کہ مولویوں سے اینڈے بینڈے سوالات کرتے ہیں اور اگر ان سے جواب نہ آئے تو ان کے علم پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے کیا خاک پڑھا ہے اتنی بات کا تو جواب نہ دے سکے۔ سبحان اللہ اسی لیے علماء نے پڑھا لکھا ہے کہ آپ کے واہیات سوالات کو حل کیا کریں ان سے احادیث و آیات کا مطلب پوچھو مسائل و احکام واقعات کا جواب لو الغرض دنیا کے کاموں کا تجربہ تو ان کو ضروری نہیں مگر سلیقہ اور تہذیب اور انتظام ان میں اس قدر ہوتا ہے کہ واللہ اہل دنیا کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی جس کا امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ان کے پاس تھوڑے دن رہ کر دیکھ لے اور وہ شخص ایسا ہو جس کو اپنے مہذب اور سلیقہ دار اور منتظم ہونے کا دعوی ہو اور اپنے کو بڑا عاقل سمجھتا ہو ان شاء اللہ تعالیٰ وہ اپنے کو بے وقوف کہہ کر نہ اٹھے تو کوئی بات نہیں تھوڑے ہی عرصہ میں اس کو اپنی تہذیب کا بدتہذیبی ہونا اور اپنے انتظام کا غلط ہونا مشاہدہ ہو جائے گا۔ (الباب لاولی الالباب ج ۲۵)

ترقی کا مدار محض اسباب پر نہیں

میں نے ایک شہر میں ایک رئیس دیکھا ہے کہ پہلے وہ چھ پیسے کے مزدور تھے پھر ریلوے میں نوکر ہو گئے۔ پھر ریلوے کے ٹھیکے لینے لگے حتیٰ کہ ترقی کرتے کرتے ہزاروں لاکھوں کے آدمی ہو گئے کہ بڑے بڑے بی اے، ایم اے کی ڈگری پاس کرنے والے ان کے یہاں ملازم تھے اور خود اپنے دستخط بھی نہ کر سکتے تھے اگر ترقی کا مدار محض اسباب پر ہے تو ذرا تم کسی دوسرے کو تو چھ پیسہ کی مزدوری سے لاکھوں ہزاروں کا آدمی

بنادو۔ اور جس طرح اس رئیس نے ترقی کی ہے اس کو بھی وہی ذرائع بتلادو۔ یقینی بات ہے کہ ہر شخص ان ذرائع سے ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ ہر شخص رات دن مشاہدہ کرتا ہے کہ آج وہ ایک کام کا ارادہ کرتا ہے جو پورا ہو جاتا ہے کل کو پھر اسی کام کا ارادہ کرتا ہے اور پورا نہیں ہوتا۔ اسی لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں عرفت ربی بفسخ العزائم، کہ میں نے خدا تعالیٰ کو ارادوں کے ٹوٹنے اور ناکام رہنے سے پہچانا کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ارادہ سے کچھ نہیں ہوتا کوئی دوسرا کام کرنے والا ہے۔ (الباب لاولی الالباب ج ۲۵)

جسمانی اعضاء کے گناہ

رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **العینان تزنیان وزنا هماالنظر والقلب یتمنی ویشتهی ویصدق ذلک الفرج اویکذبه** (مسند احمد ۲:۳۷۲، مجمع الزوائد ۶:۲۵۶)، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھ کے لئے بھی زنا ثابت فرمایا ہے اور قلب کے لئے بھی کہ آنکھ بھی زنا کرتی ہے۔ اس کا زنا دیکھنا ہے (بقصد شہوت) اور دل بھی زنا کرتا ہے اس کا زنا تمنا اور اشتہا ہے آگے فرج کے زنا کو الگ بیان فرمایا ہے اس سے صاف معلوم ہوا کہ قلب کی تمنا و اشتہا پر بھی مواخذہ ہے مگر وہی جو بقصد ہو جو بلا قصد تو وسوسہ زنا کیا کفر و شرک کے وساوس بھی مضر نہیں پس وساوس غیر اختیاریہ سے بالکل مطمئن رہو ان سے کچھ بھی ضرر نہیں ہوتا۔ میں اس مسئلہ کو تاکید و توضیح کے ساتھ اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ بہت لوگ اس کے نہ جاننے کی وجہ سے پریشانیاں اور وہم میں مبتلا ہیں اور اس میں عوام کو زیادہ ابتلاء نہیں زیادہ وساوس کے وہم میں آپ اتقیاء کو مبتلا دیکھیں گے کیونکہ شیطان اپنے وقت کو خراب نہیں کرتا ہے وہ بڑا جنٹلمین ہے کہ وہ بے ضابطہ اپنے وقت کو فضول ضائع نہیں کرتا بلکہ ضابطہ سے کام کرتا ہے۔ تو جن سے وہ گناہ بھی آسانی سے کراسکتا ہو ان کو وسوسے کیوں ڈالے اور خواہ مخواہ القاء وساوس میں اپنا وقت کیوں برباد کرے ہاں جن سے گناہ بلاواسطہ نہیں کراسکتا اور یہ اتقیاء ہیں جن سے اگر وہ زنا یا چوری کرانا چاہے تو جانتا ہے کہ وہ فوراً اس سے متوحش ہوں گے اور کبھی اس فعل پر جرات نہ کریں گے ان کو وہ عبادت کے وقت وساوس میں مبتلا کرتا اور اس طرح پریشان کرتا ہے تاکہ وساوس سے گھبرا کر یہ عبادات کو ترک کردیں چنانچہ بہت سے اتقیاء کو اس نے وساوس کے چکر میں ڈال کر

عبادات وذکر سے معطل کر دیا کیونکہ ان کی حالت یہ ہوگئی ویسے بیٹھے رہیں تو ایک وسوسہ بھی پاس نہیں آتا اور جہاں نماز وذکر میں مشغول ہوئے معاً وساوس کفر وشرک ومعاصی کے آنا شروع ہوئے پھر چونکہ وہ محقق نہ تھے اس لئے گھبرا گئے۔ اور نماز وذکر چھوڑ بیٹھے اور شیطان اپنے مقصود میں کامیاب ہوگیا، مگر جو محقق ہیں وہ اس سے نہیں گھبراتے کیونکہ ان کی نظر میں قرآن وحدیث ہے اور عمل بالقرآن ان کی طبیعت ثانیہ ہوگئی ہے ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس شان کا ظہور ہے کان خلقہ القرآن (مسند احمد ۹۱۶، کنز العمال ۱۸۳۷۸) وہ تو وساوس آنے کے وقت کہتے ہیں الحمدللہ الذی ردکیدہ الی الوسوسۃ (سنن ابی داؤد ۵۱۱۲، مسند احمد ۱: ۲۳۵) کہ خدا کا شکر ہے کہ دشمن کی سب چالیں ختم ہو کر وسوسہ ہی پر رہ گئیں وہ ان وساوس سے نہیں گھبراتا بلکہ شیطان سے کہتا ہے کہ آ جتنے وسوسے ڈال سکے ڈال دے میرا کچھ ضرر نہیں ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ وسوسہ سے خوش ہونا چاہیے تاکہ شیطان تمہاری خوشی کو دیکھ کر بھاگ جائے کیونکہ اس کو مسلمان کی خوشی گوارا نہیں وہ تو رنج دینے کیلئے وسوسہ ڈالتا ہے پھر جب دیکھے گا کہ اس کو تو الٹی خوشی ہے بھاگ جائے گا۔ (الرغبہ المرغوبہ ج ۲۵)

علم کی قسمیں

علم کی تین قسمیں ہیں نافع اور مضر اور غیر نافع وغیر مضر لیکن واقعات کے اندر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو غیر مفید ہے وہ بھی حقیقت میں مضر ہی ہے میں پختگی کے ساتھ کہتا ہوں کہ جس شے کے اندر کوئی فائدہ نہیں ہے وہ مضرت سے خالی نہیں اور تقسیم مشہور اور اس تحقیق میں کچھ تعارض نہیں اس لئے کہ تین قسموں کی طرف تفریق باعتبار ابتداء کے ہے یعنی ابتداء میں فی الواقع علم کی تین ہی قسمیں ہیں مفید مضر غیر مفید مضر لیکن آثار کے اعتبار سے اور مآل کار میں وہ غیر مفید بھی مضر ہو جاتا ہے تو آثار کے اعتبار سے کل دو قسمیں ہیں مفید اور مضر اس لئے امر فضول بھی قابل ترک ہوا حاصل یہ کہ چونکہ دنیا کی مذمت کی اس مقام میں ضرورت نہ تھی اس لئے ایک لغو بات ہوئی اس لئے حضرت رابعہ بصریہ کو ناپسند ہوا حضرات اہل بصیرت بلاضرورت بروں کو بھی برا نہیں کہتے۔ حکایت ختم ہوئی۔ (التصدی للغیر ج ۲۵)

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بضرورت مذمت دنیا فرمائی

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی مذمت کی ہے بات یہ ہے کہ نری اردو کی

کتابیں دیکھنے سے عالم نہیں ہوتا جب تک کہ ان کو کسی عالم سے سبقاً سبقاً نہ پڑھے جیسے طب کی کتابیں اردو میں ہونا کافی نہیں جب تک کسی حکیم کے یہاں طب نہ کرے طب کی کتابیں دیکھنے سے جیسے کوئی حکیم نہیں بنتا اسی طرح دینیات دیکھنے سے دیندار نہیں بنتا جب تک کسی استاد سے نہ پڑھے پس یہ قصہ رابعہ بصریہؒ کا بھی ایسے ہی علم متلقی عن الشیوخ پر موقوف ہے اگر ایسا علم ہو تو اعتراض کچھ بھی نہیں بات یہ ہے کہ جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دنیا کی مذمت کی تو آپ کو ضرورت تھی دنیا کے محبین دنیا کو سنائیں اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو تمام جن وانس کی طرف مبعوث تھے اور ان میں محبین دنیا بھی تھے اور حضرت رابعہ بصریہؒ کی خدمت میں اس وقت سب کے سب مقدس ہی تھے اس لئے انہوں نے فرمایا **قوموا عنی فانکم تحبون الدنیا** اور **من احب شیا اکثر ذکرہ** یعنی میرے پاس سے اٹھ جاؤ اس لئے کہ تم لوگ دنیا کو دوست رکھتے ہو اور جو شخص کسی شے کو دوست رکھتا ہے اس کا ذکر زیادہ کرتا ہے شرح اس اجمال کی موقوف ہے اس کی چند مثالیں سمجھنے پر دیکھو فخر اور تفاخر اس پر کیا کرتے ہیں کہ ہم کو ہزاروں روپے ملتے تھے ہم نے نہیں لیے اور اس پر کوئی فخر نہیں کرتا ہم نے گوہ نہیں لیا ان دونوں میں فرق کیا ہے۔ فرق یہی ہے کہ ہزار روپے کو باوقعت سمجھتے ہیں اسلئے اس کے ترک کو فخر جانتے ہیں اور گوہ کی کوئی وقعت نہیں اسلئے اس کے چھوڑ دینے کو فخر نہیں سمجھتے۔ اور مثال لیجئے یہ کہا کرتے ہیں کہ ہم نے فلاں رئیس کو پیٹا اور یہ نہیں کہتے کہ ہم نے فلاں بھنگی کو مارا اس لیے کہ رئیس کو وقیع سمجھتے ہیں پس حضرت رابعہ بصریہؒ کے فرمانے کا حاصل یہ ہوا کہ اے بزرگو تم جو دنیا کی مذمت کرتے ہو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی تمہارے قلب میں وقعت ہے اس لئے مذمت کرتے ہو چیونٹی کی مذمت کیوں نہیں کرتے اس لئے وہ بچاری اس قابل نہیں کہ اس کی کوئی مذمت کرے تو حضرت رابعہ بصریہؒ نے ان کا مرض بیان کیا۔ (التصدی للغیر ج ۲۵)

اپنی فکر مقدم ہے

ایک بزرگ سے کسی نے یزید کے بارے میں پوچھا تھا کہ یزید کیسا تھا۔ یزید شعر گوئی میں بڑا ماہر تھا دیکھئے اس شیخ نے یزید کی بھی ایک مدح کی اس لئے کہ ان حضرات کو بجز اپنے عیوب کے دوسروں کے عیوب میں سے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ایک شخص نے مجھ سے بھی

پوچھا تھا کہ یزید کو لعنت کرنا جائز ہے میں نے کہا کہ ہاں اس شخص کو جائز ہے کہ جس کو یقین ہو کہ میں یزید سے اچھا ہو کر مروں گا تو حقیقت یہی ہے کہ جب تک خاتمہ ایمان پر نہ ہو کیا اطمینان ہو سکتا ہے، ہم لوگوں کی تو یہ حالت ہے۔

گہ رشک برد فرشتہ برپا کی ما　　گہ خندہ زند دیو زناپا کی ما
کبھی ہماری پا کی پر فرشتہ کو رشک آتا ہے اور کبھی ہماری ناپا کی پر شیطان بھی ہنستا ہے۔
ایمان چو سلامت بہ لب گور بریم　　احسنت بریں چستی و چالا کی ما

قبر کے کنارہ پر جب ہم ایمان کو صحیح سلامت لیجائیں اسی وقت ہماری چستی و چالا کی پر تم کو آفرین کہنا چاہیے۔ تو ایسی حالت میں ہم کیا منہ لیکر کیا کسی کو کہیں۔ (التصدی للغیر ج ۲۵)

صدقہ میں وسعت سے زیادہ خرچ کرنا مناسب نہیں

حدود شرعیہ میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ وسعت سے زیادہ خرچ نہ کرو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **افضل الصدقة ماكان عن ظهر غنی** (الصحیح للبخاری ۷: ۸۱، الصحیح لمسلم، الزکاة ۹۵) بہتر صدقہ وہ ہے کہ دے کر بھی کچھ پاس رہے **و ابداء بمن یتمول.** شروع کرو ان لوگوں سے جن کا نفقہ تمہارے ذمہ لازم ہے، ایک مقدمہ تو یہ ہوا کہ صدقہ میں وسعت سے زیادہ خرچ کرنا نہ چاہئے۔ دوسرا مقدمہ اس کے ساتھ اور ملا لیجئے وہ یہ کہ صدقہ تمام نفقات سے افضل ہے اب نتیجہ یہ نکلا کہ جب صدقہ میں یہ قید ہے کہ وسعت سے زائد خرچ نہ کیا جائے تو پھر اپنے لباس میں اس کی کہاں اجازت ہوگی کہ وسعت سے زیادہ خرچ کیا جائے

حدیث میں ہے **لاینبغی للمؤمنین ان یذل نفسه** (سنن الترمذی، ۲۲۵۴، سنن ابن ماجة: ۴۰۱۶) مسلمان کو مناسب نہیں کہ اپنے کو ذلیل کرے قالوا یا رسول اللہ و کیف یذل نفسه قال تحمل من البلاء لما لا یطیقہ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان اپنے کو ذلیل کیونکر کیا کرتا ہے فرمایا کہ اپنی سر پر ایسی بلا لے لے جس کے تحمل کی اس میں طاقت نہیں ہے۔ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے ساتھ کس درجہ کی محبت ہے کہ آپ کی ذلت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گوارا نہیں اس پر بھی مسلمان احکام شریعۃ کی قدر نہیں کرتے تو قرض کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ابواب غیر مباحہ کی طرف نظر جائے گی ذلیل کام کرنے لگے گا۔ کہیں جوا کھیلے گا کہیں جھوٹی شہادت دیگا، کہیں رشوت لے گا۔ دھوکہ دے کر بھی ظلم کر کے لوگوں کا مال دبانا چاہے گا۔ (الاسراف ج ۲۵)

حضرت امام مالکؒ کی قابل رشک دیانت علم

امام مالکؒ کی حکایت ہے کہ ایک مجلس میں ان سے چالیس مسائل کسی نے پوچھے اچھی طرح یاد نہیں رہا 36 کا جواب دیا اور چار میں لا ادری (میں نہیں جانتا) کہا یا چار کا جواب دیا اور 36 میں عدم واقفیت ظاہر کی۔ آج کل ادنی طالب علم سے پوچھ کر دیکھئے جو ہرگز بھی یہ کہے کہ میں نہیں جانتا۔ مجھ کو باوجود اس کے کہ اتنے دن کام کرتے ہوگئے مگر اب تک ایسی ضرورت پڑتی ہے کہ یہ لکھتا ہوں کہ اس مسئلہ میں مجھ کو شرح صدر نہیں ہوا اور قواعد سے اگر جواب لکھتا ہوں تو اس میں یہ احتیاط کرتا ہوں کہ یہ لکھ دیتا ہوں کہ قواعد سے یہ جواب لکھا ہے۔ جزئیہ نہیں ملا اور کبھی جواب لکھ دیتا ہوں اور بعد میں لغزش ثابت ہوتی ہے۔ پس میں کہتا ہوں کہ جو لوگ لکھے پڑھے ہیں جب ان کو لغزشیں ہوتی ہیں تو جو ان پڑھ ہیں وہ تو بطریق اولی غلطیوں میں مبتلا ہوں گے۔ اور وہ شخص بھی ان پڑھ ہی ہے جو آمد نامہ دستور الصبیان بلکہ گلستان سکندر پڑھا ہو یا انٹرلس یا ایف اے پاس ہو۔ (الغاء المجازفۃ ج ۲۵)

ہر مسئلہ کی وجہ معلوم ہونا لازم نہیں

ایک شخص پوچھنے لگا کہ گاؤں میں جمعہ نہ ہونے کی کیا وجہ ہے اس زمانہ میں لوگوں کو مجتہدیت کا ہیضہ بھی ہوگیا ہے ہر بات کی وجہ سمجھنا چاہتے ہیں میں نے ان صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ نے ہر مسئلہ کی وجہ معلوم کرلی ہے تو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ مجھے اس کی وجہ بتلایئے کہ مغرب کی تین رکعتیں اور عشاء کی چار کیوں ہیں اور اگر ہر مسئلہ کی وجہ معلوم نہیں ہے تو اسی مسئلہ کی کیا تخصیص ہے۔ اس کو بھی اسی فہرست میں داخل کرلو۔ ایسے ہی یہ سوال ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تعلیم قرآن پر اجرت لینا جائز ہے اور ایصال ثواب کے لئے ناجائز بات یہ ہے کہ حکم شرعی اسی طرح ہے قانون یہی ہے۔

اگر جج کے یہاں مقدمہ ہو اور ایک شخص ہار جائے اور وہ ہارنے والا یہ کہے کہ اس دفعہ کی رو سے بیشک میں ہار گیا لیکن اس دفعہ کی وجہ کیا ہے جج فوراً کان پکڑ کر نکال دے گا کہ قانون سرکاری کی گستاخی کرتا ہے۔ اسی طرح عوام کو مسائل شرعیہ کی وجوہ دریافت کرنا شریعت کی بے ادبی ہے اور منشاء اس کا قلب میں احکام کی عظمت نہ ہونا ہے ہاں اگر طالب

علم ہو اور فن سیکھتا ہو اس کو وجہ اور دلائل کا سوال کرنا برا نہیں بلکہ اس کو ضروری ہے اس لئے کہ وہ دین کے اندر محقق بننا چاہتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ہم بھی محقق بننا چاہتے ہیں تو ہم ان سے کہیں گے کہ جناب نوکری چھوڑیئے زراعت تجارت دنیا کے سب کام چھوڑیئے اور ہمارے پاس کم از کم دس برس رہیئے دیکھئے آپ کو بھی ہم بتلائیں گے۔ (الغاء المجازفۃ ج ۲۵)

باطل اور حق کے پہچاننے کا سہل طریقہ

جس حدیث میں تہتر فرقوں کا بیان ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ اس میں سے ایک ناجی ہے اور باقی سب ناری۔ اس پر صحابہ نے عرض کیا **من هم یا رسول الله** یہ کونسا فرقہ ہے جو ناجی ہے یہ وہی سوال ہے جس پر گفتگو ہو رہی ہے حضورؐ سے زیادہ کون اچھا اور سہل جواب دے سکتا ہے۔ فرمایا **ما انا علیه و اصحابی** (تفسیر ابن کثیر ۴: ۲۳۰)

یعنی ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ اس مسلک پر ہونگے جو میرا اور میرے صحابہ کا ہے یعنی میرا اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا اتباع کریں گے یہ ایک ایسی پہچان ہے کہ اس سے بہت ہی سہولت سے اہل حق اور اہل باطل میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ دیکھ لیا جاوے کہ کس کے اقوال وافعال حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے اقوال وافعال سے ملے ہوئے ہیں۔ کھینچ تان کر کسی بات کا ثبوت حاصل کر لینا اور بات ہے۔ (الغاء المجازفۃ ج ۲۵)

فقہ پر اعتبار نہ کرنے کا انجام

فقہ پر اعتبار نہ کرنے کا انجام چند روز میں یہ ہوگا کہ قرآن وحدیث بھی حجت نہ رہے گا کیونکہ جب آزادی کی ٹھہری اور ہر شخص ایک رائے رکھتا ہے اور ایک رائے کو دوسری پر کوئی ترجیح نہیں بلکہ جو جس کا خیال ہو وہی دین ہے تو اگر کسی کی رائے یہی ہو کہ قرآن وحدیث کی بھی ضرورت نہیں تو پھر یہی دین ہوگا۔ (الغاء المجازفۃ ج ۲۵)

دعائے مغفرت مطلوب ہے

حضرت ابراہیم بن ادہم کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے دعا کی **اللهم اعصمنی که** اے اللہ مجھے گناہوں سے بچایئے) ارشاد ہوا کہ اگر سب یہی دعا کرنے لگیں تو رحمت ومغفرت

کا ظہور کہاں ہوگا۔ **اللھم اغفرلی** (اے اللہ میری مغفرت کر) کیوں نہیں کہتے وہ اس میں بتلا دیا گیا ہے کہ جس طرح حفاظت مطلوب ہے مغفرت بھی مطلوب ہے یہی مطلب ہے اس حدیث کا **لو لم تذنبوا لجاء اللہ بقوم یذنبون فیستغفرون اللہ فیغفرلھم**۔ ترجمہ (اگر تم گناہ نہ کرو تو حق تعالیٰ ایسی جماعت کو پیدا کریں گے جو گناہ کریں پھر استغفار کریں اور ان کی مغفرت کی جائے ۱۲) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گناہ ہم سے مقصود ہے اور حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ہم گناہ کیا کریں۔ بلکہ گناہ سے جو ضعف و عجز ظاہر ہوتا ہے وہ مقصود ہے پس اگر کہیں بدون صدور گناہ ہی کے یہ ضعف و عجز پیدا ہو جائے جیسے انبیاء علیہم السلام باوجود عصمت کے جس قدر اپنے کو گنہگار خطاوار سمجھتے ہیں ہم گنہگار ہو کر بھی اپنے کو اتنا گنہگار نہیں سمجھتے اور جس قدر وہ حق تعالیٰ سے خوف و خشیت رکھتے ہیں ہم مجرم ہو کر بھی اتنا تو کیا اس کا ہزارواں حصہ بھی خوف نہیں رکھتے۔ تو اگر ہم لوگ گناہوں میں بتلا نہ کئے جاتے تو نہ معلوم ہماری کیا حالت ہوتی جب ہم گنہگار ہو کر بھی اپنے کو کچھ زیادہ گنہگار نہیں سمجھتے تو معصوم ہو کر نہ معلوم ہم اپنے کو کیسا کچھ مقدس سمجھتے اور ہمارے عجب کی کیا حالت ہوتی۔ اس لئے کبھی کبھی ہم کو گناہ میں بتلا کر دیا جاتا ہے۔ جس سے ہمارا وہ عجب توڑ دیا جاتا ہے جو طاعات و اذکار سے کبھی پیدا ہونے لگتا ہے۔ اور وہ خیال تقدس پارہ پارہ ہو جاتا ہے جو کچھ دنوں تہجد اور مراقبات کی پابندی سے دل پر گزرنے لگتا ہے۔ تو جیسے ہم کو حفاظت حق کی ضرورت ہے اسی طرح مغفرت کی بھی ضرورت ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم بن ادہم کو تنبیہ کی گئی کہ محض عصمت کی دعا کیوں کرتے ہو۔ اس کے ساتھ دعائے مغفرت کیوں نہیں ملاتے۔ اس کے علاوہ **اللھم اعصمنی** (اے اللہ مجھے گناہوں سے بچایئے) کے ساتھ **اللھم اغفرلی** (اے رب مجھے بخش دیجئے) ملانے میں ایک اور بھی حکمت ہے۔ جس پر نظر کر کے اس کا ملانا بہت ہی ضروری ہو گیا وہ یہ کہ سب مسلمانوں کا عقیدہ ہے حق تعالیٰ مجیب الدعوات ہیں۔ (الاسعاد والابعاد ج ۲۶)

فضیلت شب برأت

شعبان کی بابت حدیث میں یہ خاص فضیلت مذکور ہے۔

اذا کانت لیلۃ النصف من شعبان فقوموا لیلھا وصوموا نھارھا فان اللہ تبارک و تعالیٰ ینزل فیھا لغروب الشمس الی السماء الدنیا

فیقول الامن مستغفرفاغفرله الامن مسترزق فارزقه الامن مبتلی فاعافیه الاکذاالاکذاحتی یطلع الفجر رواه ابن ماجه سنده ضعیف کمایدل علیه تصدیر المنذری ایاه بلفظ روی وهو علامته الضعف کما صرح به فی خطبته کتابه اه ترغیب ص ۱۷۹ لکنه تجمل فی فضائل الاعمال. جامع) (سنن ابن ماجة :۱۳۸۸)

یعنی حق تعالیٰ اس مہینے کی پندرھویں رات میں غروب ہی کے وقت سے آسمان اول کی طرف نزول فرماتے ہیں۔

جیسا نزول ان کی شایان شان ہے اس میں ہم کو کاوش کی ضرورت نہیں بلکہ اس کی ممانعت بھی ہے کیونکہ یہ متشابہات میں سے ہے پھر فرماتے ہیں کہ کوئی مغفرت کا طالب ہے؟ کہ میں اس کی مغفرت کر دوں کوئی روزی کا طالب ہے کہ میں اس کو روزی دوں کوئی بیمار (طالب شفا) ہے کہ میں اس کو عافیت دوں اسی طرح بہت سے امور کے متعلق فرماتے رہتے ہیں کہ کوئی ایسا ہے کوئی ایسا ہے یہاں تک کہ طلوع فجر تک یہی معاملہ رہتا ہے سبحان اللہ یہ اس رات کی کتنی بڑی فضیلت ہے گویا یوں کہنا چاہئے کہ اس رات حق تعالیٰ ہمارے گھر پر تشریف لاتے ہیں کیونکہ آسمان اول ہمارے گھر کی چھت ہے اور محبوب کا چھت پر آ جانا گھر ہی میں آ جانا ہے تو بس ہمارا حال اس شعر کے مصداق ہوتا ہے۔

امروز شاہ شاہاں مہماں شد است مارا جبریل باملائک درباں شد است مارا

(آج بادشاہوں کا بادشاہ ہمارا مہمان ہے جبرائیل وملائک ہمارے دربان ہیں)

اب اس کو خود سوچ لو کہ جب محبوب گھر میں مہمان ہو تو عاشق کا کیا حال ہوتا ہے جناب خوشی کے مارے رات بھر نیند نہیں آتی۔ یہی جی چاہا کرتا ہے کہ ساری رات محبوب سے باتیں کرتا رہوں خصوصا جس کا محبوب ایسا ہو جو اپنے عشاق کی باتیں سننے سے گھبراتا بھی نہ ہو نہ اس کو نیند آتی ہو نہ غنودگی ستاتی ہو ایسے محبوب کا عاشق تو ہرگز اس رات میں نہ سووے گا۔ جس میں محبوب اس کے گھر پر آیا ہو پس اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس رات میں قیام کا امر بھی نہ فرماتے جب بھی صرف اس خبر کا کہ حق تعالیٰ اس رات آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں مقتضا یہی تھا کہ ہم اس رات کو عبادت و ذکر میں گزاریں اور رات بھر بیدار رہیں چہ جائیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے۔ قوموالیلھا وصوموانھارہا (اس کی

رات میں شب بیداری کرو اور دن میں روزہ رکھو) مگر وہ شاہ شاہاں ایسا مہربان ہے کہ مہمان ہو کر بھی تمہیں سونے سے نہیں روکتا تم کو سونے کی اجازت مگر باوجود اس طرف سے اجازت ہونے کے پھر بھی یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ جیسے اور ویسے ہی اس روز کچھ تو کرنا چاہئے۔ رات بھر جاگنے کی ضرورت نہیں بلکہ اچھا بھی نہیں کیونکہ حدیث میں ہے۔

احب الاعمال الی الله ادومها (الصحیح لمسلم' المسافرین : ۲۱۸)

بہتر عمل خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جس پر دوام کیا جائے سو شعبان کی اس شب میں اتنا جاگنا چاہئے جس پر نباہ ہو سکے یہ نہیں کہ ایک مرتبہ تو ساری رات جاگ لئے اور دوسری مرتبہ کچھ بھی نہیں شاید کوئی صاحب اس حدیث کو سن کر یہ کہیں کہ یہ دوام تو بڑا اسر لگا سال میں ایک رات تو کچھ دیر جاگنا آسان تھا سال بھر کون جاگے ارے صاحب! آپ گھبرائیں نہیں میں سال بھر کی راتوں میں آپ کو نہیں جگاتا بلکہ آپ سال میں ایک ہی رات جاگ لیا کیجئے رہا یہ شبہ کہ اس صورت میں دوام کہاں ہوا تو میں کہتا ہوں یہ بھی ایک صورت دوام کی ہے کہ سال میں ایک رات ہمیشہ جاگ لیا کرے جیسے روٹی پر آپ کو دوام ہے مگر اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ ہر وقت کھایا کرے یا کپڑے بدلنے پر دوام ہے کہ ہفتہ میں ایک بار یا دو بار بدلا کرتے ہیں اس دوام کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہر وقت کپڑے بدلے جائیں پس اسی طرح سال بھر میں ایک رات جاگنے کا التزام کر لینا یہ بھی دوام ہے بشرطیکہ یہ ایک رات ناغہ نہ ہو تو اس رات میں اتنی مقدار بیداری کے لئے معین کرنی چاہئے کہ جس پر ہمیشہ کم از کم اس رات میں تو دوام ہو جایا کرے چاہے ایک ہی گھنٹہ ہو۔

حدیث میں آتا ہے اس رات سب کی مغفرت ہو جاتی ہے (جو بھی مغفرت طلب کرے ۱۲) سوائے مشرک اور مشاحن کے یعنی جن دو شخصوں میں دنیوی عداوت و کینہ ہو ان کی بھی مغفرت نہیں ہوتی بلکہ کہہ دیا جاتا ہے ان کو ابھی رہنے دو جب تک یہ صلح کر لیں قلت رواہ البیہقی من طریق العلاء بن الحارث عن عائشہؓ وقال ھذا مرسل جید یعنی ان العلاء لم یسمع من عائشۃ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم کذا فی الترغیب ص ۱۰ ج)

اللہ اللہ کینہ بھی کتنا گناہ ہے کہ اس کو شرک کے ساتھ جمع کیا گیا ہے کہ جس طرح مشرک کی مغفرت اس رات میں نہیں ہوتی اسی طرح کینہ ور کی بھی مغفرت نہیں ہوتی اب تو مسلمانوں میں کینہ بہت ہی بڑھ گیا ہے حالانکہ اس میں ہر مسلمان کا وہ مشرب ہونا چاہئے تھا جو صوفیہ کا ہے وہ یوں کہتے ہیں۔

کفر ست در طریقت ما کینہ داشتن   آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن

(ترجمہ: ہمارے طریق میں کینہ رکھنا کفر ہے ہمارا آئین ہے سینہ کو مثل آئینہ صاف رکھنا)

(کینہ کو کفر کہنا کا مطلب یہ ہے کہ وہ قریب بکفر ہے اور اس کی دلیل حدیث مذکور میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشاحین کو مشرک کے ساتھ جمع فرمایا ۱۲) مگر اب تو صوفیوں میں بھی یہ بات نہیں رہی ان میں کینہ وبغض کی کثرت ہونے لگی حالانکہ مسلمانوں کو تو یہ دعا تعلیم کی گئی ہے وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اے اللہ ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ پیدا نہ کیجئے ۱۲) تو اس مرض سے بچنا چاہئے مگر آج کل مسلمان اپنے بھائیوں ہی سے کینہ بہت رکھتے ہیں غیروں سے تو اتحاد کی کوشش کی جاتی ہے ان کو غیر قوموں سے اتنا کینہ نہیں ہوتا جتنا اپنے بھائیوں سے ہوتا ہے افسوس! پس اس رات سے پہلے ہر شخص کو اپنے دل میں سے مسلمانوں کی طرف سے کینہ نکال دینا چاہئے ورنہ اس کی مغفرت نہ ہوگی اس دن کے ختم ہونے کے بعد (اس دن چودھویں تاریخ تھی) جو رات اب آ رہی ہے وہی لیلۃ النصف من شعبان ہے۔ جس کا نام شب برات ہے۔ (الاسعاد والابعاد ج ۲۶)

حکایت حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری رحمہ اللہ

جناب مولوی احمد علی صاحب محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ بازار میں جوتا خریدنے کے لئے تشریف لے گئے ایک دکان دار نے کہا کہ میں آپ سے نفع نہیں لوں گا۔ ساتھیوں سے فرمایا کہ چلو بھائی آگے اس کے یہاں سے ہم نہ لیں گے اس لئے کہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو یہ سچ بولتا ہے یا جھوٹ۔ اگر سچ بولتا ہے تو ہم اپنے بھائی کے لئے یہ نہیں چاہتے کہ وہ بازار میں چار پیسہ کے لئے بیٹھے اور اس کو وہ بھی نہ ملیں۔۔ اور اگر جھوٹا ہے تو یہ ہم کو الو بنا کر لینا چاہتا ہے۔ کہ آج کل اس کے برعکس معاملہ ہے کہ اگر دوست سے کوئی شے خریدیں گے تو کہیں گے کہ بندہ خدا ہم سے بھی نفع لیتے ہو۔ آج کل بس اس پر عمل ہے خانہ دوستاں بروب کہتے ہیں کہ دوستوں کی قسمیں مختلف ہوتی ہیں جانی۔ ونانی۔ نانی وہ ہیں کہ بس نان پیارا ہے۔ ہزاروں روپیہ کا تاجروں کا مال اسی دوستی کی بدولت دبا پڑا ہے لے کر دینا جانتے ہیں نہیں اسی لئے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ دوست کو کبھی قرض نہ دے۔ اور نہ قرض اس سے لے۔ چنانچہ کسی نے کہا ہے۔

مدہ شان قرض مستاں نیم حبہ
فان القرض مقراض المحبہ

یعنی نہ ان کو قرض دے نہ لے۔ کیونکہ قرض محبت کے لئے مقراض ہو جاتی ہے۔ اور قرض سے محبت منقطع ہو جاتی ہے۔ (اشرف المواعظ ج ۲۶)

خود کو مقدس سمجھنے کی عجیب مثال

ہماری مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی شخص باہر پردیس میں تھے۔ ان کے گھر سے ایک نائی آیا اور اس نے یہ خبر دی کہ آپ کی بیوی بیوہ ہوگئی۔ سنتے ہی رونے پیٹنے لگے۔ یاروں دوستوں نے سمجھا کہ ان کے گھر کوئی موت ہوگئی۔ یہ سمجھ کر تعزیت کے لئے جمع ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ کیا ہوا فرمائیے تو سہی۔ کہنے لگے کہ گھر سے خبر آئی ہے کہ ہماری بیوی بیوہ ہو گئی۔ لوگوں نے کہا کہ آپ بھی بڑے بیوقوف ہیں آپ تو خود زندہ بیٹھے ہیں پھر بیوی کے بیوہ ہونے کے کیا معنی؟ کہنے لگے کہ یہ تو صحیح ہے لیکن نائی معتبر ہے۔

گو کہ میں جانتا ہوں اے بھائی
ایک آیا ہے معتبر نائی

پس صاحبو یہی حالت ہماری بھی ہے کہ باوجود اس کے کہ اپنی حالت سے خوب واقف ہیں کہ ہمارے اندر یہ خرابیاں ہیں لیکن چار آدمیوں کے کہنے سے دھوکے میں آ گئے۔ پھر جب تقدس مشہور ہو جاتا ہے تو بعض اوقات اپنے افعال کو تقدس کے خلاف سمجھ کر بھی لوگوں کے سامنے بننے لگتے ہیں۔ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ اسی کو کہتے ہیں۔

واعظاں کیں جلوہ برمحراب ومنبر میکنند
چوں بخلوت میروند آن کار دیگر میکنند

(واعظ جو کہ محراب و منبر پر جلوہ افروز ہوتے ہیں جب تنہائی میں جاتے ہیں تو دوسرے کام کرتے ہیں)

بعض واعظوں نے اس کے معنی یہ گھڑے ہیں کہ ظاہر میں خشک واعظ ہیں مگر جب خلوت میں جاتے ہیں تو ذکر و شغل کرتے ہیں ایک تو شرارت کریں پھر اس کے ساتھ نصیحت میں تاویلیں کریں۔ اچھا پھر اس آئندہ شعر کے کیا معنی ہوں گے۔

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس بازپرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

(مجھے یہ مشکل درپیش ہے کہ مجلس کے خردمند شخص سے پوچھوں کہ دوسروں کو توبہ کی نصیحت کرنے والے خود کیوں توبہ نہیں کرتے) (اشرف المواعظ ج ۲۶)

بھولنے کی دو علتیں

شیطان کو نماز کے ناگوار ہونے پر مجھ کو ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شخص امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آیا کہ میں نے اپنے گھر میں کچھ مال دفن کیا تھا اور اب یاد نہیں رہا کہ کہاں دفن کیا تھا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ نماز پڑھنا شروع کر دو اور جب تک یاد نہ آوے پڑھتے رہو۔ چنانچہ اس نے نماز شروع کی پس فوراً ہی یاد آ گیا۔ اگر کوئی کہے کہ یہ تو خوب نسخہ ہاتھ آیا۔ بہت سی چیزیں ہم کو یاد نہیں رہتیں اب اس تدبیر سے یاد ہو جا کریں گے۔ تو خوب یاد رکھو کہ بھولنے کی دو علتیں ہیں ایک تو یہ ہے کہ وہ شے متخیلہ کے اندر ہے۔ لیکن شیطان نے محزون کرنے کے لئے دماغ میں تصرف کر کے اس کو بھلا دیا **کقولہ تعالیٰ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ** (اور مجھ کو شیطان ہی نے بھلا دیا کہ میں اس کا ذکر کرتا) سو ایسی بھولی ہوئی شے بعلت مذکورہ نماز سے یاد آ سکتی ہے۔ دوسری علت یہ ہے کہ متخیلہ ہی میں کچھ فتور ہے سو اس کے لئے یہ تدبیر موثر ہوگی۔ سو اس کا پہچاننا صاحب بصیرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ کا کام ہے۔ اس لئے نماز کو نسیان کا عام علاج سمجھنے کا شبہ جاتا رہا۔ (اشرف المواعظ ج۲۶)

مباحات کے انہماک کے مضر ہونے کا احادیث سے ثبوت

حدیث میں ہے **لا تکثروا الکلام بغیر ذکر اللہ فان کثرۃ الکلام بغیر ذکر اللہ قسوۃ وان ابعد الشیء عند اللہ القلب القاسی** (سنن الترمذی:۲۴۱۱)

یعنی اللہ کی یاد کے سوا کلام کی کثرت نہ کر اس لئے کہ کثرت کلام بدون ذکر اللہ کے قساوت ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ دور قلب قاسی ہے۔ اور ارشاد ہے

لاتکثروا الضحک فان کثرت الضحک تمیت القلب

(سنن الترمذی : ۲۳۰۵)

یعنی ہنسی زیادہ مت کرو کیونکہ کثرت ہنسی کی دل کو مردہ کر دیتی ہے۔ حضرت شیخ عطار فرماتے ہیں۔

دل ز پر گفتن میرد در بدن　　گرچہ گفتارش بود در عدن
گر خبر داری زحی لایموت　　بر زبان خود بنہ مہر سکوت

(دل زیادہ بولنے سے بدن کے اندر مر جاتا ہے اگرچہ اس کی گفتار عدن کے موتی کے ہی برابر کیوں نہ ہو۔ اگر تجھ کو اللہ تعالیٰ کی خبر بھی ہے تو اپنی زبان پر مہر سکوت لگا لے)

یہ بزرگوں کے ارشادات بھی حدیثوں ہی کے ترجمے ہیں۔ اور ایک حدیث اس مسئلہ پر سب سے زیادہ دال ہے گو اس میں ذرا فکر کی ضرورت ہے اور اس میں بہت بڑی مضرت کی تصریح ہے اور نیز طلبہ کے کام کی بات ہے وہ یہ ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ عید کا دن تھا حضور دولت خانہ میں تشریف رکھتے تھے دو لڑکیاں دف لئے بجا رہی تھیں اور گا رہی تھیں اور ایک روایت میں ایک قصہ جشن کا آیا ہے کہ لڑکے جمع تھے اور وہ اچھل کود رہے تھے۔ میرٹھ میں ایک شخص نے ایک روایت سے دعویٰ کیا کہ (نعوذ باللہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گانا بجانا سنا اور ناچ دیکھا بات یہ ہے کہ برے آدمی کی نظر بھی بری ہی طرف جاتی ہے چونکہ اپنے دماغ میں خباثت ہے اس قصہ میں بھی اسی طرح ذہن گیا۔ ایک بددین نے جنت کی حوروں کے اعتقاد کے متعلق طعن کیا ہے کہ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ جنت میں عورتیں ہیں وہ چاندی کے کنگن پہنیں گی جیسے ہمارے یہاں کی گھوسنیں۔ مولوی محمد علی صاحب بچھرایونی نے خوب جواب دیا ہے کہ چونکہ خود گندہ تھا خیال میں بھی گندی ہی عورتیں آئیں۔ الخبیثات للخبیثین والخبیثون للخبیثات (خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے ہیں) اسی طرح ان میرٹھی صاحب نے بات کہی چونکہ طبیعت میں ناپاکی ہے اس لئے کسبیوں ہی کی طرف ذہن گیا اگر شرافت اور سادگی اور پاکی طبع میں ہوتی تو اس طرف ذہن نہ جاتا۔ جناب من یہ لڑکیاں جوان نہ تھیں یہ نابالغ چھوٹی چھوکریاں تھیں جو اکثر گھروں میں ادھم مچایا کرتی ہیں اور ان کا گانا بھی ایسا ہی تھا جیسے گھروں میں بسا اوقات ان کو شور مچاتے دیکھا ہوگا گانا ان کو کیا ہوتا ہے یہ گانا ہے ''میری مہندی کے چوڑے چوڑے پات ری بوواری واری جا'' نہ ان کے گانے میں کچھ لطف ہوتا ہے اور نہ ان کے دف میں کوئی فتنہ۔ اسی طرح وہ جشن یونہی سڑی بسی پاگلوں کی طرح کود رہی تھی جس سے بجائے لطف کے اور تکدر ہوتا تھا محض لڑکوں کا ایک کھیل تھا جیسے ایک ڈوم حج کرنے گیا تھا بدوؤں کا گانا سنا سن کر کہنے لگا قربان جاؤں اپنے حضرت جی کے ایسوں ہی کا راگ سنا ہے جو حرام کر دیا میرا راگ سنتے تو ثواب کا وعدہ فرما لیتے۔ بہرحال انہیں بدوؤں کی طرح سے دو چھوکریاں تھیں اور وہ کچھ گا بجا رہی تھیں۔ اور حضور چادرہ اوڑھے لیٹے ہوئے تھے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تشریف

لائے اور وہ برابر اسی طرح گاتی رہیں اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو وہ بھاگ گئیں حضور نے فرمایا کہ دیکھو میں لیٹا تھا یہ لڑکیاں گاتی رہیں۔

اس کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے پھر بھی گاتی رہیں پھر اے عمر رضی اللہ عنہ تم آئے تمہارے آتے ہی بھاگ گئیں تم سے شیطان بھاگتا ہے۔ اس حدیث میں طلبہ کو سخت اشکال ہوتا ہے کہ وہ فعل جائز تھا یا ناجائز اگر ناجائز تھا تو حضور نے کیسے گوارا فرمایا اور اگر ناجائز نہیں تھا بلکہ جائز تھا تو شیطان کی طرف اس کو کیوں نسبت فرمایا۔ میری اس تقریر سے یہ اشکال حل ہو گیا بات یہ ہے کہ تھا تو یہ فعل مباح لیکن بوسائط اس کی کثرت مضرت ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تشریف لانے تک تو کثرت نہ تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے وقت آئے کہ اس وقت کثرت ہو گئی شیطان کا دخل آ گیا اور اس کا وقت آ پہنچا کہ اس فعل سے شیطان اپنا کچھ کام نکالے حتیٰ کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی نہ آتے تو خود حضور بھی اس وقت اس کو روک دیتے مگر پھر بھی یوں نہ کہیں گے کہ اس حالت میں یہ فعل مباح نہیں رہا تھا لیکن یہ مباح ایسا ہے کہ احیاناً واسطہ ہو جاتا ہے کسی امر ناجائز کا اب کوئی اشکال نہیں ہے اور یہاں سے اس حدیث کے معنی بھی سمجھ میں آ گئے ہوں گے کہ ابغض المباحات طلاق ہے کیونکہ بنا بر تقریر مذکور ممکن ہے کہ بعض چیزیں حلال اور مباح ہوں اور مضر ہوں مثلاً کسی نے طلاق دی تو دیکھو طلاق مباح ہے لیکن ممکن ہے کہ وہ سبب ہو جائے۔ دو خاندانوں کی باہمی کدورت کا چنانچہ ایسا ہوتا بھی ہے اور نیز ممکن ہے کہ مرد کو بیوی کے ملنے میں دیر ہو اور وہ مبتلا ہو جائے حرام میں اسی طرح ممکن ہے کہ اس عورت کے اندر آوارگی آ جائے اس لئے طلاق مباح بھی اور ابغض بھی ہے۔ بہر حال میرا مقصود یہ ہے کہ جو لوگ مباحات میں کثرت رکھتے ہیں ان کو چاہئے کہ ذرا اپنے نفس کو روکیں گو وہ امر مباح ہی ہو کیونکہ مباح ہونے سے یہ تو ضروری نہیں کہ اس میں حد سے بڑھ جائے دیکھو کھانا فی نفسہ مباح ہے لیکن دو لقمہ اگر زیادہ کھائے جاویں گے تو تخمہ ہو جائے گا۔ وہی نفیس غذا سبب ہو جاتی ہے تکلیف اور مرض کا اور اس واسطے چونکہ مباح کی کثرت باوجود مباح ہونے کے مورث قساوت اور منافی خشوع ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مجلس سے اٹھتے تھے تو پڑھتے تھے۔

سبحانک اللھم وبحمدک اشھد ان لا الہ الا
انت استغفرک واتوب الیک (سنن الترمذی: ۳۴۳۳)

(اے اللہ تو ہر عیب سے پاک ہے اور تیری ثناء کے ساتھ میں اس کی گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں تجھ سے استغفار کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں) اس لئے کہ شاید مجلس میں کوئی امر ایسا ہو گیا ہو جو بوسائط بعیدہ سبب ہو جاوے کسی محذور کا تو اس کا یہ کفارہ ہو جاوے گا۔ جب حضور باوجود اس پاکی اور عصمت کے اس قدر احتیاط فرماتے ہیں تو ہم کو تو بطریق اولی اس کا اہتمام ضروری ہے۔ اور یہاں سے ایک حدیث کی بھی شرح ہوتی ہے جس کے اندر شراح حدیث کو حیرانی ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے

انه ليغان على قلبى (الصحيح المسلم الكتاب الذكر : ۴۱)

وانی لاستغفر اللہ فی الیوم مائة مرة (مسند احمد ۲ : ۳۹۷)

(میرے دل پر حیرانی ہوئی اور میں دن میں سو مرتبہ اللہ سے استغفار کرتا ہوں) اس میں حیرانی ہوئی ہے کہ یہ غین جس کے معنی ابر اور گرد و غبار کے ہیں کیا تھا خدانخواستہ معصیت کا تو تھا نہیں تو ممکن ہے کہ وہ ایسے مباح کا اشتغال ہو کہ جو فی نفسہ معصیت نہیں لیکن کثرت اس کی گو وہ مباح ہو بلکہ ہمارے اعتبار سے عبادت سے بھی بڑھ کر ہو مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کے اعتبار سے خشوع کے کسی درجہ کے منافی ہو کیونکہ بعضی بات مباح ہوتی ہے مگر چونکہ حد سے ذرا بڑھی ہوئی ہوتی ہے اس لئے اس کا اثر بھی صحیح الادراک کو محسوس ہوتا ہے جس طرح جو لطیف المزاج اور ذکی الحس ہوتا ہے اس کو دور کی آواز محسوس ہوتی ہے مشہور ہے کہ بوعلی سینا اس قدر ذکی الحس تھا کہ بارہ بارہ میل کی آواز سنتا تھا یہ حکم تھا کہ بارہ بارہ میل چاروں چکی نہ چلے اس لئے کہ چکی کی آواز سے شیخ کو نیند نہ آتی تھی۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کی لطافت و نفاست مزاج کے قصے بہت مشہور ہیں۔ سنا ہے کہ ایک شخص نے انگور ہدیہ بھیجے اپنے نزدیک اس نے نہایت نفیس چھانٹ کر بھیجے تھے حضرت نے ایک دانہ چکھ کر چھوڑ دیا۔ ایک روز وہ مہدی صاحب آئے اور عرض کیا کہ حضرت میں نے انگور بھیجے تھے پہنچے بھی۔ حضرت نے فرمایا پہنچ گئے۔ اب یہ رئیس صاحب منتظر تھے کہ کچھ داد ملے گی حضرت فرما کر خاموش ہو گئے اس نے اپنے دل میں کہا کہ حضرت نے معلوم ہوتا ہے کچھ التفات نہیں فرمایا پھر پوچھا حضرت آپ نے کھائے بھی کیسے تھے۔ فرمایا کہ میاں کیا بتلاؤں ان میں مردوں کی بو آتی تھی وہ شخص حیران ہوا کہ انگوروں کو مردوں

سے کیا تعلق کچھ سمجھ میں نہ آیا بہت تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ ان انگوروں کے درخت مدت دراز ہوئی کہ مرگھٹ میں لگائے گئے تھے پس ادراک باطنی میں چونکہ حضور سے زیادہ کوئی لطیف المزاج نہیں آپ نے اس مضرت کو محسوس فرما کر غین سے تعبیر فرمایا اور اس سے استغفار کیا۔ اس کی ایک دلیل اور لیجئے ایک شخص تھے ابوجہم انہوں نے ایک منقش چادرہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے بھیجی تھی حضور نے اس کو اوڑھ کر نماز پڑھی اور نماز کے بعد یہ فرمایا کہ یہ چادر واپس کر دو اور اس کے پاس سے یہ سادہ چادر لے آئے۔ دیکھئے محتمل افضاء الی الالہاء سے آپ نے کس درجہ احتیاط فرمائی پھر فرمایا کہ فانھا کادت ان تلھینی انفا یعنی قریب تھا کہ وہ ابھی میرا دل بٹا دیتی۔ اور جب حضور قرب وقوع یعنی احتمال افضاء کا پہلے سے انسداد و انتظام فرما دیں تو ہم کو تو بہت زیادہ ضرورت ہے کہ بہت ہی پہلے سے اس کا انتظام کریں اس لئے کہ آپ تو عین وقت پر بھی نفس کو روک سکتے تھے آپ کا نفس تو بالکل قابو میں تھا اور ہمارا نفس تو منہ زور گھوڑے کی طرح ہے کہ جب نکل جاتا ہے پھر قابو میں نہیں رہتا پھر جو کچھ بھی اس سے صادر ہو بعید نہیں اس لئے ہم کو بہت انتظام کی ضرورت ہے ورنہ وقت پر بچنا ایسا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس دشواری کو دیکھ کر بعض متحدوں نے شریعت پر الزام لگا کر یہ شعر بک دیا ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ   بازمیگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(تو نے دریا کی گہرائی میں مجھے تختہ بند کر دیا ہے اور پھر مجھ سے تو یہ کہہ رہا ہے کہ ہوشیار رہنا دامن نہ بھیگے) (اشرف المواعظ ج ۲۶)

دین سیکھنے کا سہل طریقہ

ایک مسئلہ روز پوچھ لیا جاوے ایک مہینے میں تیس مسئلے ہو جاویں گے اور سال بھر میں تین سو ساٹھ مسئلے ہوں گے۔ اگر دس برس اسی طرح گزار دیئے تو اس قدر مسائل یاد ہو جائیں گے کہ کسی معمولی مولوی کو بھی اس قدر مسائل یاد نہیں ہوں گے اور کچھ محنت بھی نہ اٹھانی پڑے گی اور اگر اس وقت کوئی بتلانے والا موجود نہ ہوا تو اس کو ایک بیاض میں لکھ لیا جب کوئی بتلانے والا ملا اس سے سب مسائل کے جوابات پوچھ کر لکھ لئے۔ اور عورتوں کے لئے یہ مناسب ہے کہ گھر کے مردوں کی معرفت دریافت کرا لئے۔ غرض جس بات کا آدمی کو فکر ہوتا ہے اس کے سینکڑوں طریقے خود ہی سوچ کر نکال لیتا ہے۔ عورتوں کو گہنے زیور کا فکر ہے پھر دیکھ لیجئے اس کے لئے

کیسے کیسے فکر اور اہتمام کرتی ہیں دور دور سے چوڑیاں اور چھڑے اور کڑے، بنوا بنوا کر منگاتی ہیں اگر ایک چوڑی ٹوٹ جاتی ہے تو اس کا تو ان کو غم ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اگر دین کا ایک مسئلہ بھی ان کو یاد نہ ہو تو اس کا غم نہیں گویا دین بزبان حال شکایت کرتا ہے۔

نماند ستمگار بد روزگار　　　بماند برو لعنت پائدار

(بدذات ظالم زمانہ میں ہمیشہ نہیں رہتا مگر اس پر لعنت قائم رہتی ہے) (السوال ج ۲۶)

فساد کا انجام

حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فساد ذات البین مونڈ نے والی چیز ہے میری مراد یہ نہیں کہ بالوں کو مونڈ دیتی ہے بلکہ دین کو مونڈ دیتی ہے کہ ایک کیل تک بھی نہیں چھوڑتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو آپس کی باتیں ہیں ان کو شریعت سے کیا تعلق۔ میں کہتا ہوں کہ شریعت کو تعلق کا ہے سے نہیں کیا خدا کی خدائی سے باہر یہ کام ہوتے ہیں ایک حاکم دنیا کے قانون کو بھی رعایا کے افعال میں دخل ہوتا ہے پھر خدائی قانون کو آپ کے افعال میں کیسے دخل نہیں خدا تعالیٰ کو ہمارے جملہ افعال میں دخل تام ہے اور ان کے لئے قانون مقرر کر دیا ہے جس میں کسی کو مجال دم زدنی نہیں ہے۔ اور وہ قانون ایسا ہے کہ ہمارے نفع کا بھی ہے۔ دیکھئے عداوت سے اگر منع کیا گیا ہے تو کیا ظلم ہے حیوان سے انسان بنایا گیا تو کیا برا ہو گیا۔ ہمارے ہی بھلے کے واسطے یہ باتیں بتائی گئی ہیں جس کی یہ قدر کی کہ بیباکی کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ شریعت کو ہمارے افعال میں کیا دخل ہے (ذم المکروہات ج ۲۶)

جھوٹ کی مذمت

حدیث میں فرمایا گیا ہے: **کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ماسمع**

(الصحیح المسلم، المقدمه باب : ۳ رقم: ۵)

یعنی آدمی کے لئے جھوٹ بولنے کے لئے یہی بہت ہے کہ جو کچھ سنے اسے فوراً نقل کر دے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جھوٹ فرمایا ہے حالانکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سنی سنائی باتوں میں بعضی باتیں سچی بھی ہوتی ہیں سب کو جھوٹ فرمانے کی کیا وجہ تو سنو وجہ یہ ہے کہ جو شخص اس کا عادی ہو گا وہ ضرور بالضرور جھوٹ میں مبتلا ہو گا تو حدیث کے یہ معنی ہوئے کہ ہر

مسموع کو روایت کر دینا اور اس کا عادی ہونا جھوٹا بننے کے لئے کافی ہے دو شخص حضرت سلطان الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بغرض بیعت حاضر ہوئے نماز کے وقت دونوں حوض پر وضو کرنے بیٹھے۔ ایک بولا ہماری مسجد کا حوض اس حوض سے بہت بڑا ہے حضرت سلطان الاولیاء نے سن پایا پوچھا کہ کتنا بڑا ہے کہا حضرت یہ تو ٹھیک طور پر نہیں بتلا سکتے مگر اس سے بہت بڑا ہے فرمایا جاؤ اس کو ماپ کر آؤ کہ کتنا بڑا ہے جب انہوں نے ناپا تو صرف ایک بالشت کا فرق نکلا آ کر خوش خوش حضرت سلطان جی سے عرض کیا کہ حضرت ایک بالشت بڑا ہے فرمایا ایک بالشت کو بہت بڑا نہیں کہہ سکتے تم بہت بے احتیاط آدمی ہو کہ بدون تحقیق کے تم نے اسے بہت بڑا کہہ دیا میں تم کو بیعت نہیں کرتا اور اول اپنی زبان کی اصلاح کرو اس کے بعد بیعت کا نام لو اور دیکھئے ظاہر میں کتنی ذرا سی بات ہے حتیٰ کہ اس قصہ کو سن کر آج کل کے لوگ تو تعجب کریں گے کہ اس میں کیا ایسا قصور ہو گیا جو بیعت سے انکار کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ قصور کیا چاہئے کہ یہ بات حدیث کے خلاف ہے اور حدیث میں ایسی بات کو جھوٹ فرمایا گیا ہے اور جھوٹ کچھ کم قصور ہے مگر افسوس ہے کہ ہم تو صریح جھوٹ کو بھی عیب نہیں سمجھتے اس کو تو کیا عیب سمجھیں گے۔ (ذم المکروہات ج ۲۶)

مصنف کی قلبی ظلمت کا تصنیف پر اثر

کسی کا کلام یا کتاب سننے یا دیکھنے سے اس کے مصنف کا خفی اثر قلب پر پڑتا ہے گو وہ کتاب ظاہراً کیسی ہی ہو حتیٰ کہ ایک بزرگ کسی کے مکان پر گئے تھے پوچھا کہ یہاں بڑی ظلمت محسوس ہوتی ہے کیا بات ہے۔ صاحب خانہ نے کہا کہ یہاں ظلمت کی کوئی وجہ نہیں۔ یہاں قرآن شریف کی تفسیر رکھی ہے۔ پوچھا کونسی تفسیر ہے کہا کہ تفسیر کشاف ہے کہا کہ یہ اسی تفسیر کی ظلمت ہے کیونکہ یہ ایک معتزلی کی تصنیف ہے۔ دیکھئے مصنف کی قلبی ظلمات اس کتاب میں موجود تھیں۔ اسی طرح مصنف کے قلبی انوار بھی اس کی تصنیف میں موجود ہوتے ہیں۔ پرانے عام لوگوں کے قلوب میں اتنی ظلمات نہ تھیں جتنی آج کل کے قلوب میں ہیں اس واسطے ان کی نامناسب تصنیف میں بھی اتنی برائی نہیں جتنی آج کل کی تصانیف میں ہیں بلکہ ایسے لوگوں کی تصانیف جو اہل دل تھے مطلق ظلمت نہیں رکھتیں گو ان میں کیسا ہی

نامناسب مضمون ہو دیکھئے یوسف زلیخا جامی کی کیسی کتاب ہے بعض جگہ اس میں ظاہراً حسن وعشق کے مضامین ہیں خصوصاً زلیخا کا سراپا لکھنے میں تو ذرا بھی کوتاہی نہیں کی گئی مگر آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ اس کو پڑھ کر کسی پر برا اثر پڑا ہو۔ یوسف زلیخا پرانے مکتبوں میں داخل درس تھی اور اب تک بھی ہے مگر اس کے پڑھنے والوں میں سے کسی پر بھی بے حیائی کا اثر نہیں پڑا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ تصنیف ایک اہل دل کی ہے جن کا قلب نہایت سلیم تھا ان کی سلامت قلب ان کے کلام کے اندر موجود ہے خوب یاد رکھئے کہ جب کوئی کتاب دیکھنا ہو تو اول اس کے مصنف کے حالات معلوم کر لیجئے جس مذاق کا وہ ہوگا وہ مذاق اس کتاب سے دیکھنے والے میں ضرور متعدی ہوگا یہ بڑے کام کی بات ہے۔ (ذم المکروہات ج ۲۶)

اپنی اولاد کو غیر مستند کتب کے مطالعہ سے روکئے

میرا اعتراض صرف ناولوں پر ہی نہیں ہے جو کتابیں بھی اس قسم کی ہوں سب کو الگ کر دینا چاہئے جیسے گل بکاولی بدر منیر، قصہ حاتم طائی وغیرہ وغیرہ یہ سب جلا دینے کے قابل ہیں۔ تعجب ہے کہ اچھے اچھے عقلمند ان کتابوں سے اپنی اولاد کو نہیں روکتے بلکہ خود بھی دیکھتے ہیں اور بار بار پڑھتے ہیں۔ بوڑھے بوڑھے آدمی اس خبط میں مبتلا ہیں۔ اسی طرح جو کتابیں بے اصل ہیں گو دین کی صورت میں ہوں ان کو مت پڑھو ان کے پڑھنے سے سوائے وقت ضائع کرنے کے اور کیا حاصل ہے اسی جنس سے معراج نامہ ہے۔ عورتیں معراج نامہ بہت پڑھتی ہیں اور معراج نامہ بکتے بھی بہت ہیں۔ علیٰ ہذا آج کل مولد شریف کے رسالے بہت تصنیف ہو رہے ہیں۔ ظاہراً یہ کتابیں خیر ہی خیر ہیں اسی وجہ سے لوگ ان پر بہت گرویدہ ہیں اور منع کرنا بھی ظاہراً سوءِ ادب معلوم ہوتا ہے اور ظاہرین اور ناواقف اور جاہل لوگ منع کرنے والوں کے مخالف بھی ہو جاتے ہیں اور ان کو بے ادب اور گستاخ سمجھتے ہیں حالانکہ درحقیقت وہ مانعین گستاخ نہیں۔ ان کے اس ممانعت کا سبب گستاخی اور بے ادبی نہیں بلکہ اس کا اصلی سبب شان تحقیق اور ادب ہے وہ اس کو پسند نہیں کرتے کہ غیر واقعی مضامین اللہ اور رسول کی طرف سے منسوب کئے جائیں۔ کیونکہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی اس کو منع فرمایا ہے۔ (ذم المکروہات ج ۲۶)

اہل باطل کی کتب کا مطالعہ مضر ہے

دنیا میں وہ کون شخص ہے جو اپنی تمام ضروریات کو خود اپنے ہاتھ سے انجام دے سکتا ہو کہ کھیتی بھی خود ہی کر لے آٹا بھی خود ہی پیس لے روٹی بھی خود ہی پکا لے کھانے پکانے کے آلات ہانڈی، برتن، چمٹا توا وغیرہ بھی خود بنا لے جوتا بھی خود ہی سی لے۔ کوئی ایک ہی شخص ایسا بتا دیجئے۔ انسان کے مدنی الطبع ہونے کے یہی تو معنی ہیں کہ یہ اپنے کاموں میں محتاج ہے۔ اور آج کل تو تقسیم عمل کا مسئلہ بہت ہی مسلم اور زبان زد ہے پھر دین ہی نے کیا قصور کیا کہ اس میں ہر شخص دخل دینے لگے اور دوسرے افراد کی احتیاج نہ سمجھے مجھے سخت تعجب ہے ان لوگوں سے جو تمدن کے مدعی ہیں اور رفارمر کہلاتے ہیں اور وہ دین کے لئے اپنی رائے کو کافی سمجھتے ہیں اور اس جماعت کی ضرورت نہیں سمجھتے جو اس کام کی متکفل ہے اسی طوفان بے تمیزی کو دیکھ کر میں نے خطاب عام کیا ہے کہ کوئی شخص اپنی رائے کو کافی نہ سمجھے اور اپنی رائے سے کسی کتاب کو نہ دیکھے بلکہ اس جماعت سے رائے لے لے جو اس کام کے لئے مخصوص ہے یعنی علماء سے عقل کی بات یہی ہے اور یہ ضروری بات ہے اس کو سرسری نہ سمجھا جاوے۔ (ذم المکروہات ج ۲۶)

بلاغت حدیث

صاحبو! کثرت کلام ایسی چیز ہے اس واسطے اس سے حدیث میں

ان اللہ کرہ لکم قیل وقال (مسند احمد ۴: ۲۴۹)

(یقیناً اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا تمہارے لئے کثرت کلام کو) کہہ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ ظاہراً تو اس میں کثرت کلام سے روکا ہے لیکن جب ثابت ہو گیا کہ کثرت کلام اس قدر مفاسد کو ضمن میں لئے ہوئے ہے تو اس سے روکنا ان سب سے روکنا ہوگا۔ یہ حدیث کی بلاغت ہے کہ ذرا سے لفظ سے کس قدر اصلاحیں کی ہیں۔ یہ بیان ہوا حدیث کے ایک جملہ کا اس کے بعد حدیث میں یہ لفظ ہے **وکثرۃ السوال** (اور کثرت سوال کو) اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ سوال کے معنی دو ہیں ایک تو سب جانتے ہیں جس کا ترجمہ مانگنا اور ایک معنی اور ہیں جس کا ترجمہ ہماری زبان میں ہے پوچھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی کثرت سے منع فرمایا ہے یعنی نہ کثرت سے مانگو اور نہ کثرت سے پوچھو۔ لفظ کثرت سے معلوم ہوا کہ قلت کے ساتھ دونوں جائز ہے مگر یہ سمجھ لیجئے کہ تھوڑے

سے مراد یہ نہیں کہ پیسہ دو پیسہ مانگ لینا جائز ہے۔ اور زیادہ نہ مانگے یا ایک آدھ مسئلہ پوچھ لینے میں کچھ حرج نہیں زیادہ نہ پوچھے بلکہ دونوں صورتوں میں قلیل کا معیار یہ ہے کہ محتاج الیہ کا سوال جائز ہے یعنی ضرورت کے وقت سوال جائز ہے اور بلاضرورت جائز نہیں خواہ سوال کے معنی مانگنے کے لئے جاویں یا پوچھنے کے بہر تقدیر معنی یہ ہوئے کہ ضرورت کے وقت مانگنا بھی جائز ہے اور پوچھنا بھی اور بلاضرورت مانگنا بھی جائز نہیں اور پوچھنا بھی جائز نہیں پھر ضرورت کے وقت جو سوال کیا جاوے وہ چاہے قلیل ہو یا کثیر وہ سب قلت میں داخل ہے اور جو سوال بے ضرورت کیا جاوے وہ کثرت میں داخل ہے چاہے وہ ایک پیسہ ہی یا ایک بات ہی ہو۔ اب میں اس کو بیان کرنا چاہتا ہوں کہ آج کل لوگوں نے دونوں میں کیا کیا غلطیاں کر رکھی ہیں اور دونوں میں کس قدر افراط اور تفریط ہے خاص کر عورتوں میں۔ انہوں نے بعض مواقع سوال پورا کرنے کے ایسے سمجھ رکھے ہیں کہ وہاں خرچ کرنا بہت ضروری سمجھتی ہیں مثلاً بھیک مانگنے والے فقیر ان کو اس طرح ٹھگتے ہیں کہ یہ ڈر جاتی ہیں اور خواہ اپنے آپ فاقہ ہی کرنا پڑے مگر اس کا سوال ضرور پورا کرتی ہیں۔ کوئی شاہ صاحب بن کر آتے ہیں اور اپنا یہ کمال دکھلاتے ہیں کہ الگنی پر فلانی رضائی پڑی ہے میں تو وہ لوں گا کوٹھے میں صندوق کے اندر فلاں کپڑا رکھا ہے میں تو وہ لوں گا بس عورتیں سمجھتی ہیں کہ کوئی بڑے کامل آ گئے اگر وہی چیز ان کو نہ دی گئی تو خدا جانے کیا آفت آ جاوے گی مال پر وبال پڑے یا اولاد پر پڑے پس وہ چیز ان کو دے ہی دیتی ہیں نہ یہ دیکھتی ہیں کہ ہم کو تکلیف ہوگی نہ یہ کہ شوہر کی اجازت بھی ہے یا نہیں عورتوں کو اس سے بھی بحث نہیں ہوتی کہ کون چیز کس کی ملک ہے یاد رکھو خاوند کی ملک میں تصرف کرنا درست نہیں بلکہ عورت کو تو اپنے مال میں بھی خاوند سے مشورہ کر کے تصرف کرنا چاہئے کیونکہ وہ ناقص العقل ہوتی ہے مگر یہاں یہ حالت ہے کہ دوسرے کی ملک میں بھی بے دھڑک تصرف کر ڈالتی ہیں خوب سمجھ لو کہ یہ دینا بالکل جائز نہیں اور کسی شاہ صاحب اور فقیر صاحب کی دھمکی میں نہ آنا چاہئے سمجھنے کی بات ہے کہ جو شخص اس طرح سے ڈرا دھمکا کر پرایا مال چھینے وہ کامل کہاں سے ہوا وہ تو غاصب اور ڈاکو ہے۔ (ذم المکروہات ج ۲۶)

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا ادب

صحابہ ایسے مودب تھے کہ جو ضروری باتیں پوچھنا بھی چاہتے تھے تو کئی کئی دن تک نہ پوچھتے۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے بعض دفعہ فرشتہ کو بصورت انسان بھیجا اور اس نے وہ

سوالات کئے جو صحابہؓ کے دل میں تھے تاکہ لوگوں کو علم ہو یہ ان کے ادب کی برکت تھی کہ حق تعالیٰ نے خود ان سوالات کو حل فرما دیا چنانچہ حدیث جبریل ایک مشہور حدیث ہے جس کا خلاصہ یہی ہے کہ جبرئیل بصورت انسان آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سوالات کئے اور اس سے غرض یہی تھی کہ لوگوں کو ان باتوں کا علم ہو جائے۔ ادب کی یہ برکت ہے کہ خود خدا تعالیٰ کی طرف سے ضرورت پوری کی گئی۔ (ذم المکروہات ج ۲۶)

بنی اسرائیل کی بے ادبی کا انجام

بے ادبی کا یہ نتیجہ ہے کہ بنی اسرائیل کو حکم ہوا تھا کہ ایک گائے کی قربانی کرو انہوں نے اس حکم میں حجتیں نکالنا شروع کیں کہ بتلایئے گائے کیسی ہو بتلایا گیا کہ جوان گائے ہو کہا یہ بھی بتلایئے کہ اس کا رنگ کیسا ہو حکم ہوا کہ رنگ زرد ہونا چاہئے پھر کہا کہ ٹھیک ٹھیک اور مشرح بتلایئے کہ کیسی گائے ہو اب تک ہماری سمجھ میں پوری حالت اس کی آئی نہیں حکم ہوا کہ ایسی گائے ہو کہ جس سے نہ جوتنے کا کام لیا گیا ہو اور نہ سینچائی کا کام لیا گیا ہو اور بالکل یک رنگ ہو کہیں اس میں داغ دھبہ نہ ہو چنانچہ ایسی گائے ان کو تلاش کرنا پڑی اور یہ ہزار وقت رقم کثیر خرچ کر کے بہم پہنچی۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر بنی اسرائیل اتنی حجت نہ کرتے اور جیسے ہی حکم ہوا تھا فوراً کوئی سی گائے ذبح کر ڈالتے تو کافی ہو جاتی یہ تنگی کثرت سوال کی وجہ سے ہوئی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس امت کو حق تعالیٰ نے خود ہی اس فعل سے منع فرما دیا چنانچہ ارشاد ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَلَكُمْ تَسُؤْكُمْ (اے ایمان والو وہ باتیں مت پوچھو کہ اگر ظاہر کر دی جاویں تو تمہاری ناگواری کا سبب ہو) اور آگے یہ بھی فرما دیا قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ یعنی تم سے پہلی امت نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ احکام میں اس طرح حجتیں کرتے تھے گویا تحقیق کر رہے ہیں لیکن جب حکم ہوتا اور اس کی پوری شرح کر دی جاتی تو اس کی امتثال سے انکار کر دیتے ہیں اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ حجتیں کرنا اسی بات کی علامت ہے کہ اس شخص کو کام کرنا منظور نہیں کام کرنے والا ہمیشہ ڈرا کرتا ہے کہ خدا جانے مجھ سے تعمیل ہو سکے گی یا نہیں اسی واسطے وہ اپنے اوپر تنگی کو اختیار کرتا ہے بنی اسرائیل بڑے سرکش تھے انہوں نے حجتیں چھانٹیں اور تقریریں کر کر کے اپنے اوپر مصیبت لاد دی اس امت پر خدا کا فضل رہا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم حکم کو سن کر اس میں شقوق اور احتمالات نہ نکالتے تھے۔ (ذم المکروہات ج ۲۶)

شیطان کی شرارت

ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ میں اس قابل ہی نہیں کہ خود دعاء کروں میں نے کہا کہ کلمہ بھی پڑھتے ہو یا نہیں کہنے لگے کہ پڑھتا ہوں میں نے کہا کہ اس کی کیا وجہ کہ تم کلمہ پڑھنے کے قابل تو ہو مگر دعاء کرنے کے قابل نہیں یہ شیطان کی شرارت ہے کہ دلیلیں یوں ڈالتا ہے کہ دعا کے قابل نہ سمجھنا تواضع ہے ایک صاحب نے یہ فرمائش کی تھی کہ تم ہی استخارہ بھی دیکھ دو غرض اپنے اوپر کسی قسم کی تکلیف نہ ہو سب کچھ دوسرے ہی کر دیں مجھے پھر یاد آتا ہے کہ کھانے میں کبھی یہ نہ سوچا کہ بزرگوں سے کہتے ہیں کہ آپ ہی کھالیا کیجئے ہمارے کھانے کی ضرورت نہیں۔ (اصلاح النفس ج ۲۶)

تفاوت فہم

یعنی حضرت علی سے پوچھا گا کہ کیا آپ حضرات (اہل بیت) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خاص باتیں دوسروں سے الگ بتلائیں فرمایا نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو قرآن کی فہم (خاص درجہ میں) عطا فرمادیں (تو وہ دوسروں سے زیادہ صاحب علوم ہو جائے گا) یا وہ چند باتیں جو اس صحیفہ میں ہیں (اس کو دیکھا گیا تو اس میں دیت وغیرہ کے کچھ احکام تھے جو حضرت علی کے ساتھ مخصوص نہ تھے بلکہ دوسرے صحابہ کو بھی اس کا علم تھا مقصود اس سے نفی کرنا تھا تخصیص کی) اس سے معلوم ہوا کہ فہم میں تفاوت ہوسکتا ہے جس کی وجہ سے ایک شخص کو قرآن سے وہ علوم حاصل ہوں گے جو دوسروں کو حاصل نہیں۔ حضرت علی کو چونکہ قرآن سے مناسبت تھی اس لئے ان کو بعض دوسروں سے زیادہ قرآن کے علوم حاصل تھے شاید اس سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کچھ باتیں دوسروں سے الگ بتلائیں ہیں یا کسی نے اڑائی ہو یہ خیال اسی وقت سے لوگوں میں پیدا ہوگیا ہے کہ بعض علوم سینہ بسینہ ہیں جو کتاب وحدیث میں نہیں۔

یہ خیال عبداللہ بن سبا بانی فرقہ سائیہ نے ایجاد کیا ہے جس سے مقصود اس کا اسلام کا استیصال تھا کیونکہ عبداللہ بن سبا اول یہودی تھا پھر بطور نفاق کے مسلمان ہوا اور حضرت علی کی محبت کا دم بھرنے لگا اور ان کے متعلق مسلمانوں میں غلط اعتقادات پھیلانے لگا کیونکہ وہ

لوگ یہ سمجھ چکے تھے کہ تلوار سے اسلام کا خاتمہ نہیں ہوسکتا تو اب انہوں نے یہ تدبیر نکالی کہ احکام اسلامیہ میں خلط کرنا چاہئے۔ اور اس کا یہ ذریعہ نکالا کہ بعض علوم کو سینہ بہ سینہ بتلایا مگر اللہ کا وعدہ ہے اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ اللہ تعالیٰ نے دین کی خود حفاظت کی ہے کہ احکام میں خلط نہیں ہوسکتا گو فرق ضالہ اسلام میں بہت ہوئے ہیں اور اب بھی ہیں جن کے متعلق حدیث میں ہے کہ میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے اور تہتر تو اصول کے اعتبار سے ہیں ورنہ ہر فرقہ کے اندر بہت سے فرقے ہوگئے ہیں بلکہ آج کل تو ہر شخص ایک مستقل فرقہ ہے کیونکہ ہر شخص دین کے متعلق اپنی الگ رائے قائم کرتا ہے اور اس میں بھی حکمت ہے تاکہ اس تفرق سے پریشانی نہ ہو کیونکہ اختلاف تو ناگزیر تھا کہ کسی قدر اختلاف تو ضرور ہوتا اس عالم میں بناء حکمت یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی امر میں اختلاف نہ ہو اب اگر اختلاف کبھی کبھی ہوتا تو طالب حق کو طبعاً احتمال ہوسکتا تھا کہ نہ معلوم ان میں سے کون حق پر ہے اور جب روزانہ نئے نئے فرقہ نکلتے آتے ہیں تو اس کا اثر طبعاً کم ہوجائے گا اور دیکھے گا کہ اختلاف کی تو کہیں انتہا نہیں یہ تو روز کی دال روٹی ہوگئی ہے کہاں تک ہر چیز کی تحقیق کیا کرے بس وہ پرانا ہی طریقہ اسلم ہے۔ (الارتیاب والاغتیاب ج ۲۶)

دعا کی خاصیت

ایک نومسلم کا بیان ہے کہ جب میں نے مذہب حق کو تلاش کرنا شروع کیا تو مجھے مذہب میں حق کی جھلک نظر آتی تھی جس سے میں پریشان ہوگیا آخر میں نے یوں دعا کی کہ اگر آسمان وزمین کا پیدا کرنے والا کوئی ہے تو میں اس سے دعا کرتا ہوں کہ مجھ پر حق واضح ہو جائے بس یہ دعا کرتے ہوئے دو چار دن نہ گزرے تھے کہ اسلام کا حق ہونا مجھے واضح ہوگیا۔

صاحبو! دعا بڑی چیز ہے دعا میں خاصیت ہے کہ اس سے تدبیر ضعیف بھی قوی ہو جاتی ہے جس کا بار بار مشاہدہ ہو چکا ہے مگر یہ مطلب نہیں کہ تم تدبیر نہ کرو تدبیر ضرور کرو اور اس کے ساتھ دعا بھی کرتے رہو اس سے تدبیر ضعیف قوی ہو جائے گی افسوس ہم لوگوں نے اس کو آج کل چھوڑ دیا اس کے بعد میں ایک اور بات کہتا ہوں وہ یہ کہ اگر دعا کے بعد بھی کسی پر حق واضح نہ ہو جب بھی اس کو ترک نہ کرے کیوں کہ اس وقت دعا کا یہی قاعدہ ہوگا کہ اس سے دل میں قوت پیدا ہوگی قلب کو راحت وسکون ہوگا اور بھی

مطلوب ہے کیونکہ دنیا کی تمام تدابیر سے راحت قلب ہی تو مقصود ہے ورنہ پھانسی کے مجرم کے پاس سامان عیش تو بعض دفعہ دوسروں سے بھی زیادہ ہوتا ہے لیکن کیا نفع! اس کی نظر میں سب خار ہے اور محض بے کار ہے کیونکہ اس کے قلب کو راحت حاصل نہیں۔

آج کل کی رسومات زیادہ خطرناک ہیں

جس شریعت میں کفر و شرک کو برا لکھا ہے کبیرہ گناہ کو بھی برا لکھا ہے زائد سے زائد گوہ اور موت کا سا فرق کہہ لو۔ بلکہ میں کہتا ہوں اس زمانہ کی موجودہ رسمیں ان رسموں سے زیادہ بری ہیں جو چھوٹ گئیں اس واسطے کہ تمہارے ہی قول کے بموجب ان کا مبنی کفر پر تھا اور ان کا مبنی اس چیز پر ہے کہ وہ کفر کی بھی جڑ ہے یعنی کبر پہلی رسمیں کفر تھیں لیکن حظ نفس سے خالی تھیں ان کے ترک میں نفس مزاحم نہ تھا کیونکہ ان میں حظ نہیں تھا اور رسوم موجودہ میں حظ نفس ہے ان سے تنبہ ہونے کی امید نہیں۔ سمجھ لو کہ کفر و شرک میں حظ نفس نہیں ہوتا۔ اس واسطے کہ نفس کو سب سے زیادہ ناگوار کسی کے سامنے لچنا ہے تو جو شخص مشرک ہے اس کو بہت سوں کے سامنے لچنا پڑتا ہے۔ تو اس میں حظ کہاں جہالت وغیرہ اور داعی ان کو ہو جاتے ہیں ورنہ نفس کے وہ رسوم خلاف ہیں علی ہذا یہ سمجھنا کہ آج کل کی رسمیں کچھ رسمیں ہی نہیں ہیں اور زیادہ خطرناک ہے کیونکہ جس گناہ کو آدمی گناہ نہ سمجھے اس سے توبہ کی کیا امید ہو سکتی ہے کیونکہ توبہ نام ندم یعنی پشیمانی کا ہے اور پشیمانی اسی چیز سے ہوا کرتی ہے جس کی کچھ برائی دل میں ہو۔ جب ان رسموں کی برائی ہی دل میں نہیں ہے تو پشیمانی کیوں ہوگی اور جب پشیمانی نہیں تو اس سے توبہ کیسی (علاج الکبر ج ۲۶)

سلطان محمود غزنوی کی بت شکنی

محمود بادشاہ نے جب ہندوستان کو فتح کیا اور سومنات کا مندر توڑا تو تمام بت توڑ ڈالے جو بت سب سے بڑا تھا اس کو بھی توڑنا چاہا۔ پجاریوں نے بہت الحاح وزاری کی اور کہا اس کے برابر ہم سے سونا لے لیا جائے اور اس کو نہ توڑا جائے۔ محمود نے ارکان سے مشورہ کیا سب نے کہا ہم کو فتح ہو چکی ہے اب ایک بت کے چھوڑ دینے سے ہمارا کیا جاتا ہے اس قدر مال ملتا ہے لشکر اسلام کے کام آئے گا چھوڑ دینا چاہئے مجلس میں سید سالار مسعود

غازی بھی تھے فرمایا یہ بت فروشی ہے اب تک بادشاہ بت شکن مشہور تھا اب بت فروش کہلائے گا محمود کے دل کو یہ بات لگ گئی مگر گونہ تردد باقی تھا دوپہر کو سویا تو خواب میں دیکھا کہ میدان حشر ہے اور ایک فرشتہ ان کو دوزخ کی طرف یہ کہہ کر کھینچا ہے کہ یہ بت فروش ہے دوسرے فرشتے نے کہا نہیں یہ بت شکن ہے اس کو جنت میں لے جاؤ اتنے میں آنکھ کھل گئی فوراً حکم دیا بت توڑ ڈالا جائے اس کو جو توڑا تمام پیٹ میں جواہرات بھرے ہوئے نکلے حق تعالیٰ کا شکر کیا کہ بت فروشی سے بھی بچا اور جس مال کی طمع میں بت فروشی اختیار کرتا تھا اس سے زیادہ مال بھی مل گیا۔ یہ جنت اور دوزخ کی طرف کھینچا جانا اس تردد کی صورت دکھائی گئی جو محمود کے قلب میں تھا۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ بت کو چھوڑ دینا حقیقت میں بت فروشی نہ تھا لیکن صورۃ بت فروشوں کی مشابہت تھی جس کا یہ نتیجہ ہوا خدا پناہ دے مسلمانو! اس میں سب کفار کی رسمیں ہیں مزید برآں مل گیا ہے ان میں تفاخر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور بدعات ظلمات بعضہا فوق بعض تہہ بتہ تاریکیاں، شر کے اندر شر گھسا ہوا ہے۔ (علاج الکبر ج ۲۶)

مستورات کی اصلاح کی آسان تدبیر

خواتین علاج کے لئے سوچ کر کوئی نہ کوئی تدبیر ایسی نکال لیتی ہیں کہ شرم بھی نہ جائے اور علاج بھی ہو جائے۔ بیبیو! کسی مسئلہ کا تحقیق کر لینا تو آج کل کچھ بھی بات نہیں دو پیسے میں چاہے کہاں سے جواب منگالو اگر خود نہ کرسکو اپنے خاوند کی معرفت پوچھوا لو یا اور کسی بی بی کے ہاتھ سے لکھوا کر دریافت کرالو اگر نہ خود لکھ سکو نہ شوہر موجود ہو۔ مگر بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ جب ہو کہ جب دین کا خیال ہو۔ اس غفلت کو چھوڑو اور دین کو دنیا سے بھی زیادہ ضروری سمجھو۔ دنیا ختم ہو جائے گی اور آخرت ختم نہ ہوگی۔ جو طریقہ میں نے بیان کیا اس سے بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ گھر میں جب مسائل کا تذکرہ ہوگا بچوں کے کان میں پڑیں گے اور ساری عمر ان کو یاد رہیں گے۔ جو لوگ تمہارے تابع ہیں ان کی اصلاح ہوگی ان کی اصلاح بھی تمہارے ذمہ ضروری ہے۔ حدیث میں ہے

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته (الصحیح للبخاری ۲ : ۲)

یعنی ہر بڑے کو چھوٹے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محافظ فرمایا کہ ہر ہر شخص کچھ نہ کچھ ذمہ دار ہے اور اس کی جواب دہی اس کے ذمہ ہے اگر نوکرانی تمہاری نماز نہیں

پڑھتی تو وہ گنہگار رہے ہی مگر تم بھی اس کے ساتھ گنہگار رہو اور جواب دینا ہوگا کہ اسے نماز کیوں نہیں سکھائی تھی۔ بعض لوگوں نے اس کا جواب یہی اختیا کرلیا ہے کہ ہم نے تو بہتیری تاکید کی مگر وہ نماز پڑھتی ہی نہیں۔ کیوں بیبیو! اگر کھانے میں وہ نمک کم وبیش کردے تو تم کیا کرتی ہو کیا ایک دو دفعہ سمجھا کر نیک بخت نمک ٹھیک رکھا کہہ کر خاموش ہو رہتی ہو اور پھر نمک ویسا ہی کھالیتی ہو جیسا اس نے ڈال دیا ہو۔ یہ تو کبھی بھی نہ کرو گی چاہے نوکرانی رہے یا نہ رہے اسے سمجھاؤ گی پھر مارو پیٹو گی اگر کسی طرح نہ مانے گی تو نکال باہر کرو گی۔ بیبیو! دین کا اتنا بھی خیال نہیں جتنا نمک کا جو نماز کے مقابلے میں بالکل غیر ضروری چیز ہے۔ دین کا خود بھی خیال کرو اور جن پر تمہارا قابو چل سکتا ہے ان کو بھی دین دار بناؤ تمہاری کوشش سے جو کوئی دیندار بنے گا تمہیں بھی اسی کے برابر ثواب ملے گا۔ اس کا طریقہ وہی ہے جو میں نے بیلن کیا کہ جہاں دنیا کے دس کاموں کا وقت ہے ایک دن کے کام کا بھی وقت نکال لو۔ جو بی بی خود کتاب پڑھ سکیں وہ کتابوں کو دیکھ کر اپنی اصلاح کریں اور جو خود نہ پڑھ سکیں کسی اپنے رشتہ دار سے پڑھوا کر سنیں علماء سے وعظ اپنے مکانوں میں کہلوایا کریں جو واقعات پیش آیا کریں ان کی پوچھ پاچھ کیا کریں۔ علماء سے ان کی معرفت یا خط کے ذریعے سے جواب منگا لیا کریں اس سے دین میں ایسی بصیرت ہو جائے گی کہ رفتہ رفتہ ہر ہر عمل کی نسبت حکم معلوم ہو جائے گا۔ جب کسی چیز کا علم ہو جاتا ہے تو کبھی نہ کبھی تو دل میں اس سے بچنے کا ارادہ پیدا ہوتا ہی ہے رات میں اگر تم ذرا سی بھی ہمت سے کام لو گی تو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگی۔ اور تم میں شدہ شدہ تمام مفاسد کی جڑ یعنی کبر بھی قلب سے نکل جائے گی۔ (علاج الکبر ج ۲۶)

جنت کو پہلے پیدا کرنے میں حکمت

حق تعالیٰ نے آسمان و زمین کو تو پہلے پیدا کیا ہی جنت کو بھی پہلے ہی پیدا کر دیا حالانکہ اس کی ضرورت اس عالم کے بعد انسان کو ہوگی کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا اور اس میں راز یہ ہے کہ انسان کو جب یہ معلوم ہوگا کہ میرا اصلی گھر جہاں ہر قسم کی راحت و آسائش ہے اس وقت موجود ہے تو اس کو ادھر زیادہ رغبت ہوگی اور دنیا میں اس کا دل نہ لگے گا اور اگر اس کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جنت تو ابھی بنی بھی نہیں دنیا کے فنا ہونے کے بعد بنے گی تو اکثر طبائع

کو عالم آخرت کی طرف رغبت نہ ہوتی اور اگر ہوتی بھی تو کم ہوتی کیونکہ معدوم کی طرف رغبت ہونا انسان کے طبائع میں نادر ہے گو وہ معدوم کیسا ہی یقینی الوجود ہو اور اب جس وقت حق تعالیٰ کے اس ارشاد پر نظر پڑتی ہے: "اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ" کہ جنت خدا سے ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے تو خواہ مخواہ اس کی طرف کشش ہوتی ہے اور تقویٰ کو جی چاہتا ہے۔

بعض لوگ عقل کے منکر ہیں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ انسان کے اندر عقل نہیں ہے حالانکہ جانور اور انسان میں فرق ظاہر ہے مگر یہ خدا کے بندے پھر بھی عقل کے منکر ہیں اس کا عقلی جواب تو ہے ہی مگر لطیفہ کے طور پر ایک جواب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے گھر کا حال خوب جانتا ہے تو وہ جو عقل کے منکر ہیں وہ اپنا حال بیان کرتے ہیں سو ان میں واقعی عقل نہ ہوگی اور ہم کو اپنے گھر کا حال معلوم ہے اور ہمارے اندر عقل ہے ہم کو خود اپنا حال معلوم ہے اس لیے ہم عقل کے منکر نہیں ہیں۔ (تعظیم العلم ج ۲۷)

تحصیل علم کی اصل غرض محض رضاء الٰہی ہے

حدیث میں اس سے ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "**من تعلم العلم لیماری به السفهاء الی اخره**" مجھے حدیث کے الفاظ بعینہ کم یاد رہتے ہیں اسی طرح حوالہ بھی یاد نہیں رہا کرتا کہ یہ کس کتاب کی حدیث ہے:

اہل علم اس کی تحقیق کر لیں مجھے حدیث کا مضمون یاد ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص علم کو اس لیے حاصل کرے تاکہ اس کے ذریعے سے علماء کا مقابلہ کرے اور جاہلوں سے جھگڑا کرے اور لوگوں کا رخ اپنی طرف پھیرے خدا تعالیٰ اس کو جہنم میں داخل کریں گے تو دیکھئے مراء پر کس قدر شدید وعید ہے مگر افسوس کہ آج کل تحصیل علم سے زیادہ غرض وہی ہوتی ہے جس سے حدیث میں ممانعت وارد ہو رہی ہے بلکہ آج کل تو عجیب بات یہ ہے کہ بعض لوگوں کی تحصیل علم سے کوئی بھی غرض نہیں ہوتی نہ حسن نہ مذموم اب تک تو ہم یہ سنا کرتے تھے کہ افعال اختیاریہ بدون تصور غایت و غرض کے موجود نہیں ہو سکتے مگر آج کل کے طلبہ کی حالت دیکھ کر اس مسئلہ میں ہم کو شبہ ہو گیا اور جن کی کچھ غرض ہوتی بھی ہے تو ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کی غرض محض رضائے الٰہی ہو بلکہ اکثر کو تو جاہ مطلوب ہوتی ہے کیونکہ بہت لوگ علم دین پڑھتے ہیں مگر اپنی اصلاح نہیں کرتے اگر رضائے الٰہی ان کو مطلوب ہوتی تو عمل کا اہتمام ضرور ہوتا بلکہ ہم

دیکھتے ہیں کہ بہت لوگوں کا مشغلہ تحصیل علم کے بعد جھگڑنا ہی رہ جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مراء جدال ہی کے واسطے علم حاصل کرتے تھے۔ بس آج کل اسی میں فخر و ناموری سمجھتے ہیں کہ اس سے مقابلہ بحث کر لی اس سے جھگڑ لئے' کچھ جاہل ان کی طرف ہو گئے پھر علاوہ ناموری کے اس صورت میں آمدنی بھی زیادہ ہوتی ہے اور جب ان دونوں جھگڑنے والوں میں فیصلہ نہیں ہوتا تو علماء محققین کے پاس سوالات جاتے ہیں اور خواہ مخواہ ان کو بھی اس جھگڑے میں پھانسا جاتا ہے اگر کوئی اللہ کا بندہ اس سے احتیاط کرے اور جھگڑے سے بچنا چاہے تو اس کے پاس سے ٹلتے نہیں اس کے سر ہو جاتے ہیں۔ (تعظیم العلم ج ۲۷)

مسائل کی تحقیق میں حضرت حاجی صاحب کا ارشاد

حضرت حاجی صاحب ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی تم کو تنگ کرے اور کسی مسئلہ کی تحقیق و تدقیق کرنی چاہیے تو سب رطب و یابس شبہات و جواب اس کے سامنے رکھ دو اور کہہ دو کہ ان میں سے تم خود انتخاب کر لو' مجھے انتخاب اور ترجیح کی فرصت نہیں مجھے اور بھی کام کرنا ہے جس کے واسطے میں پیدا ہوا ہوں۔ حضرت حاجی صاحب نے اس کی ایک مثال بھی ارشاد فرمائی کہ ایک شخص نے جس کے کچھ بال سفید کچھ سیاہ تھے' حجام سے کہا کہ میری داڑھی میں سے سفید سفید بال چھانٹ دے اس نے استرہ لے کر سارے بال مونڈھ کر اور سب کو سامنے رکھ کر کہا کہ اس میں سے سفید سفید چھانٹ لیجئے مجھے فرصت نہیں۔ لیکن حضرت حاجی صاحب کے ارشاد پر عمل کرنا اسی شخص کو آسان ہے جو ننگ و ناموس کو آگ لگا چکا ہو کیونکہ ایسے جواب سے مجیب کی وقعت نہیں ہوتی' لوگ اس کو جاہل یا بدمزاج مشہور کر دیتے ہیں۔ اسی لیے آج کل ایسے جواب بہت کم لوگ دیتے ہیں اکثر تو جھک جھک میں مشغول ہی ہو جاتے ہیں۔ سلف کو اس کا بہت اہتمام تھا کہ فضول وقت ضائع نہ کیا جائے۔ (تعظیم العلم ج ۲۷)

مسلمانوں کو علم نافع حاصل کرنا چاہیے اور اس کی طرف پوری توجہ کرنا چاہیے۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو نماز' روزہ کی طرف تو توجہ ہے مگر علم نافع کی طرف توجہ نہیں اگر کوئی نماز نہ پڑھے روزہ نہ رکھے زکوٰۃ نہ دے حج نہ کرے تو سب لوگ اس کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں اور اگر کوئی شخص علم دین بالکل حاصل نہ کرے تو اس کو برا کوئی نہیں کہتا حالانکہ بقدر ضرورت علم حاصل کرنا ہر شخص کے ذمہ ویسا ہی فرض عین ہے

مستورات کے لیے طریق تحصیل علم دین

جو مرد پڑھے لکھے نہ ہوں وہ عورتوں سے کہہ دیا کریں کہ تم کو جو مسئلہ پوچھنا ہو ہم سے کہہ دیا کرو، ہم علماء سے پوچھ کر تم کو بتلا دیں گے۔ لیجئے اس ترکیب سے ساری امت بقدر ضرورت علم سے فیض یاب ہو سکتی ہے اور جو لوگ اردو پڑھ بھی سکتے ہیں ان کو علماء سے ملنے ملانے اور سوال کرنے کا عادی رہنا چاہیے کیونکہ بعضی بات کتاب سے حل نہیں ہوتی علماء سے زبانی دریافت کر کے اس کی حقیقت حل ہو جاتی ہے اور دین کے ساتھ تعلق و مناسبت تو بدون صحبت کے حاصل ہوتا ہی نہیں۔ (تعظیم العلم ج ۲۷)

آمین کہنے والا دعا میں شریک ہوتا ہے

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ.

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دونوں کی موسیٰ و ہارون علیہما السلام مراد ہیں کیونکہ حضرت ہارون اس دعا پر آمین کہہ رہے تھے اور آمین کہنا بھی دعا میں شریک ہوتا ہے۔ دعا قبول کر لی گئی سو تم (اپنے منصبی کام پر) مستقیم رہو اور ان لوگوں کی راہ نہ چلنا جن کو علم نہیں۔ پس باوجود یہ کہ دعا قبول ہو چکی تھی اور اس کی قبولیت کی اطلاع بھی فوراً دی گئی تھی مگر مؤرخین نے لکھا ہے کہ ظہور اس دعا کا چالیس سال کے بعد ہوا۔ مفسرین نے ”وَلَا تَتَّبِعٰنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ“ کی تفسیر میں لکھا ہے یعنی استعجال نہ کرنا یعنی جیسا کہ جاہل لوگ دعا کے اگلے ہی دن وحی کے منتظر ہوا کرتے ہیں۔ دیکھئے اگر آپ کسی طبیب کے پاس جائیں کہ مجھ کو مسہل کی ضرورت ہے، مسہل دیدو تو یہ بھی کہیں ہو سکتا ہے کہ آج تم نے درخواست کی اور کل ہی دست آنے لگیں، ہرگز نہیں بلکہ وہ اول منضج (مادہ کو پکانے والی دوا) کا نسخہ لکھے گا، مہینہ بھر اس کو پینا پڑے گا، اس کے بعد وقت اور موسم کو دیکھ کر مسہل دیا جائے گا اور ہر مسہل کے بعد تبرید ہو گی پھر اگر مسہل میں کچھ کسر رہ گئی تو کوئی ملین شربت مہینہ بھر پینا پڑے گا۔ غرض چار مہینہ کے بعد کہیں مسہل پورا ہو گا۔ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ صبح کو نسخہ پی کر شام ہی کو دست آ جاویں، سو بعضے طبیب ایسے بھی ہیں لیکن وہ آپ کو ایسا مسہل دیں گے کہ مادہ کے ساتھ روح کا بھی اخراج کر دے گا۔

جنٹلمینوں کا عجیب مرض

ایک مولوی صاحب جو کہ ریاست بہاولپور میں کسی سکول میں پروفیسر ہیں وہ فرماتے تھے کہ ایک بار میں بہاولپور سے وطن کو آ رہا تھا میرے ساتھ ٹھنڈے پانی کی ایک صراحی تھی۔ اس گاڑی میں ایک جنٹلمین سوار تھے، وہ میرے برتنوں کو دیکھ کر ہنسنے لگے کہ یہ بھنگیوں کے سے برتن آپ کہاں سے ساتھ لائے۔ میں اس پر خاموش ہو رہا، تھوڑی دیر میں ان صاحب کو پیاس لگی تو اسٹیشن پر گلاس لے کر اترے وہاں پانی نہ ملا اور کئی اسٹیشن تک نہ ملا تو اب ان کا مارے پیاس کے برا حال تھا، بار بار کن انکھیوں سے میری صراحی تکتے تھے، آخر مجھے رحم آیا اور میں تختہ پر آنکھیں بند کر کے سوتا بن کر لیٹ رہا، تھوڑی دیر میں وہ صاحب آہستہ آہستہ صراحی کے پاس آئے اور اس سے منہ لگا کر پانی پینا شروع کیا مگر حالت یہ کہ ایک آنکھ میری طرف تھی اور ایک آنکھ پانی کی طرف، بڑی گھبراہٹ میں غریب نے پانی پیا، میرے جی میں آیا کہ فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لوں مگر میں نے خیال کہ بے چارہ پیاسا ہے جب پانی پی چکے گا پھر سمجھوں گا چنانچہ جب وہ خوب پانی پی چکے اور وہاں سے اٹھنے لگے تب میں نے ہاتھ پکڑ لیا کہ کیوں صاحب آپ نے بھنگیوں کے برتن سے کیوں پانی پیا۔ بس اب تو ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور معافی چاہنے لگے میں نے پھر تو ان کی بدتہذیبی خوب ظاہر کی کہ تم تہذیب کا دعویٰ محض جھوٹا کرتے ہو تم میں خاک تہذیب نہیں، میں کہتا رہا اور خاموش سنتے رہے۔ (تعظیم العلم ج ۲۷)

شیخ ابن عربی کا مقام

شیخ ابن عربی کو ان کے زمانہ میں بہت لوگوں نے کافر و زندیق کہا حتیٰ کہ مرنے کے بعد ان کی قبر پر سالہا سال پاخانہ پڑتا رہا تو کیا جہلاء کے ان افعال سے نعوذ باللہ (اللہ کی پناہ) شیخ کا درجہ گھٹ گیا ہرگز نہیں تو اگر آج تم کو بھی لوگ برا بھلا کہنے لگیں تو کیوں ڈرتے ہو پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ شیخ ابن عربی امام اور شیخ اور صدیق کہلانے لگے اور ان کی قبر زیارت گاہ بن گئی۔ حضرت شیخ نے اس کی نسبت پیشین گوئی بھی فرمائی تھی۔ "**اذا دخل السین فی الشین ظهر المیم**" سین سے مراد سلطان سلیم ہیں اور شین سے مراد ملک شام ہے اور میم سے مراد خود حضرت شیخ ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جب سلطان سلیم ملک شام

میں داخل ہوں گے اس وقت محی الدین بن عربی کا ظہور ہوگا۔ چنانچہ جب سلطان سلیم کا شام پر تسلط ہوا ہے اور شیخ کی قبر کا حال معلوم ہوا تو اس کو گندگیوں سے صاف کرایا اور اس پر قبہ تعمیر کیا اس دن سے شیخ کی قبر زیارت گاہ خاص و عام بن گئی۔ (تعظیم العلم ج ۲۷)

امام غزالی کی وقعت وعظمت

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو کچھ معاملہ ہوا سب کو معلوم ہوا ہے۔ لوگوں نے ان پر کفر کے فتوے لگائے، ان کی کتاب احیاء العلوم کو جلایا گیا تو کیا اس سے ان کی وقعت کچھ کم ہوگئی ہرگز نہیں اس کے بعد ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ احیاء العلوم کو سونے کے پانی سے لکھوایا گیا اور آج امام غزالی کے نام کی جو وقعت ہے مخفی نہیں ہر شخص ان کو حجۃ الاسلام اور امام کے لقب سے یاد کرتا ہے اور وہ لوگ جو امام غزالی اور شیخ ابن عربی کو کافر و زندیق کہتے تھے جن کی وقعت اس زمانہ میں بہت کچھ تھی خدا تعالیٰ نے آج ان کے ناموں کو ایسا مٹایا ہے کہ کوئی بھی ان کا نام نہیں لیتا۔ (تعظیم العلم ج ۲۷)

کسب اور طلب میں فرق

کسب دنیا کو منع نہیں کرتا کسب وہ ہے کہ جس میں نقصان دین نہ ہو اور طلب وہ ہے جس میں دین مغلوب یا گم ہو جائے تو اصلی چیز مطلوب علم دین ہونا چاہیے اور علم دنیا ہو تو اس کا معین ہو۔ دیکھو جب ایک شخص گھوڑے کی خدمت کرتا ہے تو اصلی غرض قطع مسافت ہوتی ہے کہ یہ کھا کر قطع مسافت کرے گا اور گھاس دانہ دینا مقصود بالعرض ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص گھوڑے کو کھلائے اور اس سے کام نہ لے تو کہا جائے گا کہ اس نے گھوڑے کو قبلہ توجہ بنا رکھا ہے اور سب اس کو بیوقوف کہیں گے کہ مقصود بالغیر کو مقصود بالذات بنا لیا۔ غرض گھوڑے کی خدمت منع نہیں مگر جب اصل مقصود میں مزاحم ہو تو روکا جائے گا اور مشورہ نیک دیا جائے گا۔ اسی طرح کسب دنیا اس درجہ میں مزاحم نہ ہو طلب دنیا پر غالب نہ ہو تو اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ اسی کو فرماتے ہیں: "**کسب الحلال فریضة بعد الفریضة** " (فرائض کے بعد کسب حلال مستقل فریضہ ہے) اور عجب نہیں کہ یہ بعدیۃ اسی اشارہ کے لیے ہو کہ یہ تابع ہے کیونکہ اس میں بعدیۃ رتبیہ ہے اور تابع رتبہ میں متبوع کے بعد ہوتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ تابع

ہے اسی پر تنبیہ فرمایا ہے اس حدیث میں۔ مگر اس کے متعلق اکثر لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کہ اس وقت مسلمان بہت کم طلب علم ہیں۔ اہتمام کے ساتھ مشغول ہیں اور دنیا میں بہت زیادہ مشغول ہیں بعض کی تو یہ کیفیت ہے کہ مہینوں میں بھی ان کو نوبت نہیں آتی کسی مسئلہ کے دریافت کی۔ کیا ان لوگوں کو کبھی کوئی شبہ نہیں پڑتا جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگوں نے بہت سے کاموں کو دین سے خارج کر رکھا ہے۔ مثلاً معاملات معاشرت اخلاق کے بہت کم لوگ ہیں کہ جائیداد خرید کر یا بیچ کر کسی مولوی کو اس کا مسودہ دکھلاتے ہوں کہ کوئی معاہدہ اس میں خلاف شریعت تو نہیں۔ یوں سمجھ رکھا ہے کہ اس کو دین سے کیا واسطہ۔ (طلب العلم ج ۲۷)

نعمت مدرسہ کی قدر اور شکر گزاری

نعمت مدرسہ کی قدر اور شکر گزاری یہی ہے کہ دین کی تلاش میں لگ جاؤ۔ دوسرے قدر دانی یہ کرو کہ آج کل جو ہم لوگ کسی کام کو ایک ہی کے ذمہ ڈال دیتے ہیں اس عادت کو بھی چھوڑ دو کیونکہ یہ بہت برا ہے۔ صاحبو! جو شخص جتنا کام کر رہا ہے غنیمت سمجھو کیونکہ وہ فرض کفایہ ہے وہ تم سب کی طرف سے کر رہا ہے سو جن باتوں میں تمہاری ضرورت ہے ان میں تم بھی شریک ہو جاؤ۔ مثلاً جو صاحب وسعت ہیں وہ اس طرح شرکت کریں کہ کچھ طالب علم یہاں باہر کے بھی رہیں اور وہ ان کی امداد کریں اگر چہ یہ ضروری ہے کہ سب بالکل باہر ہی کے نہ ہوں کیونکہ بستی کو زیادہ نفع ہونا چاہیے تو زیادہ تو بستی کے ہوں اور چار پانچ باہر کے بھی ہوں۔ اس میں ایک تو برکت ہوتی ہے دوسرے وہ صرف طلب علم کے لیے آئے ہیں ان کی امداد میں بڑی فضیلت ہے۔ تیسرے ان سے مدرسے کی رونق ہوتی ہے چوتھے ان سے مدرس کی دلچسپی ہوتی ہے (طلب العلم ج ۲۷)

انگریزی دانوں کی ایک غلطی

جنٹلمینوں نے انگریزی پڑھنے کو بھی علم میں شمار کر لیا ہے اور جتنے فضائل احادیث میں علم کے وارد ہیں انگریزی تعلیم پر بھی ان کو جاری کرتے ہیں اور اس کے متعلق یہ حضرات ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں "اطلبوا العلم ولو بالصین" (علم کو طلب کرو اگر چہ چین میں ہو ۱۲) وہ کہتے ہیں کہ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چین سے بھی طلب علم کی

ترغیب دی ہے حالانکہ اس وقت چین میں دین کا علم بالکل نہ تھا بلکہ محض دنیوی علم تھا معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مطلق علم کی ترغیب دے رہے ہیں خواہ دنیا کا علم ہو یا دین کا پس انگریزی بھی علم ہے اور اس حدیث کے تحت میں داخل ہے ان لوگوں کو اول تو اس حدیث کا ثبوت دینا چاہیے۔ ان الفاظ سے یہ حدیث محدثین کے نزدیک ثابت ہی نہیں۔

اور اگر ثابت بھی ہو تب بھی ان لوگوں کا مدعا حاصل نہیں ہوتا کیونکہ انہوں نے لفظ ولو پر نظر نہیں کی۔ یہ لفظ فرض کے لیے آتا ہے مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض چین میں بھی علم ہو تو وہاں سے بھی کوشش کر کے حاصل کرنا چاہیے اور فرض اسی چیز کو کیا جاتا ہے جو معدوم یا مستبعد ہو موجود کو فرض نہیں کیا جاتا اور دنیوی علم کا چین میں اس وقت موجود ہونا آپ کو مسلم ہے تو اس کو لفظ ولو سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس حدیث میں وہی علم ہے جو چین میں اس وقت موجود نہ تھا اس لیے بطور فرض کے فرما رہے ہیں کہ اگر وہاں بھی ہو تو حاصل کرو اور وہ علم دین ہی ہے ورنہ اگر علم کو ایسا عام کیا گیا کہ دنیوی علم بھی اس میں داخل ہو جائیں تو پھر ایک بھنگی اور چمار کو بھی عالم کہنا چاہیے کیونکہ اس کو بھی دنیا کا ایک علم حاصل ہے جو کام وہ کرتا ہے اس کو وہ خوب جانتا ہے اگر آپ ان کاموں کو بھی علم میں داخل کر لیں گے تو پھر آپ کی خاطر سے ہم انگریزی کو بھی اس میں داخل کر لیں گے اور خیر جانے دیجئے ہم لفظ ولو سے بھی استدلال نہیں کرتے مگر ہم کہتے ہیں: "**اطلبوا العلم ولو بالصين**"، (علم کو طلب کرو اگر چہ چین میں ہو) میں تو تصریح نہیں کہ اس سے کونسا علم مراد ہے اب شریعت کی دوسری نصوص سے اس کو دریافت کیا جاوے۔

بس علم شرعی وہ ہے جس کو شریعت علم کہتی ہے جس کے جاننے والوں میں ایک شیخ سعدی بھی ہیں وہ فرماتے ہیں:

علمے کہ رہ بحق نماید جہالت است

(جو علم حق کا راستہ نہ دکھائے وہ جہل ہے) (الهدى والمغفرة ج ۲۷)

دنیائے ملعونہ

حدیث میں ہے: "**الدنيا ملعونة ومافيها ملعون الاذكر الله وما والاه الحديث**" (دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے ملعون بجز ذکر اللہ کے اور وہ چیز جو ذکر کو قریب کرے)

معلوم ہوا کہ جو چیز خدا کی طرف قریب نہ کرے وہ دنیا ملعونہ ہے۔ اس میں ایسے علوم بھی داخل ہیں، اب میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ کیا سائنس اور جغرافیہ اور انگریزی زبان سے خدا کی طرف قرب ہوتا ہے؟ وصل ہوتا ہے یا فصل قرب ہوتا ہے یا بعد۔ مشاہدہ ہے کہ ان سے بعد ہی بڑھتا ہے گو چاہیے تو یہ تھا کہ سائنس سے اور خدا کی طرف قرب بڑھتا کیونکہ اس سے قدرت صانع کا انکشاف زیادہ ہوتا ہے اور اپنا عجز زیادہ مشاہدہ ہوتا ہے کیونکہ اہل سائنس رات دن ترقی کی فکر میں رہتے ہیں اس لیے ان کے مقاصد بہت وسیع ہیں جن میں کثرت سے ایسے مقاصد بھی ہیں جو عرصہ تک پورے نہیں ہوتے، زمانہ دراز تک ان میں ناکامی رہتی ہے۔ بخلاف ہمارے مقاصد کے کہ وہ معدودے چند ہیں جو اکثر پورے ہو جاتے ہیں مگر ہم پھر بھی اپنے عجز کے معترف ہیں اور ان لوگوں کے زیادہ مقاصد ناکام رہتے ہیں جو کھلی دلیل ہے عجز کی مگر یہ لوگ باوجود مشاہدہ عجز زائد کے پھر بھی اپنے کو قادر کہتے ہیں وجہ یہ کہ یہ لوگ اپنے عجز پر نظر نہیں کرتے بس عرصہ کے بعد جو کسی مقصود میں کامیابی ہوگئی اس پر نازاں ہوتے ہیں کہ ہم نے یہ ایجاد کرلی، ڈلے پتھر اتجاد کرلی۔ اگر ایجاد تمہارے اختیار میں تھی تو پہلے ہی دن کیوں نہ ایجاد کرلی۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ سوچو اور غور کرو، باقی ذہن میں ایجاد کا صحیح طریق آ جانا یہ تمہارے اختیار سے بالکل خارج ہے۔ یہ محض حق تعالیٰ کے قبضے میں ہے مگر عادت الٰہیہ یہ ہے کہ جب کسی بات کے لیے انسان غور وفکر کرتا ہے تو وہ اکثر راستے کھول دیتے ہیں اور بعض دفعہ اپنی قدرت ظاہر کرنے کے لیے ہزار غور وفکر کے بعد بھی حقیقت ظاہر نہیں کرتے۔ چنانچہ اب تک کسی کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے اور ایسی نظائر بکثرت موجود ہیں اگر غور وفکر کے بعد حقیقت تک پہنچ جانا تمہارے اختیار میں ہے تو ان چیزوں کی حقیقت کا انکشاف کیوں نہ کرلیا، غرض تجربے سے یہ بات مشاہد ہے کہ کچھ عوارض کہ بمنزلہ لوازم کے ہیں ایسے جمع ہو رہے ہیں کہ سائنس اور جغرافیہ سے قرب خداوندی نہیں بڑھتا بلکہ بعد ہی میں ہوتا ہے تو یہ علم شرعی میں داخل نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے جاننے سے دین کا علم حاصل ہو سکتا ہے ہاں ایسے لوگوں کو ایسے علم دین ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔

دین کے بارے میں علم کی ضرورت کوئی نہیں سمجھتا۔ پس جو لوگ دین پر عمل ہی نہیں کرتے وہ بھی سن لیں اور جو عمل کر رہے ہیں وہ بھی سن لیں کہ علم کی ضرورت سب کو ہے کیونکہ جو لوگ دین پر عمل کر رہے ہیں اگر وہ علم سے کورے ہیں تو ان کا عمل ضرور ناقص ہوگا ان کو تکمیل عمل کے لیے علم

کی ضرورت ہے اور جو عمل نہیں کرتے ان کو عمل کی بھی ضرورت اور چونکہ وہ موقوف ہے علم پر اس لیے پھر علم کی ضرورت۔ غرض علم کی ضرورت سب کے لیے ہوئی۔ (الہدیٰ و المغفرہ ج ۲۷)

اردو میں مسائل پڑھنے کا طریقہ

بحمد اللہ آج کل علم کا سامان بہت کچھ میسر ہے، جا بجا دینی مدارس موجود ہیں، سب مسلمانوں کو ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے، میں یہ نہیں کہتا کہ سب عربی پڑھ کر عالم ہی بنیں بلکہ جن کو عربی پڑھنے کی فرصت نہ ہو وہ اردو رسائل ہی سے دینی مسائل کا علم حاصل کریں۔ آج کل خدا کا شکر ہے کہ اردو میں بھی مسائل کا ذخیرہ کافی مقدار میں موجود ہے لیکن ان کا خود مطالعہ کرنا کافی نہیں بلکہ سبقاً سبقاً کسی عالم سے سمجھ کر پڑھنے کی ضرورت ہے کیونکہ اردو میں مسائل کا ترجمہ ہو جانے سے صرف زبان سہل ہو جاتی ہے مضامین سہل نہیں ہو جاتے۔ چنانچہ اردو میں اقلیدس اور طب کی کتابیں بھی ترجمہ ہو گئی ہیں تو کیا ان کے مطالعہ سے کوئی شخص ریاضی داں یا طبیب ہو سکتا ہے ہرگز نہیں بلکہ استاد سے پڑھنے کی ضرورت ہے پھر قرآن یا فقہ کا اردو ترجمہ آپ کو استاد سے کیونکر مستغنی کر سکتا ہے، میں تجربہ کی بناء پر سچ کہتا ہوں کہ محض ترجمہ کے مطالعہ سے آپ قرآن مجید یا فقہ کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے یقیناً بہت جگہ ٹھوکریں کھائیں گے اور مطلب کچھ کا کچھ سمجھ جائیں گے اس لیے عربی میں نہ پڑھو تو اردو ہی میں پڑھو لیکن کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھو اپنے مطالعہ کو کافی نہ سمجھو۔

دین کی برکات

میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر آپ کی اس بے اعتنائی سے قرآن مجید کا وجود دنیا سے ناپید ہو گیا تو ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں کا نام بھی مٹ جائے گا۔ اب تک جو اسلام کا نام دنیا میں روشن ہے وہ اس مبارک کتاب ہی کی بدولت ہے اور جس فرقہ کو آپ مسلمانوں میں سب سے زیادہ بیکار سمجھتے ہیں واللہ وہی اسلامی قومیت کا محافظ ہے تم ہو کس ہوا میں، خدا کی قسم اگر یہ قرآن مجید کے پڑھنے پڑھانے والے نہ رہے تو مسلمان دنیا کے طبقہ میں کہیں بھی نہ رہیں گے، ساری قومی حمیت ناک کے رستہ نکل جائے گی بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ یہ فرقہ جو تمہارے نزدیک بیکار ہے صرف قومیت اسلامی کا محافظ نہیں بلکہ وجود عالم کا محافظ

ہے۔ اگر یہ جماعت دنیا میں نہ رہے تو دنیا نہ رہے گی بلکہ سارا عالم برباد ہو کر قیامت آ جائے گی اور یہ میں اپنے گھر سے نہیں کہتا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لاتقوم الساعة حتیٰ یبقی فی الارض واحد یقول اللّٰہ اللّٰہ اونحوہ.

قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک زمین میں اللہ اللہ کہنے والا ایک شخص بھی موجود ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ اللہ کرنے والے یہی لوگ ہیں جن کو آپ بیکار سمجھتے ہیں اور دوسرے طبقوں میں بھی اگر کوئی خدا کا نام لینے والا ہے تو وہ بھی ان ہی کی برکت سے ان ہی کے تعلق سے ہے۔ اب تو ان جنٹلمین صاحب کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ مسلمان کا بچہ دو سال قرآن پڑھ کر دنیا و آخرت کے کتنے درجے طے کرتا ہے۔ اسکول کا ایک درجہ طے کر کے تو وہ خاک بھی حاصل نہیں کرتا اور قرآن کی ایک سورت بلکہ ایک آیت پڑھ کر وہ اسلامی قومیت کا محافظ بلکہ تمام عالم کا محافظ بن جاتا ہے۔ یہ تو دنیا کا نفع ہے اور آخرت کا نفع تو سب جانتے ہیں پھر میں کہتا ہوں کہ آج کل جس علم کی وجہ سے لوگ تعلیم قرآن سے غفلت کر رہے ہیں زمانہ نے اس وقت اس کی قلعی کھول دی ہے۔ پہلے انگریزی تعلیم کی جس درجہ قدر تھی اب اس کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ خدا اس محکمہ تخفیف کا بھلا کرے اس نے دکھلا دیا کہ بہت سے انگریزی پڑھنے والے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں گو اس سے رنج بھی ہوتا ہے کہ ملازمت چھوٹنے سے بعض مسلمانوں کو تکلیف ہوئی اور ان پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا مگر اس کی خوشی ہے کہ جس کے نشہ میں وہ دین سے غافل ہو رہے تھے اس محکمہ نے وہ نشہ ان کے دماغوں سے اتار دیا اور ان کو معلوم ہو گیا کہ انگریزی تعلیم سے دین تو حاصل ہوا ہی نہ تھا' دنیا بھی سب کو حاصل نہیں ہوتی۔ ایک صاحب نے خوب کہا کہ علم دنیا تو جب تک مکمل نہ ہو کسی مصرف کا نہیں اور علم دین کا جو درجہ بھی حاصل ہو جائے وہ نافع ہے۔ آخرت کا تو نفع ہے ہی دنیا کا بھی نفع اگر کوئی حاصل کرنا چاہے وہ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ (الھدیٰ والمغفرہ ج ۲۷)

غیر عالم کے وعظ میں مفاسد

غیر عالم وعظ کبھی نہ کہے اس میں چند مفاسد ہیں ایک تو یہ کہ اس میں حدیث کی مخالفت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر ہے کہ ہر کام اس کے اہل کے سپرد کرنا چاہیے اور آپ فرماتے ہیں: "**اذا وسد الا مر الی غیر اھلہ فانتظر الساعة**" کہ جب کام

نااہلوں کے سپرد کئے جانے لگیں تو قیامت کے منتظر رہو۔ گویا نااہل کو کوئی کام سپرد کرنا اتنی سخت بات ہے کہ اس کا ظہور قیامت کی علامات سے ہے اور یہ امر مصرح وثابت ہے کہ جو فعل اختیاری علامات قیامت سے ہوں وہ معصیت اور مذموم ہے اور ظاہر ہے کہ غیر عالم وعظ گوئی کا اہل نہیں یہ منصب صرف علماء کاملین کا ہے اس لیے غیر عالم کو اس کی اجازت ہرگز نہ دی جائے۔ دوسری خرابی اس میں یہ ہے کہ بعض دفعہ جاہل کو کسی مسئلہ میں بوجہ ناواقفیت کے ایسی غلطی پیش آتی ہے کہ اسے خبر بھی نہیں ہوتی گو بعضے بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ وہ اپنی علمی حیثیت ہی کے موافق اختیار کر سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں کر سکتے اور جب پورا علم نہیں تو غلطی کا احتمال رہے گا۔ علاوہ ازیں جب یہ شخص وعظ کہے گا تو لوگ عالم سمجھ کر اس سے ہر قسم کے مسائل بھی پوچھیں گے۔ پھر آج کل ایسے نفس کہاں ہیں جو صاف کہہ دیں کہ ہم جاہل ہیں، ہم کو مسائل معلوم نہیں، ضرور کچھ گڑھ مڑھ کر جواب دیں گے اور اکثر وہ غلط ہوگا اور اگر گول مول جواب دیا اور اس طرح غلط جواب سے اپنے کو بچالیا تو ممکن ہے کہ عوام اس سے کسی غلطی میں پڑ جاویں۔ بعض دفعہ جاہل ایسے ہوشیار ہوتے ہیں کہ جو مسئلہ ان کو معلوم نہیں ہوتا اس کا ایسا جواب دیتے ہیں جس سے نہ جواب معلوم ہو نہ جہل ظاہر ہو۔ گنگوہ میں ایک جاہل فتویٰ دیا کرتا تھا۔ مولانا گنگوہی نے اپنی نوعمری میں اس سے امتحاناً سوال کیا کہ حالت حمل میں بے شوہر عورت سے نکاح کرنا کیسا ہے، کہا ایسا ہے جیسے گھیرا دینا۔ اس گول مول جواب سے نہ اس کا جہل ظاہر ہوا نہ جواز کا فتویٰ ہوا۔ مگر ایسے جوابات سے عوام کیا سمجھیں گے۔ یقیناً غلطی میں پڑیں گے شاید کوئی جاہل واعظ یہ کہے کہ ہم کتابیں دیکھ دیکھ کر فتویٰ دیا کریں گے اور آج کل اردو میں بھی مسائل کا ذخیرہ موجود ہے تو میں کہتا ہوں کہ بعض مسائل کا تعلق دو باب سے ہوتا ہے۔ ایک باب تو اطلاق ہوتا ہے اور دوسرے باب میں اس کا مقید ہونا معلوم ہوتا ہے اور یہ قیود و شرائط بعض دفعہ ایسے ہوتی ہیں جن پر جاہل تو جاہل ناقص عالم کی نظر بھی نہیں پہنچتی۔ بعض دفعہ ناتمام علم سے لوگوں کو تنگی میں ڈالے گا اور جب وہ تنگی کی برداشت نہیں کر سکیں گے تو شرع کو بدنام کریں گے۔ مثلاً شریعت کا حکم ہے کہ اتحاد جنسین کے ساتھ تفاضل ناجائز ہے۔ مثلاً چاندی کے بدلے چاندی یا سونے کے بدلے سونا خریدا جائے تو مساوات ضروری ہے تفاضل (کمی بیشی) حرام ہے اب جاہل تو اس مسئلہ کو دیکھ کر اسی طرح بیان کردے گا اور ممکن ہے کہ ایک وقت

میں چاندی کا بھاؤ روپے کے برابر نہ ہو بلکہ چاندی دس آنے تولہ ہو جو ایک روپیہ کے مقابلہ میں روپیہ کے وزن سے زیادہ آ جائے گی اور ان حضرت کو صرف اتنا ہی مسئلہ معلوم ہے کہ اتحاد جنس کے وقت تفاضل حرام ہے تو یہ حضرت یا تو خود روپے کے برابر ہی لائیں پھر گھر والے ان کو بیوقوف بنائیں گے اور یا دوسروں کو اس پر مجبور کریں گے تو دونوں صورت میں شریعت کو بدنام کریں گے کہ یہ اچھا مسئلہ ہے کہ ایک چیز روپے میں روپے سے زیادہ آ سکتی ہے مگر شریعت کہتی ہے کہ نہیں برابر ہی لو زائد مت لو۔ تو یہ خرابی جہل کی وجہ سے ہوئی محقق اگر اس مسئلہ کو بیان کرے گا تو ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دے گا کہ اگر چاندی ایک روپیہ کے بدلہ میں اس سے زیادہ آتی ہو تو اس وقت روپے سے چاندی نہ خریدو بلکہ روپے کو بھنا کر کچھ دونیاں چونیاں اور ان کے ساتھ کچھ پیسے ملا کر خریدو اب جائز ہے کہ ایک روپے کے بدلے میں تولہ بھر سے زیادہ چاندی لے آؤ کیونکہ ریزگاری میں جتنی مقدار چاندی ہوگی اس کے مقابلہ میں تو اس کے برابر چاندی آ جائے گی باقی چاندی پیسوں کے مقابلہ میں ہو جاوے گی اور پیسہ اور چاندی میں جنس بدل گئی اس میں کمی بیشی جائز ہے بعض جاہل کہہ دیتے ہیں کہ یہ بات ہی کیا ہوئی روپیہ دینا اور روپیہ کی ریزگاری دینا ایک ہی بات ہے پھر اس کی کیا وجہ کہ روپے کے بدلہ میں تو تولہ بھر سے زیادہ چاندی نہ لے سکیں اور ریزگاری کے بدلہ میں زیادہ لے سکیں میں کہتا ہوں کہ یہ ضابطہ کی بات ہے کہ شریعت نے اس کو ناجائز کیا ہے اور اس کو جائز کیا ہے اس میں ایسے سوالات کا حق نہیں شریعت کا مقصود یہ ہے کہ تم کو نقصان نہ ہو اور احکام کے پابند بھی رہو۔ اس طرح سے کہ جو کام کرو شریعت سے پوچھ کر کرو تا کہ تم معاملات میں آزاد اور مطلق العنان نہ رہو کہ جس طرح چاہا کر لیا بلکہ حکم کے پابند ہو کر کام کرو کیونکہ جو ضروری کام تم آزادی کے ساتھ کرنا چاہتے ہو پابندی شریعت کے ساتھ بھی وہ کام نکل سکتا ہے۔ پھر خواہ مخواہ گناہ میں مبتلا ہونا کونسی عقلمندی ہے۔ یہ تو مثال تھی تنگی میں ڈالنے نہ ڈالنے کی۔ (الھدیٰ والمغفرہ ج ۲۷)

قوانین کی دو قسمیں

قوانین دو قسم کے ہیں ایک تو وہ کہ جن میں محض ہار جیت ہو جیسے مال کے قوانین۔ سو اول تو ان کا جاننا بھی ضروری ہے کہ ان میں جلب منفعت اور دفع مضرت ہے لیکن اگر ان کو نہ سیکھا جائے تو زیادہ ضرر نہیں کیونکہ ہار جانا خسارہ ہے جرم نہیں۔ دوسرے وہ قوانین ہیں کہ

ان کی خلاف ورزی جرم اور بغاوت ہے اس کا سیکھنا واجب ہوتا ہے۔ خواہ پڑھ کر یا پوچھ کر جیسے ایک شخص کو تجارت کی اجازت ہے اور جب معلوم ہو کہ مثلاً کوکین کی تجارت کی اجازت نہیں تو اس سے رکے۔ اب یہ سوال کرتا ہوں کہ ہم لوگ خدا تعالیٰ کی عملداری میں ہیں یا نہیں اور دوسرا سوال یہ کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ کے کچھ قوانین ہیں کہ نہیں اگر ہم اس کی عملداری سے باہر ہوتے یا وہ صاحب قوانین نہ ہوتا تب تو چنداں فکر نہ تھی اور جبکہ یہ دونوں باتیں ہیں تو اب بدوں قوانین سیکھے چارہ نہیں۔ خدا تعالیٰ کی عملداری سے باہر نہ ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ سب کو قدرۃً محیط ہے ہر مذہب کے لوگ بلکہ حکماء بھی اس کو جانتے ہیں رہا دوسرا جز تو اس کو سب مسلمان بلکہ ہر مذہب کے لوگ مانتے ہیں اب یہ بات رہ گئی کہ وہ قوانین کس قسم کے ہیں۔ آیا ان میں صرف اپنا نقصان ہے یا ان کی مخالفت جرم اور بغاوت بھی ہے۔ سو قرآن شریف کو اٹھا کر دیکھ لیجئے کہ تمام قرآن شریف اس سے بھرا پڑا ہے۔ کہیں "اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" اللہ نے خرید وفروخت حلال کی ہے اور سود حرام کیا ہے۔ "لَاتَقْرَبُوا الزِّنَا" دور رہو زنا سے ہے۔ غرض تمام قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہمارے معاشرت اور معاملات دونوں کے متعلق کافی انتظام فرمایا ہے اور عدم اطاعت پر وعید بھی فرمائی ہے پھر کیا شبہ رہ گیا۔ آج کل لوگ قوانین خداوندی صرف نماز روزہ کو سمجھتے ہیں باقی دوسرے امور میں اپنے کو آزاد محض سمجھتے ہیں۔ سو اول تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ نے نماز روزے ہی میں کونسا اہتمام کیا ہے۔ افسوس ہے کہ معاملات سے یہ آزادی شروع ہوتی تھی مگر چونکہ زمانہ ترقی کا ہے ہر چیز کو ترقی ہوتی ہے اس کو بھی یہاں تک ترقی ہوئی کہ تحریراً اور تقریراً یہ کہا جاتا ہے کہ جس غرض سے نماز مقرر ہوئی تھی یعنی تہذیب نفس اب بوجہ غلبہ تہذیب کے چونکہ وہ ضروری نہیں رہی اس لیے نماز کی ضرورت نہیں۔ روزہ کے متعلق کہتے ہیں کہ فدیہ دیدیں تو روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں اور یہ خرابی اس کی ہے کہ ہر شخص قانون شریعت کے معنی بیان کرنے میں آزاد ہے جس کا جو جی چاہے کہہ دے حالانکہ موٹی سی بات ہے کہ اس وقت قانون کی کتابیں موجود ہیں لیکن پھر بھی اگر کوئی فیصلہ ہائی کورٹ میں جا کر منسوخ ہو تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ماتحت نے اس دفعہ کے معنے نہیں سمجھے اب دیکھئے کہ ماتحت بھی جج ہے اور حاکم بالا بھی جج ہے مگر چونکہ یہ مان

لیا گیا ہے کہ ہائیکورٹ کے جج کی برابر کوئی قانون کو نہیں سمجھتا تو سب اس کا اتباع کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ گو قانون عام ہو اور سب کے پاس ہو مگر پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ بعض لوگ اس قدر سمجھتے ہیں کہ دوسرے نہیں سمجھتے۔ (ضرورۃ العلی فی الدین ج ۲۷)

پردے سے گھبرانا عجیب بات ہے

پردے سے گھبرانا سو اول تو یہ عجیب بات ہے کہ پردے میں رہیں تو عورتیں اور جی گھبرائے مردوں کا خیر اگر تمہارے نزدیک پردے کا توڑ دینا ہی مصلحت ہے تو پردے کو واجب سمجھ کر ہی توڑ دو بے پردگی کا مقصود تو اس طرح بھی حاصل ہو جائے گا اور تمہارے نزدیک اس واسطے کہا کہ واقع میں پردے کا توڑنا ہرگز مصلحت نہیں ہو سکتا اور یہ جو بعض کہتے ہیں کہ صاحب جب طبائع میں فساد ہوتا ہے تو پردے میں بھی سب کچھ ہو جاتا ہے سو یہ کوتاہی نظر کی دلیل ہے واقع میں جو کچھ خرابیاں ہوئیں وہ بے پردگی یا ادھورے پردے کی وجہ سے ہوئیں۔ بھلا کون عاقل کہہ سکتا ہے کہ مرد کبھی اجنبی عورت کو نہ دیکھے اور عورت کبھی اجنبی مرد کو نہ دیکھے اور پھر ان میں کسی قسم کا فساد ہو سکے اور جب ذرا سی بے پردگی میں اتنے فساد ہوئے تو پوری بے پردگی میں جتنے فساد ہوں کم ہیں اسی طرح اگر نماز کو چھوڑنا ہے تو فرض سمجھ کر بھی چھوڑا جا سکتا ہے اس کی کیا ضرورت ہے کہ فرضیت سے انکار کر کے ایمان بھی برباد کر لو۔ ایک صاحب کہنے لگے کہ اگر سود کو حلال نہ سمجھیں تو قوم ترقی نہیں کر سکتی کیونکہ حرام سمجھنے کی صورت میں کم لوگ سود لیں گے، میں نے کہا کہ اول تو آپ کو دوسروں کی کیا فکر، دوسرے حلال کہہ کر بھی تمام قوم ترقی نہیں کر سکتی کیونکہ جو مسلمان قوت ایمان سے سود کو چھوڑ بیٹھے ہیں وہ تمہارے یا مولویوں کے کہہ دینے سے بھی کبھی نہ لیں گے بلکہ یوں کہیں گے علماء بگڑ گئے تو حلال کہہ کر بھی سود خواروں کی تعداد دس پانچ سے زیادہ نہ ہوگی۔ (ضرورۃ العلی فی الدین ج ۲۷)

حضرت عارف رومی کے ایک شعر کا مفہوم

میں جب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مثنوی پڑھا کرتا تھا تو اس شعر میں مجھے خیال ہوا کہ یہ فرض محض شاعرانہ طور پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرما دیا ہے کیونکہ واقعی فرق تو اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب اہل اللہ کے پیٹ سے فضلہ نہ نکلنا جب سبق شروع ہوا تو حضرت قبلہ نے کیا

خوب فرمایا کہ پلیدی سے مراد اخلاق ذمیمہ ہیں اور نور خدا سے مراد اخلاق حسنہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ کھاتے ہیں تو ان کو اخلاق حمیدہ میں مدد ملتی ہے اور دوسرے لوگ کھاتے ہیں تو ان کو اخلاق ذمیمہ میں مدد ملتی ہے تو باوجود اس فرق عظیم کے کفار نے نہ سمجھا اور انبیاء کو اپنی مثل کہا کیونکہ ان میں کوئی انوکھی بات نہ تھی، کھانا بھی کھاتے تھے، پانی بھی پیتے تھے۔ (تفاضل الاعمال ج ۲۷)

فقہ کی تعریف

امام ابوحنیفہ نے فقہ کی تعریف یہی کی ہے کہ **معرفتہ النفس مالھا و علیھا** کہ نفس کا یہ پہچاننا کہ اس کے لیے کیا چیزیں نافع ہیں، کیا چیزیں مضر ہیں۔ سو یہ تعریف ظاہر و باطن دونوں قسم کے احکام کو عام ہے۔ البتہ علم مکاشفہ نہ تو نافع ہے نہ مضر مثلاً اگر کسی کو تجدد امثال توحید وجودی تنزلات ستہ وغیرہ منکشف نہ ہوں تو یہ ذرا بھی قرب الی اللہ میں مانع نہیں لیکن اگر معاملہ درست نہ ہو تو قرب حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا کیا گزری فرمایا کہ ”**فتت الرموز والاشارات ونفدت الحقائق والعبارات وما نفعنا الارکیعات فی جوف اللیل**“ یعنی حقائق و معارف متعارفہ سب فنا ہو گئے صرف چند رکعتیں جو پچھلی رات میں پڑھ لیا کرتا تھا وہ کام آئیں اور علمی تحقیقات کچھ کام نہیں آئیں حالانکہ ان کے پاس کتنے بڑے علوم تھے مگر وہ فقہ نہیں تھے بلکہ علوم مکاشفہ تھے جو کچھ بھی کارآمد نہیں ہوئے۔ (اشرف العلوم ج ۲۷)

اللہ تعالیٰ کی ہستی کی دلیل

جس زمانہ میں میرے ماموں منشی شوکت علی صاحب مدرسہ سرکاری میں مدرس تھے اس زمانے میں ایک انسپکٹر مدارس مدرسہ میں امتحان کے لیے آئے، اثنائے امتحان میں انہوں نے لڑکوں سے اپنے منصب کے خلاف سوال کیا کہ بتلاؤ خدا کی ہستی کی کیا دلیل ہے، لڑکے بیچارے کیا جواب دیتے وہ تو خاموش رہے، ماموں صاحب نے فرمایا کہ جناب مجھ سے پوچھئے میں جواب دوں گا، انسپکٹر صاحب اپنی افسری کے گھمنڈ میں تھے، انہوں نے ناخوشی کے لہجہ میں فرمایا کہ اچھا آپ ہی جواب دیجئے، ماموں صاحب نے فرمایا کہ خدا کی ہستی کی دلیل یہ ہے کہ پہلے تو معدوم تھے اور اب موجود ہو اور ہر حادث کے لیے کوئی علت ہونی چاہیے وہ

علت خدا ہے اس نے جواب دیا کہ ہم کو تو ہمارے ماں باپ نے پیدا کیا ہے نہ کہ خدا نے، ماموں صاحب نے فرمایا کہ آپ کے ماں باپ کو کس نے پیدا کیا، اس نے کہا کہ ان کے ماں باپ نے، ماموں صاحب نے فرمایا کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو الی غیر النھایۃ یوں ہی سلسلہ چلا جاوے گا یا جا کر ختم ہوگا۔ پہلی صورت میں تسلسل لازم آتا ہے جو کہ محال ہے۔ دوسری صورت میں خدا کا وجود ماننا پڑے گا اس کا اس سے کچھ جواب نہ آیا اور اس نے کہا کہ آپ تو منطق کی باتیں کرتے ہیں لوگوں کا مذاق بگڑ گیا ہے کہ دقیق اور گہرے مضامین کو ناقابل التفات سمجھتے ہیں اور سطحی اور پیش پا افتادہ باتوں کو دلائل خیال کرتے ہیں غرض کہنے لگا کہ ہم ان منطقی باتوں کو نہیں جانتے وہ یہ کہ اچھا اگر خدا ہے تو آپ اپنے خدا سے کہئے کہ ہماری آنکھ درست کردے، یہ انسپکٹر کانا تھا، ماموں صاحب نہایت ظریف تھے، انہوں نے کہا بہت بہتر ہے ابھی کہتا ہوں یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کر کے آسمان کی طرف منہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے انسپکٹر صاحب سے کہا کہ میں نے عرض کیا تھا مگر وہاں سے یہ جواب ملا ہے کہ ہم نے اس کو دو آنکھیں عطا کی تھیں، اس نے ہماری نعمت کی ناشکری کی اور کہا کہ ہمارے ماں باپ نے ہمیں پیدا کیا ہے ہمیں اس پر غصہ آیا ہم نے اسکی ایک آنکھ پھوڑ دی، اب اس سے کہو کہ اس آنکھ کو اپنے انہیں ماں باپ سے بنوا جنہوں نے تجھے پیدا کیا ہے، اس جواب پر اس کو بہت غصہ آیا اس کا اور تو کچھ بس نہ چلا مگر معائنہ خراب لکھ گیا، اس گستاخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر درد اٹھا اور ہلاک ہوگیا۔ (شکر المثنوی ج ۲۷)

مثنوی شریف مضامین حقہ سے لبریز ہے

مثنوی ایک ایسی کتاب ہے جو مضامین حقہ سے لبریز ہے مولوی جامی رحمۃ اللہ نے اسکی نسبت فرمایا ہے:

ہست قرآن در زبان پہلوی   مثنوی مولوی معنوی

(یہ مثنوی مولوی معنوی فارسی زبان میں الہامی کتاب ہے)

اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ اس میں اسرار و دقائق قرآنیہ کو بیان فرمایا ہے یہ معنی ایسے ہیں جن سے عوام کو وحشت نہیں ہو سکتی اور دوسرے معنی وہ جن میں عوام کے توحش کا خطرہ ہے اور وہ وہ ہیں جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے غلبہ حال میں بیان فرمائے ہیں یعنی مثنوی حق سبحانہ کا الہامی کلام ہے اور اس مقام پر قرآن سے کلام معروف حق سبحانہ مراد نہیں ہے

بلکہ مطلق کلام حق مراد ہے گو بالوحی نہ ہو بالالہام ہو حق سبحانہ کا کلام فی نفسہ تو حرف وصوت سے پاک ہے مگر جس طرح وہ لباس عربیت میں جلوہ گر ہوا ہے یوں ہی لباس فارسی میں بھی جلوہ گر ہو سکتا ہے اس سے کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب یہ کلام حق ہے تو اس کے لیے بھی وہی احکام ثابت ہوں گے جو قرآن کے ہیں کیونکہ قرآن کا کلام الٰہی ہونا قطعی ہے اور مثنوی کا کلام الٰہی ہونا قطعی نہیں ہے اس لیے دونوں کا حکم ایک نہیں ہو سکتا' قرآن اپنے مرتبہ میں رہے اور مثنوی اپنے مرتبہ میں بلکہ دوسری کتب سماویہ خود کلام قطعی بھی ہیں ان کے لیے بھی کسی حکم کا ہونا محتاج دلیل مستقل ہوگا' خیر یہ وہ معنی ہیں جو حضرت حاجی صاحب نے غلبہ حال میں بیان فرمائے ہیں۔

اہل کمال مغلوب الحال نہیں ہوتے پھر حاجی صاحب کیسے مغلوب ہوئے کیونکہ یہ خود قاعدہ ہی صحیح نہیں کہ اہل کمال مغلوب الحال نہیں ہوتے ضرور ہوتے ہیں مگر ان میں اور غیر اہل کمال میں فرق یہ ہوتا ہے کہ جن احوال سے غیر اہل کمال مغلوب ہو جاتے ہیں اہل کمال ان سے مغلوب نہیں ہوتے بلکہ ان کے مغلوب کرنے والے احوال دوسروں کے احوال سے اقوی ہوتے ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اہل کمال کی مغلوبیت کم ہوتی ہے اور غیر اہل کمال کی زیادہ مگر ان کی نفس مغلوبیت کا انکار مشکل ہے' انبیاء سے زیادہ کون صاحب کمال ہو سکتا ہے لیکن جب ان کے حالات میں غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تاثر من الحال وہاں بھی ہے چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر میں ان الفاظ سے دعا فرمائی تھی: "**اللھم ان تھلک ھذا العصابة لم تعبد بعدالیوم**" (اے اللہ اگر یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو آج کے بعد (کوئی) آپ کی عبادت نہیں کرے گا) اب آپ خیال کر لیجیے کہ اگر غلبہ حال نہ ہوتا تو کیا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس عنوان سے دعا فرماتے جس میں ایہام ہے حق سبحانہ کی احتیاج الی العبادات کا گو آپ کا مقصود یہ نہیں بلکہ آپ کا مقصود یہ ہے کہ اے اللہ آپ نے انسانوں کو اپنی عبادات کے لیے پیدا فرمایا ہے گو آپ کو ان کی احتیاج نہیں ہے اور نہ آپ کا کچھ نفع ہے پس اگر تیرے بندوں کی یہ قلیل جماعت ہلاک ہو گئی تو میرے خیال میں پھر حق کی اشاعت نہ ہو سکے گی اور انسانوں کی پیدائش سے جو مقصود ہے وہ فوت ہو جاوے گا اس لیے آپ اس جماعت کو بچا لیجیے:

رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّایَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ o

یہ اگر غلبہ حال نہ تھا تو کیا تھا یہ واقعات محض تائید کے درجے میں ہیں اگر ان کو کوئی نہ مانے تو اس کو خود غیر انبیاء اہل کمال کا اعتراف تو ماننا ہی پڑے گا۔ (شکر المثنوی ج ۲۷)

مثنوی کا ایک خاص کمال

مثنوی میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کے مضامین حافظہ میں ضبط نہیں ہو سکتے حالانکہ میں اس کی شرح بھی لکھ چکا ہوں اور متعدد بار پڑھنے پڑھانے کا بھی اتفاق ہوا ہے لیکن جب اٹھا کر دیکھتا ہوں تو ہر مرتبہ وہ مجھے نئی معلوم ہوتی ہے اور جن اشعار کے جو مضامین میں نے پہلے سمجھے تھے وہ یاد نہیں آتے بلکہ نئے مضامین یاد آتے ہیں کبھی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا اور خود اپنی شرح کو دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی حالت قرآن شریف کی ہے کہ جب دیکھیے نیا معلوم ہوتا ہے اور اس کے مطالب سمجھنے کے لیے ہی مجھے اپنی تفسیر دیکھنی پڑ جاتی ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن شریف مثنوی شریف بخاری شریف یہ تینوں کتابیں البیلی ہیں یعنی ان تینوں کتابوں کا کوئی ضابطہ نہیں ہے جس کا احاطہ ہو سکے۔ مثنوی اور قرآن کے اس تشابہ طرز بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ مثنوی الہامی کلام حق ہے۔ مثنوی میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وقت وعلو صولت وشوکت معانی کی طرح اس میں شوکت وصولت الفاظ بھی ہے جو اور کتابوں میں نہیں دیکھے جاتے اور اس کا فیصلہ ذوق صحیح کر سکتا ہے کیونکہ یہ ایک ذوقی بات ہے نہ کہ استدلالی دیکھو ایک بلغاء عرب تھے جن پر قرآن کریم کی بلاغت نے وہ اثر کیا ہے کہ باوجود کمال مخالفت وعناد وحق پوشی کے ان کو جرأت نہ ہو سکی وہ جھوٹا بھی کوئی کلام بنا کر اس کے مقابلہ میں لے آئیں اور کہہ دیں کہ یہ اس کے ہم پلہ ہے اور ایک آج کل کے حمقاء ہیں جو مقامات حریری کو بلکہ خود اپنے کلام کو قرآن کے برابر بتاتے ہیں۔ یہ تفاوت کیوں ہے محض اس لیے کہ بلغاء عرب کا ذوق صحیح تھا اور ان کا ذوق فاسد ہے ان کا ذوق صحیح ان کو اعتراف اعجاز پر مجبور کرتا تھا اور ان کا فساد مذاق اس بیہودہ دعوے پر جرأت دلاتا ہے۔ دیکھو بلغاء تصریح کرتے ہیں کہ قرآن میں ابلغ الآیات یہ آیت ہے:

قِیْلَ یٰۤاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآئَکِ وَیٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ وَغِیْضَ الْمَآءُ وَقُضِیَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَی الْجُوْدِیِّ وَقِیْلَ بُعْدًالِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ.

ترجمہ: ''اور حکم ہوگیا کہ اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان تھم جا اور پانی گھٹ گیا اور قصہ ختم ہوا اور وہ (کشتی) جودی پر آٹھہری اور کہہ دیا گیا کہ کافر لوگ اللہ کی رحمت سے دور'' (شکر المثنوی ج ۲۷)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''لو کان بعدی نبی لکان عمراً'' اور یہ نہیں فرمایا لکان ابوبکر اس کی وجہ استادی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بوجہ شدت تعلق برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ملحق برسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حکماً بعد کے مضاف الیہ میں داخل ہیں (شکر المثنوی ج ۲۷)

محبت کا انحصار تین باتوں پر ہے

محبت اور حقوق کا صرف تین چیزیں ہیں جمال، کمال، نوال یعنی عطاء و انعام تو کیا خدائے تعالیٰ کے اندر کوئی کمال نہیں یا اس کی طرف سے کوئی انعام نہیں یا اس کے اندر جمال نہیں ظاہر ہے کہ مرکز تمام کمالات کی وہ ہی ذات پاک ہے اور جو کمال اوروں کے اندر دیکھا جاتا ہے وہ اسی کے کمال کا پرتو ہے۔

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردہ
پس بچشم عاشقاں خودرا تماشا کردہ

(تو نے اپنی خوبی کو خوبصورتی کے چہروں سے ظاہر کر دیا ہے مگر عاشقوں کی نظروں میں نمایاں بن گیا ہے)

پرتو حسنت نگنجد در زمین و آسمان
در حریم سینہ حیرانم کہ چوں جاں کردہ

(تیرے حسن کا پرتو نہ زمین میں سما سکتا ہے نہ آسمان میں، میں حیران ہوں کہ میرے سینہ کی چاردیواری میں کس طرح سمایا ہے)۔ (مظاہر الاحوال ج ۲۷)

عبادت کے مقبول ہونے کی علامت

ایک شخص عبادت کیا کرتا تھا کہ ایک روز اس کو شیطان نے بہکایا، اس کو یہ خیال آیا کہ میں ذکر اور عبادت کرتے کرتے تھک گیا اور ادھر سے نہ پیام ہے نہ جواب ہے۔ یہ خیال کر کے اس روز وہ تمام اپنے اوراد اور عبادت چھوڑ کر سو رہا۔ خواب میں حق تعالیٰ کا پیام آیا کہ تو نے آج ہمارا نام نہیں لیا، عرض کیا کہ نام کیا لوں نہ کچھ جواب ہے نہ پیام ہے، ارشاد ہوا کہ یہ جو تو ہمارا نام لیتا ہے اور تجھ کو توفیق نام لینے کی ہوتی ہے یہی ہماری طرف سے لبیک ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

گفت آں اللہ تو لبیک ماست   ویں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

(انہوں نے کہا کہ تمہارا اللہ کہنا ہماری لبیک ہے تمہارا سوز و درد ہماری پکار ہے)

(مظاہر الاحوال ج ۲۷)

حسن تعلیم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حسن تعلیم کو ملاحظہ فرمایئے کہ آپ فرماتے ہیں **لا یغلبنکم الاعراب علیٰ اسم العشا الاخرۃ و کانو ایسمونہا العتمۃ** (اوکما قال) مطلب یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عشاء کے وقت کو عتمہ کہا کرتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جہلا عرب اس لفظ میں تم پر غلبہ نہ کرنے پائیں کہ تم بھی ان کی طرح عشاء کو عتمہ کہنے لگو۔ اس میں اس بات کی تعلیم ہے کہ شریعت نے جن الفاظ میں اپنی کوئی خاص اصطلاح مقرر کی ہے مسلمانوں کو اسی کا استعمال کرنا چاہئے اس کو چھوڑ کر کفار کی اصطلاح نہ برتنی چاہیئے ظاہر میں تو یہ معمولی بات ہے کہ بول چال میں اپنے اسلامی الفاظ بولے جائیں مگر اس کے چھوڑنے میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر اس تعلیم کی قدر معلوم ہوتی ہے واقعی اگر سب مسلمان الفاظ کو معمولی چیز سمجھ کر دوسری زبان کے مہینے استعمال کرنے لگیں تو رمضان اور عید اور حج وغیرہ کا کسی کو پتہ بھی نہ چلے کہ یہ کب آئے تھے اور کب چلے گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رعایت الفاظ کی تعلیم فرما کر حقیقت میں محض الفاظ کو نہیں سنبھالا بلکہ دین کو سنبھالا ہے مگر آج کل لوگ ان کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ (اسباب الفتنہ ج ۲۸)

پیرانی صاحبہ کی عملی تبلیغ

میں نے اپنے گھر میں کہا کہ یہ کام تمہارے کرنے کا ہے کیونکہ وعظ کہاں تک اثر کرے گا تم اس رسم کو توڑو اور عورتوں کو سمجھاؤ کہ میت کے گھر جا کر کھانا پینا بہت بری بات ہے۔ ایک تو ان غریبوں پر موت کا صدمہ ہوا اور دوسرا صدمہ ان پر یہ ڈالا جاوے کہ وہ آنے والیوں کے کھانے پینے اور پان چھالیہ کا انتظام کریں بہت شرم کی بات ہے میرے گھر میں اس سے پہلے کسی شادی غمی میں نہیں جاتی تھیں کیونکہ اکثر جگہ منکرات ہوتے ہیں مگر میں نے اس ضرورت سے ان کو غمی کے مواقع میں جانے کی اجازت دے دی اور یہ کہا کہ دین کا کام ہے اس لئے تم کو شرکت کرنی

چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا کرنا شروع کیا اور عورتوں کو میت کے گھر جا کر کھانے پینے حتیٰ کہ پان کھانے سے بھی روکا زیادہ اثر اس کا ہوا کہ انہوں نے خود اس پر عمل کیا کہ جس کے گھر گئیں اس کے یہاں پان تک نہ کھایا اول اول تو بہنوں نے ناک منہ چڑھایا کہ کیا ہم ایسے گرے پڑے اور مفلس غریب ہیں جو آنے والیوں کے پان چھالیہ کی بھی ہمیں مقدور نہ ہو لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں سب مستورات نے اس پر عمل شروع کر دیا اور اب کوئی میت کے گھر پر پان تک نہیں کھاتی مرد تو بعض دفعہ چوک بھی جاتے ہیں مگر عورتیں بالکل پختہ ہیں۔ (اسباب الفتنہ ج ۲۸)

قبروں کی پختگی پر فخر قابل افسوس ہے

شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے، ناگہ ایک رئیس زادے اور غریب زادے میں گفتگو ہوئی رئیس زادے نے کہا کہ دیکھو ہمارے باپ کی قبر کیسی عمدہ اور مضبوط ہے جس پر شان وشوکت برستی ہے اور تمہارے باپ کی قبر کچی اور شکستہ ہے جس پر بے کسی برستی ہے۔ غریب زادہ نے کہا بے شک یہ فرق تو ہے لیکن قیامت کے دن میرا باپ تو قبر میں سے آسانی سے نکل آئے گا اور تمہارا باپ پتھر ہی ہٹانے میں رہے گا وہ اتنے چٹانوں اور پتھروں کو ہی ہٹاتا رہے گا میرا باپ جنت میں جا پہنچے گا کچھ ٹھکانا ہے اس تفاخر کا کہ قبروں کی پختگی پر بھی فخر کیا جاتا ہے۔ (اسباب الفتنہ ج ۲۸)

ہمارے سلف کا فقر اختیاری تھا

خود حضرت عمرؓ سے عرض کیا گیا تھا کہ اب فتوحات میں وسعت ہوگئی ہے آپ اتنی تنگی کیوں فرماتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہمارے بہت سے بھائی اس فقر کی حالت میں شہید ہوگئے انہوں نے خدا کے راستہ میں عمل زیادہ کیا اور دنیا سے تمتع حاصل نہیں کیا ان کا سارا ثواب آخرت میں ذخیرہ رہا اور ہم لوگوں نے فتوحات حاصل کر کے بہت کچھ مال ودولت حاصل کر لی ہے اور ہماری محنت کا کچھ ثمرہ یہاں مل گیا ہے۔ اب مجھے اس مال ودولت سے منتفع ہوتے ہوئے یہ ڈر لگتا ہے کہ قیامت میں کہیں یہ نہ کہہ دیا جائے اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيٰوتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ کہ تم نے حیات دنیا میں مزے اڑا لئے ہیں اور طیبات سے تمتع حاصل کر لیا ہے اب یہاں (تمہارے واسطے کچھ نہیں

بس) تم کو عذاب ذلت کی سزا دی جائے گی اس لئے کہ تم بڑا بننا چاہتے تھے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ہمارے سلف کا فقر اختیاری تھا اضطراری نہ تھا۔ (اسباب الفتنہ ج ۲۸)

استقامت

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک چور کو پھانسی پر لٹکا ہوا دیکھا پوچھا کہ اس کو پھانسی کیوں دی گئی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یہ بڑا پکا چور تھا ایک بار گرفتار ہوا تو اس کا داہنا ہاتھ کاٹا گیا پھر بایاں پیر کاٹا گیا پھر بھی چوری سے باز نہ آیا تو خلیفہ نے پھانسی کا حکم دیا حضرت جنیدؒ نے یہ سن کر اس کے پیر چوم لئے لوگوں نے عرض کیا حضرت آپ چور کے پیر چومتے ہیں فرمایا میں نے چوری کی وجہ سے اس کے پیر نہیں چومے بلکہ اس کے استقلال کے قدم چومے ہیں کہ یہ اپنے محبوب پر گو وہ مذموم ہی تھا ایسے استقلال کے ساتھ جما رہا کہ اسی میں جان دے دی، افسوس ہم اپنے محبوب محمود کے ساتھ بھی یہ معاملہ نہیں کرتے تو جیسے حضرت جنیدؒ نے برے فعل سے نتیجہ اچھا نکال لیا۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ گو اس شخص کا گالیاں دینا برا فعل تھا مگر سادگی کے ساتھ یہ اس میں خوبی تھی جس کا یہ اثر ہوا کہ لوگ اس کی باتوں کا برا نہ مانتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ سادگی اور بے تصنعی عجب چیز ہے جو تلخ کو شیریں کر دیتی ہے۔ (اسباب الفتنہ ج ۲۸)

مدرسین کی ایک کوتاہی

ہندوستان کے اکثر مدرسین میں بھی یہ برا مرض ہے کہ اپنی غلطی کا کبھی اعتراف نہ کریں گے اگر کسی مقام کی غلط تقریر زبان سے نکل گئی اور طالب علم نے کہہ دیا کہ اس مقام کی یہ تقریر نہیں بلکہ صحیح تقریر یہ ہے تو کبھی طالب علم کی بات کو نہ مانیں گے برابر رد کئے جائیں گے یہاں تک کہ ایسی جھک جھک میں سبق کا وقت ختم ہو جاتا ہے ان کو اس حدیث سے سبق لینا چاہئے کیا ان کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے بھی بڑھ گیا حضورؐ تو ایک جواب دے کر حضرت جبریلؑ کے مطلع کرنے سے علی الاعلان اپنے جواب کا ناتمام ہونا ظاہر فرمائیں اور تم کبھی اپنی کوتاہی کو ظاہر نہیں کرتے ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کی یہ حالت تھی کہ اگر درس میں کسی ادنیٰ طالب علم نے بھی حضرت کی تقریر پر اعتراض کر دیا اور اس کا اعتراض معقول ہوا تو فوراً اپنی غلطی کا اعتراف فرما لیتے اور کئی بار

یہ فرماتے رہتے کہ ہاں واقعی مجھ سے غلطی ہوئی تم نے صحیح سمجھا یہاں تک کہ طالب علم شرمندہ ہو جاتا اور اس سے ایسی عظمت مولانا کی طلبہ کے دل میں پیدا ہوتی تھی کہ تاویل کرنے والے مدرسین کو اس کا دسواں حصہ بھی نصیب نہیں ہو سکتی البتہ مدرسین عرب کا مذاق وہی ہے جو حضرت استاد کا مذاق تھا وہ کبھی اعتراف خطا سے نہیں شرماتے۔ (الحج ج ۲۸)

کبائر بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے

الحج یھدم ما کان قبلہ سے ایک تو دیون (یعنی حقوق العباد و حقوق اللہ از قسم صلوٰۃ فائتہ وصوم فوت شدہ و زکوٰۃ واجبہ سبقا و نحوھا) مستثنیٰ ہیں دوسرے کبائر مستثنیٰ ہیں حج سے کبائر معاف نہیں ہوتے صرف صغائر معاف ہوتے ہیں کیونکہ قرآن میں اَلْحَسَنَاتُ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ کہ نیک کام برے کاموں کو مٹا دیتے ہیں اور قرآن ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے سیئات سے مراد صغائر ہیں چنانچہ ارشاد ہے اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ یہاں سیئات کو کبائر کے مقابلہ میں لانا اس کی دلیل ہے کہ مراد صغائر ہیں پس معلوم ہوا کہ اعمال حسنہ سے صرف صغائر معاف ہوتے ہیں کبائر معاف نہیں ہوتے جب تک کوئی دلیل نہ ہو اور ہجرت سے بھی صغائر ہی معاف ہوتے ہیں کبائر معاف نہیں ہوتے۔ (الحج ج ۲۸)

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ حجر اسود کسوٹی ہے اس کے چھونے سے انسان کی اصلی حالت ظاہر ہو جاتی ہے اگر واقعی فطرۃ صالحہ ہے تو حج کے بعد اعمال صالحہ کا اس پر غلبہ ہوگا اور اگر فطرۃ طالع ہے محض تصنع سے نیک بنا ہوا ہے تو حج کے بعد اس پر اعمال سیئہ کا غلبہ ہوگا جن لوگوں پر حج فرض نہیں وہ توکل کے دعوے پر ارادہ نہ کریں بلکہ وہ ہندوستان ہی میں رہ کر خدا کو راضی کریں اور اپنے کو کسی محقق کے سپرد کریں جس وقت وہ حج کی اجازت دے اس وقت حج کا ارادہ کریں ایسے ہی لوگوں کے متعلق حضرت مسعود مکؒ کا قول ہے۔

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید — معشوق در نیجاست بیائید بیائید
(اے قوم جو حج کو گئی ہوئی ہے کہاں ہو، معشوق (محبوب حقیقی) تو یہاں ہے یہاں آؤ)

اس مضمون کے مخاطب تو ناقص ہیں اور کاملین کے بارہ میں مولانا فرماتے ہیں۔

حج زیارت کردن خانہ بود — حج رب البیت مردانہ بود
(حج بیت اللہ کی زیارت کرنے کا نام ہے، اس میں خانہ کعبہ کے مالک کی ہیبت مردانہ ہے)

حج مردانہ

جس پر حج فرض ہو اس کو اس کی کوشش کرنا چاہئے کہ حج مردانہ نصیب ہو جس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی محقق سے تعلق پیدا کر کے حج کو جائیں ان شاء اللہ اگر درجہ اعلیٰ میں کامل حج نہ ہوگا تو ایک درجہ میں کامل ضرور ہو جائے گا تیسرے وہ لوگ ہیں جن پر حج فرض نہیں مگر خدا تعالیٰ نے ان کو وسعت قلب وقوت توکل عطا فرمائی ہے ان کو بدوں زادوراہ کے بھی حج کی اجازت ہے چنانچہ ایک صاحب حال عازم نے شاہ فضل الرحمٰن صاحب سے سفر حج کی اجازت مانگی تو شاہ صاحب نے فرمایا تم کو شرائط حج بھی معلوم ہیں کہا ہاں حضور معلوم ہیں فرمایا بتلاؤ کیا معلوم ہے کہا

دررہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجان　　شرط اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی
(لیلیٰ کی راہ کی منزل جان کو خطرے لاحق ہیں اس راہ کی شرط اوّل مجنون ہونا ہے)

اس جواب سے شاہ صاحب پر وجد کی سی حالت طاری ہوئی اور ایک چیخ ماری پھر چونکہ صاحب مقام تھے اس لئے سنبھلے اور فرمایا کہ یہ سب فضول ہے زادوراہ ساتھ ہونا چاہئے جس کا شریعت میں حکم ہے مگر وہ مولوی صاحب بدوں زادوراہ ہی کے چل پڑے اور چونکہ توکل صحیح تھا اس لئے کسی جگہ پریشان نہیں ہوئے پھر ان کی ایک کرامت یہ ظاہر ہوئی جس کی مجھ سے ایک حاجی نے چشم دید روایت کی کہ جب بیت اللہ میں داخل ہونے لگے تو شیبی (خادم کعبہ) سب سے فیس لے کر اندر جانے کی اجازت دیتا تھا مولوی صاحب سے بھی فیس لی اور انہوں نے دے دی مگر ان سے رقم لیتے ہی اس پر پریشانی کا اثر ظاہر ہوا اور حجاج کے نکلنے کے وقت وہ ایک ایک کا منہ تکتا تھا جب یہ باہر آنے لگے تو اس نے ان کی رقم واپس کر دی تو ایسے لوگ بدوں زادوراہ کے جائیں تو مضائقہ نہیں باقی ہر اک کا یہ منہ نہیں۔ (الحج ج ۲۸)

ریل سے جہنم کی یاد تازہ ہوتی ہے

مولانا محمد یعقوبؒ صاحب نے فرمایا تھا کہ ریل کو دیکھ کر مجھے جہنم یاد آتی ہے کیونکہ اس کا انجن جہنم کی اس صفت کا مصداق ہے وَهِيَ تَفُوْرُ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ کہ اس قدر جوش کھاتا ہے گویا غصہ اور قہر سے ابھی پھٹ پڑے گا اور ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے کہ

ریل کے تیسرے درجہ جہنم کی اس صفت کا مذکور ہوتا ہے کُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا کہ جیسے جہنم میں ایک جماعت دوسری جماعت پر لعنت کرے گی ایسے ہی ریل میں تیسرے درجہ والے آپس میں خوب لڑتے ہیں جب کسی اسٹیشن پر نئے نئے مسافر تھرڈ میں بھرتے ہیں تو جو پہلے سے بیٹھے ہوتے ہیں وہ انہیں کوستے برا بھلا کہتے ہیں کہ سارے اسی گاڑی میں آ جاؤ تمہارے واسطے اور کہیں جگہ نہیں رہی۔ منہ پر آنکھیں نہیں کہ یہ تو پہلے ہی سے بھر رہی ہے بس تمہاری سزا یہ ہے کہ کھڑے رہو۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ جگہ تو بہت ہے سیدھے ہو کر بیٹھو کیا تم ہی نے کرایہ دیا ہے تم ریل کے مالک ہو پھر خوب گالم گلوچ اور جھگڑا فساد ہوتا ہے۔ اس وقت بالکل یہی منظر ہوتا ہے کُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا اور جب کہتے ہیں کہ ہم نے بھی تو ٹکٹ لیا ہے اس وقت اس کا نمونہ ہوتا ہے لکل ضعف اور جب کہتے ہیں کہ تم کو ہم پر کیا ترجیح ہے اس وقت اس کا نمونہ ہوتا ہے فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ۔

ایک شان اس میں جنت کی بھی ہے وہ یہ کہ جنت میں جس چیز کو دل چاہے گا وہ جلدی مل جائے گی اس بات میں ریل جنت کے مشابہ ہے کہ جس چیز کو دل چاہتا ہے ریل کے ذریعہ سے جلدی حاصل ہو جاتی ہے چنانچہ کلکتہ اور پشاور کے میوے یہاں دوسرے دن پہنچ جاتے ہیں بڑے شہروں میں ہر ملک کی چیزیں ہر وقت ملتی ہیں نیز جیسے جنت میں جہاں جانے کو دل چاہا فوراً پہنچ گئے اسی کا نمونہ گو ادنی ہی نمونہ ہو اس میں بھی ہے چنانچہ ظاہر ہے اور اس کے متعلق اسٹیشنوں کے انداز سے تقارب اور ہر اسٹیشن پر ضرورت کی چیزیں ملنا بالکل بلاد سباط کو یاد دلاتا ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بَارَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّ قَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَ اَيَّامًا اٰمِنِيْنَ۔ (اور ہم نے ان کے اور ان کی بستیوں کے درمیان میں جہاں ہم نے برکت کر رکھی ہے بہت سے گاؤں آباد کر رکھے تھے جو نظر آتے تھے اور ہم نے ان دیہات کے درمیان ان کے چلنے کا ایک خاص انداز کر رکھا تھا کہ بے خوف خطر ان میں راتوں کو اور دنوں کو چلو۔) اور گو یہ نعمت دنیوی تھی مگر اس پر ناشکری کی مذمت اس طرح فرمائی گئی فَقَالُوْا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِ نَا وَظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَا هُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنَا هُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (پس وہ کہنے لگے کہ اے ہمائے پروردگار ہمارے سفروں میں درازی کر دے اور

انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا پس ہم نے ان کو افسانہ بنا دیا اور بالکل تتر بتر کر دیا) الآیۃ پس اس طرح یہ ریل بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اس کا شکر کرنا چاہیے اور اس کے اندر جو مشابہتیں جنت و دوزخ کی مذکور ہوئیں ان پر اگر نظر کی جائے تو نعمت ظاہرہ کے ساتھ اس سے نعمت باطنہ یعنی تذکر آخرت بھی حاصل ہوگی۔ (النعم المرغوبہ ج ۲۸)

بدنظری سے سیری نہیں ہوتی

دیگر معاصی اور بدنگاہی کی معصیت میں ایک اور فرق ہے وہ یہ کہ صدور کے بعد سب گناہوں کا اثر ختم ہو جاتا ہے اور دل بھر جاتا ہے مگر بدنگاہی ایسی شئے ہے کہ جب صادر ہوتی ہے اور زیادہ تقاضا ہوتا ہے کہ اور دیکھو آدمی کھانا کھاتا ہے سیر ہو جاتا ہے پانی پیتا ہے پیاس بجھ جاتی ہے، مگر یہ نظر ایسی بلا ہے کہ اس سے سیری نہیں ہوتی اس حیثیت خاص سے یہ تمام گناہوں سے بڑھ کر ہے۔ (غض البصر ج ۲۸)

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ اللہ تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے چنانچہ حدیث میں ہے **انا غیور و اللّٰہ اغیر منی و من غیرۃ حرم الفواحش ماظھر منھا وما بطن** اور یہ سب فواحش ہیں آنکھ سے دیکھنا ہاتھ سے پکڑنا پاؤں سے چلنا کیونکہ ان سب کو شارع نے زنا ٹھہرایا ہے۔ (غض البصر ج ۲۸)

الفاظ و معانی

زمانہ طالب علمی میں ہم لوگ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عربی عبارتیں مقفا و مسجع لکھ کر پیش کرتے تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ تم لوگ معانی کو الفاظ کے تابع کرتے ہو الفاظ کو معانی کے تابع نہیں کرتے اس کے بعد قافیہ کی رعایت سے منع فرمایا پھر قافیہ کی رعایت چھوڑنے کے بعد عبارت کا رنگ بالکل بدل گیا اب خود معلوم ہوتا تھا کہ پہلی مقفا عبارتیں اس کے سامنے بالکل ردی تھیں۔ قافیہ پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شیخ صاحب نے کسی جاٹ سے کہا کہ جاٹ رے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ اس نے جواب دیا کہ شیخ رے شیخ تیرے سر پر کولھو شیخ نے کہا واہ قافیہ تو ملا ہی نہیں تو وہ جاٹ کہتا ہے کہ بلا سے بوجھ میں تو مرے گا۔ دیکھئے اس جاٹ نے بھی قافیہ کے ضروری نہ ہونے کو سمجھ لیا۔ جو مضامین صحیح ہوتے ہیں وہ عام لوگوں کے دماغوں میں بھی آجاتے ہیں۔ (مظاہر الاقوال ج ۲۸)

دروغ برگردن راوی کہنے سے بری الذمہ نہیں ہوسکتا

بعض گناہوں کا گناہ ہونا لوگوں کو معلوم نہیں جیسے بے تحقیق کسی بات کا نقل کرنا اور سنی سنائی بات کو بدوں تحقیق کے فوراً زبان سے نکال دینا اس کو بہت لوگ گناہ ہی نہیں جانتے حتیٰ کہ اتقیاء بھی اس میں مبتلا ہیں اور جو بہت محتاط ہیں وہ سنی سنائی بات کو نقل کر کے اخیر میں کہہ دیتے ہیں کہ دروغ برگردن راوی اول (جھوٹ کا گناہ اول راوی کی گردن پر ہے گویا اس کہنے سے وہ بری ہوگئے ہرگز بری نہیں ہو سکتے اگر یہ قاعدہ ہوتا کہ سارا گناہ راوی اول ہی پر ہو اور اس سے سن سنا کر جو لوگ بعد میں نقل کریں وہ بریٔ الذمہ ہوں تو واقعہ افک میں حق تعالیٰ کیوں لتاڑتے اور ان پر یہ جرم کیوں قائم کرتے **اِذْتَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّالَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ** (جبکہ تم اپنی زبانوں سے اس افتراء کا تذکرہ کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی) کیونکہ وہاں بھی تو ایک راوی اول تھا جس نے یہ بہتان تراشا تھا اور اسی سے یہ بات مدینہ میں پھیلی تھی کیونکہ اول منافقین نے اس بات کا چرچا کیا تھا پھر کچھ مسلمانوں نے بھی منافقین سے سن کر تذکرہ شروع کیا تھا جس پر یہ آیات نازل ہوئیں جن میں یہ نہیں کہا گیا کہ دروغ برگردن راوی اول (جھوٹ کا گناہ پہلے راوی کی گردن پر ہے) بلکہ یہ فرمایا گیا ہے **اِنَّ الَّذِيْنَ جَآؤُا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ** (کہ جن لوگوں نے یہ بہتان باندھا ہے وہ تمہارے ہی میں سے ایک جماعت ہے تم اس واقعہ کو اپنے لئے برا مت سمجھو بلکہ اس میں تمہارے لئے خیر ہے ان میں سے ہر شخص کے لئے وہ ہے جو گناہ حاصل کیا ہے) کیونکہ ایک تو اس سے افتراء (یعنی حد قذف ۱۲) کا حکم معلوم ہو جائے گا دوسرے یہ معلوم ہو جائے گا کہ سنی سنائی بات کا نقل کرنا اور اس کا اعتبار کرنا جائز نہیں۔ (مطاہر الاقوال ج ۲۸)

بڑوں کی موت میں حکمت

حضرت استاد علیہ الرحمۃ نے اس کا مطلب عجیب بیان فرمایا کہ اگر موت نہ ہوتی تو آج پہلے زمانہ کے اسخیاء حاتم وغیرہ اور پہلے زمانہ کے اتقیاء حضرات انبیاء علیہم السلام وصحابہ وغیرہ اور پہلے زمانہ کے بہادر حضرت خالدؓ بن ولید اور رستم وغیرہ سب موجود ہوتے پھر ان کے ہوتے

ہوئے ہماری سخاوت وشجاعت و استقلال کی کیا خاک قدر ہوتی کچھ بھی نہیں اس وقت جو ہمارے کمالات کی قدر ہے وہ موت ہی کی برکت سے ہے کہ پہلے زمانہ کے اہل کمال اس وقت مفقود ہیں پس شعر کا حاصل یہ ہوا کہ کبرنی موت الکبراء بڑوں کی موت نے ہمیں بڑا بنا دیا ہے پھر فرمایا کہ مطلب تو یہی ہے چاہے متنبی نے بھی نہ سمجھا ہو واقعی اس وقت یہ شعر ایک علمی پاکیزہ مضمون پر مشتمل ہوگیا وھو کما قال ابوحنیفۃ فی جواب من مدحہ واثنی علیہ (اور ایسا ہے جیسا کہ ابوحنیفہ نے اس شخص کے جواب میں فرمایا ہے جس نے آپ کی تعریف اور ثناء کی ہے)

خلت الدیار فسدت غیر مسود   ومن الشقاء تفردی بالسودد

(کذا فی مناقب الامام للقاری ۱۲)

(یہ شعر امام اعظم کے مناقب میں جو قاری نے لکھے ہیں مذکور ہے)(مطاہر الاقوال ج ۲۸)

نماز اور بیت الخلاء میں ہجوم وساوس

شیطان کی چالوں کو عارفین خوب سمجھتے ہیں امام صاحب نے خوب سمجھا کہ یہ جو دفن کر کے بھول گیا ہے اس کو شیطان نے بھلایا ہے وہ اس کو پریشان کرنا چاہتا ہے اس لئے آپ نے ایسی تدبیر بتلائی جس سے شیطان جلدی سے بتلا دے کیونکہ اس کو نماز گوارا نہیں اسی لئے یہ نماز میں وساوس بہت زیادہ ڈالتا ہے دنیا بھر کی باتیں نماز ہی میں یاد دلاتا ہے واللہ بڑی شرم آتی ہے کہ دو جگہ بہت وساوس آتے ہیں ایک بیت الخلاء میں دوسرے نماز میں، بیت الخلاء شعراء کے لئے بہت مناسب جگہ ہے وہاں بیٹھ کر مضامین خوب ذہن میں آتے ہیں شاعروں کے لئے بیت الخلاء فرحت خانہ ہے جیسا کبھی ظالموں کے لئے جیل خانہ بھی ہو جاتا ہے چنانچہ ریل میں ایک عہدہ دار شخص نہایت بدخلق بدزبان سفر کر رہا تھا کئی آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی مسافروں کو اس سے بہت تکلیف تھی بے چارے کھڑے کھڑے جا رہے تھے کسی کو جگہ نہ دیتا تھا اتفاق سے اس کو بیت الخلاء جانے کی حاجت ہوئی جب اس نے اندر کی چٹخنی لگائی تو نہ معلوم کس طرح سے لگ گئی کہ پھر کھل نہ سکی اب آپ اندر قید ہوگئے جب نکلنے لگا تو کواڑ نہ کھل سکا اول تو زور لگاتا رہا مگر جب دیر ہوگئی تو مسافروں کی خوشامد کرنے لگا لوگوں نے کہا بس تمہاری یہی سزا ہے کہ اندر بند رہو تم لوگوں کو بہت تنگ کر رہے تھے غیب سے تم کو قید کیا

گیا ہے آخرکار غریب نے منت سماجت کی کہ اب کسی کو کچھ نہ کہوں گا جب خوب پختہ عہد لے لیا تب کواڑ کھولا اس کے بعد بے چارہ شرمندہ ہو کر تختہ کے ایک کنارہ پر خاموش بیٹھ گیا۔

غرض ہم کو ایک تو پاخانہ میں بہت وساوس آتے ہیں اور ایک نماز میں اور اس کا ایک راز ہے ورنہ ظاہر میں تو اس حالت سے سخت افسوس ہوتا ہے کہ ہماری حالت نماز میں وہ ہے جو بیت الخلاء میں ہوتی ہے مگر راز معلوم کرنے کے بعد زیادہ وحشت نہ رہے گی گو حالت وہ بھی اچھی نہیں راز یہ ہے کہ وساوس اس کام میں آیا کرتے ہیں جس کے کرنے میں سوچ اور فکر کی ضرورت نہ ہو دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جس کام کی خوب مشق ہو کیونکہ مشق کے بعد وہ کام تو خود بخود ہوتا رہے گا قلب کو ادھر متوجہ ہونے کی ضرورت نہ ہوگی اب لامحالہ وہ کسی دوسری طرف متوجہ ہوگا تو ہم کو جیسے پاخانہ کی مشق ہے کچھ سوچنا نہیں پڑتا ایسی ہی نماز کی مشق ہے جس میں کچھ سوچنا نہیں پڑتا بلکہ جہاں تکبیر کہی فوراً گھڑی کی سوئی کی طرح زبان چلنے لگی گویا تکبیر کہنا کوک بھرنا ہے اس کے بعد گھڑی خود چلتی رہے گی اسی لئے اکثر لوگ ہر نماز میں دو ہی چار سورتیں ہمیشہ پڑھتے ہیں کیونکہ وہ زبان پر چڑھی ہوئی ہیں جو **قل ھو اللہ ، انا اعطینا ، لایلف والعصر** ہی کے اندر اندر محدود ہیں اور یہ اس لئے تجویز کی ہیں کہ ان سے چھوٹی اور کوئی نہیں اگر کوئی سورت ان سے بھی چھوٹی ہوتی تو اسی کو تجویز کرتے چنانچہ ایک شخص ہر نماز میں صرف قل ھو اللہ پڑھا کرتا تھا کسی نے اس کا سبب پوچھا کہ ہر نماز میں قل ھو اللہ ہی کیوں پڑھتے ہو کہنے لگا اس لئے کہ اس سے چھوٹی کوئی سورت نہیں ورنہ اسے پڑھتا غرض نماز میں سب کام بے سوچے ہوتے ہیں اس وجہ سے نماز میں وسوسے زیادہ آتے ہیں۔ (مطاہر الاقوال ج ۲۸)

شادی ایک ماہ کی خوشی کا نام ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے دریافت کیا تھا کہ شادی کیسی چیز ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: **سرور شھر** یعنی ایک ماہ کی خوشی ہے سائل نے کہا **ثم ماذا** پھر کیا ہوتا ہے فرمایا: **لزوم مھر** (مہر کا لازم ہونا) اس نے پوچھا **ثم ماذا** پھر کیا؟ فرمایا: **کسور ظھر** (کمر کا ٹوٹنا) اس نے کہا **ثم ماذا** فرمایا **غموم دھر** یعنی عمر بھر کا غم لگ جاتا ہے۔ (ازالۃ الغین ج ۲۸)

تعلق مع اللہ کی برکت

ایک پادری نے لکھا ہے کہ مسلمان اپنے خدا سے شرمندہ نہیں ہے اس واسطے شگفتہ رہتے ہیں عاصی اور مطیع کی حالت میں ضرور فرق ہوتا ہے بلکہ ادنیٰ مسلمان کی حالت میں بھی کافر سے فرق ہوتا ہے کیونکہ تعلق مع اللہ کچھ نہ کچھ ہر مسلمان کو حاصل ہے جس کی وجہ سے اس کی حالت کو اس شخص کی حالت سے ضرور فرق ہوتا ہے جس کو بالکل تعلق نہیں یعنی کافر آپ کو نسبت حق تعالیٰ سے ضرور حاصل ہے گو آپ کو خبر نہیں

یک سبد پرناں ترا بر فرق سر — تو ہمی جوئی لب ناں در بدر
تابزانو غرق ہستی اندر آب — وز عطش و ز جوع گشتی خراب

(ایک ٹوکرا روٹوں کا تیرے سر پر رکھا ہے اور تو ایک روٹی کے ٹکڑے کے لئے در بدر مارا پھرتا ہے تو زانو تک پانی میں کھڑا ہے اور بھوک اور پیاس سے خراب ہوتا ہے) (لفظاہر ج ۲۸)

لیڈران قوم کی خیر خواہی کی عجیب مثال

آج کل لیڈران قوم نے دین میں وہ تصرفات کئے ہیں اور ایسی خیر خواہی اس کے ساتھ کی ہے جیسے کسی بوڑھیا نے ایک شاہی باز کے ساتھ کی تھی حکایت اس کی اس طرح ہے کہ ایک شاہی باز اڑ کر ایک بڑھیا کے یہاں جا بیٹھا بڑھیا نے اس کو پکڑ لیا اور اس کی چونچ اور پنجوں کو دیکھ کر بڑا رحم آیا دیکھا چونچ ٹیڑھی ہے ناخن کس قدر بڑھے ہوئے ہیں اور ٹیڑھے بھی ہیں اور اس کو گود میں لے کر رونا شروع کیا کہ ہائے بچے تو کیسے زمین پر بیٹھتا ہوگا تیری انگلیاں ٹیڑھی ہیں ناخن اتنے بڑھ گئے ہیں اور کھاتا کیسے ہوگا کیونکہ چونچ بھی ٹیڑھی ہے معلوم ہوتا ہے کہ تو بے ماں باپ کا ہے کوئی تیری غور کرنے والا نہیں ہے جو ناخن کاٹتا اور چونچ کو درست کرتا ہے اور رحم وشفقت نے ایسا زور کیا کہ قینچی لے کر اس کے ناخن سب کاٹ دیئے اور چونچ بھی تراش دی اپنے نزدیک تو بڑھیا نے اس کی بڑی خیر خواہی اور ہمدردی کی مگر خدا بچاوے ایسی ہمدردی سے کہ اس کو برباد ہی کر دیا نہ وہ شکار پکڑنے کے کام کا رہا اور نہ کھانے کے۔

یہی خیر خواہی اسلام کے ساتھ آج کل کے ہمدردان اسلام کرتے ہیں کہ یہ بھی فضول اور وہ بھی فضول نماز بھی زائد ہے روزہ بھی زائد ہے زکوٰۃ کی حاجت نہیں، حج بھی فضول ہے اور پھر

مسلمان ہونے کے مدعی معلوم نہیں اسلام کس چیز کا نام ہے کوٹ کا نام ہے یا پتلون کا نام ہے جب اسلام کا ہر جز فضول ہے تو کل بھی فضول ہے اس کا نام ہی کیوں لگا رکھا ہے اور ہم تو جانیں تم بھی فضول ہو جو ایسی فضول باتیں کرتے ہو سچ یہی ہے کہ درحقیقت یہی لوگ فضول ہیں ایک پیسہ کا سنکھیا کھا کر مر جاتے تو دنیا ایسی ناپاک وجود سے پاک ہو جاتی ۔ (الظاہر ج ۲۸)

حضرت حکیم الامتؒ کا ایک خواب

میرا ایک خواب ہے جو موافقت قواعد صحیحہ کی وجہ سے میرے نزدیک خوب ہے اور اس سے اچھا فوٹو اس مبحث کا شاید ہی ملے میرے دل میں کھٹک پیدا ہوئی اور یہ زمانہ طالب علمی دیوبند کا ذکر ہے کہ غیر مقلد اپنے ہر مدعا پر حدیث پیش کرتے ہیں جو ہمارے امام کے خلاف ہوتی ہے شاید ان ہی کا طریق حق ہو خواب دیکھا کہ میں دہلی میں ایک محدث میاں صاحب کے مکان پر ہوں دیکھا کہ وہاں چھاچھ تقسیم ہو رہی ہے مجھے چھاچھ کا شوق ہے انہوں نے مجھ کو بھی دی مگر میں نے نہیں لی۔ بس آنکھ کھل گئی معا تعبیر ذہن میں آئی کہ علم کی صورت رؤیا میں لبن ہے جیسا کہ حدیث میں موجود ہے اور چھاچھ کی صورت تو دودھ کی ہے مگر حقیقت بالکل مغائر ہے معنی اور مغز اس میں نہیں پس یہ سمجھ میں آیا کہ ان کا طریقہ صورت دین تو ہے مگر اس میں معنی دین بالکل ندارد ہے یہ لوگ امام صاحب پر خلاف حدیث کا اعتراض کرتے ہیں۔ امام صاحب نے بھی حدیث کے خلاف کوئی بات نہیں کہی مگر معنی اور مغز کو لے کر اور یہ لوگ صرف صورت سے شبہ کرتے ہیں تو یہ معارضہ معارضہ حدیث نہ ہوا بلکہ معارضہ معنی وصورت حدیث ہوا اور ایسا ممکن ہے

تارکین تقلید کا حال

جو لوگ تارک تقلید ہیں وہ کہنے کو تو ائمہ کے خلاف ہیں مگر درحقیقت دین کے خلاف ہیں اس کی بناء صرف خود رائے پر ہے اور اتباع ہوئی اور اعجاب سب جانتے ہیں مہلک چیزیں ہیں جس کا جی چاہے تجربہ کر کے دیکھ لے کہ تارکین تقلید میں اکثر یہ دونوں مرض رگ و پے میں گھسے ہوئے ہوتے ہیں ہمارا علم کچھ بھی نہیں ہم سے بڑوں نے اور ان لوگوں نے جن کو علم مسلم ہے کیوں تقلید کو اختیار کیا معلوم ہے کہ ہماری رائے غلط اور متہم ہے تقلید شخصی چھوڑ کر گنجائشیں نکالی جاویں تو نتیجہ اس کا بہت ہی جلد آزادی نفس پیدا ہو جاتا ہے ان میں سے بعض نفس کے نزدیک اجتہاد ہی کوئی چیز نہیں بدوں نص کے ان کے نزدیک کوئی حکم ہی ثابت نہیں ۔ (ادب الاعلام ج ۲۸)

غیر مقلدین کی آمین

ایک شخص نے کہا حضور ہاں ایک جگہ مقلدین کی جماعت میں ایک غیر مقلد آ گیا اور آمین زور سے کہی تو اس پر بڑا فساد ہوا اور پولیس تک نوبت پہنچی اور مقدمہ کو بڑا طول ہوا فرمایا حضرت والا نے اس پر جنگ و جدل کرنا ہے تو زیادتی لیکن تجربہ سے ثابت ہے کہ عمل کچھ ہو مگر جس نیت سے کیا جاوے اس کا اثر ضرور ہوتا ہے اگر اس نے خلوص سے اور عمل بالسنّت کی نیت سے کیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی غیر مقلدین کی آمین اکثر صرف شورش اور مقلدین کے چڑانے کے لئے ہوتی ہے میرے بھائی محمد مظہر نے قنوج میں غیر مقلدین کی آمین سن کر کہا آمین تو دعا ہے اس میں خشوع کی شان ہونی چاہئے اور ان لوگوں کے لہجہ میں خشوع کی شان نہیں ہے خود سننے سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی کو چھیڑتے ہوں اس نے عرض کیا کہ یہ واقعی بات ہے مقدمہ مذکور جب پولیس میں پہنچا تو ایک ہندو تھانیدار اس کی تحقیقات پر تعینات ہوا وہ بہت سمجھ دار تھا اس نے فساد کا الزام غیر مقلد ہی پر رکھا اور رپورٹ میں لکھا کہ یہ لوگ شورش پسند ہیں اور بلا وجہ اشتعال دلاتے ہیں اور آمین صرف فساد اٹھانے کے لئے کہتے ہیں اس پر غیر مقلدین نے بڑا غل مچایا اور کہا کہ آمین مکہ مکرمہ میں بھی ہوتی ہے داروغہ نے کہا کہ مکہ مکرمہ میں آمین خدا کی یاد کے لئے ہوتی ہوگی دنگے کے لئے نہ ہوتی ہوگی یہاں دنگے کیلئے ہے۔ (ادب الاعلام ج ۲۸)

آمین کی تین قسمیں

ایک موقع پر ایک انگریز نے تحقیقات کی اور آخیر میں گویا تمام واقعہ کا فوٹو کھینچ دیا اور کہا آمین تین قسم کی ہیں۔ ایک آمین بالجہر اور اہل اسلام کے ایک فرقہ کا وہ مذہب ہے اور حدیثیں بھی اس کے ثبوت میں موجود ہیں اور ایک آمین بالسر ہے اور وہ بھی ایک فرقہ کا مذہب ہے اور حدیثوں میں موجود ہے اور تیسرے آمین بالشر ہے جو آج کل کے لوگ کہتے ہیں۔ (ادب الاعلام ج ۲۸)

جنم روگ

ہمارے حضرت حافظ ضامن صاحبؒ نے کسی شخص سے پوچھا تھا کہ آپ کا لڑکا کیا پڑھتا ہے، کہا قرآن حفظ کرتا ہے، فرمایا: ارے اس بیچارے کو کیوں جنم روگ لگایا۔ حافظ

صاحب میں مزاح بہت تھا' اس لیے گفتگو کے عنوان ایسے ہی ہوا کرتے تھے مگر حقیقت اس کی یہ تھی کہ حفظ قرآن ایک دن کا کام نہیں' عمر بھر کا کام ہے' ساری عمر اسی میں لگا رہے تب تو محفوظ رہتا ہے ورنہ بہت جلد حفظ سے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ رجب کا مہینہ آتے ہی حفاظ کو قرآن یاد کرنے کی فکر ہو گی' دور شروع ہو جائے گا۔ پانی پت میں ایک رئیس ہیں وہ سبعہ قرأت کے حافظ ہیں اور کمال یہ ہے کہ ہر سال ایک قاری کی روایت میں تراویح سناتے ہیں مگر کیا مجال کہ دوسری قرأت اس میں اختلاط ہو جائے۔ اگر قالون کی روایت شروع کریں گے تو اخیر تک قالون ہی کی روایت رہے گی ورش کی روایت کا اس میں خلط نہ ہو گا بڑا اچھا حافظ ہے مگر یہ اس کی بدولت ہے کہ ہر سال رجب سے جو وہ قرآن میں مشغول ہوتے ہیں پھر کسی کام کو نہیں دیکھتے۔ (الرحیل الی الخلیل ج ۲۹)

مدعیان عامل بالحدیث کو دو نصیحتیں

ایک دفعہ قنوج گیا تو غیر مقلدوں نے میری دعوت کی' حنفیوں نے تو مجھے منع کیا اور کہا کہ ان لوگوں کا کیا اعتبار کہیں سنکھیا نہ دیدیں مگر میں نے دعوت قبول کی اور کھانے کے بعد یا قبل ان سے کہا کہ میں آپ کا بالقوہ یا بالفعل نمک خوار ہو گیا ہوں اس لیے میرے ذمہ آپ کی خیر خواہی لازم ہو گئی۔ اس خیر خواہی کی بناء پر میں آپ کو دو نصیحت کرتا ہوں ایک یہ کہ بدگمانی نہ کرو' دوسرے یہ کہ بدزبانی نہ کرو' غیر مقلدوں میں یہ دو مرض زیادہ غالب ہیں۔ اسی وجہ سے وہ آئمہ کو حدیث کا مخالف سمجھتے ہیں ان کے نزدیک تاویل و قیاس کے معنی مخالفت حدیث ہیں۔ گو وہ مستند الی الدلیل ہی ہو۔ (سبیل السعید ج ۲۹)

ایک عامی کا عجیب استدلال

ایک عامی نے ایک غیر مقلد عالم کو اسی بناء پر سخت الزام دیا۔ ان سے پوچھا کہ "من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر" کے کیا معنی ہیں' کہا کہ معنی کیا ہوتے۔ تاویل ہی کی کیا ضرورت ہے بس جو نماز نہ پڑھے وہ کافر ہے' عامی نے کہا کہ حنفی لوگ امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتے اور حدیث میں ہے کہ "لاصلوٰۃ لمن لم یقر ابام الکتاب" (جو شخص سورۃ الفاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں) تو یہ لوگ آپ کے اصول پر کہ اس میں کچھ تاویل نہیں تارک صلوٰۃ

ہوئے اور تارک صلوٰۃ کافر ہے تو کیا حنفی سب کافر ہیں۔ جناب وہ عالم دم بخود ہو گئے اور ایسے خاموش ہوئے کہ کچھ جواب نہ بن پڑا کیونکہ وہ محض اس بات پر ان کی تکفیر نہیں کرتے پس نہ حنفیوں کو کافر کہہ سکے اور نہ حدیث میں تاویل کر سکے کیونکہ تاویل اور قیاس کرنا ان کے نزدیک شرک و کفر میں داخل ہے مگر عامی نے ان کو الزام دے کر بتلا دیا کہ بدون تاویل و قیاس کے چارہ نہیں اور یہ الزام دینے والا ایک عامی لوہار تھا۔ غرض مشکوٰۃ و بخاری کا ترجمہ دیکھ کر اجتہاد کرنا جاہلوں کا کام ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا اور بات ہے مگر وہ کسی محقق عالم کے سامنے اپنے اجتہادات بیان کریں تو حقیقت معلوم ہو جائے وہ ان کے سب اجتہادیات کی قلعی کھول کر رکھ دے گا اور ان سے اقرار کرائے گا کہ تم اجتہاد کے ہرگز اہل نہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے:

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را　　عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

(کسی صاحب نظر کو اپنا موتی دکھاؤ کہ وہ اصلی ہے یا نہیں، چند گدھوں کی تصدیق سے کوئی عیسیٰ نہیں ہو سکتا)

شاہد آں نیست کہ موے و میانے دارد　　بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

(معشوق وہ نہیں کہ وہ اچھے بال اور پتلی کمر رکھتا ہو، حسین وہ ہے کہ اس میں کچھ آن ہو)

(سبیل السعید ج۲۹)

جملہ معاصی میں سخت کلفت ہے

جس قدر گناہ ہیں ان کے نہ کرنے میں اس قدر تکلیف نہیں جس قدر کہ ان کے کرنے میں ہے نہ کرنے سے تو تھوڑے دنوں کی کلفت ہے اور اس کے بعد حلاوت ہی حلاوت ہے اور کرنے سے فوراً تو کوئی حظ ہوتا ہے اس کے بعد روح کو سخت پریشانی ہوتی ہے۔ چنانچہ جس نے اول بار کوئی گناہ کیا ہو اور اس سے پہلے اس گناہ کا وہ شخص مرتکب نہ ہوا ہو وہ اس کو خوب سمجھ سکتا ہے کہ پہلے میرے اندر کیا تھا اور اب کیا ہو گا۔ واللہ وہ اپنے اندر سخت کدورت محسوس کرے گا اور اپنے کو سخت لعنت ملامت کرے گا اور اپنی موت کو زندگی پر ترجیح دے گا باقی ہم لوگوں کو تو اس لیے احساس نہیں رہا کہ گناہ کرتے کرتے قلب کا احساس باطل ہو گیا ہے اس لیے گناہ کے اندر جو کلفت اور کدورت ہے وہ محسوس نہیں ہوتی جس نے آنکھ کھول کر کبھی راحت حقیقی نہ دیکھی ہو اس کو تکلیف کا احساس نہ ہو گا لیکن اگر آپ اس کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک طریقہ ہے کہ جس کو میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے نفس سے چالیس روز

مستعار لے لو اور ان دنوں میں اس سے صلح کرلو اور اس کو کہو کہ صرف ان چالیس روز کے لیے تو معاصی کو چھوڑ دے اور اطاعت اختیار کرے اس کے بعد پھر تجھ کو آزادی ہے اور یہ چالیس روز اس طرح گزار دو کہ کسی قسم کی معصیت اس میں سرزد نہ ہو، فضول کلام، غیبت، فضول میل جول بدنگاہی غرض تمام گناہوں کی چالیس دن کے لیے تعطیل کردو لیکن بداعتقادی کے ساتھ نہیں میں یہ بھی نہیں کہتا کہ اعتقاد ایسا کرو یعنی یہ اعتقاد کہ اس سے نورانیت ہوگی بلکہ ذہن دونوں امر سے خالی کرلو۔ جب یہ چالیس دن اس حالت سے گزر جاویں اس کے بعد اندازہ کرلو کہ ہمارے قلب کی پہلے کیا کیفیت تھی اور اب کیا کیفیت ہے۔ واللہ قلب میں اس وقت ایک ایسی حلاوت اور لطف پاؤ گے جو اس چالیس روز سے پہلے نہ تھی اور یہ معلوم ہوگا کہ ہم تو جہنم میں تھے اب جنت میں ہیں۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ گناہ میں کیا کلفت ہے اور طاعت میں کیسی حلاوت ہے۔ غرض گناہ کے چھوڑنے میں تھوڑے دنوں کی کشاکشی ہے اس کے بعد راحت دائمی ہے۔

چند روزے جہد کن باقی بخند

(کچھ دن جد و جہد کر پھر آرام سے رہ)

اور آپ خود مشاہدہ کر لیجئے جن حضرات نے طاعت کو اختیار کرلیا ہے اور دنیا کو چھوڑ دیا ہے وہ کس راحت اور اطمینان کے اندر ہیں۔ واللہ ان حضرات کی طمانیت اور راحت وہ ہے کہ جو ہفت اقلیم کے بادشاہ کو بھی نصیب نہیں ہے۔ کوئی یہ نہ کہے کہ ہم کو یہ درجہ کہاں نصیب ہوسکتا ہے، صاحبو! ممتنع اور محال نہیں ہے اعمال صالحہ اختیار کرو اور معاصی کو ترک کردو، تم کو بھی ایسی ہی راحت میسر ہو جاوے گی۔ الحاصل کوئی گناہ ایسا نہیں ہے کہ اس کے نہ کرنے میں کلفت ہو لیکن میں آپ کے زعم کے موافق گفتگو کرتا ہوں کہ جن گناہوں کے چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے ان کے چھوڑنے میں آپ کو کیا عذر ہے۔ مثلاً رشوت کے بارے میں تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر چھوڑ دیں گے تو گھی نہ ملے گا مگر ڈاڑھی رکھنے سے کون سی مصلحت برباد ہوتی ہے ابتدائے عمر میں تو اس لیے منڈانا شروع کی تھی کہ خوبصورت معلوم ہوں گے لیکن اب بوڑھے ہو کر منڈانے میں کیا مصلحت ہے۔ اسی طرح اور بہت سے گناہ ہیں کہ اگر ان کو چھوڑ دیں تو دنیا کا کچھ بھی نقصان نہیں ہے، خدا کے لیے ایسے ہی گناہ چھوڑ دو غرض یہ طبقہ فضائل دینیہ کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہے گو اعتقاد صحیح ہے۔ (اسباب الفضائل ج۲۹)

تعدد کثرت ازواج رسول کریمؐ میں حکمت

بعض مخالفین کثرت ازواج پر اعتراض کرتے ہیں لیکن علاوہ اور بہت سی حکمتوں اور مصالح اور ضرورتوں کے یہ کتنی بڑی مصلحت اس وقت معلوم ہوئی کہ علم کا وہ باب جو کسی کے ذریعے مفتوح نہیں ہو سکتا تھا وہ ہم کو حضرات ازواج مطہراتؓ کے معرفت پہنچا۔ احسان ماننا چاہیے ان بیبیوں کا تم خود اپنے دل میں ٹٹولو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان وشوکت وہیبت خداداد کے پیش نظر ہوتے ہوئے کہ جس کی وجہ سے صحابہ فرماتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایسے بیٹھے رہتے تھے "کان علی روسنا الطیر" یعنی گویا کہ ہمارے سروں پر پرندہ بیٹھا ہے۔ یعنی جیسے کسی کے سر پر پرندہ بیٹھ جائے اور وہ یہ چاہے کہ اڑے نہیں تو وہ جیسے بے حس وحرکت ہوتا ہے اس طرح ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رہتے تھے تو کس کی ہمت تھی کہ بولے اور سوال کرے اور سوال بھی ایسا یہ بیوی کا رشتہ ہی ایسا ہے کہ اس میں بہت سے ایسے امور کھپ جاتے ہیں جو اوروں سے بے ادبی اور گستاخی شمار ہوں۔ افک کے قصہ میں جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ اٹھو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کرو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ ان کا شکریہ ادا نہ کروں گی میں تو اپنے اللہ تعالیٰ کا شکر کروں گی، دیکھئے اگر کوئی اور شخص اس کلمہ کو کہے تو سخت بے ادبی اور گناہ ہے لیکن زوجیت کا ایسا علاقہ ہے کہ یہ کلمہ اس میں بے حد لطف دے رہا ہے۔ الحاصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں اپنے سر مبارک پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: "ولا انا الا ان یتغمدنی اللّٰہ برحمتہ" یعنی میں بھی عمل سے جنت نہ جاؤں گا مگر جبکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھ کو ڈھانپ لیں۔ پس جبکہ حضور سید الاولین والاخرین صلی اللہ علیہ وسلم ہی یہ فرمادیں تو آج کون شخص ہے جو اپنے عمل پر اعتماد کرے حالانکہ عمل میں آپ کے برابر تو کوئی کیا ہوگا' قریب بھی آپ کے کوئی نہیں بلکہ بعید اور ابعد بھی نہیں کہا جا سکتا' کہاں ہمارا عمل کہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی یہ نہ کہے کہ میں تمام رات جاگتا ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوتے بھی تھے اور جاگتے بھی تھے۔ (اسباب الفضائل ج۲۹)

عمل کا موقوف علیہ طلب صادق ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو نفلیں ہم سب کی تمام عمر کی عبادت سے کہیں زیادہ ہیں' ہمارے اندر وہ اخلاص وہ محبت کہاں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو بڑا رتبہ ہے' ہمارے حضرت

پیر مرشد فرماتے تھے کہ عارف کی ایک رکعت غیر عارف کی لاکھ رکعت سے افضل ہے اور اسی واسطے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ایک مد اوروں کے احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرنے سے بہتر ہے۔ پس اس تفاوت کے ہوتے ہوئے آج اگر کوئی عمل پر مدعی استحقاق ہو بڑا نادان ہے۔ اگر کوئی کہے کہ جب فضل ہی پر مدار ہے تو ہم کو عمل کی کیوں تکلیف دی۔ بات یہ ہے کہ دیں گے تو فضل ہی سے لیکن عمل توجہ فضل کی شرط ہے، مؤثر مستقل نہیں۔ (اسباب الفضائل ج ۲۹)

وجوب عمل علم پر موقوف نہیں

ایک ڈوم کی حکایت ہے اس نے وعظ میں سنا کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے اس نے کہا کہ میں چاند ہی نہ دیکھوں گا اور ۲۹ شعبان سے گھر کے اندر محبوس ہو کر بیٹھ گیا، کھانا بھی وہاں کھاتا اور پاخانہ پیشاب بھی وہاں کرتا، ایک روز بیوی نے کہا کہ کم بخت تجھے کیا ہو گیا، ایسا کیوں احدی بن گیا کہ گھر میں ہگتا موتا ہے، بیوی کے کہنے سننے سے باہر نکلا مگر اس صورت سے کہ منہ پر کپڑا رکھے ہوئے اور آنکھوں کو چھپائے ہوئے کہ کہیں چاند نظر نہ آ جائے، اسی ہیئت سے جنگل پہنچا اور قضائے حاجت کے بعد طہارت کے واسطے تالاب پر آیا اور نظر نیچے کیے ہوئے تھا، جب پانی کے پاس آیا تو تالاب میں چاند کا عکس نظر آ گیا تو آپ فرماتے ہیں کہ بندہ خدا میں تو تجھ کو دیکھتا نہیں تو کیوں خواہ مخواہ میری آنکھوں میں روزہ فرض کرنے کو گھسا آتا ہے، بڑے بڑے ثقہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم وعظ سنیں گے یا مسئلہ دریافت کریں گے تو اس پر عمل کرنا فرض ہو جائے گا اس لیے ہم سنتے ہی نہیں۔ یاد رکھو عمل کرنا بغیر سنے اور جانے بھی فرض ہے جب تم مسلمان ہو تو تمام احکام اسلام کے تم پر فرض ہیں۔ پس یہ سمجھنا غلطی ہے کہ وجوب عمل علم پر موقوف ہے چونکہ تحقیق اور وجود خارجی عمل کے بغیر نہیں ہو سکتا پس علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے اس سے ایک واجب تو ادا ہو گا، دوسرے کو بھی توفیق ہو جائے گی۔ غرض پوچھا کرو کہ جائز ہے یا ناجائز اور علم سے دینی فائدہ یقینی ہے کم از کم کاموں میں جو خرابیاں اور گناہ پیدا ہو جاتے ہیں علم سے ان کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ (اسباب الفضائل ج ۲۹)

علم و عمل

یہ بھی یاد رہے کہ عمل جب ہو سکتا ہے جب علم ہو اور علم حاصل ہو سکتا ہے سیکھنے سے اور

کسی کا اتباع کرنے سے تو حاصل یہ ہوا کہ خیال اس وقت مفید ہے کہ اس کے ساتھ عمل اور اتباع کسی محقق کا ہو ہر خیال کی یہی حالت ہے۔ پس اسی طرح اللہ کا خیال بھی ہے کہ وہ جب مفید ہے کہ کام بھی شروع کر دیا جائے اور یہ نہ ہو تو نرے خیال سے مقصود حاصل نہیں ہوتا وہ مقصود کیا ہے تعلق مع اللہ جو صرف یاد سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ یاد اور خیال میں فرق ہے، خیال تو وہ ہے جو شیخ چلی نے باندھا تھا اور یاد وہ ہے جو دن رات آپ کے محاورات میں موجود ہے۔ آپ کے دوست کا خط آتا ہے کہ میاں تم نے تو ہم کو بھلا دیا کبھی ملتے نہیں، خط نہیں بھیجتے، کبھی ہم کو بلاتے نہیں، کیا آپ اس کے جواب میں، یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے بھلایا نہیں ہر وقت تمہارا خیال دل میں رہتا ہے، اس جواب کو کوئی تسلیم نہیں کرے گا، بات کیا ہے؟ وہی کہ خیال کو یاد نہیں کہتے، خیال اور یاد میں فرق ہے، مجھے اسی کی شرح کرنے کی اور فرق بتلانے کی ضرورت نہیں اس مثال سے بخوبی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ دونوں میں فرق ہے۔ (الباطن ج ۲۹)

باکمال شخص

تین قسم کے لوگ ہیں اول تو وہ جو سب سے کنارہ کش ہوتے ہیں اور ذکر و عبادت میں مشغول ہیں، کسی سے بولتے تک نہیں۔

اگر کوئی آتا بھی ہے تو خلوت خانہ سے برآمد نہیں ہوتے، اگر کچھ بات کریں گے تو اشارہ سے جواب دیں گے، ایسے شخص کو لوگ باکمال سمجھتے ہیں اور ایک وہ ہے جو رات دن ہنسی مذاق، دل لگی، لغویات، فضولیات ہی میں رہتا ہے یہ دونوں کچھ نہیں۔ تیسرا وہ شخص ہے کہ وقت پر عبادت بھی کرتا ہے اور کسی وقت دوستوں میں ہنسی دل لگی کی باتیں بھی کرتا ہے، توسط کو لیے ہوئے یہ شخص باکمال ہے غرض جو ہر وقت کام میں رہتا ہے وہ کسی نہ کسی وقت ضرور بیکار ہو جاوے گا، ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص آیا اور بہت دیر تک باتیں کیں، آخر میں عرض کیا حضرت میں نے آپ کی عبادت میں بڑا حرج کیا، فرمایا کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ نماز پڑھنا ہی عبادت ہے بھائی دوستوں سے باتیں کرنا بھی عبادت ہے۔ (التوبہ ج ۲۹)

حضرات اہل اللہ پریشان کیوں نہیں ہوتے

حضرات اہل اللہ کسی وقت پریشان نہیں ہیں اور وہ خود تو کیا پریشان ہوں گے آپ کو

جس وقت پریشانی ہو آپ ان کے پاس بیٹھ کر دیکھ لیجئے، خود آپ کی پریشانی مبدل بہ اطمینان ہو جاوے گی اور کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ ہم لوگوں کو تو دنیا کی طرح طرح کی پریشانیاں اور تفکرات اور غموم ہیں اس لیے پریشان ہیں اور وہ آزاد ہیں اس لیے پریشان نہیں تو اس میں ان کے اہل اللہ ہونے کو کیا دخل، سو اس کا امتحان یہ ہے کہ آپ ان کو ایسے وقت دیکھئے کہ جب ان پر کوئی واقعہ مصیبت کا ہو کہ جس میں آپ گھبرا جاتے ہوں ان کو آپ اس وقت دیکھیں گے کہ ان کی جمعیت میں مطلق ذرا برابر فرق نہیں، مثلاً ان کا بیٹا یا عزیز مر جاوے یا کوئی مالی نقصان پہنچے اس وقت ان کو دیکھئے، میں یہ نہیں کہتا کہ ان کو رنج نہ ہوگا ان کے آنسو نہ بہیں گے، رنج بھی ہوگا، روئیں گے بھی لیکن جس کا نام پریشانی ہے، گھبراہٹ ہے، اضطراب ہے، قلب کا تفرق ہے، وہ مطلق نہ ہوگا، دل سے راضی برضائے الٰہی ہوں گے۔ بخلاف دنیا داروں کے کہ ایسے وقت پریشان ہوتے ہیں کہ ہائے اب کیا ہوگا، دل کسی کام میں نہیں لگتا، ہر وقت وہی دھن لگ جاتی ہے اور اہل اللہ مغموم بھی ہوتے ہیں اور اسی عین غم میں راضی بھی ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی شخص کے دنبل نکل آیا اور ڈاکٹر نے یہ تجویز کیا کہ یہ بغیر شگاف کے اچھا نہ ہوگا تو وہ مریض بہت خوشی سے اس عضو کو نشتر زن کے سامنے کر دے گا۔ دیکھئے اس وقت اس کو نشتر لگانے کی تکلیف بھی محسوس ہوگی مگر اس پر دل سے راضی ہے اور جانتا ہے کہ اس میں میری بہبودگی ہے۔ چنانچہ بعد نشتر لگانے کے وہ نائی انعام مانگتا ہے، حضور انعام لائیے، چنانچہ خوشی سے اس کو انعام دیتے ہیں اگر ناراض ہوتا تو انعام کیوں دیتا، اسی طرح اہل اللہ اگر بیمار ہوتے ہیں یا ان کا کوئی عزیز مرتا ہے تو تکلیف ضرور ہوتی ہے مگر اندر سے دل ان کا ہر وقت باغ باغ ہے، کسی وقت پریشانی یا اضطراب نہیں بخلاف دنیا داروں کے کہ اگر کوئی بیٹا یا عزیز مر جاتا ہے تو حسرتیں اور ارمان آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بس جی برباد ہو گئے، کیسا اچھا ہوتا کہ دس برس اور جیتا اور بعض تو اتنا بڑھتے ہیں کہ وہ حق تعالیٰ کی شکایت کرنے لگتے ہیں نعوذ باللہ منہ اور خواص اہل اللہ کی تو یہ شان ہے ہی ان کے عوام میں بھی ایسے ایسے موجود ہیں کہ خواہ کچھ گزر جائے مگر ان کی زبان سے بجز شکر کے کلمات کے اور رضا کے کچھ نہیں نکلتا۔ یہاں تھانہ بھون میں ایک خان صاحب تھے اکثر بیچارے سخت تکلیف میں رہتے لیکن جب کوئی پوچھتا تو ہنس کر یہی کہتے کہ اللہ کی رحمت ہے۔ (التوبہ ج۲۹)

اہل اللہ کا مختلف مذاق

اگر کوئی کہے کہ ہم نے تو اہل اللہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ ہم کو بخار ہے سر میں درد ہے بات یہ ہے کہ بخار وغیرہ ظاہر کرنا دو طور سے ہوتا ہے ایک تو یہ کہ شکایت کے طور پر ہو اور قضائے الٰہی اور اپنی خواہش میں جو مزاحمت ہوتی ہے اور اپنی خواہش حاصل نہیں ہوتی اس لیے تنگ دل ہوتا ہے اور اپنا درد ظاہر کرتا ہے یہ تو مذموم ہے اور اس طور کا اظہار حضرات اہل اللہ میں نہیں ہوتا اور دوسری جہات اظہار مرض کی یہ ہے کہ اپنا عجز اور درماندگی اور قضا کے سامنے اپنی بیچارگی ظاہر کرنا مقصود ہے اور نیز مخاطب یعنی عیادت کرنے والے کا اکرام اور اس کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ منظور ہے اس لیے کہ جو شخص آپ کی عیادت کے واسطے آیا ہے اس کا مقصود یہ ہے کہ تمہارا درد معلوم کر کے تمہارا شریک حال ہو اور غمخواری کرے۔ اگر آپ نے خشک جواب دیا کہ جی اچھا ہوں یہ بداخلاقی ہے اور یہ رضا نہیں ہے بلکہ بزبان حال آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم ایسے مضبوط ہیں کہ کوئی شے ہم کو از جا رفتہ نہیں کر سکتی بعض اولیاء اللہ سے کسی نے پوچھا کہ اب تو آپ کی طبیعت اچھی ہے، فرمایا کہ نہیں لوگوں نے کہا کہ کیا آپ مرض ظاہر کرتے ہیں، فرمایا کہ کیا میں خدا کے سامنے پہلوان بنوں، عجز ظاہر نہ کروں، غرض حضرات اہل اللہ کا گو اس بارے میں بھی مذاق مختلف ہے لیکن یہ امر مشترک ہے کہ تنگی قلب میں ہرگز ہرگز نہ ہوگی اور دنیاداروں سے جب سنا ہے شکایت ہی کے کلمات سنے گئے ہیں بلکہ کفر و شرک تک کے کلمات ان کی زبان سے نکلتے ہیں، مجھ کو تو ایسے کلمات سے اس قدر نفرت ہے کہ کان سن نہیں سکتے۔ (التوبہ ج ۲۹)

حکایت حضرت بہلول داناؒ

حضرت بہلول دانا نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ کیا حال ہے کیسا مزاج ہے، جواب دیا کہ اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو کہ جو کام دنیا میں ہوتا ہے وہ اس کے حسب خواہش ہوتا ہے، بہلول اس جواب سے حیران ہوئے (اس لیے کہ یہ تو خدا تعالیٰ کی ہی شان ہے) فرمایا کہ جس شخص نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا کر دیا ہو تو جو کام دنیا میں ہوتا ہے سب اس کی خواہش کے موافق ہوتا ہے وہ کسی وقت پریشان نہیں ہوتے۔

کوئے نا امیدی مرد کا امید ہاست

(نا امید ہونے کی کیا ضرورت ہے ابھی تو بہت امیدیں موجود ہیں) (التوبہ ج ۲۹)

اجازت اور مشورہ میں فرق

اجازت اور چیز ہے اور مشورہ اور چیز۔ آپ نے اجازت کو مشورہ سمجھا میں اجازت تو عام طور

سے دیتا ہوں کہ صلحاء کے پاس جانے میں کچھ حرج نہیں ہے اور مشورے کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ بات بتاؤں کہ جو صرف غیر مضر نہیں بلکہ مفید بھی ہو اس کی مثال یہ ہے کہ طبیب سے اجازت چاہتے ہیں کہ گنا کھالیں وہ اس کو اگر مضر نہیں دیکھتا تو کہہ دیتا ہے کھالو یہ اجازت ہے اور مشورہ یہ ہے کہ طبیب سے کہتے ہیں کہ آپ کے سپرد ہے جو مناسب تدبیر ہو بتلایئے۔ وہ اس وقت ایسی تدابیر نہیں بتلائے گا جو غیر مضر اور مفید نہ ہوں بلکہ وہ تدابیر بتلائے گا جو مفید ہوں اس وقت یہ کبھی نہ کہے گا کہ گنا کھاؤ بلکہ اس وقت کہے گا گلو پیو اور شاہترہ پیو اور کونین کھاؤ اس وقت وہ آپ کا تبع نہ ہوگا بلکہ اپنی رائے کا تبع ہوگا۔ خواہ آپ کی طبیعت کے خلاف ہو۔ (ادب الطریق ج ۲۹)

احناف تفقہ فی الدین رکھتے ہیں

اکثر غیر مقلد لوگ اپنا نام اہلحدیث رکھتے ہیں لیکن حدیث سے ان کو مس بھی نہیں ہوتا صرف الفاظ پر رہتے ہیں اور حدیث میں جو بات سمجھنے کی ہے جس کی نسبت وارد ہے: ”مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْراً يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ“ (جس شخص سے اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتے ہیں) وہ اور چیز ہے اگر وہ صرف الفاظ کا سمجھنا ہوتا تو کفار بھی تو الفاظ سمجھتے تھے وہ بھی فقیہ ہوتے اور اہل خیر ہوتے۔ ”تفقہ فی الدین“ یہ ہے کہ الفاظ کے ساتھ دین کی حقیقت کی پوری معرفت ہو سو ایسے لوگ حنفیہ میں بکثرت ہیں۔ (التوبہ ج ۲۹)

تصوف اور فقہ کے معنی

اب لوگوں نے تصوف اور فقہ دونوں کے معنے بدل دیئے ہیں اور دونوں کو متنافیین قرار دیا ہے حالانکہ ان میں تنافی نہیں کیونکہ تصوف کے معنے ہیں **تعمیر الظاهر و الباطن** ظاہر کی تعمیر اعمال سے اور باطن کے اخلاق سے اور فقہ کی امام صاحب نے تعریف کی ہے **معرفت النفس مالها و ما عليها** یہ عام ہے۔ اعمال ظاہر و باطنی سب کو تو تصوف اور فقہ میں منافات کہاں ہے پہلے لوگ فقہ اور تصوف کے جامع ہوتے تھے یہ بلا آج کل ہی پھیلی ہے کہ دونوں علیحدہ سمجھ کر دونوں کو خراب کیا حالانکہ ان دونوں کا ساتھ ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ صحبت کے لیے اس شخص کو اختیار کرو جو محدث بھی ہو اور فقیہ بھی صوفی بھی اعتدال اسی سے ہوتا ہے یہ قول ان کا قول جمیل میں ہے۔ (ادب الاعتدال ج ۲۹)

حضرت مولانا شاہ اسماعیل صاحب شہید حنفی تھے

شاہ عبدالعزیز صاحب کا خاندان ماشاء اللہ ان اوصاف کا جامع ہے جن میں مولانا اسماعیل صاحب بھی ہیں، بعض لوگ مولانا کو غیر مقلد سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، میرے ایک استاد بیان فرماتے تھے کہ وہ سید صاحب کے قافلے کے ایک شخص سے ملے ہیں ان سے پوچھا تھا کہ مولانا غیر مقلد تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو ہم کو معلوم نہیں لیکن سید صاحب کے تمام قافلہ میں یہ مشہور تھا کہ غیر مقلد چھوٹے رافضی ہوتے ہیں اس سے سمجھ لو کہ اس قافلہ میں کوئی غیر مقلد ہو سکتا ہے۔ ایک حکایت اور فرمائی سند یاد نہیں کسی نے مولانا سے مسئلہ پوچھا، فرمایا کہ امام صاحب کے نزدیک یوں ہے اس نے کہا آپ اپنی تحقیق فرمائیے، فرمایا میں کیا کہتا ہوں امام صاحب کے سامنے، مولانا کے غیر مقلد مشہور ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ مولانا نے بعض جاہل غسالی مقلدین کے مقابلہ میں بعض مسائل خاص عنوان سے تعبیر کرائے اور ایک باران کے مقابلہ میں آمین زور سے کہہ دی کیونکہ غلو اس وقت ایسا تھا کہ میں نے ایک کتاب میں دیکھا ہے کہ ایک شخص نے زور سے آمین کہہ دی تھی تو اس کو مسجد کے اونچے فرش پر سے گرا دیا تھا، مولانا کو اس پر بہت جوش ہوا اس کتاب میں ہے کہ آپ نے بیس مرتبہ آمین کہی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب سے لوگوں نے یہ واقعہ بیان کیا اور کہا ان کو سمجھائیے، فرمایا وہ خود عالم ہیں اور تیز ہیں کہنے سے ضد بڑھ جاوے گی، خاموش رہو۔ مولانا نے ایک رسالہ بھی رفع یدین کے اثبات میں لکھا ہے لیکن غیر مقلد ہرگز نہ تھے۔ ایک حکایت مولوی فخر الحسن صاحب بیان کرتے تھے اس سے بھی مولانا کے حنفی ہونے کی تائید ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مولانا کے ایک بیٹے محمد عمر نام مجذوب تھے اور بہت بھولے لیکن بہت ذہین چنانچہ ایک شخص ان کے سامنے کنز لے گیا کہ اس کا سبق پڑھا دیجئے، کہا میں نے یہ کتاب دیکھی نہیں مگر جب وہ طالب علم پڑھنے بیٹھا تو بہت اچھی طرح سے پڑھا دی، حتیٰ کہ تھوڑا تھوڑا پڑھ کر اس نے کتاب بند کی تو کہا بھائی دس ورق تو پڑھو اور بھولے ایسے تھے کہ ایک بار مولوی محبوب علی صاحب کے وعظ میں پہنچے، مجمع بہت تھا مگر واعظ صاحب کی آواز پست تھی ان کو آواز نہ آئی تو گھر لوٹ کر گئے اور کہا کہ دعا کریں گے کہ اس واعظ کی آواز بڑھ جاوے اور دعا مانگی پھر فوراً آدمی بھیجا، دیکھنے کے لیے بتلاؤ آواز کچھ بڑھی یا

نہیں۔ سو یہ صاحبزادے ایک دفعہ جامع مسجد کے حوض کے پاس کو گزرے وہاں غیر مقلدین میں مذاکرہ حدیث ہو رہا تھا' یہ بھی بیٹھ گئے' ہمراہیوں نے عرض کیا حضرت کہ یہ لوگ غیر مقلد ہیں' فرمایا بلا سے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تو بیان ہو رہا ہے۔ بیان کرنے والے نے ایک مقام میں امام صاحب پر کچھ طعن کیا' انہوں نے ایک دھول رسید کی اور کہا چلو یہاں بے ایمان ہیں' ان کی وجاہت بہت تھی کوئی بول نہ سکا' سو اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا غیر مقلد نہ تھے۔ اگر غیر مقلد ہوتے تو ان کا بیٹا ایسا کیوں ہوتا' واللہ اعلم (ادب الاعتدال ج ۲۹)

اہل حق کو سب وشتم کرنے کا انجام

جو لوگ اہل حق کو سب وشتم کرتے ہیں ان کے چہروں پر نور علم نہیں پایا جاتا بلکہ خالص کفار اتنے مسوخ پائے جاتے جتنے یہ لوگ ہیں۔ اس کی وجہ میں نے بطور لطیفہ کے کہا تھا کہ کفر فعل باطن ہے اس کا اثر چھپا ہوا رہتا ہے اور سب وشتم فعل ظاہر ہے اس کا اثر نمایاں ہو جاتا ہے۔ انگریزی خوانوں پر نور ایمان نہ سہی مگر شان تو ہوتی ہے ان میں وہ بھی نہیں خدا بچاوے۔ شعر

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد   میلش اندر طعنہ پاکاں برد

(جب اللہ تعالیٰ کسی کی پردہ داری اور رسوائی چاہتے ہیں تو اس کا میلان نیک لوگوں کے طعن میں پیدا کر دیتے ہیں) دیگر

چوں خدا خواہد کہ پوشد عیب کس   کم زند درعیب معیوبان نفس

(اللہ تعالیٰ کو جب کسی کی عیب پوشی منظور ہوتی ہے تو وہ شخص عیب دار لوگوں کے عیب میں بھی کلام نہیں کرتے) (ادب الاعتدال ج ۲۹)

شیطان تو انسان کی آخرت کا جیسا دشمن ہے اسی طرح دنیا کا بھی دشمن ہے لیکن اس سے زیادہ دشمن نفس ہے جو کسی وقت اس سے جدا ہی نہیں ہوتا' اس سے کسی وقت بے فکر نہ ہونا چاہیے خواہ تم کو وہ نفس ولی ہی نظر آوے مگر پھر بھی اس سے اطمینان نہ ہونا چاہیے کہ اس کی یہ ساری ولایت مجبوری اور بے سروسامانی کی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

نفس اژدہاست او کے مردہ است   ازغم بے آلتی افسردہ است

(نفس تو ناگ ہی ہے وہ بھلا کب مردہ ہوتا ہے ہاں بے اوزار ہونے پر بعض اوقات افسردہ ہو جاتا ہے) (ادب الاعتدال ج ۲۹)

عذاب جان

بعض عورتوں اور نیز مردوں کو دیکھا ہے کہ ان کو اولاد کی بے انتہا محبت ہوتی ہے ایک بیگم تھیں ان کے بہت سے بچے تھے' شب کو سب کو اپنے پاس سلاتی تھیں' اب اتنی بڑی چارپائی تو کہاں سے آوے' فرش پر سوتی' بیچ میں خود ہوتی تھیں اور چاروں طرف بچے اور رات کو کئی کئی مرتبہ ہاتھ سے دیکھتی تھیں کہ کوئی کم تو نہیں ہو گیا' توبہ توبہ ایسی محبت بھی عذاب جان ہے۔ ایسی ہی محبت کے بارے میں تو ارشاد ہے جو کفار میں ہوتی تھی:

وَلاَ تُعْجِبْکَ اَمْوَالُهُمْ وَلاَ اَوْلاَدُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُوْنَ.

یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ان کے مال اور اولاد پسند نہ آنے چاہئیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس مال اور اولاد سے ان کو دنیا کی زندگی میں عذاب دینا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ان کی جانیں اسی حالت میں نکل جاویں اور وہ کفر کرتے رہیں (نعوذ باللہ منھا) واقعی دنیادار سخت تکلیف میں ہیں اگر راحت ہے تو بس اللہ والوں کو ہے لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ والوں کو اولاد اور مال سے تعلق نہیں ہوتا یا یہ کہ وہ اپنے اہل وعیال کا حق ادا نہیں کرتے۔ ان سے زیادہ محبت کرنے والا اور حقوق کو ادا کرنے والا تو کوئی بھی نہیں ہے ہاں حق تعالیٰ کی محبت اور اس کے حقوق پر مال اور اولاد کی محبت کو غلبہ نہیں ہوتا اور اس کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جبکہ دنیا اور دین میں باہم تزاحم ہو کہ وہ اس وقت دنیا کو چھوڑ دیتے ہیں اور دین کو اختیار کرتے ہیں۔ حدیث میں وارد ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ گھر میں ملے جلے رہتے مگر جب اذان ہوتی تو آپؐ اس طرح کھڑے ہو جاتے کہ گویا ہم کو پہچانتے بھی نہیں۔ پس ان کو حق تعالیٰ کی ایسی محبت ہوتی ہے کہ اس سے وہ ہر وقت چین میں رہتے ہیں۔ ایک دفعہ جب وہ اللہ کا نام لیتے ہیں تو رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں ان کے سکون اور چین اور اطمینان طاری ہو جاتا ہے اسی واسطے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ہم کو ایسی دولت میسر ہے کہ اگر ملوک دنیا کو اس کی اطلاع ہو جاوے تو ہم پر تلواریں لے کر آ چڑھیں۔ (العفۃ ج ۲۹)

دیندار سے دوستی

المرء علی دین خلیله (ہر شخص اپنے دوست کے طریق پر ہوتا ہے)

(سنن الترمذی: ۲۳۷۸، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۰۱۹)

تو جملہ خبریہ ہے اور فلینظر الخ جملہ انشائیہ ہے۔ جملہ خبریہ کا حاصل ایک قاعدہ کلیہ ہے اور جملہ انشائیہ اس پر متفرع اور اس کا فائدہ ہے تو جملہ اولیٰ سے بھی مقصود یہی انشاء ہے اور وہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے اب اس پر متفرع فرماتے ہیں کہ جب تم کو معلوم ہو گیا کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے اور دین کی درستی ہے ضروری، تو ہر شخص غور کرے کہ کس سے دوستی رکھتا ہے تاکہ اس کا اثر دین میں سمجھ سکے اور جملہ فلینظر (چاہئے کہ غور کرے) سے اہل زبان سمجھ سکتے ہیں کہ بعد نظر کے دو امر میں سے ایک امر تحقیق ہوگا۔ یا تو یہ تحقیق ہوگا کہ وہ دیندار ہے اور یا یہ معلوم ہوگا کہ دیندار نہیں پس فلینظر سے دو ارشاد ثابت ہوئے ایک یہ کہ دیندار سے دوستی کرو اور ایک یہ کہ غیر دیندار سے دوستی نہ کرو۔ (اختیار الخلیل ج ۳۰)

نیک صحبت خلوت سے بہتر ہے

مرزا مظہر جان جاناں کی حکایت سنی ہے کہ ان کی مجلس میں یہ حدیث شریف بیان کی گئی کہ ایک ساعت ایسی ہوتی ہے کہ جو کچھ دعا اس میں کی جائے قبول ہوتی ہے۔ شرکاء جلسہ کے آپس میں تذکرہ ہوا کہ اگر وہ ساعت مل جائے تو اس ساعت میں کس شے کی دعا کرنا چاہئے کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ ہم تو صحبت نیک کی دعا کریں یہ بڑی چیز ہے اور تمام خیر کی جڑ یہی ہے اور عزلت سے یہ افضل ہے البتہ اگر صحبت نیک کسی وقت میسر نہ ہو تو اس وقت عزلت ضروری ہے۔ (اختیار الخلیل ج ۳۰)

تمنائے موت

آخر اہل اللہ کس سے ڈریں اور کیوں ڈریں بس وہ تو ایک سے ڈرتے ہیں اس کے سوا کسی سے ڈرنے کی ان کو ضرورت نہیں آخر لوگ ان کا کیا کر لیں گے بیش بریں نیست کہ مار ڈالیں گے سو یہ تو ان کا عین مقصود ہے وہ تو اس دن خوشیاں منائیں گے جس دن روح بدن سے مفارقت کرے گی ان کی تو یہ حالت ہے کہ غلبہ شوق لقاء میں موت کی تمنا کیا کرتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم   راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے   تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

(میں بہت خوش ہوں گا جس دن اس منزل ویراں یعنی دنیا سے میں رخصت ہوں گا اور حق تعالیٰ کی بقاء سے اپنی جان کی راحت پالوں گا۔ میں نے نذر کیا ہے کہ اگر کسی دن محبوب حقیقی کا غم مجھے مل گیا تو کسی اللہ والے کے پاس شاداں و غزلخواں جا پڑوں گا)

یہ نری شاعری نہیں بلکہ سچا حال ہے واقعی سالک کو سچ مچ موت کی تمنا ہی ہوتی ہے اور یہ تمنا خلاف شرع نہیں تمنائے موت وہ ممنوع ہے جو کسی دنیوی تکلیف کی وجہ سے ہو چنانچہ حدیث میں لضر نزل بہ کی قید موجود ہے۔ باقی اشتیاق لقاء میں تمنائے موت ہونا یہ ولایت خداوندی کی دلیل ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. (اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیں کہ تم اپنے خیال میں لوگوں سے الگ (ممتاز) اولیاء اللہ ہو تو ذرا موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو) دعوے ولایت پر تمنائے موت کا مطالبہ فرماتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوا کہ حصول ولایت کے لئے تمنائے موت لازم ہے۔ تو جو چیز لوگوں کے نزدیک سب سے بڑی کلفت ہے عارف کے نزدیک وہ محبوب ہے تو پھر کسی سے کیوں ڈرے نیز عارف کو یہ یقین ہوتا ہے کہ مخلوق مجھ کو نفع یا ضرر کچھ نہیں دے سکتی جو کچھ ہوگا خدا کے حکم سے ہوگا اس لئے اس کو نہ کسی سے طمع ہوتی ہے نہ خوف۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش   چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نہ باشد زکس   ہمیں است بنیاد توحید و بس

(جس کو توحید کی دولت ملتی ہے اس کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے پاؤں پر اگر سونے کا تم نے ڈھیر ڈال دیا اس کے سر پر تلوار ہندی رکھ دو تو نہ تو پہلے شخص سے اس کو امید و طمع ہوگی اور نہ دوسرے شخص سے کوئی خوف ہوگا)۔ (تقلیل الطعام ج ۳۰)

جان کی دو حیثیتیں

جان میں دو حیثیتیں ہیں ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ اپنی جان ہے اس لحاظ سے وہ ان کو عزیز نہیں (کیونکہ وہ کسی چیز کو اپنی سمجھتے ہی نہیں ۱۲)

دوسری یہ حیثیت ہے کہ یہ سرکار کی دی ہوئی مشین ہے اس لحاظ سے وہ عزیز ومحبوب ہے۔ کیونکہ سرکاری چیز ہے جو ہم کو امانت کے طور پر دی گئی ہے اور اس کی حفاظت کا حکم کیا گیا ہے اور اسی لحاظ سے عارف کبھی اپنی مدح بھی کیا کرتا ہے۔ ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی مدح کر رہا ہے مگر حقیقت میں وہ خدا کی چیز کی مدح کر رہا ہے۔ جو خدا ہی کی مدح ہے۔ چنانچہ حضرت غوث اعظمؒ فرماتے ہیں۔

شکر للہ کہ نمردیم ورسیدیم بدوست
آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما

(اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم خیریت سے دوست تک پہنچ گئے ہماری اس ہمت مردانہ پر آفرین ہے)
(تقلیل الطعام ج ۳۰)

تقلید شخصی کی ضرورت

میں کہتا ہوں کہ کم از کم چالیس روز علماء کی صحبت میں رہو یا کم از کم علماء کے پاس بیٹھنے والوں کو دیکھو۔ پھر انتخاب کے بعد ایک کو لے لو۔ ’’یک درگیر محکم گیر‘‘۔ (ایک کو لو نہایت مضبوطی سے تھامو) جب تک اطمینان واستقلال سے ایک کا اتباع نہ کیا جائے گا۔ کامیابی نہیں ہوسکتی۔ یہی راز ہے بیعت اور تقلید شخصی کا کہتے ہیں تقلید شخص کے لئے کوئی آیت نہیں اتری کیا بتلایا جاسکتا ہے کہ ایک ہی حکیم سے علاج کرانے کے لئے کون سی وحی اتری ہے۔ یہ تمام حالات تجربہ سے معلوم ہوتے ہیں اور ہوئے ہیں کہ فلاں چیز نافع اور فلاں شے ضار ہے تقلید کی ضرورت بھی تجربہ سے معلوم ہوئی ہے کیونکہ تاوقت کہ تقلید شخصی نہ ہوگی دین کا نظام قائم نہ رہ سکے گا ہر شخص جہاں اور جس طرف اپنا فائدہ خیال کرے گا چلا جائے گا کبھی اس طرف اور کبھی اس طرف مثال میں شفع کا مسئلہ لیجئے کہ ایک شخص نے اپنا مکان فروخت کیا قریب کے مکان والے نے جو حق شفع رکھتا ہے۔ حق شفع جتلا کر خود خرید کرلیا اور دوسرے کی بیع فسخ کرادی اس وقت تو حنفی رہے اور خود جو ایسی ضرورت پیش آئی تو امام شافع کے مقلد بن گئے اور کہہ دیا کہ ہمارے یہاں حق شفع نہیں ہے۔ اس مثال کی بناء پر تقلید شخصی نہ ہونے سے ہر شخص فائدہ کو پسند کرے گا اور فائدہ کی طرف رغبت کرے گا جو نظام دین کے لئے مخل ہوگا۔

’’تقلید شخصی‘‘ کا ضروریات دین کی وجہ سے اگر علماء نے التزام کیا ہے تو اس کے لئے حدیث ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (دعاء ج ۳۰)

تبلیغ کے حدود وآداب

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ

(بھلائی کا حکم کرتے رہیئے اور برائی سے روکتے رہیئے) لیکن یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس فریضہ کے کچھ حدود وشرائط ہیں ہر شخص کو اس کی اجازت نہیں کیونکہ اگر ہر شخص کو امر بالمعروف کی اجازت دی جائے تو واقعی ہر روز فوجداری ہوا کرے گی آپ چلے جا رہے ہیں راستہ میں کوئی ہندو ملا آپ نے اس سے کہا مسلمان ہو جا وہ کہے گا ہندو ہو جا۔ بس اسی پر لڑائی شروع ہو جائے گی۔ یا کسی کو بری طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اس سے کہا کہ نماز لوٹا صحیح نہیں ہوئی وہ کہے گا تیرے باپ کا کچھ اجارہ ہے نہیں لوٹاتے۔ آپ کہیں گے ہاں ہمارا اجارہ ہے بس یہیں سے فوجداری شروع ہو گئی۔ اب یہاں سوال ہو سکتا ہے کہ صاحب اگر امر بالمعروف کریں تو دنیا میں فوجداری اور امر بالمعروف نہ کریں تو آخرت میں فوجداری تو اس مسئلہ میں یہ بڑا اشکال ہوا اس کا جواب الحمد للہ مجھے القا ہوا وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے جو امر بالمعروف کا امر فرمایا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ حکم کو سنتے ہی امر بالمعروف شروع کر دو بلکہ یہ حکم ایسا ہی ہے جیسے اقیموا الصلوۃ (نماز کو قائم رکھو) وغیرہ کہ اس کو سن کر فوراً نماز شروع نہیں کی جاتی خواہ نماز پڑھنا آتا ہی نہ ہو بلکہ اول سیکھنے کی فکر ہوتی ہے پھر نماز پڑھتے ہیں اسی طرح یہاں بھی اول طریقہ سیکھو پھر امر بالمعروف کرو بدون سیکھے امر بالمعروف کرنے کی اجازت نہیں البتہ سیکھنا فرض ہے جیسا کہ نماز کا سیکھنا فرض ہے اب بعضے لوگ خط سے طریقہ دریافت کرنا چاہتے ہیں یہ نہایت حماقت ہے بھلا کہیں خط سے بھی کسی کام کا طریقہ معلوم ہو سکتا ہے ہم تو جب جانیں کہ کتاب دیکھ کر بدون کسی نمازی کو دیکھے ہوئے کوئی نماز تو پڑھ لے ہرگز نہیں پڑھ سکتا ضرور غلطی کرے گا۔ (اتفاق المحبوب ج ۳۰)

علاج بالاضداد

بریلی میں ایک لڑکا میرے سامنے لایا گیا کہ اس کو ذرا نصیحت کر دیجئے یہ نماز نہیں پڑھتا میں نے اس سے پوچھا کہ بھائی نماز کیوں نہیں پڑھتے اس نے کہا کہ سچ کہہ دوں میں تو خدا

تعالیٰ کے وجود ہی کا قائل نہیں یہ کہا اور کہہ کر رو یا اور کہنے لگا کہ میرے ماں باپ سے مواخذہ ہوگا کہ مجھے علم دین نہیں پڑھایا اور نہ نیک صحبت کی طرف کبھی توجہ دلائی۔ یہ لڑکا ایک اسلامی کالج میں پڑھتا تھا۔ اب دیکھئے اس کی کیا حالت ہے میں نے ان لوگوں سے کہا کہ اس کو اس کالج سے نکال کر گورنمنٹ کالج میں بھیجئے وہاں یہ اتنا خراب نہ ہوگا جتنا کہ یہاں ہوا کیا انتہا ہے کہ گورنمنٹ کالج کو ترجیح دینی پڑی۔ اس کالج پر جو مسلمانوں کا کالج کہلاتا ہے اور جس پر لوگ ہم سے لڑتے مرتے ہیں کہ اس کالج کو علماء برا کہتے ہیں دیکھئے یہ اثر آپ کے نزدیک برا ہے یا نہیں۔ گورنمنٹ کالج میں یہ اثر نہیں ہوتا وجہ یہ کہ اس میں ہندو بھی ہوتے ہیں جب دو قوم اجنبی ایک جگہ رہتی ہیں تو دونوں میں مقابلہ رہتا ہے۔ (ادب الاسلام ج ۳۰)

دین کا مدار اعمال پر ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے لفظ دین کے دو چیزیں ارشاد فرمائی ہیں ایک عمل دوسری نیت اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ دین کا مدار اعمال پر ہے کسی اور شئے پر مثلاً کسی دنیوی و دینی شرف کی طرف انتساب پر نہیں بہت لوگ آج کل مغرور ہیں کہ ہم فلاں بزرگ کے مرید ہیں ہم فلاں بزرگ کی اولاد ہیں ہماری نجات ہو جاوے گی اعمال کی ہم کو ضرورت نہیں اللہ تعالیٰ ہی ان لوگوں کے رد میں فرماتے ہیں۔ تِلْکَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ لوگ گزر گئے ان کے لئے ان کے اعمال ہیں تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں تم سے ان کے اعمال کی نسبت سوال نہ ہوگا۔ ہاں بزرگوں کے انتساب سے برکت البتہ حاصل ہوتی ہے بشرطیکہ اعمال وعقائد کا ذخیرہ بھی اپنے پاس موجود ہو اور اگر اعمال نہ ہوں نہ عقائد صحیح ہوں تو نری برکت کیا کام آوے گی برکت مثال چٹنی اور مربے کی سی ہے اور اعمال کی مثال غذا کی سی ہے جو کہ جزو بدن ہوتی ہے۔ مربے اور چٹنی معین ہضم طعام ضرور ہیں لیکن غذا بھی ہونی چاہئے اور اگر غذا نہ ہو صرف مربے اور چٹنی مہمان کے سامنے رکھ دیں اور روٹی وغیرہ کچھ نہ ہو تو کیا اس سے کام چل سکتا ہے۔ پس اسی طرح انتساب الی الانبیاء والاولیاء باعث برکت فی الاعمال ہے نہ کہ نجات کے لئے انتساب ہی کافی ہو اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خاص بیٹی کو خطاب کر کے فرمایا یا فاطمۃ انقذی نفسک من النار فانی لا اغنی

عنک من اللہ شیئاً (الصحیح للبخاری ۴:۸، الصحیح المسلم الایمان ۸۹، رقم ۳۵۱) یعنی اے فاطمہ نفس آگ سے بچاؤ میں اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کچھ کام نہ آوٴں گا یعنی اگر تمہارے پاس اعمال کا ذخیرہ نہ ہوگا تو میں کچھ کام نہ آوٴں گا اور اس کی نفی نہیں کہ اعمال کے ہوتے ہوئے بھی میں باعث ترقی درجات ہونا خود منصوص ہے۔ (الاخلاص ج ۳۰)

درجات کا اصل مدار

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ** یعنی جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ان کا ایمان کے ساتھ اتباع کیا ہم اس اولاد کو بھی ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کے عمل میں سے کچھ کمی نہ کریں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ اولاد کے اعمال اس درجہ کے نہ ہوں جیسے کہ آباء کے تھے لیکن اگر اس اولاد نے ایمان کے ساتھ ان کا اتباع کیا ہوگا تو ہم ان کو ان کے آباء کے درجہ میں پہنچا دیں گے تو اسی الحاق کا انکار نہیں ہو سکتا مگر اس کی کوئی دلیل نہیں کہ صرف یہ انتساب ہی الحاق کے لئے کافی ہے بلکہ اس آیت میں ایمان کو خود شرط فرمایا ہے اور **وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ** (اور ان کے عمل میں سے کچھ کمی نہ کریں گے) میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ضروری عمل بھی شرط ہے کیونکہ دفع دخل میں یہ فرمایا کہ ہم ان اسلاف کے عمل سے کچھ کم نہ کریں گے اس سے صاف معلوم ہوا کہ اصل مدار درجات کا عمل ہے اور ظاہر ہے کہ اصل کا ہونا ضروری ہے اور یوں اضافہ خواہ غیر عمل سے ہو جاوے۔ (الاخلاص ج ۳۰)

مغلوب الحال کی تصانیف کا مطالعہ مضر ہے

تم ان حضرات کو مغلوب الحال سمجھ کر کافر نہ کہو مگر ایسے مجذوبوں کے پاس نہ جاؤ ان کی صحبت میں نہ بیٹھو نہ ان کی کتابوں کا مطالعہ کرو ان کی صحبت کم فہم کے لئے مضر ہے اور نا اہل کو ان کے کلام کا مطالعہ سم قاتل ہے بس ان کی ایسی مثال ہے جیسے بجلی کا تار کہ فی نفسہ وہ نہایت عجیب شئے ہے کہ روشنی اور ہوا کا آرام اس سے ملتا ہے، ٹریموے اس سے چلتی ہے مگر اس سے دور ہی رہنا چاہئے ہاتھ لگانا غضب ہے جہاں ہاتھ لگایا اور اس نے انسان کا خاتمہ کیا اسی طرح ان حضرات کو صاحب کمال سمجھتے رہو ان کا احترام کرو مگر دور ہی رہو ان کی صحبت مضر ہے گو خود قابل احترام ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

نکتہ ہاچوں تیغ پولا دست تیز   چوں نداری تو سپرواپس گریز
پیش ایں الماس بے اسپرمیا   کز بریدن تیغ رانابود حیا

(نکتے مانند فولادی تلوار کے تیز ہیں جب تمہارے ڈھال نہیں واپس بھاگو اس تلوار کے سامنے بغیر ڈھال کے مت آؤ اس لئے کہ کاٹنے سے تلوار حیا نہیں کرتی)

وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی یعنی خدا تعالیٰ نے آپ کو (امور قطعیہ سمعیہ سے) ناواقف پایا پھر خبردار کردیا۔ (ایواء الیتامی ج ۳۰)

انبیاء علیہم السلام کامل العقل ہوتے ہیں

امور عقلیہ کے علم میں انبیاء علیہم السلام بدوں فطرت ہی سے کامل ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام عقل میں سب لوگوں سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ محض دعویٰ ہی نہیں بلکہ ہر زمانہ کے عقلاء کو یہ بات تسلیم کرنا پڑی ہے کہ واقعی انبیاء علیہم السلام کامل العقل ہوتے ہیں پس آپ امور عقلیہ سے کسی وقت ناواقف نہ تھے۔ البتہ وہ علوم جو عقل کے ادراک سے باہر ہیں جیسے بعض صفات واجب واحوال جنت ونار ومقادیر عبادات وغیرہ وغیرہ ان سے قبل از وحی آپ بے خبر تھے وحی کے بعد خبر دار ہوئے اور بعض امور عقلیہ ظنیہ میں گو قبل از وحی بھی آپ کو علم حاصل تھا مگر ظنی تھا پھر وحی سے ان کی تاکید کردی گئی تاکہ وحی سے وہ علم قطعی ہوجائے کیونکہ عقل سے بلاواسطہ جو علوم حاصل ہوتے ہیں ان میں خلط وہم کا اندیشہ رہتا ہے اور وحی میں کسی قسم کا احتمال نہیں اس لئے امور عقلیہ وحی کے بعد زیادہ قطعی ہو جاتے ہیں اس لئے شیخ ابن عربی کا مقولہ ہے کہ صوفیہ کے جو علوم حق سے بلاواسطہ ماخوذ ہوں وہ ظنی ہیں اور جو بواسطہ انبیاء کے ہوں وہ قطعی ہیں اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

درراہ عشق وسوسہ اہرمن بسے است   ہشدار وگوش رابہ پیام سروش وار

(طریق باطن میں شیطان کے خطرات وساوس ہیں اگر ان سے بچنا چاہتے ہو تو ہوشیار رہو اور شریعت کا اتباع کرو)

یعنی صوفیہ کو جو بلاواسطہ القا ہوتا ہے اس میں خلط شیطانی کا اندیشہ رہتا ہے اور جو علوم بواسطہ قرآن وحدیث کے حاصل ہوتے ہیں وہ اس خلط سے بری ہیں اس لئے علوم مکاشفہ میں ضرورت ہے شریعت کے سامنے ان کو پیش کرنے کی اگر شریعت ان کو قبول کرے تو قبول ہیں ورنہ رد ہیں۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم تین قسم کے ہیں۔

(۱) عقلیہ محضہ جو عقل محض کے متعلق ہیں ان میں تو علوم انبیاء کے سامنے نہ ارسطو کی کچھ حقیقت ہے نہ افلاطون کی۔

(۲) امور سمعیہ غیر عقلیہ جہاں عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی ان سے قبل از وحی انبیاء علیہم السلام ناواقف ہوتے ہیں وحی کے بعد ہی ان کو علم حاصل ہوتا ہے۔

(۳) امور عقلیہ ظنیہ ان میں کبھی تو مزید تاکید کے لئے وحی کی احتیاج ہوتی ہے تا کہ وحی سے قطعیت ہو جائے اس وقت وحی آپ کے علم کے موافق نازل ہوتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کو بھی مطابقت بالوحی ہو گئی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو کیوں مطابقت نہ ہوتی مگر مزید قطع وحی ہی سے ہوتا ہے اور کبھی بدون وحی کے آپ کو یہ علم ہوتا ہی نہیں اور کبھی وحی ناسخ اس اجتہاد کی ہوتی ہے اس تفصیل سے یہ بات سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ علوم عقلیہ قطعیہ سے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی وقت بھی ناواقف نہ تھے اور امور عقلیہ ظنیہ ہیں بعض سے قبل از وحی واقف تھے اور بعض سے ناواقف تھے اور امور سمعیہ غیر عقلیہ سے بعد وحی ہی کے واقف ہوئے خوب سمجھ لو۔

احکام الغضب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لا یقضین قاض بین اثنین وھو غضبان (سنن الدارقطنی ۴، ۲۰۶) یعنی حاکم کو چاہئے کہ غصہ کی حالت میں کبھی فیصلہ نہ کرے بلکہ اس وقت مقدمہ کو ملتوی کر دے تاریخ بڑھا دے اور یہاں حاکم سے مراد ہر وہ شخص ہے جس کی دو آدمیوں پر حکومت ہو اس میں معلم اور استاد بھی داخل ہیں اور گھر کا مالک بھی کیونکہ اپنے گھر میں بھی ہر شخص حاکم ہے اور رؤسا اور حکام تو داخل ہیں ہی پس غصہ کی حالت میں کبھی سزا نہ دو بلکہ اس وقت کو ٹال دو اور بعد میں خوب سوچو کہ یہ عمل کتنی سزا کے قابل ہے پھر سوچ سمجھ کر سزا دو مگر سزا کی مقدار بھی کسی عالم سے پوچھو اپنی رائے سے تجویز نہ کرو اور عالم کو بھی چاہئے کہ جواب جلدی نہ دے بلکہ سوچ کر جواب دے اور جو مسئلہ پیچیدہ ہو اس کا جواب زبانی کبھی نہ دے بلکہ سائل سے اگر وہ دور کا ہو کہہ دے کہ سوال لکھ کر جواب کے لئے لفافہ دے جاؤ ہم ڈاک سے جواب بھیج دیں گے کیونکہ زبانی جواب میں عجلت کی وجہ سے بعض قیود رہ جاتے ہیں۔ یہ قاعدہ میں میانجیوں کو بھی سناتا ہوں اور رؤسا کو بھی اور پولیس والوں کو بھی مگر یہ میانجی نہیں مانیں گے کیونکہ سوچ کر سزا

دینے میں مزا نہیں آتا مزا تو غصہ ہی میں مارنے سے آتا ہے مگر وہ یاد رکھیں کہ اس وقت سو آپ کو بچوں کے مارنے میں مزا آتا ہے اور قیامت میں جب آپ کو سزا ملے گی تو مظلوموں کو مزا آئے گا اس لئے ہمیشہ غصہ کو ٹال کر سزا دو اور کسی عالم سے سزا کی مقدار معلوم کر کے جتنی وہ بتلا دے اتنی سزا دو اسی طرح رؤسا و حکام کو علماء سے پوچھ کر فیصلہ کرنا چاہئے اپنی رائے سے فیصلہ نہ کریں حدیث میں آیا ہے کہ طبیب ناواقف اور جاہل فیصلہ کرنے والا دونوں جہنم میں ہیں گو ان کی نیت درست ہی ہو مگر خوش نیتی سے کام نہیں چلتا یہاں علم کی ضرورت ہے۔ ابھی قریب زمانہ میں قومی پنچائیتیں قائم ہوئی تھیں میں اس تحریک میں بھی شریک نہیں ہوا گو بعض لوگوں نے کہا بھی کہ یہ تو اچھا کام ہے میں نے کہا عدل شرعی کی رعایت تو نہ ان پنچائتوں میں ہوگی نہ عدالت میں ہوتی ہے تو غیر عادل ہونے میں تو دونوں برابر ہیں لیکن اول تو عدالتیں ہم نے تو مقرر نہیں کیں ان کی کارروائی ہماری طرف منسوب نہیں پنچائتیں ہماری بنائی ہوئی ہیں ان کے افعال ہماری طرف منسوب ہیں دوسرے عدالت میں عدم عدل کے ساتھ آئین کی پابندی تو ہے اور یہاں کوئی آئین بھی نہ ہوگا تو بڑا فساد ہوگا چنانچہ اسی قاعدہ کو دیکھ لیجئے **لا یقضین قاض بین اثنین وھو غضبان** (سنن الدار قطنی ۴، ۲۰۶) کہ پنچائتوں میں اس پر کون عمل کرتا ہے پھر چند روز کے بعد ان پنچائتوں سے جو کچھ فساد ہوا سب نے دیکھ لیا۔ بہر حال شریعت میں سختی کے موقع پر غضب کی حالت میں فیصلہ کی تو ممانعت ہے۔ (الاخوۃ ج ۳۰)

قضا فی غیر الغضب کے بعد ضرورت سختی

قضا فی غیر الغضب کے بعد سختی کی اجازت ہے چنانچہ ارشاد ہے **وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ. وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ** کہ زنا کاروں پر حکم خداوندی جاری کرنے میں تم کو شفقت نہ پکڑے اگر تم کو اللہ پر اور آخرت پر ایمان ہے اور چاہئے کہ ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت حاضر ہو یعنی عدل فقط نرمی ہی کا نام نہیں بلکہ جہاں سختی کی ضرورت ہو وہاں سختی کرنا بھی عدل ہے اس موقعہ پر نرمی کرنا ظلم ہے پھر قرآن کی کیا بلاغت ہے کہ یوں نہیں فرمایا **لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ** کہ مجرموں کو سزا دیتے ہوئے تمہارے دل میں بھی شفقت نہ ہو بلکہ **لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ** فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ شفقت

کا ایسا غلبہ نہ ہونا چاہئے جو حد شرعی کے جاری کرنے کے وقت تم پر ایسی غالب آ جائے کہ اس کے جاری کرنے سے تمہارا ہاتھ پکڑ لے باقی حد جاری کرتے ہوئے اگر دل میں شفقت ہو تو اس کا مضائقہ نہیں وہ شفقت طبعی ہوگی جس کے ساتھ غیظ عقلی و شرعی بھی ہوگا اور یہ بڑا کمال ہے کہ شفقت طبعیہ کے ساتھ غیظ شرعی بھی مجتمع رہے۔ (الاخوۃ ج ۳۰)

مسلمانوں کا اجراء حد کے وقت حال

صاحبو! اجراء حد کے وقت مسلمانوں کا جو کچھ حال ہوتا ہوگا اس کو ان کے ہی دل جانتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے ابوشحمہ پر حد خمر جاری کی تھی تو کیا ان کا دل اندر سے نہ روتا ہوگا ضرور روتا ہوگا کیونکہ اولاد کے ساتھ طبعاً محبت ہوتی ہے مگر اسی کے ساتھ حکم شرعی سے حد بھی جاری کی طبعی محبت اجراء حد سے ان کو مانع نہ ہوئی۔ (الاخوۃ ج ۳۰)

جانوروں کو ذبح کرنا بے رحمی نہیں

مسلمان جب جانوروں کو ذبح کرتے ہیں تو ان کے دل پر آرہ چلتا ہے مگر حکم کی وجہ سے ذبح کرتے ہیں یہ بڑا کمال ہے کہ دل کڑھ رہا ہے اور پھر حکم کا امتثال کر رہے ہیں۔ بعض قومیں اس پر اعتراض کرتی ہیں مگر اس میں شریک وہ بھی ہیں کیونکہ جانور جانور سب برابر ہیں اور بعض جانوروں کو وہ بھی مارتے ہیں کوئی جوں کو مارتا ہے کوئی کھٹل کو کوئی چوہے کو کوئی سانپ بچھو کو۔ کیوں صاحب کیا یہ پتہ نہیں ہے اور بعضے ہندو کمال کرتے ہیں خود اپنے ہاتھ سے تو نہیں مارتے بلکہ ہمارے محلہ میں چوہوں کو چھوڑ جاتے ہیں تاکہ ہم مار دیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر جانوروں کا مارنا بے رحمی ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ تمہارے نزدیک حق تعالیٰ بھی رحیم ہیں یا نہیں۔ یقیناً ہیں پھر بتلاؤ کہ حق تعالیٰ بھی جانوروں کو مارتے ہیں یا نہیں۔ یقیناً مارتے ہیں تو کیا اس کو بھی بے رحمی کہو گے ہرگز نہیں جب یہ بے رحمی نہیں تو مسلمان ہی کیوں بے رحم ہیں وہ تو وہی کام کرتے ہیں جو حق تعالیٰ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مالک ہیں چاہے وہ خود بلاواسطہ مار دیں یا اپنے نوکر اور غلام کے ہاتھ سے مار دیں اب یہ سوال باقی رہا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ مسلمان خدا کے حکم سے مارتے ہیں تو اس کا ثبوت ہم ہر وقت دینے کو تیار ہیں ہم دلائل سے قرآن کا کلام اللہ ہونا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول برحق ہونا ہر وقت ثابت کر سکتے ہیں اور قرآن و حدیث میں حکم ذبح موجود ہے تو مسلمان یقیناً حکم الٰہی سے ذبح کرتے ہیں۔ تیسری یہ ہے کہ

ذبح کرنے والوں کو بے رحم کہنا فلسفہ کے قاعدہ سے بھی بالکل غلط ہے بلکہ قاعدہ فلسفہ کا مقتضا یہ ہے کہ جو لوگ ذبح نہیں کرتے وہ زیادہ بے رحم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اطباء وفلاسفہ کا اس پر اتفاق ہے کہ جس قوت سے کام نہ کیا جائے وہ رفتہ رفتہ زائل ہو جاتی ہے جیسے ترک جماع عنت کا سبب ہو جاتا ہے اسی طرح انسان میں ایک صفت کڑھنے کی ہے اگر اس کا کوئی سبب واقع نہ ہو تو یہ صفت زائل ہو جائے گی۔ ہندو چونکہ ذبح نہیں کرتے اس لئے ان کی یہ صفت معطل رہتی ہے اور مسلمانوں کی یہ صفت ذبح کے وقت حرکت میں آتی ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ ذابح سے زیادہ رحم غیر ذابح کو کبھی نہیں ہوسکتا اسی لئے حق تعالیٰ انسان پر مصائب نازل کرتے ہیں تاکہ اس کو اہل مصیبت پر رحم وشفقت بڑھے اور جس میں یہ صفت نہ ہو اس میں پیدا ہو جائے کیونکہ جس شخص پر نزول مصائب نہ ہو وہ سنگدل ہو جاتا ہے اسی لئے حضرت یوسف علیہ السلام زمانہ کے قحط میں خود بھی کم کھایا کرتے اور اکثر اوقات بھوکے رہا کرتے تھے تاکہ قحط زدوں پر رحم آئے کہ ان کو بھی بھوک سے ویسی ہی تکلیف ہوتی ہوگی جیسے مجھے ہو رہی ہے۔ حالانکہ آپ کے یہاں اناج کے کوٹھے بھرے ہوئے تھے اور جو شخص دونوں وقت پیٹ بھر کے کھائے گا اسے بھوکوں پر کیا خاک رحم آئے گا کیونکہ اسے تو بھوک کی حقیقت ہی معلوم نہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر کسی شخص کی اصلاح سختی پر موقوف ہو تو وہاں سختی کی بھی اجازت ہے مگر اس کا طریقہ یہ ہے کہ اول مرہم سے کام لو اور اگر مرہم سے کام نہ چلے بلکہ آپریشن ہی کی بضرورت ہو تو آپریشن کرو مگر چند ماہروں کو مشورہ میں شریک کرلو گو وہ تم سے چھوٹے ہی ہوں جیسے ڈاکٹر آپریشن کے وقت اسسٹنٹ کو بھی بلا لیتا ہے حالانکہ وہ درجہ میں اس سے چھوٹا ہے۔ (الاخوۃ ج ۳۰)

حرارت غریزیہ کی دعا

ایک دفعہ ہم سفر میں گئے اور میزبان کے گھر کے پاس ایک مسجد تھی وہاں سب کا ٹھہرنا قرار پایا تھوڑی دیر میں کچھ گانے کی آواز آئی معلوم ہوا کوئی بازاری عورت ہے تو ہم نے وہاں سے بستر اٹھوا لیا اور ایک دوسرے مکان میں چلے گئے مگر ایک پیر صاحب ہمارے ساتھ تھے وہ وہیں سوئے اور صبح کو کہنے لگے کہ رات بھر آواز تو اس کی کان میں تھی (یعنی گانیوالی کی) اور دل خدا کی طرف تھا۔ ان لوگوں کا دل خدا کی طرف بھی اگر مائل ہوتا ہے تو گانے ہی کی آواز سے ہوتا ہے نماز میں قرآن پڑھنا خدا کی طرف ان کے دل کو متوجہ نہیں کرتا واللہ ان لوگوں کو

لذت نماز کی کچھ بھی خبر نہیں۔ جس کو نماز کی لذت کا ادراک ہے اس کا دل قرآن کی تلاوت سے خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور گانے بجانے کی آواز سے اس کو وحشت ہوتی ہے اور ان پیر صاحب کو جو گانے کی آواز سے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ ہوئی یہ محض حرارت غریزیہ کی مستی تھی روحانی لذت نہ تھی لوگوں کو اس میں بہت دھوکہ ہوتا ہے۔ بہت لوگ حرارت غریزیہ کی مستی کو روحانی لذت سمجھ لیتے ہیں ان کو بڑھاپے میں اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے کیونکہ اس وقت حرارت غریزیہ کم ہو جاتی ہے تو جس کو جوانی میں روحانی لذت حاصل ہو چکی ہے بڑھاپے میں اس کی لذت کم نہیں ہوتی بلکہ زیادہ ہوتی ہے اور جس نے حرارت غریزیہ کی مستی کو روحانی لذت سمجھا تھا وہ اب اپنے کو لذت طاعات سے کورا پاتا ہے تو نہایت پریشان ہوتا ہے۔ ایک بزرگ بڑھاپے میں افسوس کرتے اور روتے تھے کہ میں اب تک غلطی میں تھا میں جوانی کی حالت میں نماز کے اندر حلاوت پاکر یہ سمجھتا تھا کہ مجھ کو نماز میں لذت آتی ہے مگر اب معلوم ہوا کہ وہ نماز کی لذت نہ تھی بلکہ حرارت غریزیہ کی لذت تھی ان دونوں لذتوں کی ایسی مثال جیسے قند اور گڑ گڑ بہت میٹھا ہوتا ہے مگر اس میں لطافت نہیں کثافت ہے اور قند میں مٹھاس کم ہوتا ہے مگر لطیف ہے اسی طرح حرارت غریزیہ کی لذت میں مستی اور جوش تو بہت ہوتا ہے مگر اس میں نفس کی آمیزش ہے اس لئے کثف ہے۔ (عمل الشکر ج ۳۰)

جوانی اور بڑھاپا

لڑکپن اور جوانی میں اگر اعمال صالحہ اور ذکر کی عادت کرلو گے وہ بڑھاپے میں بھی رہے گی بلکہ بڑھاپا تو درکنار سوتے سوتے بھی کیا کرو گے۔ اس لئے کبھی یہ خیال نہ کرو کہ بڑھاپے میں کرلیں گے۔ حدیث میں ہے **اغتنم خمسا قبل خمس صحتک قبل سقمک شبابک قبل ھرمک و فراغک قبل شغلک وحیاتک قبل موتک** (المستدرک الحاکم ۲:۳۰۶ حلیة الأولیاء ۴:۱۴۸) الخ پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں کے آنے سے پہلے غنیمت سمجھو اپنی صحت کو اپنی بیماری سے پہلے اپنی جوانی کو بڑھاپے سے پہلے اپنی فرصت کو اپنی مصروفیت سے پہلے اور اپنی زندگی کو اپنی موت سے پہلے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ ان کو فراغ اور صحت اور شباب سب کچھ حاصل ہے لیکن وہ اس کی قدر نہیں کرتے اور اپنے اوقات کو فضول ضائع کرتے ہیں اپنے وقت کی قدر کرنا چاہئے اس لئے کہ ہر طرح بے فکر ہیں کسی نے کیا خوب کہا ہے

خوشا روز گارے کہ دارد کسے   کہ بازار حرصش نباشد بسے
بقدر ضرورت یسارے بود   کند کارے از مرد کارے بود

اس وقت عمل کی سہولت کو بہت غنیمت سمجھنا چاہئے‘ بڑھاپے میں یہ نہ ہوگا اور بوڑھوں کو بڑھاپا ہی غنیمت سمجھنا چاہئے اس لئے کہ مرکر یہ بھی نہ رہے گا۔ مرنے کے بعد اگر لاکھ جتن کرو گے کہ ایک مرتبہ ہم سبحان اللہ کہہ لیں تو ہرگز نصیب نہ ہوگا اور اگر ہوگا بھی تو اس وقت ثواب نہ ملے گا وہاں جو ذکر ہوگا وہ بطور غذا کے ہوگا۔ حدیث میں آیا ہے **یلھمون التسبیح کما یلھمون النفس** (الصحیح لمسلم‘ الجنۃ ۱۸‘ مسند احمد ۳‘ ۳۵۴) جس طرح سانس لینا اضطراراً ہوتا ہے ایسے ہی ان کا ذکر ہوگا۔

مرنے کے بعد ثواب سب منقطع ہو جاتے ہیں اور اگر کسی کو صدقات جاریہ سے شبہ ہو تو وہ بھی اس حیات ہی کا ثمرہ ہے ہاں اگر کسی کے حال پر فضل ہو جاوے اور بعد مرنے کے بھی درجہ بڑھ جاوے تو وہ دوسری بات ہے یہاں کلام قواعد کی رو سے ہے سو قاعدہ سے ہر عمل کا ثواب بعد مرنے کے منقطع ہو جاتا ہے۔ (الذکر ج ۳۰)

تمام علوم کی روح اور تمام اعمال کا مدار

بلکہ قرآن وحدیث میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اعمال کا قطب الرحی اور مدار کار اور مقصود اعظم ذکر ہے اور اسی طرح تمام علوم کی روح اور لب یہی ذکر ہے دو چار امثلہ نمونہ کے طور پر ذکر کی جاتی ہیں اعمال میں سب سے بڑی شے نماز ہے اور اس کی نسبت ارشاد ہے **اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ط اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ط وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ** (یعنی آپ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت کیجئے وہ جو آپ کی طرف کتاب سے وحی کیا گیا ہے اور نماز کو قائم کیجئے بے شک نماز بے شرمی کی بات اور بری بات سے روکتی ہے (آگے اس کی علت میں ارشاد ہے کہ بے شک اللہ کی یاد بڑی شے ہے یعنی فحشا اور منکر سے نماز کا روک دینا عجب نہیں اس لئے کہ وہ ذکر ہے اور اللہ کی یاد بڑی شے ہے حقیقت میں اللہ کی یاد ایسی ہی شئے ہے کہ جب وہ پائی جاتی ہے اس کے سامنے سب شے ہیچ ہو جاتی ہے۔ (الذکر ج ۳۰)

اسلام اور عیسائیت کے مابین بڑا فرق ہے

میرے بھائی نے ایک عیسائی سے عجیب گفتگو کی میرے بھائی نے کہا کہ اسلام اور عیسائیت میں بڑا فرق یہ ہے کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ اپنے مولیٰ کی محبت میں یہ چاہے کہ میں رات دن چوبیس گھنٹے اپنے خدا کی خدمت میں گزاروں تو اسلام ہی کے اندر یہ خوبی ہے کہ ہر ہر منٹ کے کام کی فہرست اس کو بتلا دی ہے بلکہ کام زیادہ ہیں اور وقت کم ہے سوائے اسلام کے کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں اس طور سے اوقات کو مشغول کر دیا ہو وہ عیسائی یہ سن کر ساکت ہو گیا۔ (الذکر ج ۳۰)

شیطان کا جال

مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ دریا کے پاس ایک ناپاک کا گزر ہوا دریا نے کہا کہ میرے پاس آ جا میں تجھ کو پاک کر دوں اس نے کہا کہ میں ناپاک ہوں کیسے تجھ جیسے طاہر مطہر کے پاس آؤں مجھ کو شرم آتی ہے دریا نے کہا کہ بچہ اگر شرم ہی شرم میں رہو گے تو تمام عمر اسی ناپاکی میں گزر جاوے گی اور جب کبھی پاک ہو گے مجھ ہی سے ہو گے یا میری کسی موج سے آ جاؤ ایک موج اٹھے گی اور سب ناپاکیوں کو دور کر دے گی مجھ سے شرم نہ کرو مجھ سے شرم کرو گے تو کہاں جاؤ گے کہیں ٹھکانا نہیں ہے

ہر چہ بینم در جہاں غیر تو نیست　　　یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

(یعنی تمام عالم آپ کی صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے غیر کا وجود بھی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے) پس حق تعالیٰ سے اگر حجاب کرو گے تو کہاں ٹھکانا ہے شیطان بہکاتا ہے کہ تمہاری ایسی ردی حالت ہے کہ تم اگر ذکر کرو گے تو کچھ نہ ہوگا اس کے جال میں نہ آؤ یہ ہمیشہ نئے نئے جال پھیلاتا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

صد ہزاراں دام و دانہ است اے خدا　　　ما چو مرغان حریص بے نوا
دمبدم پابستہ دام تو ایم　　　گر ہمہ شہباز سیمر شویم
ے رہائی ہر دے مارا و باز　　　سوئے دامے میرویم اے بے نیاز

(اے خدا لاکھوں جال اور دانے ہیں اور ہم لالچی بھوکے پرندوں کی طرح ہیں ہم ہر

وقت ایک سے جال میں گرفتار ہیں اگر ہم شہ باز اور سیمرغ بن جائیں تو ہمیں ہر وقت چھڑاتا ہے اور پھر ہم کسی جال کی طرف چل دیتے ہیں)

ذاکرین کو تو اس طرح روکتا ہے اور غیر ذاکر کو اس طرح روکتا ہے کہ ان کو ذکر ہی نہیں کرنے دیتا غرض شیطان کی بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ذکر نہ کرے۔ (الذکر ج ۳۰)

دین کی حقیقت

ہماری حالت یہ ہے کہ ہم دین کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اس لئے محض نماز روزہ کر کے اپنے کو دیندار سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ معاملات و معاشرات وغیرہ بھی سب دین ہیں حتیٰ کہ پیشاب و پاخانہ کرنا اور ان سے فراغت کرنا بھی دین ہے گو ظاہر میں راحت نفس ہے مگر ان کاموں میں اگر نیت درست رکھی جائے تو سب دین کے کام ہیں مثلاً پیشاب و پاخانہ اس نیت سے کرو کہ اس سے فارغ ہو کر طبیعت ہلکی ہوگی اور تندرستی قائم رہے گی تو نماز وغیرہ میں دل لگے گا اس نیت سے یہ کام بھی باعث ثواب ہوں گے۔ حدیث میں ہے لا یصلے احدکم وھو یدافعہ الاخبثان (کنز العمال ۲۰۰۷۳، موارد الظمآن ۱۹۵) یعنی ایسی حالت میں نماز نہ پڑھو کہ تم کو بول و براز کا تقاضا ہو۔ اب دیکھئے اس وقت نماز پڑھنا حرام اور پیشاب و پاخانہ سے فراغت کرنا واجب ہے اور یہ شخص دنیا کے کام میں نہیں بلکہ دین کے کام میں ہے کیونکہ اس حالت میں یہ حکم شرعی کا امتثال کر رہا ہے پس دین کی حقیقت امتثال امر ہے۔ جس وقت جس کام کا شریعت امر کرے اس وقت وہی دین ہے فقط نماز روزہ ہی دین نہیں بلکہ نماز وغیرہ بھی اسی وقت تک دین کے کام ہیں جبکہ امر کے موافق ہوں اگر امتثال امر نہ ہو تو یہ بھی دین میں داخل نہیں۔ مثلاً نماز خلاف امر ہو جیسے طلوع یا غروب کے وقت پڑھی جائے تو بجائے ثواب کے گناہ ہوگا روزہ کیسی اچھی عبادت ہے مگر خلاف امر ہو تو وہ بھی دین کا کام نہیں۔ مثلاً کوئی شخص عید کے دن روزہ رکھے اور تمام دن غیبت بھی نہ کرے ذکر شغل ہی میں مشغول رہے اور تمام آداب صیام کی رعایت کرے مگر شام کو یہ شخص مردود ہے کیونکہ اس دن روزہ رکھنا خلاف امر ہے۔ ایسے ہی کوئی شخص حج کرے مگر ذی الحجہ کی نویں تاریخ کے بجائے دسویں کو وقوف عرفہ کرے تو اس کا حج مردود ہے کیونکہ اس نے خلاف امر کیا۔ پس معلوم ہوا کہ دین کی حقیقت امتثال امر ہے۔ (درجات الاسلام ج ۳۰)

انسان اور دیگر مخلوقات کی اطاعت کا فرق

اب دیکھنا یہ ہے کہ دوسری مخلوقات کی اطاعت کس قسم کی ہے سو انسان کی اطاعت اور دوسری مخلوقات کی اطاعت میں بڑا فرق ہے۔ اس کو پہلے اپنے خادموں کے اندر دیکھ لو۔ ہمارے یہاں دو قسم کے خادم ہوتے ہیں ایک تو نوکر ہوتا ہے اور ایک غلام۔ نوکر کی خدمات اکثر متعین ہوا کرتی ہیں گو اس سے مختلف قسم کے کام لئے جائیں مگر پھر بھی باوجود عموم کے اس میں کچھ مستثنیات بھی ہوا کرتے ہیں مثلاً جو نوکر آپ کی ڈیوڑھی کا ملازم ہے آپ اس سے گھر کے کام جتنے چاہیں لے لیں مگر اس سے پاخانہ نہیں اٹھوا سکتے وہ اس کام سے انکار کر دیتا ہے کیونکہ اس کی خدمتیں متعین ہیں جن میں یہ خدمت داخل نہیں اس کو اس سے انکار کا حق ہے اور غلام کی خدمتیں معین نہیں ہوتی اس سے ہر قسم کا ذلیل وخسیس اور نفیس وشریف (جائز) کام لیا جا سکتا ہے اس کو کسی خدمت سے انکار کا حق نہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آقا کو کسی مجلس یا محفل میں جانا ہے مگر خود کسی وجہ سے نہیں جا سکتا تو سلاطین وامراء کے قصص سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایسے مواقع میں اپنے غلام کو اپنا لباس پہنا کر بھیج دیا۔ اس وقت وہ غلام شاہی منصب کے فرائض انجام دیتا تھا کیونکہ اس وقت وہ بادشاہ کا نائب بنا ہوا ہے اور کبھی آقا بیمار ہے غلام اس کی تیمارداری کرتا اور بعض دفعہ اس کا پاخانہ تک اٹھاتا ہے۔ غرض غلام کے لئے کوئی خاص خدمت متعین نہیں یہی حالت انسان و دیگر انواع خلق کی ہے کہ تمام مخلوق کے متعلق خاص خاص عبادات ہیں مگر انسان کے لئے کوئی عبادت خاص نہیں (انسان سے مراد مجموعہ انس وجن ہے یعنی مکلفین) مثلاً ملائکہ میں بعض کے لئے عبادت رکوع معین ہے وہ رکوع ہی میں رہتے ہیں بعض کے لئے عبادت سجود متعین ہے وہ ہر وقت سجدہ ہی میں رہتے ہیں)

(یہاں سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہئے۔ جو اسلام کے مسئلہ غلامی پر اعتراض کرتے ہیں بھلا جس غلامی کے یہ آثار ہوں کہ آقا اور غلام میں کامل اتحاد پیدا ہو جاوے اس کو خلاف عدل کون کہہ سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب دشمن کی فوج کے ہزاروں لاکھوں آدمی معرکہ قتال میں اسیر وقید ہو کر آئیں تو ان کے متعلق بہتر سلوک کی صورت کیا ہے۔ اگر ان کو فوراً رہا کر دیا جائے تو یہ صورت جس قدر ضرر رساں ہے ظاہر ہے کہ جس دشمن کی کثیر تعداد کو مصیبت کے ساتھ گرفتار کیا تھا اس کو پھر اپنے مقابلہ کے لئے رہا کر دیا

اور اگر ان کو قید کیا جاوے تو اس میں جو قباحت ہے ظاہر ہے۔ قید کو قیدی رکھ کر خواہ کتنی ہی راحت دی جائے اس کے دل سے عداوت نہیں نکل سکتی۔ دوسرے قیدیوں پر جتنا روپیہ صرف ہوتا ہے اس کا اندازہ ہر سلطنت کر سکتی ہے تو دشمنوں کے اوپر اتنی کثیر رقم صرف کرنا جس سے نتیجہ کچھ بھی حاصل نہیں کیونکہ وہ دشمن کے دشمن ہی رہتے ہیں۔ محض حماقت ہے پھر قید کے اندر اسیروں کو ہر قسم کی علمی اور تمدنی ترقی سے روکنا ظاہر ہے کہ قید میں رہ کر کوئی شخص علمی ترقی نہیں کر سکتا اس کی تمام قوائے فکریہ معطل پڑی رہتی ہیں اس لئے اسیروں کو قید رکھنا بھی کچھ مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ اگر ضرر سے بچنے کے لئے سب کو تہ تیغ کیا جاوے تو اس کا قبیح ہونا ہر شخص کو معلوم ہے ان سب باتوں پر نظر کر کے بتلایا جاوے کہ قیدیوں کے ساتھ بہتر سلوک کی صورت کیا ہے ہم دعوے کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس کے متعلق جو طریقہ اسلام نے بتلایا ہے اس سے بہتر کوئی مذہب نہیں بتلا سکتا اسلام کا حکم ہے کہ جتنے قیدی معرکہ جنگ میں گرفتار ہوں تو ان سے اپنے قیدیوں کا مبادلہ کیا جاوے جو فریق مخالف کے ہاتھوں میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد جو بچیں ان کو غنائم میں تقسیم کر دیا جائے کہ وہ ان کو اپنا غلام بنا کر اپنے گھر میں رکھیں جو خود کھاویں وہی ان کو کھلاویں جو خود پہنیں وہی ان کو پہناویں طاقت سے زیادہ ان سے کوئی کام نہ لیں اور ان کے دین و دنیا کے درست کرنے کا خیال رکھیں۔ جب آقا غلام کو اپنے گھر میں اولاد کی طرح رکھے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پہلی عداوت اس کے دل سے نکل جائے گی اور آقا کے گھر کو اپنا گھر سمجھے گا اس کی اولاد کو اپنے بھائی خیال کرے گا اس طریقہ پر خزانہ سلطنت اسیروں کے بیشمار مصارف سے محفوظ رہتا ہے اور ایک ایک آدمی پر ایک ایک غلام تقسیم ہو جانے سے اس پر بھی کوئی بار نہیں پڑتا بلکہ وہ غلام کے کھانے کپڑے کو اس کی خدمت کے معاوضہ میں خوشی سے قبول کر لیتا ہے۔ مسلمان غلاموں کو علم وحرفت سے بھی محروم نہیں رکھ سکتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ جاہل غلام سے مہذب اور شائستہ غلام کی قیمت زیادہ ہوتی ہے اس وجہ سے مسلمانوں نے عموماً غلاموں کی تعلیم کا بہت زیادہ انتظام کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج علماء کی فہرست میں صدہا اور ہزارہا آزاد شدہ غلاموں کا نام نہایت عزت و احترام سے لکھا ہوا نظر آ رہا ہے۔ پھر چونکہ آقا کو غلام کے ساتھ ایک تعلق مالکانہ ایسا دیا گیا ہے جو انسان کو اپنی اولاد کے ساتھ بھی حاصل نہیں اس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ غلاموں کے ساتھ آقاؤں کو اولاد سے زیادہ تعلق ہو گیا کہ جس طرح کسی شخص کے بیٹے کو گالی دینا اور مارنا باپ کی اہانت شمار ہوتا ہے اسی طرح کسی کے غلام کو ذلیل وحقیر کرنا آقا کو ذلیل کرنا سمجھا جانے لگا جو مسلمان احکام اسلام کے پابند تھے ان کے واقعات تاریخ میں موجود ہیں کہ وہ غلاموں کو کس محبت اور شفقت کے ساتھ پالتے تھے اور ان کی تعلیم وتہذیب کا کس درجہ خیال کرتے تھے تو کیا اس غلامی کو خلاف عدل و انصاف کہنا انصاف کا خون کرنا نہیں ہے۔ رہا یہ کہ بعض لوگوں نے غلاموں کے ساتھ برے برتاؤ بھی کئے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کا یہ برتاؤ ایسا ہی تھا جیسا کہ بعض مسلمان نماز نہیں پڑھتے اور شراب پیتے ہیں اس کے ذمہ دار یہ لوگ خود ہیں قانون اسلام اس کا کسی طرح ذمہ دار نہیں اسلام نے غلاموں کے متعلق جس قدر رعایتی احکام صادر کئے ہیں کوئی قوم اس کی نظر نہیں دکھا سکتی کہ دشمن کی فوج کے قیدیوں کے ساتھ اس نے اتنے حقوق کی رعایت کی ہو۔ واللہ اعلم ۱۲ جامع)

اور وہ ایک حال پر رہنے سے تھکتے نہیں کیونکہ وہ نور سے بنے ہیں اور نور میں یہ خاصیت ہے کہ اس میں تعب ونصب نہیں ہوتا حق تعالیٰ فرماتے ہیں یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ (رات دن پاکی بیان کرتے ہیں اس سے تھکتے نہیں) اسی طرح آسمان زمین وغیرہ کے لئے ایک ایک عبادت متعین ہے۔ چنانچہ ان کی ایک عبادت تو محسوس ہے وہ یہ کہ جس کام کے لئے جو چیز بنائی گئی ہے اس کام میں آتی رہے جیسے پہاڑ جس کام کے لئے بنائے گئے ہیں اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ زمین اپنے کام میں لگی ہوئی ہے آسمان چاند سورج سب ایک ایک کام میں لگے ہوئے ہیں یہ ان کی عبادت ہے چنانچہ آیت فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ کی تفسیر میں یہی کہا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے آسمان وزمین سے فرمایا کہ تم (جس کام کے لئے بنائے گئے ہو اس کے انجام دینے کے لئے) آؤ خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے انہوں نے جواب دیا کہ ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ غرض ان مخلوقات کا ان کاموں میں مستعمل ہوتے رہنا جن کے لئے یہ بنائے گئے ہیں ایک عبادت ہے یہ عبادت تو محسوس ہے اور ایک عبادت غیر محسوس ہے جیسے حق تعالیٰ نے ہر مخلوق کو ایک تسبیح جداگانہ تعلیم کر دی ہے۔ (درجات الاسلام ج ۳۰)

حقوق نفس

حدیث میں ہے کہ تمام رات مت جاگو ان لنفسک علیک حقا وان لعینک علیک حقا وان لزوجک علیک حقاً فادوا الی کل ذی حق حقہ (مسند احمد ۶، ۲۶۸، المستدرک للحاکم ۴، ۱۰۴) (تیرے نفس کا تجھ پر حق اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے پس ہر صاحب حق کے حق کو ادا کرو) تو دیکھئے ایک مخصوص حصہ شب میں سونا مامور بہ ہوا اور وہ مخصوص حصہ ہر شخص کے مزاج کے مناسب ہوگا جتنی دیر میں دماغ وجسم کا تعب زائل ہو جایا کرے۔ نیز اگر کسی شخص کو ذکر کرتے کرتے یا تہجد کی نماز پڑھتے ہوئے نیند کا غلبہ ہونے لگا تو اس کے لئے حدیث میں وارد ہے۔ لیرقد یعنی سو رہے۔ لعلہ یستغفر فیسب نفسہ مبادا کہیں استغفار کرتے ہوئے اپنے آپ کو برا بھلا ہی کہنے لگے مثلاً اللھم اغفرلی (اے اللہ مجھ کو بخش دے) کی جگہ اللھم اعفرلی عین سے کہنے لگے تو اس کے معنی برے ہیں جس میں اپنے اوپر بددعا ہے کہ مجھے مٹی میں ملا دے اور یہاں تک بھی غنیمت ہے بعض دفعہ نیند میں حق تعالیٰ کا نام غلط سلط نکلنے لگتا ہے اس لئے میں مشورہ دیتا ہوں کہ ذکر میں جب نیند آنے لگے تو زبان سے ذکر فوراً بند کر دو اس وقت قلب سے توجہ اور خیال رکھو اور کوئی شخص ذکر قلبی کو بے اصل سمجھ کر اس سے متوحش نہ ہو یہ بھی احادیث سے ثابت ہے۔ صحیحین کی متفق علیہ روایت ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذکر اللہ علی کل احیانہ (الصحیح للبخاری ۱: ۸۳، سنن الترمذی ۳۳۸۴) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہر وقت میں ذکر اللہ کرتے رہتے تھے) اب بتایئے کہ ذکر ہر وقت میں زبان سے کیونکر ہو سکتا ہے بعض مواقع میں ذکر لسانی نہیں ہو سکتا اب یا تو علی کل احیانہ میں مجاز کے قائل ہو جایئے کہ اس کے معنے فی اکثر احیانہ ہیں یا صوفیہ کے مذہب پر ذکر قلبی کے قائل ہو کر اس کو اپنے عموم پر رکھیے اور یہی ظاہر ہے۔ (درجات الاسلام ج ۳۰)

اسلام کے چند درجے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قریب ہے لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آوے گا

کہ لوگوں میں اسلام کا نام ہی رہ جائے گا اور قرآن سے کچھ نہ رہے گا مگر رسم یعنی نقش حدیث طویل ہے مگر آگے اجزاء کا بیان اس وقت مقصود نہیں گو ممکن ہے کہ ضمناً وہ بھی بیان میں آجاویں مگر مقصود اس وقت یہی جملے ہیں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام کے چند درجے ہیں۔ **لایبقی من الاسلام الا اسمه** (مشكوة المصابيح ۲۷۶، كنز العمال ۳۱۱۳۶) (نہیں باقی رہے گا اسلام بجز اس کے نام کے) میں لفظ من الاسلام (اسلام ہے) بتلا رہا ہے کہ یہ بھی اسلام کی ایک فرد ہے گو فرد ادنیٰ ہی سہی تو ایک درجہ تو یہ ہوا جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درجہ اسم فرمایا ہے یعنی نام کا اسلام پھر اس جملہ میں نفی و استثناء ہے جو حصر کو مفید ہے اور حصر میں ماعدا کی نفی ہوا کرتی ہے معلوم ہوا کہ اسلام میں ہیں اور بھی چیزیں جن کی یہاں نفی کر کے صرف درجہ اسم کو باقی رکھا گیا ہے اور ویسے بھی محاورہ میں نام کا درجہ حقیقت کے مقابلہ میں بولا جایا کرتا ہے تو ایک درجہ اور نکلا جس کو کام کا اسلام یا حقیقی اسلام کہنا چاہئے اب آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اس حدیث میں مضمون کو اسلام سے کس قسم کا تعلق ہے اس میں اسلام کے درجے بتلائے گئے ہیں جن میں بعض ناقص ہیں بعض کامل جب اس حیثیت کا تعلق ہے تو اس کی ضرورت میں کیا کلام رہا۔ پھر جب اسلام مطلوب ہے جیسا کہ بیان بھی ہو چکا اور مسلمان کے لئے اسلام کا مطلوب ہونا بدیہی بات ہے اور قاعدہ ہے کہ جو چیز مطلوب ہوا کرتی ہے اس کا درجہ کمال ہی مطلوب ہوا کرتا ہے۔ درجہ نقصان کسی کو مطلوب نہیں ہوتا نہ اس پر کوئی راضی ہوتا ہے مثلاً تعلیم اولاد کا درجہ ایک کامل ہوتا ہے ایک ناقص مثلاً انٹرنس کا درجہ کامل ہے تو اس سے کم کے اوپر کوئی راضی نہیں ہوتا اور اگر کوئی زیادہ مالدار ہے اس کی نظر میں درجہ کمال بی اے یا ایف اے وہ اس سے کم کے اوپر راضی نہیں ہوتا پھر خود بی اے اور ایف اے میں بھی دو درجے ہیں ایک ناقص ایک کامل ناقص یہ کہ پڑھنے لکھنے کے بعد استعداد درست نہ ہو کسی فن سے مناسبت نہ ہو تو اس حالت میں کہا جاتا ہے کہ صاحب تعلیم برائے نام ہوئی روپیہ ہی برباد گیا ایسی تعلیم باوجودیکہ عدم تعلیم کے مقابلہ میں کچھ درجہ ضرور رکھتی ہے مگر عموماً اس کو ناکافی اور برائے نام سمجھا جاتا ہے اور کوئی شخص اپنی اولاد کے لئے ایسی ناقص تعلیم کو پسند نہیں کرتا اسی طرح ہر چیز کو دیکھ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مطلوب میں ہمیشہ درجہ کمال مقصود ہوتا ہے درجہ نقصان کوئی گوارا نہیں کرتا جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھو کہ اسلام

کے بھی مختلف درجات ہیں جن میں بعض کامل اور بعض ناقص ہیں اور اسلام مطلوب ہے تو اسلام میں بھی درجہ کمال ہی مطلوب ہونا چاہئے مگر افسوس کہ اسلام میں ہم لوگ ناقص حالت پر قناعت کئے ہوئے ہیں۔ اس کے کمال کی فکر نہیں کرتے‘ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کی شکایت فرماتے ہیں یہ حدیث گو بظاہر بصورت خبر ہے مگر درحقیقت اس سے مقصود شکایت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دراصل ہماری شکایت فرما رہے ہیں کہ تمہاری دین سے لاپرواہی رفتہ رفتہ اس درجہ بڑھ جائے گی کہ ایک وقت میں تمہارا اسلام ناکارہ ہو جائیگا۔ (درجات الاسلام ج ۳۰)

شریعت اور خواب

خواب کا درجہ شریعت میں صرف اتنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے خواب کو مبشرات سے فرمایا ہے کہ یہ دل خوش کن چیز ہے اور برے خواب کو تحزین من الشیطان (شیطان کی طرف سے حزن وملال میں ڈالنا) کہا گیا ہے یعنی شیطان برے خواب دکھلا کر مسلمان کو پریشان کرنا چاہتا ہے تو اس سے پریشان ومغلوب نہ ہونا چاہئے۔ ورنہ شیطان اور تنگ کرے گا خواب سے نہ کوئی جنت میں جائے گا نہ دوزخ میں کیونکہ اس کا مدار اعمال اختیاریہ پر ہے اور خواب اختیاری نہیں اگر کوئی آدمی ساری عمر برے خواب دیکھتا رہے تو اس کا کیا قصور ہے اور جو ساری عمر اچھے خواب دیکھے اس کا کیا کمال ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خواب علت نہیں محض علامت ہے وہ بھی جبکہ خواب خواب ہی ہو تبخیر دماغ نہ ہو اور آج کل اکثر خواب تو ایسے ہی ہوتے ہیں کہ تبخیر دماغ سے پریشان خیالات نظر آنے لگے ہیں مگر لوگوں نے اس کو مقاصد میں داخل کر لیا ہے اور خواب کے اوپر اعتماد کر کے فیصلے کر لیتے ہیں۔ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ مردہ کو خواب میں دیکھ لیا جائے اور جب تک وہ نظر نہیں آتا اس وقت تک متفکر رہتے ہیں۔ حالانکہ اس میں ایک ضرر ہے وہ یہ کہ مردہ اگر اچھی حالت میں نظر آیا تو اس کے بعد ایصال ثواب سے غفلت ہو جاتی ہے گویا ان کے نزدیک ثواب پہنچانے کے لئے معذب ہونا بھی ضروری ہے۔ اور اگر اسے معذب دیکھا تو مسلمان سے خواہ مخواہ بدگمانی ہوگی حالانکہ محض خواب کی بنا پر کسی سے بدگمان ہونا جائز نہیں۔ (درجات الاسلام ج ۳۰)

درجات اسلام

اسلام کے تین درجے ہوئے ایک تو درجہ حقیقت ہے جس کو کام کا اسلام کہنا چاہئے‘

دوسری صورت کا درجہ ہے تیسرے نام کا اسلام ہے جس میں نہ حقیقت ہے نہ صورت ہے مگر برائے نام اس پر حقیقت کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔ اس کو ایک مثال میں سمجھئے کہ مثلاً دوستی ایک شے ہے اس کے بھی ہمارے عرف میں تین درجے ہیں ایک تو دوستی کی حقیقت ہے کہ دل سے خیر خواہی اور ہمدردی ہو دوسرے دوستی کی صورت ہے کہ ظاہر میں برتاؤ ایسا ہے جیسا دوستوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مگر دل میں محبت زیادہ نہیں لیکن اس کے ساتھ اتنی بات بھی ہے کہ دشمنی کا برتاؤ بھی نہیں نہ پیچھے غیبت شکایت ہے نہ دشمنوں کے ساتھ سازش ہے یہ بھی ایک درجہ میں دوستی ہے یعنی دوستی کی صورت میں جس کی حقیقت یہ ہے کہ دشمنی نہ کرنے کو بھی دوستی کہہ دیا جاتا ہے اور ایک قسم کی دوستی یہ ہے کہ منہ پر تو دوستی کا برتاؤ کیا جاتا ہے جھک کر سلام کرتے ہیں سامنے خوشامد کی باتیں بناتے ہیں اور پیچھے ایذا و اضرار کے درپے ہوتے ہیں تو پہلا درجہ تو کمال دوستی کا ہے اور دوسرا درجہ صورت دوستی کا ہے اور تیسرا درجہ صرف نام کی دوستی ہے۔ جیسے منافقین کو برائے نام مسلمان کہہ دیا جاتا ہے مگر ظاہر ہے کہ جس طرح ہماری نگاہ میں نام کی دوستی کی ذرا بھی قدر نہیں ہوتی اسی طرح خدا تعالیٰ کے یہاں منافقوں کے اسلام کی کچھ بھی قدر نہیں مومن کہلانے سے اور مسلمان نام ہو جانے سے کیا ہوتا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

میم وہ واؤ میم و نون تشریف نیست　　لفظ مومن جز پئے تعریف نیست

(میم واو میم نون میں کچھ شرافت نہیں اسی طرح صرف مومن کہنے سے مومن نہیں ہوتا جب تک ایمان و عمل صالح نہ ہو) (درجات الاسلام ج ۳۰)

اعمال ظاہرہ و باطنہ

اسلام اعمال ظاہرہ پر اطلاق کیا جاتا ہے اور ایمان عقائد کا نام ہے گو اطلاق میں دونوں متحد ہیں کیونکہ آج کل جو شخص صورت اسلام اختیار کئے ہوئے ہو ہم اس کو مومن ہی کہیں گے کیونکہ نفاق کا علم ہم کو نہیں ہو سکتا وحی بند ہو چکی ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلام و ایمان میں اطلاقاً بھی فرق تھا پس آج کل دونوں کا اتحاد ایک عارض کی وجہ سے ہے کہ ہم کو نفاق کا علم نہیں ہو سکتا ورنہ اصل میں فرق ضرور ہے۔ (درجات الاسلام ج ۳۰)

شرف نسب

شرف نسب کوئی چیز نہیں دیکھو آدمی کا حسین یا بدصورت ہونا یا اندھا اور سوانکھا ہونا اگر چہ امر غیر اختیاری ہے اور اس پر فخر نہ کرنا چاہئے مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ حسن صورت اور سوانکھا ہونا نعمت بھی نہیں یقیناً اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے اسی طرح یہاں سمجھو کہ گو شرف نسب بوجہ امر غیر اختیاری ہونے کے سبب فخر نہیں مگر اس کے نعمت ہونے میں شبہ نہیں۔

تو احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی فضیلت بیان فرمائی ہے انصار کے فضائل بیان فرمائے ہیں اور ایک حدیث میں ہے **الناس معادن کمعادن الذھب والفضة خیارھم فی الجاھلیة خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا** (مسند احمد ۲:۴۹۸، مستدرک حاکم ۳:۲۴۳) کہ جیسے چاندی سونے کی کانیں ہیں اسی طرح آدمیوں کی بھی مختلف کانیں ہیں جن میں بعض سونے کے مشابہ ہیں بعض چاندی کے بعض دوسرے معادن کے مثل ہیں پھر آپ فرماتے ہیں کہ جو خاندان جاہلیت میں اچھے شمار ہوتے تھے وہی اسلام کے بعد بھی اچھے ہیں جب کہ علم حاصل کرلیں بعض نے یہ سمجھا کہ اس میں قید **اذا فقھوا** اہل انساب کو مضر ہے کہ اس میں مدار فضل فقہ کو فرمایا مگر کچھ بھی مضر نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فقہ کے بعد خیار فی الجاہلیۃ کو خیار فی الاسلام فرمار ہے ہیں تو فقہ کے بعد مساوات نہ رہی بلکہ حاصل یہ ہوا کہ فقیہ غیر صاحب نسب فقیہ صاحب نسب کے برابر نہیں بلکہ فقیہ صاحب نسب افضل ہوگا۔ (الاکرامیہ بالاعملیہ ج ۳۰)

شریعت میں ماں کے نسب کا اعتبار نہیں

خدا تعالیٰ نے ماں کے نسب میں اعتبار کرنے کی ایسی جڑ اکھاڑی ہے کہ ان کو سر اٹھانے کا موقعہ نہیں ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو بیبیاں تھیں ایک حضرت سارہ وہ تو ان کی خاندان کی تھیں دوسری حضرت ہاجرہ جن کی اولاد میں حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں جو ابو العرب ہیں وہ کنیز تھیں تو جو عورت ساری عرب کی جو اصل ہے وہ کنیز ہیں اب جو قبائل عرب ہندوستان میں عورتوں کے کھوٹ کی وجہ سے دوسرے خاندانوں میں عیب نکالتے ہیں وہ اس دھبہ کو دھوئیں کس طرح دھوتے ہیں مگر درحقیقت یہ کوئی عیب ہی نہیں اسی لئے شریعت نے نسب میں ماں کا اعتبار نہیں کیا۔

اولاد فاطمہ میں ماں کا اعتبار کیا گیا ہے کیونکہ سیادت کا مدار حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ہے اور سیدوں کا شرف دوسرے قبائل پر انہی کی وجہ سے ہے اور یہاں سے بعض علویوں کی غلطی واضح ہوگئی کہ وہ بھی اپنے کو سید کہتے ہیں حالانکہ سیادت کی بناء پر حضرت علی پر نہیں ہے بلکہ حضرت فاطمہ پر ہے پس حضرت علی کی جو اولاد حضرت فاطمہ سے ہے وہ تو سید ہے اور جو دوسری بی بی سے ہے وہ سید نہیں ہے اب ایک سوال یہاں ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر ایک شخص کا باپ سید نہ ہو اور ماں سید ہو تو وہ سید ہے یا نہیں تو قواعد کے موافق یہ شخص سید نہیں ہے ہاں ماں کی سیادت کی وجہ سے ایک گونہ شرف اس کو ضرور حاصل ہے مگر یہ اپنے کو سید نہیں کہہ سکتا اور اس کے لئے زکوٰۃ لینا بھی جائز ہے اگر صاحب نصاب نہ ہو بہر حال ماں کا نسب میں اعتبار نہیں البتہ حریت ورق میں اولاد شرعاً ماں کی قائم ہوتی ہے اور اس سے ایک اشکال کا بھی جواب ہو گیا وہ یہ کہ بعض احادیث میں وارد ہے کہ من عمل کذا فلہ اجر من اعتق اربعۃ من ولد اسمعیل (جس شخص نے ایسا عمل کیا اسے حضرت اسماعیل علیہ السلام میں سے چالیس غلام آزاد کرنے کا ثواب ملے گا) کا عتاق ہی متصور نہ ہوگا تو پھر حدیث میں اعتاق ولد اسماعیل کا کیا مطلب ہے بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ بطور فرض کے ہے کہ اگر اہل عرب کا استرقاق جائز ہوتا تو ان کا اعتاق سب سے افضل ہوتا اس کا ثواب اس عمل سے ملے گا مگر جواب صحیح اور بے تکلف اس قاعدہ مذکورہ سے حاصل ہو گیا وہ یہ کہ کسی عربی نے عجمیہ رقیقہ سے نکاح کیا تو اولاد نسب میں تو باپ کے تابع ہو کر ولد اسماعیل ہوگئی اور ان میں ماں کے تابع ہو کر محل اعتاق ہو سکے گی۔ (الاکرامیہ بالاعملیہ ج ۳۰)

ایک جماعت اولیاء کا حال

مولانا رومی نے ایک جماعت اولیاء کا حال لکھا ہے کہ وہ پل صراط سے گزر کر جب جنت میں پہنچ جائیں گے تو حق تعالیٰ یا ملائکہ سے سوال کریں گے کہ ہم نے سنا تھا کہ پل صراط سے گزرتے ہوئے جہنم بھی راستہ میں آتا ہے مگر ہم کو تو ملا ہی نہیں تو ارشاد ہوگا کہ تم نے ایک باغ سرسبز و شاداب دیکھا تھا یا نہیں وہ کہیں گے ہاں باغ دیکھا تھا ارشاد ہوگا کہ وہی جہنم تھا جو تمہارے ایمان کی برکت سے گلزار ہو گیا جیسے حضرات ابراہیم علیہ السلام کے لئے دنیا میں آگ گلزار ہوگئی تھی۔

گلستان کند آتشے بر خلیل — گروہے بآتش بردز آب نیل

اور نیز قیامت میں انبیاء علیہم السلام اور بعض مومنین اذن شفاعت کے بعد جہنم میں گھس گھس کر دوزخیوں کو نکالیں گے مگر جہنم ان کا کچھ بھی نہ کر سکے گی اور اس وقت بھی زبانیہ جہنم دوزخ میں موجود ہیں مگر ان کو اس سے کچھ ضرر نہیں ہے۔ یہ تو ان لوگوں کی حالت ہے جو کامل الایمان ہیں اور جن میں ایمان ضعیف ہے ان کو بھی جہنم پوری طرح نہ جلا سکے گی کیونکہ ان کے دل میں ایمان ہے مومن کے قلب پر آگ کا اثر نہ پہنچے گا اور حدیث مسلم میں ہے کہ **اماتھم اللہ اماتۃ** کہ گنہگار مسلمانوں کو حق تعالیٰ جہنم میں داخل کر کے ایک قسم کی موت یعنی نیند کا سا اثر دیدیں گے پھر ان کو عذاب جہنم کا کافر کے برابر احساس نہ ہوگا الغرض اصل جہنم تو خدا کی ناراضی ہے۔ (الاکرامیہ بالاعملیہ ج ۳۰)

شان ملکیت شان نبوت کے تابع ہے

آج کل جدید سوانح عمریوں کا حاصل صرف یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں شان ملکیت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ یعنی آپ بادشاہ اعلیٰ درجہ کے تھے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح وہ ہے جس میں شان رسالت کا بیان ہو اور گو آپ میں دونوں شانیں تھیں، نبوت کی بھی، سلطنت کی بھی مگر شان رسالت اصل ہے اور شان سلطنت تابع اور منصب نبوت کی مکمل ہے کیونکہ اصلاح خلق میں جو کہ منصب نبوت ہے لوگوں کے مزاحم ہونے کی بھی نوبت آ جاتی ہے ایسے لوگوں کو زیر کرنے کے لیے سلطنت بھی ضروری ہے۔ پس سلطنت تابع ہوئی مگر یہ لوگ اصل چیز یعنی نبوت کے بیان کو چھوڑ کر سلطنت کے بیان کو لے بیٹھتے ہیں جو کہ تابع ہے آج کل کی سوانح میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بادشاہی تو ملے گی مگر کمالات نبوت کے ذکر کے اہتمام سے خالی ملیں گی۔ حتیٰ کہ ان سوانح عمریوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پاک نہ ہو تو دیکھنے سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ کسی نبی کی سوانح ہے۔ بھلا یہ سوانح سوانح نبویہ کس طرح کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہیں جبکہ اصل کمالات کے ذکر ہی سے عاری ہیں (بلکہ غور کیا جاوے تو یہ سوانح تو تابع کے بیان سے بھی کوری ہیں کیونکہ درحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سلطنت کا بیان تو اس کو کہا جاوے گا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رسالت کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہو جبھی تو وہ سلطنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح ہوگی مگر جب ان میں اس حیثیت کی رعایت نہیں کی گئی تو محض ایک بادشاہ کی بادشاہی کا بیان ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سلطنت کا تذکرہ نہ ہوا۔ (۱۲ جامع) (الرحمہ علی الامہ ج ۳۱)

ایک علمی نکتہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطے یوں دعا فرمائی: "اللّٰھم ادس الحق معه حیث دا" (یعنی اے اللہ علی جدھر ہوں حق کو ادھر ہی کر دیجئے) یہ نہیں فرمایا کہ حق کی طرف ان کو کر دے اس میں اسی مقام مرادیت کی طرف اشارہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر ان سے کبھی اجتہادی غلطی بھی ہو جاوے تو آپ اسباب ایسے پیدا کر دیجئے کہ ان کی بناء پر حق علیؓ کی طرف ہو جاوے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ناحق کو حق بنا دیا جائے نہیں بلکہ صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ جو حضرت علیؓ کریں یا کہیں وہی حق ہو جائے مثلاً مدعی نے غلط دعویٰ کیا اور حضرت علیؓ نے اجتہادی خطا سے اس کو غالب کر دیا۔ یہ ظاہر میں خلاف حق ہوا مگر پھر مقدمہ میں مظلوم نے زیادتی شروع کر دی جس سے ظالم مظلوم ہو گیا تو حق علیؓ کی طرف ہو گیا۔ خوب سمجھ لو یہ احادیث کے لطائف ہیں جو صوفیہ کے علوم سے حاصل ہوتے ہیں مگر جہلاء صوفیہ کے لطائف معتبر نہیں جاہل صوفی تو بالکل ڈوب گئے اور ظاہری مولوی بالکل کورے رہ گئے مگر اتنی غنیمت ہے کہ کورے نہیں ہیں۔ بہرحال جب یہ برکت ہے اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی کہ اس کی بدولت آدمی رضائے حق کی طرف خود بخود ہو جاتا ہے۔ (الرحمۃ علی الامہ ج ۳۱)

قبولیت ذکر کی عجیب مثال

مولانا خوب فرماتے ہیں:

ایں قبول ذکر تو از رحمت است　　　چوں نماز مستحاضہ رخصت است

خوب مثال دی کہ جیسے استحاضہ والی عورت جس کو ہر وقت خون جاری رہتا ہے شریعت اس کو حکم دیتی ہے کہ ایسی حالت میں تو نماز پڑھتی رہ حق تعالیٰ اپنی رحمت سے قبول فرما لیں گے۔ ظاہر ہے کہ جب اس کا خون بہہ رہا ہے تو وہ حقیقت میں ناپاک ہے مگر اس حالت میں بھی اس کی نماز قبول ہو جاتی ہے تو اسی طرح گو ہمارا منہ مثلاً خدا کی یاد کے قابل نہیں مگر شریعت کا حکم ہے کہ قابل ہو یا نہ ہو کام کرنا چاہیے حق تعالیٰ قبول فرمانے والے ہیں اور اس میں ایک راز غامض ہے وہ یہ کہ اگر کوئی بدون طہارت غیر مامور بہا کے اطاعت نہ کرے یا نہ ہو سکتی ہو اور یہی انتظار رکھے کہ جب تک ہم ذکر کے قابل نہ ہو جاویں ذکر شروع نہ کریں تو

جس وقت بھی یہ شخص ذکر شروع کرے گا یا کوئی طاعت کرے گا تو اس وقت اپنے آپ کو طاہر اور اس کے قابل سمجھے گا حالانکہ حق تعالیٰ کی عظمت حقوق کے اعتبار سے کوئی بھی قابل اور طاہر نہیں ہوسکتا اور کسی اور کی تو کیا مجال ہے جبکہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ”**لااحصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک**“ (کہ اے اللہ میں بھی آپ کی ثناء نہیں کرسکتا تو جب بھی ہم طاعت کریں گے وہ ناقص ہی ہوگی) (شکر النعمة ج ۳۱)

رحمت خداوندی

ایک ناپاک شخص کا دریا پر گزر ہوا اور دریا نے اس کو پکارا کہ میرے پاس آ جا میں تجھے پاک کردوں اس نے کہا کہ میں کس منہ سے آؤں تو پاک صاف اور میں گندہ ناپاک۔ دریا نے کہا کہ تو چاہتا ہے کہ پاک ہوکر میرے پاس آئے اور بدون میرے پاس آئے تو پاک نہیں ہوسکتا تو ہمیشہ ناپاک ہی رہے گا۔ بس تو اسی حالت میں ناپاک ہی میرے پاس چلا آ تجھے میں ہی پاک کرسکتا ہوں مجھ سے دور رہ کر تو پاک نہیں ہوسکتا۔

صاحبو! اسی طرح ہم چاہتے ہیں کہ اپنے گمان کے موافق پاک صاف ہوکر خدا کی طرف رخ کریں۔ حالانکہ بدون خدا کی طرف رخ کیے تم پاک ہی نہیں ہوسکتے۔ بس اس کا تو یہی طریقہ ہے کہ تم جیسے بھی ہو چلے آؤ۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

(واپس آ واپس آ جو کچھ بھی تو ہے واپس آ جا، گرچہ کافر اور آتش پرست و بت پرست بھی ہے تو واپس آ)

رحمت متوجہ ہوکر تم کو خود پاک کردے گی۔ (شکر النعمة ج ۳۱)

عمل اور رحمت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ ”**لن یّدخل الجنة احد بعمله**“ کہ جنت میں اپنے عمل کی وجہ سے کوئی داخل نہیں ہوگا۔ سب رحمت خداوندی سے جنت میں جائیں گے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا ”ولا انت یارسول اللہ“ کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ بھی اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل نہ ہوں گے۔ حضور صلی اللہ

علیہ وسلم نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیا اور فرمایا "**و لا انا الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ**" یعنی نہ میں ہاں اگر خدا کی رحمت متوجہ ہو جائے تو میں بھی اللہ کی رحمت سے جنت میں جاؤں گا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہیں تو اور تو کس شمار میں ہیں بالکل سچ فرمایا:

خود کہ باید ایں چنیں بازار را — کہ بیک گل می خری گلزار را
(ایسا بازار کہاں پاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی خرید لو)

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد — انچہ در وہمت نیاید آں دہد
(فانی اور حقیقت جان لیتے ہیں اور اس کے بدلہ میں باقی رہنے والی جان عطا کرتے ہیں جو وہم وگمان سے بلند و بالا ہے) (شکر النعمۃ ج ۳۱)

معراج کے اسرار

ایک بزرگ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حق تعالیٰ کی کیا باتیں ہوئیں؟ انہوں نے جواب میں یہ شعر فرمایا:

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں — بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

(اب کس کی ہمت ہے کہ باغ کے مالی سے یہ پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا) واقعی خوب ہی جواب دیا اس وقت کسی کی کیا طاقت جو ان اسرار کو یقینی طور پر معلوم کر سکے۔ اگر قسمت میں ہے تو جنت میں جا کر معلوم کر لیں گے باقی یہاں اول تو کسی کو معلوم کس طرح ہو سکتا ہے اور جو کسی کو کشف سے کچھ معلوم بھی ہوتا ہے تو وہ ظنی ہے اس پر یقین کیونکر ہو سکتا ہے (شکر النعمۃ ج ۳۱)

ترحم سیدنا حضرت نوح علیہ السلام

حضرت سیدنا نوح علیہ السلام پر یہ الزام لگایا کہ ان میں ترحم کم تھا۔ افسوس کہ یہ لوگ قرآن کو بھی تو نہیں دیکھتے۔ قرآن میں حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں یہ ارشاد خداوندی موجود ہے:

"واوحی الی نوح انہ لن یؤمن من قومک الا من قد امن فلا تبتئس بما کانوا یفعلون واصنع الفلک باعیننا ووحینا ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا انہم مغرقون۔"

ترجمہ: ان آیات کریمہ کا یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کی طرف یہ وحی بھیجی گئی کہ بس اب

آپ کی قوم میں سے بجز ان لوگوں کے جو کہ ایمان لا چکے ہیں اور کوئی بھی ایمان نہ لائے گا تو آپ ان کے افعال سے رنجیدہ نہ ہو جایئے۔ معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام کو اپنی قوم کے افعال سے رنج ہوتا تھا اور رنج ہونا شفقت کی دلیل ہے۔ شفقت نہ ہوتی تو ان کے افعال کی کچھ بھی پرواہ نہ ہوتی۔ یہی سمجھتے کہ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے مگر نہیں ان کو بوجہ شفقت کے رنج ہوتا تھا ہاں جب تو حق تعالیٰ نے منع فرما دیا کہ بس اب مت رنج کرو تو پھر رنج نہیں کیا اور ان کی طرف سے دل کو خالی کر لیا۔ اس کے بعد حکم ہوتا ہے کہ تم ایک کشتی ہمارے سامنے اور ہمارے حکم سے بناؤ اور ان ظالموں کی بابت اب کوئی بات ہم سے نہ کہیو یہ بالیقین غرق ہوں گے۔

بھلا جب حق تعالیٰ نے صاف صاف منع فرما دیا کہ اب ان لوگوں کی بابت مجھ سے بات نہ کہیو تو حضرت نوح علیہ السلام ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کیسے ظاہر کر سکتے تھے مگر انہوں نے پھر بھی جہاں ذرا سی گنجائش پائی شفقت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ حق تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ ہم تمہارے اہل کو غرق نہ کریں گے جب نوح علیہ السلام کا بیٹا غرق ہونے لگا تو حق تعالیٰ سے اس کی سفارش کی ”**ونادیٰ نوح ربه فقال رب ان ابنی من اهلی وان وعدک الحق وانت احکم الحاکمین**“ یعنی نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی کہ یا اللہ میرا بیٹا بھی تو میرے اہل میں سے ہے اور آپ کا وعدہ سچا ہے یعنی آپ وعدہ فرما چکے ہیں کہ تمہارے اہل کو ہم غرق نہ کریں گے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نوح وہ تمہارے اہل میں سے نہیں تھا اس کے اعمال برے تھے اور تمہارے اہل سے مراد وہ لوگ تھے جو کہ آپ کے خاندان کے ہوں اور متبع بھی ہوں تو دیکھئے شفقت نہ ہوتی تو بیٹے کے واسطے عرض نہ کرتے۔ شاید آپ یہ کہیں کہ اپنے بیٹے کے لیے دعا کرنا اور سفارش کرنا یہ تو دلیل شفقت نہیں ہو سکتی کیونکہ اپنے بیٹے سے تو باپ کو شفقت ہوا ہی کرتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ اول تو نوح علیہ السلام پیغمبر تھے اور انبیاء علیہم السلام مثل اپنی اولاد کے دوسروں کو بھی سمجھتے ہیں مگر چونکہ دوسروں کی سفارش کے لیے کوئی گنجائش نہ رہی تھی اس لیے نہ کر سکے اور بیٹے کے بارے میں چونکہ عرض معروض کی گنجائش تھی بوجہ وعدہ سابق کے اس لیے ذرا سی گنجاش پر بھی نہ چونکے اور فوراً عرض کر ہی دیا اس سے ہم یہی سمجھیں گے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو دوسروں پر بھی شفقت تھی مگر بوجہ گنجائش باقی نہ رہنے کے ان کے لیے عفو کی دعا نہ کر سکے۔ (شکر النعمة ج ۳۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر شفقت

اگر آپ کے پاس مال و دولت بکثرت بھی جمع رہتا تب بھی آپ کو اس سے کچھ ضرر نہ تھا مگر پھر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فاقہ کشی کو اختیار فرمایا تو اس کی کیا وجہ تھی صرف امت کا خیال کہ اگر میں ذرا بھی دنیا کی طرف ہاتھ بڑھاؤں گا تو میری امت اس کو بھی سنت سمجھے گی اور میری سنت سمجھ کر مال و دولت جمع کرنے کی طرف جھک جائے گی، میرے واسطے تو اگرچہ مال و دولت مضر نہیں ہو سکتا مگر اُمت کو اس سے ضرر پہنچے گا تو محض ہماری خاطر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر فاقہ کی تکلیف برداشت کی۔ حتیٰ کہ شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تین برتن پیش کیے گئے ایک شہد کا ایک شراب کا ایک دودھ کا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کو اختیار فرمایا یہ بھی اُمت کے حال پر رحمت تھی۔ حالانکہ اگر آپ شراب کو اختیار فرما لیتے تو چونکہ وہ دنیا کی شراب نہ تھی جنت کی شراب تھی حلال اور پاکیزہ تھی کچھ آپ کا ضرر نہ ہوتا، نہ آپ کو گناہ ہوتا۔ اسی طرح اگر شہد کو لے لیتے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر ذرا بھی لذات کی طرف میلان فرماتے تو اُمت کو اس سے حصہ ملتا اور اُمت کے لیے وہ میلان مضر ہوتا اسی لیے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کو اختیار فرمایا تو جبریل علیہ السلام نے خوش ہو کر عرض کیا "**اخترت الفطرة ولو اخذت الخمر لغوت امتک**" یعنی آپ نے دین کو اختیار فرمایا اور اگر آپ شراب کو اختیار فرماتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔ عالم برزخ میں دودھ دین کی صورت ہے۔ چنانچہ اگر کوئی خواب میں دودھ پیتے ہوئے یا پلاتے ہوئے دیکھے تو اس کی تعبیر دین ہو گی جیسا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تعبیر اپنے اس خواب کی ارشاد فرمائی جس میں خود دودھ نوش فرما کر بچا ہوا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا فرمانا دیکھا تھا۔ اس کی مناسبت سے اپنا ایک خواب یاد آ گیا۔

میں نے ایک بار خواب میں دیکھا کہ ایک مجمع ہے جس میں لوگوں کو چھاچھ تقسیم ہو رہی ہے میرے سامنے بھی پیش ہوئی تو میں نے انکار کر دیا، میں نے نہیں پی، جب میں بیدار ہوا تو تعبیر خود بخود دل میں یہ آئی کہ جس طرح دودھ کے معنی عالم میں دین کے ہیں چھاچھ کی تعبیر صورت دین ہے جس میں معنی نہیں سو یہ مجمع بھی عمل بالحدیث کا مدعی ہے۔ گویا اس خواب میں یہ بتلایا گیا تھا کہ ان لوگوں میں دین کی صورت ہی صورت ہے، روح دین کی نہیں ہے۔ (شکر النعمة ج ۱ ۳۱)

اس میں امر سے پہلے یہ ارشاد فرمایا ہے: "**ان اللّٰه و ملٰئکتهٗ یصلون علی النّبی**"

(حق تعالیٰ اور ملائکہ علیہم السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درُود بھیجتے ہیں) "**یصلون علی النبیّ**" (نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درُود بھیجتے ہیں) صیغہ تجدد ہے. جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمیشہ درُود بھیجتے رہتے ہیں چاہے کوئی درُود بھیجے یا نہ بھیجے اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ سے بڑھ کر کس کا درُود ہو سکتا ہے اور حق تعالیٰ ہمیشہ درُود نازل فرماتے رہتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو درجات عالیہ عطا ہونے والے ہیں وہ تو حق تعالیٰ خود ہی حضور صلی اللہ کو ضرور ہی عطا فرمائیں گے اگر تم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے درُود پڑھو گے تو اس سے تم کو بھی نفع ہو گا باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اس کی کوئی ضرورت نہیں اور درُود شریف میں علاوہ اس کے کہ وہ ایک ذکر ہے، جو مقتضا محبت کا ہے اور بھی فضائل ہیں۔ (شکر النعمة ج ۳۱)

فضائل درُود شریف

حدیث شریف میں فرماتے ہیں: "**من صلی علی واحدا صلی اللہ علیہ عشراً**" جو میرے اوپر ایک بار درُود بھیجے گا حق تعالیٰ اس پر دس بار درُود بھیجیں گے۔ ایک فائدہ درُود میں بہ نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر شریف کے دوسرے طرق کے یہ ہے کہ ذکر بسیط ہے اور ذکر بسیط متفرق اذکار سے زیادہ سہل و دلچسپ ہوتا ہے۔ پھر اس میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ذکر اللہ بھی ہے اور ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کیونکہ درُود شریف میں اللہ کا نام بھی ضرور ہوتا ہے تو خلوت میں اس سے زیادہ دلچسپ ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی طریقہ نہیں۔ البتہ جلوت میں اگر مجمع مشتاق ہو تو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات اخلاق وغیرہ کا بھی ذکر کر دیا جائے یہ ذکر ولادت سے بھی افضل ہے کیونکہ ولادت بھی تو اسی کے واسطے ہوئی تھی یہ کمالات مقصود بالولادت ہیں ان کا ذکر اس کے ذکر سے افضل ہوگا۔ درُود کی اور فضیلت بھی آئی ہے چنانچہ ایک صحابی نے چند اوراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیے کہ میں چند وظائف پڑھتا ہوں جن میں درُود شریف ربع کے قریب ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "**لو زدت لکان خیراً لک**" (اگر اس سے زیادہ کرتا تو تیرے لیے یہ بہتر تھا) انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نصف کے قریب درُود شریف پڑھا کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی فرمایا کہ اگر اور بڑھاؤ گے تو بہتر ہوگا۔ یہاں تک کہ انہوں نے عرض کیا کہ میں سارا وظیفہ درُود شریف ہی کا رکھوں گا اور کچھ نہ پڑھوں گا۔ حضور صلی

اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اذا یلفی همک ویغفر ذنبک" کہ اگر ایسا کرو گے تو تمہارا تمام فکر دور ہو جائے گا اور گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ (شکر النعمة ج ۳۱)

زیارت روضۂ اقدس کی فضیلت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ایک حق یہ ہے کہ قبر شریف کی زیارت سے مشرف ہو خصوص جو حالت حیات میں زیارت سے مشرف نہیں ہوئے وہ روضۂ اطہر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے برکات حاصل کرلیں کہ وہ برکات اگرچہ زیارت حیات کے برکات جیسے بالکل نہ ہوں مگر ان کے قریب قریب ضرور ہیں۔ حدیث میں ارشاد موجود ہے: "من زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی" جس شخص نے میرے مرنے کے بعد زیارت میری قبر کی کی گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات خود بھی قابل توجہ ہے اگر آپ کا تعلق صرف مبلغ ہی ہونے کی حیثیت سے ہوتا تو زیارت قبر مسنون نہ ہوتی کیونکہ اس وقت تبلیغ کہاں ہے۔ افسوس کہ بعض لوگ ایسے خشک ہیں کہ وہ زیارت قبر شریف کی فضیلت کو نہیں مانتے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ناجواز کے قائل ہیں۔

کان پور میں ایک مرتبہ ایک مترجم اربعین حدیث میں بچوں کا امتحان تھا۔ جلسہ امتحان میں ایسے ہی ایک شخص تھے جو کہ زیارت قبر شریف کو ناجائز سمجھتے تھے۔ ایک بچہ کا امتحان شروع ہوا اس نے اتفاق سے یہ حدیث پڑھی۔ "من حج ولم یزرنی فقد جفانی" (جس نے حج کیا اور میری زیارت نہیں کی اس نے مجھ پر ظلم کیا) فرمایا ہے تو یہ آپ کی حالت حیات کے ساتھ خاص ہے بعد وفات زیارت ثابت نہیں طالب علم بچہ تھا اشکال سمجھا بھی نہیں نہ اس کو جواب معلوم تھا وہ سادگی سے آگے بڑھنے لگا۔ خدا کی شان آگے جو حدیث موجود تھی وہ اس اعتراض ہی کا جواب تھی آگے یہ حدیث تھی کہ "من زارنی بعد مماتی فکانما زرانی فی حیاتی" (جس نے میرے مرنے کے بعد زیارت کی گویا اس نے میری زندگی میں زیارت کی) جتنے علماء اس وقت موجود تھے سب نے ان صاحب سے کہا لیجئے حضرت آپ کے اعتراض کا جواب منجانب اللہ ہو گیا، بس خاموش رہ گئے بعضے لوگ زیارت قبر شریف پر ایک شبہ کرتے ہیں کہ اب تو قبر کی بھی زیارت نہیں ہوتی کیونکہ قبر شریف نظر نہیں آتی اس کے گرد پتھر کی دیوار قائم ہے جس کا دروازہ بھی نہیں یہ عجب لغو اشکال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر زیارت قبر کے لیے قبر کا دیکھنا ضروری ہے تو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے بھی یہ شرط ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جائے حالانکہ بعض صحابہؓ نابینا تھے۔ عبداللہ بن ام مکتوم صحابیؓ ہیں یا نہیں؟ مستورات کے بارے میں کیا کہو گے۔ جس طرح صحابیت کے لیے حکمی زیارت کافی مانی گئی ہے اسی طرح زیارت قبر شریف میں بھی حکمی زیارت کو کیوں نہ کافی مانا جائے گا، یعنی ایسی جگہ پہنچ جانا کہ اگر کوئی حائل نہ ہو تو قبر شریف کو دیکھ لیتے یہ بھی حکماً زیارت قبر شریف ہے۔ (شکر النعمة ج ۳۱)

ایک نیم ملا کا غلط معنے سمجھنے کے سبب حافظ کو لقمہ دینا

بنگلور میں ایک حافظ صاحب نے یہ آیت نماز میں پڑھی "**ولکن ظننتم ان اللّٰہ لایعلم کثیراً مما تعلمون**" (لیکن تم اس گمان میں رہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے بہت سے اعمال کی خبر نہیں) ان کے پیچھے ایک نیم ملا بھی تھے انہوں نے حافظ کو لقمہ دیا۔ "**ان اللّٰہ یعلم کثیراً مما تعملون**" (بے شک اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اکثر اعمال کو جو تم کرتے ہو) حافظ صاحب نے پھر آیت کا اعادہ کیا چونکہ اس کو اچھی طرح "**لایعلم کثیراً مما تعملون**" (تمہارے اکثر اعمال کو جو تم کرتے ہو نہیں جانتے) یاد تھا اس نے پھر یہی پڑھا اور ان مولوی صاحب کے لقمہ کی پرواہ نہ کی، بعد نماز کے مولوی صاحب نے حافظ صاحب سے سخت لہجہ میں کہا کہ ہم نے تم کو لقمہ دیا تم نے لیا کیوں نہیں، سب کی نماز خراب کی۔ حافظ کو چونکہ خوب یاد تھا اس نے صاف کہہ دیا کہ قرآن میں "**لایعلم**" ہی ہے دیکھ لیا جائے۔ قرآن کو دیکھا تو واقعی اس میں بھی "**لایعلم**" نکلا۔ اب تو مولوی صاحب کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کیونکر صحیح ہوسکتا ہے۔ "**ان اللّٰہ لایعلم**" کیونکہ اللہ تعالیٰ کا عدم علم تو محال ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کاتب سے غلطی ہوگئی۔ ایک عالم بھی وہاں تھے انہوں نے سمجھایا کہ "**ان اللّٰہ لایعلم کثیراً مما تعملون**" ہی صحیح ہے اور یہ تو ظن کفار کا معمول ہے کہ تم یوں گمان کرتے ہو کہ خدا کو ہمارے بہت سے اعمال کی خبر بھی نہیں کہ "**ان اللّٰہ لایعلم ظننتم**" کے تحت میں داخل ہے۔ جب ان نیم ملا صاحب کی حیرت ہوئی اور سمجھے کہ میں نے کتنی بڑی غلطی کی کہ "**ظننتم**" پر خیال نہ کیا۔ دوسرے اس بھلے مانس کو یہ بھی خیال نہ ہوا کہ "**ان اللّٰہ لایعلم کثیراً مما تعملون**" (بے شک اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اکثر اعمال کو جو تم کرتے ہو) میں کثیراً کی قید کے کیا معنی ہوں گے

اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے بہت اعمال کو جانتے ہیں یعنی سب کو نہیں جانتے مگر خیر چونکہ بے چارے کسی قدر ذی علم تھے اس لیے تنبیہ سے سمجھ گئے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ نیم ملا ہونا تو برا ہے پھر اسے اچھا کیوں کہا گیا کہ ذی علم تھے۔ بات یہ ہے کہ نیم ملا ہونا اس وقت برا ہے جبکہ وہ اپنے کو مستقل سمجھے اور جو نیم ملا محقق کا تابع ہو کر رہے تو ایسا نیم ملا تو اچھا ہے یہ تو ''ان اللہ لایعلم کثیراً مما تعملون'' (بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے اکثر اعمال کو جو تم کرتے ہو نہیں جانتے؟) کے متعلق ایک لطیفہ تھا۔ میں یہ بیان کر رہا تھا کہ لوگ خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک واقعہ تو حدیث کا بیان کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ مرض لوگوں میں قدیم سے ہے آج کل بھی ایسے واقعات سننے میں آتے ہیں۔ (الحبور لنور الصدور ج ۳۱)

گیارہویں کرنے والوں کو تاریخی غلطی

حضرت کی وفات کی کسی مورخ نے نہیں لکھی نہ معلوم عوام نے گیارہویں تاریخ کس کشف والہام سے معلوم کر لی۔ بعض لوگ ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت غوث الاعظم خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں کیا کرتے تھے تو اول تو یہ روایت ثابت نہیں اس کا ثبوت دینا چاہیے دوسرے اگر ہو بھی تو کیا تم حضرت غوث اعظم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کرتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں چھوڑ کر بڑے پیر صاحب کی گیارہویں کرتے ہو یہ تو ان کے بھی خلاف ہے کیونکہ اگر بالفرض وہ گیارہویں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا کرتے تھے تو اس کو ہرگز وہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ میرے بعد بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے میری گیارہویں کی جائے۔ تیسرے اس میں عقیدہ بھی فاسد ہے کہ لوگ حضرت غوث اعظم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا میلاد کرتے ہیں تو بڑے پیر کی گیارہویں بلکہ بعض جگہ حضرت غوث اعظم کا میلاد بھی ہونے لگا' گویا بالکل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مساوات ہو گئے اور غضب یہ ہے کہ کرنے والوں کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر گیارہویں نہ کریں گے تو بلا نازل ہو گی بڑے پیر صاحب ناخوش ہو جائیں گے اور پھر نہ معلوم کیا سے کیا کر دیں گے۔ گویا (نعوذ باللہ) وہ مخلوق کو تکلیف دیتے پھرتے ہیں۔ نیز گیارہویں کرنے کو مال واولاد کی ترقی کا باعث سمجھتے ہیں اس میں حضرت غوث اعظم سے دنیا کے لیے تعلق رکھنا ہوا یہ کیسی بے حیائی ہے کہ جس مردار کو وہ چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے اسی کے لیے ان سے تعلق کیا جائے۔ (الحبور لنور الصدور ج ۳۱)

آیت افک پر ایک اشکال کا جواب

چونکہ اس کی تحقیق اہل علم کے سمجھنے کے قابل ہے اس لیے اس کو بھی بیان کرتا ہوں اس معنی میں عند اس آیت میں ہے "**فاذلم یاتوا بالشھداء فاولئک عنداللہ ھم الکاذبون**" یہ آیت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے افک کے قصہ میں ہے۔ قصہ طویل ہے اس کا بیان کرنا یہاں ضروری نہیں جتنا جز و اس قصہ کا یہاں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو منافقین نے متہم کیا' کئی دن تک اس کا بہت چرچا ہوا۔ آخر ان کی برأت حق تعالیٰ نے قرآن میں اتاری اور منافقین کے بکواس کو رد کیا۔ اس رد میں یہ آیت بھی ہے "فاذلم یاتوا بالشھداء فاولئک عنداللہ ھم الکاذبون" اس کا ترجمہ یہ ہے کہ چونکہ یہ لوگ گواہ نہیں لا سکے لہٰذا یہ خدائے تعالیٰ کے نزدیک جھوٹے ہیں اس کا مدلول یہ ہوا کہ ان کے جھوٹے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ چار گواہ نہ لا سکے۔ اب یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ کذب کس کو کہتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ کذب کے معنی حکایت خلاف واقع کے ہیں یعنی ایک کام واقع میں نہیں ہوا اور بیان کیا کہ ہوا ہے اور اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ شہادت نہ لاسکنا مستلزم کذب ہے۔ اب فرض کیجئے کہ ایک شخص نے کسی کو حرام کرتے دیکھا اور اس کی حکایت بیان کی مگر گواہ نہ لا سکا تو اس آیت کی بموجب تو وہ کاذب ہے لیکن یہ حکایت مطابق واقع کے ہے اس پر تعریف کذب کی صادق نہیں آتی اور آیت اس کو کاذب کہتی ہے اور لطف یہ ہے کہ آیت میں عنداللہ کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کے نزدیک اور بلفظ دیگر حق تعالیٰ کے علم میں اور یہ مقدمہ مسلم ہے کہ حق تعالیٰ کا علم واقع کے مطابق ہے ورنہ علم صحیح نہ ہوگا تو عنداللہ کے مفہوم پر آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ یہ شخص جس نے حرام کو دیکھ کر حکایت بیان کی واقع میں بھی جھوٹا ہے یعنی اس نے واقع میں حرام نہیں کیا کیونکہ علم الٰہی میں اس کو کاذب قرار دیا گیا ہے اور علم الٰہی مطابق واقع کے ہوتا ہے تو اب یہ لازم آتا ہے کہ (نعوذ باللہ) علم الٰہی خلاف واقع ہے۔ یہ ایک سخت اشکال ہے قرآن پر مگر الحمدللہ حق تعالیٰ نے اس کا بہت سہل جواب دل میں ڈال دیا جس کو سننے کے بعد یہ معلوم ہوگا کہ اشکال کچھ بھی نہ تھا۔ اس کی بناء اسی پر ہے کہ قرآن میں محاورات جاننے کی زیادہ ضرورت ہے صرف لفظی ترجمے اور لغت پر نہ رہنا چاہیے۔ ایک لفظ کے لغوی معنی ایسے ہوتے ہیں کہ اس سے مخاطب کو کوئی بات قابل شرح صدر حاصل نہیں ہوتی اور اسی کے ساتھ محاورہ کی رعایت کر دی جائے تو بالکل اطمینان ہو جاتا ہے اور سننے والا پھڑک اٹھتا ہے اور بہت سے اشکال رفع ہو جاتے

ہیں۔ وہ جواب سنئے وہ یہ ہے کہ عنداللہ کے معنی یہاں "فی علم اللہ" (اللہ کے علم میں) کے نہیں ہیں بلکہ "فی قانون اللہ" (اللہ کے قانون) میں کے اور فی دین اللہ کے ہیں مطلب یہ ہوا کہ قانون شرعی اس صورت میں کہ شہادت نہ پہنچ سکی، تہمت لگانے والوں کے لیے یہ ہے کہ ان پر حکم کذب کا کیا جائے گا یعنی ان کے ساتھ کاذب کا سا معاملہ کیا جائے گا چاہے واقع میں کچھ بھی ہو۔ اب کوئی اشکال نہیں رہا کیونکہ اشکال تو یہی تھا کہ علم الٰہی کا خلاف واقع ہونا لازم آتا ہے اور یہاں علم الٰہی مراد ہی نہیں صرف یہ معنی ہو گئے کہ قانون ان کو جھوٹا کہے گا، قانون ایک ایسی چیز ہے جس میں ضابطہ دیکھا جاتا ہے جس کے کچھ قواعد مقرر ہوتے ہیں کہ جب تک ان کے موافق کام نہ ہو اس کو معتبر نہیں مانا جاتا۔ (السلام التحقیقی ج ۳۱)

"اسئلک من خشیتک ماتحول بہ بیننا وبین معاصیک" (میں آپ سے سوال کرتا ہوں آپ سے ڈرتے رہنے کا اس چیز سے جو حائل بنے ہمارے اور تیری نافرمانی کے درمیان) صاحبو! غور کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے خوف مانگتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ قید لگادی ہے کہ خوف اس قدر ہو کہ گناہ نہ ہونے دے اس میں حکمت یہ ہے کہ خوف جب حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو موجب تعطل ہو جاتا ہے اور انسان کسی قابل نہیں رہتا۔ دیکھئے ہم لوگ پڑھتے ہیں پڑھاتے ہیں مگر سمجھتے وہی لوگ جن کی شان یہ ہے کہ:

بنی اندر خود علوم انبیاء   بے کتاب و بے معید و استا

(اپنے اندر انبیاء علیہم السلام کے علوم دیکھتا ہے) (فضائل العلم والخشیۃ ج ۳۱)

اصلاح کیلئے تین امور کی ضرورت

اصلاح میں تین امر ضروری ہوئے ایک علم دوسرا عمل، تیسرا حال چونکہ جب تک حال نہ ہونے علم وعمل سے کام نہیں چلتا۔ مثلاً ایک شخص جانتا ہے کہ زنا حرام ہے اور اس پر عمل بھی کرے کہ زنا سے بچا رہے لیکن اس عمل کو بقاء اس وقت نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس عمل میں صاحب حال نہ ہو جائے بغیر حال کے عمل ایسا ہے جیسے بے انجن کی گاڑی کہ اس کو ہاتھ سے دھکیل کر کچھ دور تک لے جایئے لیکن جہاں چھوڑ دیجئے رہ جائے گی کیونکہ اس میں آگ نہیں پس یا تو خود انجن بن جاؤ کہ تمہارے اندر آتش محبت الٰہی بھری ہوئی نہیں تو کسی انجن کے ساتھ ہو لو اور اگر یہ بھی نہ ہو تو وہی حالت ہو گی جس کو پہلی مثال میں عرض کیا۔ حضرت عراقی کہتے ہیں:

صنما رہ قلندر سزا وار بمن نمائی   کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(اے صنم قلندر کا راستہ لائق یہ اگر تو مجھ کو دکھائے اس واسطے کہ میں پارسائی کے راہ و رسم سے دور دیکھتا ہوں) (فضائل العلم والخشیۃ ج ۳۱)

نجات کیلئے ایمان کی ضرورت

بعض خطوط میرے پاس آئے ان میں یہ شبہ پیش کیا گیا تھا کہ صاحب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو مسلمان نہ ہو اس میں سارے کمالات موجود ہوں لیکن اس کو نجات نہ ہوگی تو بعض مدعیان عقل نے یہ شبہ پیش کیا کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک شخص میں تمام کمالات موجود ہیں، سخاوت بھی مروت بھی، ایثار بھی قومی ہمدردی بھی آج کل بس یہ اخلاق شمار کیے جاتے ہیں اور آج کل بڑی تہذیب ان اخلاق ہی کو سمجھا جاتا ہے اور عقائد کو عقیدۃً تو نہیں لیکن حالاً دائرہ مفہوم تہذیب سے گویا خارج ہی کر دیا ہے بلکہ عقائد کے اندر تو اپنے آپ کو بالکل مختار ہی سمجھ لیا ہے۔ سمجھتے ہیں کہ عقیدہ تو محض خیال کا نام ہے اور خیال کو بھلا کیا دخل نجات میں، عقائد کو تو یوں غیر ضروری قرار دے دیا ہے، اعمال کو کسی درجہ میں ضرور مؤثر سمجھتے ہیں مگر ان میں بھی سب اعمال نہیں محض چند اعمال جن کا نام اخلاق رکھ لیا ہے اور انہی کو مدار ٹھہرا دیا ہے ترقی اور کمال کا اور انہیں اخلاق کا نام تہذیب رکھا ہے اور ان کے یہ کام ہیں ترحم ایثار، ہمدردی نفع رسانی حب قومی۔ بس ان چند اخلاق میں تہذیب کو منحصر سمجھ کر شبہ پیش کر دیا کہ ایک شخص سب بزرگوں کی تعظیم و تکریم بھی کرتا ہے کسی نبی کی اہانت بھی نہیں کرتا، کسی کا دل بھی نہیں دکھاتا۔ داد و دہش بھی کرتا ہے مگر فقط رسالت کا منکر ہے گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی بھی نہیں کرتا اور خدا کو بھی مانتا ہے یا خدا کو بھی نہیں مانتا تو یہ کہا جائے گا کہ صرف دو مفروض کمالات نہیں ہیں پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ صرف ان دو مفروض کمالات کے نہ ہونے سے اس کے سارے کمالات پر کیسے خاک ڈال دی جائے گی اور اس کو جہنم میں ٹھونس دیا جائے گا یہ تو بڑی بے رحمی کی بات ہے اور شبہ کو اس سے قوی کرتے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں ایسا شخص ہے جو نہ حلال حرام کی پرواہ کرتا ہے نہ فرائض کو ادا کرتا ہے، نہ نماز کا نہ روزہ کا بلکہ پرلے درجہ کا فاسق و فاجر اور بدکار غرض تمام اعمال اور اخلاق اس کے خراب مگر ہے مسلمان، تو کہتے ہیں کہ صاحب چونکہ مسلمان ہے اس لیے کبھی نہ کبھی جنت میں ضرور جائے گا خواہ کٹ پٹ کر ہی جائے مگر جائے گا ضرور۔ تو یہ سمجھ میں نہیں آتا یوں اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برحق ہیں لیکن بظاہر یہ

معاملہ خدا کی شان کے خلاف ہے یہ تو بالکل تعصب معلوم ہوتا ہے تو یہ شبہ پیش کرتے ہیں۔ بھلا غور تو کیجئے کیسے افسوس کی بات ہے۔ یہ شبہ ان لوگوں کی زبان اور قلم سے نکلتا ہے جو اپنے کو سچا اور پکا مسلمان بلکہ قوم کا لیڈر اور مصلح خیال کرتے ہیں وہ شبہات پیش کرتے ہیں۔

خودساختہ محقق

سو حضرت میں ان شبہات کا راز بتلا دوں جو جاہل ہو کر اپنے کو محقق سمجھے گا وہ ایسی ہی خرابی میں پڑے گا حضرت تحقیق کوئی معمولی چیز نہیں ہے بہت بڑی چیز ہے۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ یہ ساری خرابی ان کے دعوئے تحقیق کا نتیجہ ہے یعنی انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم محقق ہیں حالانکہ لوازم میں سے محققیت کے یہ سمجھنا بھی ہے کہ ہم محقق نہیں ہیں۔ جب علم و کمال کے ساتھ یہ اعتقاد نہ رہے کہ ہم محقق ہیں تب کہیں جا کر انسان محقق ہوتا ہے۔ اگر یہ لازم منفی ہے تو محقق شدن بھی منفی ہے چاہے عالم فاضل ہی کیوں نہ ہو اور چہ جائیکہ عالم فاضل بھی نہ ہو چنانچہ آج کل جو اپنے کو محقق سمجھتے ہیں ان کا مبلغ علم بھی تو کچھ نہیں۔ بس کچھ تاریخیں پڑھ لیں کچھ فلسفہ پڑھ لیا اور سمجھنے لگے کہ ہم بہت بڑے محقق ہیں۔ جب اپنے نزدیک محقق ہو گئے تو پھر یہ خیال غالب ہو گیا کہ جو ہماری رائے کے خلاف ہے وہ واقع اور تحقیق کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ جو چاہا شبہ پیش کر دیا۔

باغی سلطنت

چنانچہ یہ بھی ایک شبہ پیش کر دیا جو میں نے عرض کیا۔ میں نے اس لیے اس مثال کی ضرورت سمجھی کہ یہ شبہ رفع ہو جائے ورنہ فی نفسہ یہ مسئلہ بالکل صاف تھا اور محتاج مثال نہ تھا۔ تقریر یہ ہے اس مثال کے انطباق کی کہ میں صاحب اعتراض اور صاحب شبہ سے گورنمنٹ کا قانون پوچھتا ہوں کہ ایک شخص ہو نہایت لائق جس کو تمام کمالات اعلیٰ درجہ کے حاصل ہوں مگر باغی ہو یعنی سلطنت کی اطاعت نہ کرتا ہو اس کی سزا کیا ہے؟ سب جانتے ہیں کہ اس کی سزا پھانسی ہے یا عبور دریا شور یا حبس دوام اب ایک شخص ایسے مجرم کے مقدمہ کی پیشی کے وقت عدالت میں حاضر ہے جج صاحب نے سزائے حبس دوام کا حکم سنایا آپ نے سنا۔ سن کر آپ نے پوچھا! کیوں صاحب اس پر کیا الزام لگایا گیا ہے اور کون سی دفعہ قائم کی گئی ہے جو اس قدر سخت سزا تجویز کی گئی۔

جج صاحب نے کہہ دیا اس نے بغاوت کا جرم کیا ہے اس لیے اسے حبس دوام کی سزا دی گئی ہے۔ یہ سن کر آپ کیا فرماتے ہیں کہ حضور کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ شخص ایم اے ہے ایل ایل بی ہے اور بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کیے ہوئے ہے۔ انگریزی ایسی جانتا ہے کہ انگریز بھی نہیں جانتے۔ جج صاحب نے کہا ہاں معلوم ہے، پھر کہا حضور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ شخص سائنس کا بھی بڑا ماہر ہے اس نے وہ وہ صنعتیں ایجاد کی ہیں کہ اہل یورپ بھی دنگ ہیں، کہا ہاں سب معلوم ہے، پھر کہا بڑے ہی غضب کی بات ہے اور بڑی بے انصافی ہے کہ اس کی ساری لیاقتیں پس پشت ڈال دی گئیں اور ساری قابلیتیں خاک میں ملا دی گئیں۔ فقط اتنی سی بات پر کہ باغی ہے حبس دوام کی سزا دیدی گئی۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جج کے اس حکم پر کبھی وسوسہ بھی ذہن میں نہ آئے گا کہ ایسی سخت سزا انصاف کے خلاف ہے یا ترحم کے خلاف ہے کیونکہ سمجھ لوگے کہ بغاوت جرم ہی ایسا ہے جس کی یہی سزا ہونی چاہیے۔ اگر اس صاحب شبہ کو جج کے فیصلہ پر بھی وسوسہ آتا تو خیر یہ کہا جا سکتا تھا کہ بیچارہ کیا کرے اس کی سمجھ ہی موٹی ہے اس لیے جو وسوسہ خدا پر پہنچا وہی جج پر بھی پہنچا مگر غضب تو یہ ہے کہ جج کے فیصلے پر تو کبھی وسوسہ نہ آیا اور خدا نے جو اسی کے مثل فیصلہ فرمایا اس پر شبہ پیش کر دیا۔ پھر اے صاحبو! یہ کیسا ایمان ہے اور یہ کیسا اسلام ہے کہ اس شخص کے نزدیک جج کا فیصلہ تو عقل کے قریب اور خدا کا فیصلہ عقل سے بعید ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ (اور ہم سب اللہ تعالیٰ کے پاس جانے والے ہیں) ایک شخص سلطنت سے بغاوت کرے تو اس کے سارے اعمال اور اس کی ساری خوبیاں ضبط ہونا تو معقول جو خدا سے بغاوت کرے اس پر شبہ اور اس شبہ کے جواب کے بعد ایک شبہ اور کیا جاتا ہے کہ یہ تو سمجھ میں آ گیا کہ اگر خدا سے بغاوت کرے تو واقعی اس کے سارے اعمال حبط ہی ہو جانے چاہئیں۔ (ملت ابراہیم ج ۳۱)

دین کے جملہ احکام آسان ہیں

دین کی ساری باتیں آسان ہیں نماز بھی، روزہ بھی مگر ہم نے خود ان کو مشکل بنا رکھا ہے بلکہ زیادہ تر تو سبب تنگی کا کم ہمتی ہے جیسے مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کے یہاں ایک احدیوں کی جماعت تھی ان کی ایک یوں ہی افواہی حکایت سنی ہے کہ دو شخص تھے ایک تو بیٹھا ہوا تھا اور ایک لیٹا ہوا۔ ایک سوار کا وہاں سے گزر ہوا، لیٹے ہوئے نے پکار کر کہا کہ میاں سوار

ذرا یہاں تو آنا' وہ آیا کہ نہ معلوم بیچارے کو کیا حاجت ہوگی' پوچھا کہ کیا کام ہے' کہا میاں یہ جو میرے سینہ پر ایک بیر پڑا ہوا ہے گھوڑے سے اتر کر ذرا میرے منہ میں ڈال دو' سوار نے کہا لاحول ولا قوة میں تو سمجھا تھا کہ نا معلوم کیا ضروری اور مشکل کام ہوگا بھلا کوئی کام ہے' خواہ مخواہ میرا راستہ کھوٹا کیا' ارے بھلے مانس تو خود اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا' کیا تیرے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ اس نے کہا اجی صاحب بھلا کہاں لیجاؤں اتنا بکھیڑا کس سے ہو اگر ذرا تمہیں ڈال دو گے تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا۔

صاحب انسان کو ایسا بھی بے مروت نہ ہونا چاہیے' سوار سخت متحیر ہوا اس کے پاس والے سے کہا کہ ارے تو کس مصرف کا ہے تو بھی تو یہاں ہی بیکار بیٹھا ہوا ہے تو ہی بیر اٹھا کر اس کے منہ میں ڈال دے' اس نے بگڑ کر کہا کہ بس جی مجھ سے کچھ نہ بولو' نہیں تو لڑائی ہو جاوے گی' تمہیں میرے دُکھ کی میرے درد کی کچھ خبر بھی ہے' آئے اور بس رائے دیدی اس سے اور مجھ سے یہ معاہدہ ٹھہرا تھا کہ ایک دن ہم بیٹھیں گے اور تم لیٹے رہو اور ایک دن تم بیٹھو اور ہم لیٹے رہیں اور جو بیٹھا ہو وہ لیٹے ہوئے کا کام کر دیا کرے' کل اس کے بیٹھنے اور میرے لیٹنے کا دن تھا مجھے لیٹے لیٹے جمائی آئی ایک کتا آ کر میرے منہ میں موتنے لگا یہ بیٹھا دیکھتا رہا اور کتے کو ہٹایا تک نہیں' اب میں اسے ضرور بیر کھلاؤں گا سوار کی حیرت کی حد نہ رہی کہ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے عالی ہمتی کا کہ منہ کے اندر کتے کے موتنے میں بھی اس کے منتظر ہیں کہ کوئی اور ہٹا دے اور بیر اٹھانے میں اس کے منتظر ہیں کہ کوئی اور اُٹھا کر منہ میں ڈال دے خود کون اٹھائے احدیت میں فرق آ جائے گا۔ خیر یہ تو واہیات گھڑی ہوئی حکایت ہے۔ (ملت ابراہیم ج ۳۱)

بحمداللہ تعالیٰ